مقالاتِ چشتی

مقالات، مضامین، مقدمات و تقاریظ کا مجموعہ

جلد اول

رشحاتِ قلم:

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی صاحب

طیب اللہ آثارہ واعلی درجاتہ فی دار السلام

سابق رئیس شعبۂ تخصص علومِ حدیث

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی

مرتب: شوکت علی

فہرست

مقالات / مضامین

شخصیات

امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ

(ماہنامہ معارف، نومبر—دسمبر 2000ء)

مقالات

امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ

از جناب مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی صاحب *

امام محمد فقیہ عراق، صاحب ابی حنیفہؒ، مدون و ناشر مذہب حنفی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، جامع صفات تھی۔ امام موصوف اصلاً "حرستا" غوطۂ دمشق کے تھے، واسط میں پیدا ہوئے، کوفہ میں تربیت پائی۔

وہ دو مجتہدین مطلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی "کتاب الآثار" اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی "الموطا" کے نہایت قوی و معتبر راوی اور ناشر ہیں۔

ائمۂ مجتہدین سے استفادہ و تلمذ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو مذاہب اربعہ کے دو نہایت جلیل القدر و عظیم الشان: مقبول و مقتدائے انام، امام اعظم ابو حنیفہؒ (۸۰-۱۵۰ھ/۶۹۲-۷۷۰ء)، امیر المومنین فی الحدیث: امام مالکؒ (۹۳-۱۷۹ھ/۷۱۲-۷۹۵ء) اور مذاہب مندرسہ (جن کے پیرو اور متبع اب دنیا میں باقی نہیں رہے) کے دو لائق اتباع امام ۱- امیر المومنین فی الحدیث[1] سفیان ثوری (۹۷-۱۶۱ھ/۷۱۶-۷۷۸ء) صاحب کتاب الجامع، مجتہد مطلق سے (جن کے مذہب پر سرزمین عراق

---

[1] عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم الرازی۔ تقدمۃ المعرفۃ لکتاب الجرح والتعدیل۔ حیدرآباد دکن، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۷۱ھ ج ۹ ص ۱۱۸۔ ترجمہ سفیان الثوری۔

---

* جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی، پاکستان۔

میں عمل کیا جاتا تھا اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اہل کوفہ میں ان کے مذہب کو "جامع الترمذی" میں جگہ جگہ نقل کرتے ہیں)، اور (۲) شیخ الاسلام[1] فقیہ شام و مجتہد مطلق، امام ابو عمرو عبدالرحمٰن اوزاعیؒ (۸۸-۱۵۷ھ / ۷۰۷-۷۷۴ء، جن کا مذہب عرصہ تک شام میں قابل اتباع رہا ہے) سے روایت و استفادہ کا فخر حاصل ہے، ان تینوں موخر الذکر مجتہدین مطلق کے متعلق علامہ ابن ابراہیم کا بیان ہے:

اذا اجتمع الثوری و مالک والاوزاعی	سفیان ثوری، امام مالک اور اوزاعی اگر
علی امر فھو سنۃ وان لم یکن	کسی بات پر اتفاق کریں تو وہ سنت ہے
فیہ نص[2]	اگرچہ اس میں نص (حکم صریح) موجود نہ ہو۔

رجال کے نامور عالم حافظ عبدالرحمٰن مہدی (۱۳۵-۱۹۸ھ) ان ائمہ فن کے متعلق فرماتے تھے۔

ائمۃ الناس فی زمانھم اربعۃ:	لوگوں کے اپنے زمانے میں امام چار ہیں،
سفیان الثوری بالکوفۃ ومالک	سفیان ثوری کوفہ میں، مالک حجاز میں حماد
بالحجاز وحماد بن زید بالبصرۃ	بن زید بصرہ میں اور اوزاعی شام میں۔
والاوزاعی بالشام[3]	

اصول دین سے روایت

سنن و آثار کا بنیادی ذخیرہ جن ائمہ فن اور نامور حفاظ حدیث کے پاس محفوظ تھا، امام محمد کو ان سے راست روایت کا فخر حاصل ہے اور یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ جس نے ان سے استفادہ نہیں کیا اسے حدیث میں مفلس اور کنگال سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ امام حافظ عثمان بن

---

[1] محمد بن احمد الذھبی، سیر اعلام النبلاء تحقیق شعیب الارناؤط۔ بیروت: موسسۃ الرسالۃ ۱۴۰۲ھ، ج ۷۔ ص ۱۰۷۔ تذکرۃ الحفاظ، حیدرآباد دکن، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف، العثمانیہ۔ ۱۳۷۵ھ، ج ۱، ص ۱۷۸ [2] تذکرۃ الحفاظ۔ ج ۱، ص ۲۰۹ [3] کتاب الجرح والتعدیل۔ ج ۱، ص ۳۱۱۔ ترجمہ مالک بن انسؒ۔

سعید دارمی المتوفی ۲۸۰ھ فرماتے تھے:

یقال: من لم یجمع حدیث ھولاء	کہا جاتا ہے کہ جس نے ان پانچ (ائمہ فن)
الخمسۃ فھو مفلس فی الحدیث:	کی حدیثیں جمع نہیں کیں، وہ حدیث میں
سفیان وشعبۃ ومالک وحماد بن	کنگال ہے (اس کے پاس حدیث کا ذخیرہ
زید وابن عیینۃ وھم اصول	نہیں ہے، حدیث پر اس کی نظر نہیں)، وہ
الدین[1]	۱۔ سفیانؒ ۲۔ شعبہؒ ۳۔ امام مالکؒ (یہ
	تینوں امیر المومنین فی الحدیث ہیں) ۴۔ حماد
	بن زید (۹۸-۱۷۹ھ / ۷۱۷-۷۹۵ء) اور
	۵۔ سفیان بن عیینہ (۱۰۷-۱۹۸ھ =
	۷۲۵-۸۱۴ء) ہیں، یہ سب امام محمدؒ کے
	شیوخ اور ان کے ہم عصر ہیں۔

امام محمدؒ نے ان مذکورہ بالا پانچ ائمہ سے کتاب الحجۃ علی اھل المدینۃ میں راست روایت کی ہیں، چنانچہ سفیان ثوریؒ سے (ج ۱ ص ۱۰) شعبہؒ سے (ج ۱ ص ۲۵۲) مالکؒ سے (ج ۱ ص ۴۳) حماد بن زید سے (ج ۳ ص ۴۶۷) اور سفیان بن عیینہ سے (ج ۱ ص ۱۰۳ طبع لاہور) میں روایتیں موجود ہیں۔

اسانید حجاز و کوفہ

اسانید حجاز و کوفہ جن چھ اساطین علم و حفاظ حدیث میں دائر سائر رہی ہیں، سفیان ثوریؒ ان کے علوم کے جامع تھے۔ چنانچہ امام بخاری کے استاد حافظ علی بن المدینیؒ المتوفی ۲۳۴ھ فرماتے تھے:

---

[1] عثمان ابن الصلاح۔ مقدمہ ابن الصلاح و محاسن الاصطلاح تحقیق عائشۃ عبدالرحمٰن ط: ۲۔ القاھرۃ دار المعارف ۱۴۱۱ھ / ۱۹۹۰ء ص ۴۳۴ (النوع الثامن والعشرون)

نظرت[1] فاذا الاسناد یدور علی ستة، الزهری وعمرو بن دینار وقتادة ویحییٰ بن کثیر وابواسحاق والاعمش ثم صار علم هولاء الستة من اهل الکوفة الی سفیان الثوری۔

"میں نے اسانید کو غور سے دیکھا تو انہیں چھ ائمہ فن حفاظ میں دائر سائر پایا۔ (۱) امام حافظ ابوبکر محمد بن مسلم بن شہاب الزہری (۵۸-۱۲۴ھ = ۶۷۸-۷۴۲ء) (۲) عمرو بن دینار مکی (۴۶-۱۲۶ھ = ۶۶۶-۷۴۳ء) (۳) ابوالخطاب قتادة بن دعامة بصری (۶۱-۱۱۸ھ = ۶۸۰-۷۳۶ء) (۴) یحییٰ بن ابی کثیر یمامی (....-۱۲۹ھ = ...-۷۴۷ء) (۵) ابواسحاق عمرو بن عبداللہ ہمدانی (۳۳-۱۲۷ھ = ۶۵۳-۷۴۵ء) (۶) ابومحمد سلیمان بن مہران اعمش کوفی (۶۱-۱۴۸ھ = ۶۸۱-۷۶۵ء)

ان سب کا علم اہل کوفہ میں امیر المومنین فی الحدیث سفیان ثوریؒ (۹۷-۱۶۱ھ = ۷۱۶-۷۷۸ء) میں سمٹ آیا تھا۔"

حافظ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے "تذکرة الحفاظ" میں حافظ ابن المدینی کا قول نقل کرکے لکھا ہے:

"ثقات کا علم حجاز میں زہری اور عمرو بن دینار میں اور بصرہ میں قتادہ، یحییٰ ابن ابی کثیر میں اور کوفہ میں ابواسحاق السبیعی اور اعمش میں دائر و سائر تھا یعنی صحاح کی بیشتر حدیثیں

---

[1] کتاب الجرح والتعدیل ص ۱۱ و ۵۹، ۲۰۰- حسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی المحدث الفاصل بین الراوی والواعی تحقیق محمد عجاج الخطیب ط: ۳- بیروت دار الفکر ۱۴۰۴ھ = ۱۹۸۴ء ص ۶۱۴- احمد بن علی الخطیب البغدادی تاریخ بغداد- بیروت دار الکتب العلمیة ج ۱۴ ص ۱۷۹- یوسف المزی- تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، بیروت دار المامون للتراث ۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء ج ۱ ص ۵۴۷ (ترجمہ سلیمان الاعمش)

[2] تذکرة الحفاظ ج ۱ ص ۱۱۱ و ۳۷۰ (ترجمہ محمد بن شہاب الزہری ویحییٰ بن آدم)

مذکورہ بالا چھ حفاظ کی سند سے باہر نہیں ہیں۔"

ان میں سے ہر ایک کی فن حدیث میں امتیازی شان اور روایات کی تعداد کی طرف امام ابو داوٗد طیالسیؒ المتوفی ۲۰۳ھ نے اہل علم کی رہنمائی ان الفاظ میں کی ہے:

کان قتادة اعلمهم بالاختلاف، والزهری اعلمهم بالاسناد، وابو اسحاق اعلمهم بحدیث علی و ابن مسعود، وکان عند الاعمش عن کل هذا، ولم یکن عند واحد من هولاء الا الفین الفین[1]	ان مذکورہ بالا چھ ائمہ فن میں قتادہ اختلاف الفاظ کے زیادہ بڑے عالم تھے، زہری اسناد کے زیادہ شناسا تھے، ابو اسحاق کو حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کا زیادہ علم تھا اور اعمشؒ کے پاس یہ سب کچھ موجود تھا اور ان میں سے ہر ایک کے پاس دو ہزار حدیثوں کا ذخیرہ موجود تھا۔

یاد رہے کہ ان چھ اساطین علم میں سے پانچ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ حدیث میں سے ہیں، حافظ ابوالحجاج جمال الدین مزی المتوفی ۷۴۲ھ نے "تہذیب الکمال" میں امام ابوحنیفہ کے تذکرہ ج ۳، ص ۱۴۵۸ میں عمرو بن دینار، محمد بن مسلم زہری، ابواسحاق السبیعی کا ذکر ان کے شیوخ میں کیا ہے اور سلیمان بن اعمش سے "جامع المسانید" (ج ۱ ص ۳۲۵ و ۴۵۳) میں روایت بصراحت موجود ہے۔ قتادہؒ سے ج ۲ ص ۳۲۵ میں روایت منقول ہے۔

ان اساطین علم میں ابواسحاق اور اعمش دونوں کوفی ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کوفہ میں حدیث کا علم زیادہ فراواں تھا۔

---

[1] سیر الاعلام النبلاء ج ۵، ص ۴۰۱۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مذکورۂ بالا ائمہ حدیث کا علم بقول علی بن مدینی مندرجۂ ذیل بارہ ائمہ فن مصنفین میں دائر سائر رہا، چنانچہ قاضی حسن بن عبدالرحمن الرامہرمزی (تقریباً ۲۶۰-۳۶۰ھ) فرماتے ہیں:

"۱- مدینہ میں مالک بن انس اصبحی (۹۳-۱۷۹ھ = ۷۱۲-۷۹۵ء) محمد بن اسحاق بن یسار المدنی (۰۰-۱۵۱ھ = ۰۰-۷۶۸ء)

۲- مکہ میں عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج (۸۰-۱۵۰ھ = ۶۹۹-۷۶۷ء) اور سفیان بن عیینہ الکوفی (۱۰۷-۱۹۸ھ = ۷۲۵-۸۱۴ء)

۳- بصرہ میں سعید بن ابی عروبہ (۰۰-۱۵۶ھ = ۰۰-۷۷۳ء) حماد بن سلمہ (۰۰-۱۶۷ھ = ۰۰-۷۸۴ء) ابوعوانہ الوضاح بن خالد (۰۰-۱۷۶ھ = ۰۰-۷۹۲ء) شعبہ بن الحجاج (۸۲-۱۶۰ھ = ۷۰۱-۷۷۶ء)

۴- یمن میں معمر بن راشد (۹۵-۱۵۳ھ = ۷۱۳-۷۷۰ء)

۵- کوفہ میں سفیان بن سعید ثوری کوفی (۹۷-۱۶۱ھ = ۷۱۶-۷۷۸ء)

۶- شام میں عبدالرحمن بن عمرو اوزاعی (۸۸-۱۵۷ھ = ۷۰۷-۷۷۴ء)

۷- واسط میں ہشیم بن بشیر (۱۰۴-۱۸۳ھ = ۷۲۲-۷۹۹ء) میں پھیلا، ان کی مجموعی تعداد بارہ ہے۔

پھر علی بن مدینی نے فرمایا "مذکورۂ بالا بارہ ائمہ فن کا علم -۱- یحییٰ بن سعید القطان (۱۲۰-۱۹۸ھ = ۷۳۷-۸۱۳ء) ۲- یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ (۱۱۹-۱۸۲ھ = ۷۳۷-۷۹۸ء) ۳- وکیع بن الجراح بن ملیح (۱۲۹-۱۹۷ھ = ۷۴۶-۸۱۲ء) ۴- عبداللہ بن المبارک مروزی (۱۱۸-۱۸۱ھ = ۷۳۶-۷۹۷ء) ۵- عبدالرحمن بن مہدی لولوی (۱۳۵-۱۹۸ھ = ۷۵۲-۸۱۴ء) ۶- یحییٰ بن آدم الکوفی

الاحول المتوفی (۰۰-۲۰۳ھ = ۰۰-۸۱۸ء) میں اس کی انتہا ہوئی۔

اور علی ابن المدینی کے علاوہ جو اہل درایت و علم روایت کے نکتہ داں ہیں ان کا قول یہ ہے کہ ان سب کا علم ایک شخص میں جمع ہوگیا تھا اور وہ یحییٰ بن معین ہیں، لیکن اہل علم نے موصوف سے فائدہ نہیں اٹھایا۔[1]

ذرا غور فرمائیں ان میں یحییٰ بن سعید القطان بصری، یحییٰ بن زکریا کوفی، عبداللہ بن المبارک مروزی اور وکیع بن الجراح محدث عراق کوفی چاروں حنفی اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں اور یحییٰ بن معین امام محمد کے نامور شاگردوں میں ہیں، انہوں نے امام موصوف سے الجامع الصغیر نقل کی ہے۔[2]

امام شافعی کے سب سے بڑے شیخ

امام محمد ائمہ اربعہ میں سے تیسرے امام محمد بن ادریس شافعیؒ، (۱۵۰-۲۰۴ھ = ۷۶۷-۸۲۰ء) کے شیوخ میں سب سے بڑے شیخ ہیں[3] اس لیے کہ جتنی مدت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا کسی اور سے نہیں کیا۔ مورخ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے امام محمدؒ کے شاگردوں میں ان کو سب سے زیادہ فقیہ قرار دیا ہے۔[4]

اسلامی دنیا کے اہم علمی مرکز حجاز عراق اور شام کے جامع اور ناقد

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ اسلامی دنیا کے تین اہم علمی مرکز حجاز، عراق اور شام کے علوم کے جامع، ناقد و محقق، حافظ حدیث، فقیہ، مجتہد، مقتدائے انام، امام اور نہایت ثقہ راوی ہیں،[5] چنانچہ

---

[1] المحدث الفاصل - ۲۶۰ - تاریخ بغداد ۱۴ ص ۱۷۸-۱۷۹ [2] ایضاً ج ۲- ۱۷۶ [3] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۶ [4] سیر اعلام النبلاء - ج ۹ ص ۱۳۵، (اخذ عنہ الشافعی فاکثر جداً) امام الشافعیؒ نے موصوف سے علم حاصل کیا اور بہت زیادہ حاصل کیا [5] ایضاً ج ۵ ص ۲۳۶ (افقہ اصحاب محمد ابوعبداللہ الشافعی رحمہم اللہ - ترجمہ حماد بن ابی سلیمان)

مورخ ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ نے "الطبقات الکبریٰ" میں موصوف کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے وہ ان کے حافظ حدیث ہونے کی صریح دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

نشأ بالکوفۃ، وطلب الحدیث،	موصوف نے کوفہ میں نشوونما پائی اور
وسمع سماعا کثیرا من مسعر	حدیث کی تحصیل کی، مسعر، مالک بن مغول،
ومالک بن مغول، وعمر بن ذر	عمر بن ذر، سفیان ثوری، اوزاعی، ابن جریج
وسفیان الثوری، والاوزاعی،	مسحل ضبی، بکر بن ماعز، ابو حرۃ اور عیسٰی
وابن جریج ومسحل الضبی،	خیاط وغیرہ سے حدیثوں کا بکثرت سماع
وبکر بن ماعز، وابی حرۃ و	کیا، ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اختیار
عیسی الخیاط، وغیرھم وجالس	کی، ان سے حدیثوں کا سماع کیا اور اہل الرای
اباحنیفۃ، وسمع منہ، ونظر	کے مذہب میں غور و فکر کیا تو یہی موصوف
فی الرائی فغلب علیہ وعرف بہ	پر غالب رہا، اسی سے ان کی شہرت ہوئی
ونفذ فیہ، وقدم بغداد،	اور یہی ان کے افکار کی جولانگاہ رہی،
فنزلھا، واختلف الیہ الناس	بغداد آئے، یہیں فروکش ہوئے، اہل علم
وسمعوا منہ الحدیث والرای[1]۔	اور طلبہ کی ان کے پاس آمد و رفت رہی،
	انہوں نے موصوف سے حدیث کا سماع
	کیا اور فقہ کی تعلیم پائی۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ مورخ واقدی المتوفی ۲۰۷ھ علمائے عراق کے مخالف اور ان سے منحرف تھے، چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ "ھدی الساری مقدمہ فتح الباری"

[1] محمد بن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت دار صادر، ب، ت، ج ۷، ص ۳۳۶، تاریخ بغداد، ج ۲ ص ۱۷۲۔

میں رقم طراز ہیں:

ابن سعد یقلد الواقدی علی	ابن سعد، مورخ واقدی کی تقلید کرتا ہے
طریقۃ اھل المدینۃ فی	واقدی اہل عراق سے انحراف میں اہل مدینہ
الانحراف علی اھل العراق،	کی روش پر گامزن ہے، اس بات کو ذہن
فاعلم ذالک ترشد ان شاء	میں رکھو، ان شاء اللہ یہ بات تمہاری رہنمائی
اللہ[1]	کرتی رہے گی۔

بایں ہمہ انحراف مورخ ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ سطور بالا میں اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا۔

طلب الحدیث وسمع سماعاً	۱۔ موصوف نے حدیث کی تحصیل کی۔
کثیراً..... واختلف الیہ الناس	۲۔ بہت زیادہ حدیثوں کا سماع کیا۔
وسمعوا منہ الحدیث[2]	۳۔ تحصیل علم کی خاطر اہل علم ان کی
	خدمت میں حاضر ہوئے۔
	۴۔ ان سے حدیثوں کا سماع کیا۔

حدیث کی طلب و کثرت، اس سے وابستگی و شغف، تحصیل حدیث کے لئے طلبہ و اہل علم کی ان کے یہاں آمد و رفت، ان کے حافظ ہونے کی دلیل ہے، چنانچہ میرزا معتمد خاں محمد بن رستم بدخشی نے "تراجم الحفاظ" میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا شمار حفاظ حدیث میں کیا ہے[3]

[1] احمد بن علی بن حجر العسقلانی۔ ھدی الساری مقدمہ فتح الباری۔ القاہرۃ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، ۱۳۴۷ھ، ج ۲ ص ۱۴۷ [2] الطبقات الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۶، تاریخ بغداد، ج ۲ ص ۱۷۲ [3] محمد بن رستم البدخشی، تراجم الحفاظ المستخرج من کتاب الانساب للسمعانی، (عکس مخطوط) ورق ۱۲۶، راقم الحروف نے اس کتاب پر تحقیقی کام کیا ہے۔

حدیث میں امام محمدؒ کے سند و حجت ہونے کی دلیل اور ثقات حفاظ میں ان کا شمار

امام محمدؒ کے حدیث میں حجت و سند ہونے کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ مجتہد مطلق امام محمد بن ادریس الشافعی المتوفی ۲۰۴ھ نے ان سے حدیث میں حجت پکڑی ہے چنانچہ مورخ اسلام علامہ حافظ شمس الدین الذہبی الشافعی المتوفی ۷۴۸ھ "مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ" میں رقم طراز ہیں:

اما الشافعی رحمہ اللہ فاحتج بمحمد ابن الحسن فی الحدیث[1]

لیکن امام الشافعی رحمۃ اللہ تو موصوف نے حدیث میں امام محمد ابن الحسنؒ سے حجت و سند پکڑی ہے۔

امام الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ اور امام بخاریؒ المتوفی ۲۵۶ھ کے استاد امام حافظ علی بن المدینی المتوفی ۲۳۴ھ سے امام محمدؒ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا!

"وہ صدوق ہیں ہمیشہ سچ بولنے والے ہیں"[2]

حافظ ابو الحسن الدارقطنی المتوفی ۳۸۵ھ "غرائب کتاب مالک" میں الرفع عند الرکوع کی حدیث پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

حدث بہ عشرون نفرا من الثقات الحفاظ منہم محمد بن الحسن الشیبانی ویحیی بن سعید القطان وعبد اللہ ابن المبارک وعبد الرحمن بن مہدی وابن وھب وغیرھم[1]

اس حدیث کو بیس ثقات حفاظ نے بیان کیا ہے ان میں محمد بن الحسن الشیبانیؒ یحیی بن سعید القطان، عبد اللہ بن المبارک، عبد الرحمن بن مہدی اور ابن وہب وغیرہ ہیں۔

اس میں امام محمدؒ کا نام سر فہرست ہے۔

موطا امام مالک کی موطا امام محمد سے شہرت

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالکؒ کی مرویات کے ساتھ اختلاف کی صورت میں موطا میں اپنی سند سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ان کے اقوال اور دوسرے شیوخ کی سند سے حدیثیں پیش کی ہیں اس سے ان کا مذہب اور دلیل دونوں معلوم ہو جاتے ہیں اس بنا پر اسے موطا امام محمد سے شہرت حاصل ہے۔

استاذ شاگرد امام مالکؒ اور امام محمدؒ دونوں کا تعلق خیر القرون سے ہے دونوں تبع تابعی اور قرین و ہمسر ہیں[2]

حاکم نیشاپوری المتوفی ۴۰۵ھ "معرفۃ علوم الحدیث" میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث:

خیر الناس القرن الذی بعثت فیہم ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم الخ[3]

بہترین لوگ وہ ہیں جو اس زمانے میں موجود ہیں جس میں اللہ تعالی نے مجھے بھیجا، پھر وہ لوگ ہیں جو اس سے ملحق ہیں (یعنی تابعین

---

[1] مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ، ص ۵۹ [2] ابن حجر العسقلانی۔ تعجیل المنفعۃ

---

[1] مناقب الامام ابی حنیفہ وصاحبیہ، ص ۵۸-۵۹ (تعلیقات الکوثری) محمد بن زاہد بن الحسن الکوثری۔ تانیب الخطیب علی ما ساقہ فی ترجمہ ابی حنیفہ من الاکاذیب، مصر مطبعۃ تجلیۃ الانوار ۱۳۶۱ھ ص ۱۸۲ .... [2] سیر اعلام النبلاء ج ۸ ص ۷۵ [3] محمد بن عبد اللہ الحاکم النیشاپوری کتاب معرفۃ علوم الحدیث، تحقیق محسن منعم حسین۔ القاہرۃ۔ مطبعۃ دار الکتب المصریۃ، ۱۳۲۰ھ - ص ۴۲۔

پھر وہ ہیں جو ان کے بعد آنے والے ہیں۔

(یعنی تبع تابعین)

پر روشنی ڈالتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"قال الحاکم: فهذه صفة اتباع التابعین اذ جعلهم النبی صلی الله علیه وسلم خیر الناس بعد الصحابة والتابعین المنتخبین وهم الطبقة الثالثة بعد النبی صلی الله علیه وسلم وفیهم جماعة من ائمة المسلمین وفقهاء الامصار مثل مالك بن انس الاصبحی وعبد الرحمن بن عمرو الاوزاعی وسفیان الثوری وشعبة بن الحجاج العتکی وابن جریج رحمهم الله ایضا، فیهم جماعة من تلامذة هؤلاء الائمة الذین ذکرناهم مثل یحیی بن سعید القطان وقد ادرك اصحاب انس وعبد الله بن المبارك وقد ادرك جماعة من التابعین"

حاکم نیشاپوری معرفۃ علوم الحدیث میں فرماتے ہیں:

"ومحمد بن الحسن الشیبانی ممن روی الموطا عن مالك وقد ادرك جماعة من التابعین[1]"

اور محمد بن الحسن (شیبانی) ان علماء میں سے ہیں جنھوں نے امام مالکؒ رحمۃ اللہ علیہ سے موطا روایت کی ہے اور تابعین کی ایک جماعت کو پایا ہے۔

حاکم کہتا ہے یہ تبع تابعینؒ کی صفت ہے، جنھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برگزیدہ صحابہؓ وتابعینؒ کے بعد سب سے بہتر قرار دیا ہے اور وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تیسرا طبقہ ہے۔

---

[1] معرفۃ علوم الحدیث، ص ۴۹۔

تبع تابعین میں مشہور ائمہ مسلمین وفقہائے امصار

تبع تابعین میں مشہور ائمہ مسلمین وفقہائے امصار کی ایک جماعت ہے جیسے امام مالک بن انسؒ اصبحی، عبد الرحمن بن عمرو اوزاعی، سفیان ثوریؒ، شعبۃ الحجاج عتکیؒ اور ابن جریجؒ ہیں۔

پھر انہی میں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان کے شاگردوں کی ایک جماعت شمار کی جاتی ہے جیسے یحیی بن سعید القطانؒ ہیں، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ اور عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کو پایا اور تابعین کی ایک جماعت کو پایا ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے تابعین کی ایک جماعت کو پایا اور ان سے اکتساب فیض کیا۔

امام محمدؒ کا تابعینؒ کی ایک جماعت سے استفادہ

حاکم رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورۂ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام مالکؒ، اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، شعبہؒ، ابن جریج رحمۃ اللہ علیہم کا شمار

---

[1] **عہد تابعین** صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم کا دور پہلی صدی ہجری کے اختتام پر ختم ہوجاتا ہے، پھر تابعین کا زمانہ شروع ہوتا اور ان کا زمانہ ۱۸۰ھ پر ختم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آخری تابعی خلف بن خلیفہ کا انتقال ۱۸۰ھ میں ہوا ہے۔ چنانچہ قاضی القضاۃ علامہ صالح بن عمر ابن ارسلان بلقینی المتوفی ۸۶۸ھ کا بیان ہے:

اول التابعین موتا ابو زید معمر بن زید، قتل بخراسان۔

وقیل: باذربیجان سنة ثلاثین، وآخرهم موتا خلف بن خلیفة، سنة ثمانین ومائة

(السیوطی، تدریب الراوی، ج ۲ ص ۲۴۳)

تابعین میں سب سے پہلے ابو زید معمر بن زید کی شہادت ۳۰ھ میں خراسان یا آذربائیجان میں ہوئی اور تابعین میں آخری وفات پانے والے خلف بن خلیفہ ہیں۔ ان کا انتقال ۱۸۰ھ میں ہوا ہے۔

گویا یہ سال تابعین کے عہد کا آخری سال ہے۔

تبع تابعین میں ہے اور محمد بن الحسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ نے تابعین کی ایک جماعت کو پایا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے موطا کی روایت کرنے والوں میں ان کا شمار ہے، فقہائے امصار امام مالکؒ، اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن جریجؒ وغیرہ سے علوم کی تحصیل کی نیز ائمہ و فقہائے امصار و تابعین سے بھی بہرہ مند ہونے کا انہیں فخر حاصل ہے۔

روایتِ مالکؒ میں امام محمدؒ کا مقام راویانِ مالک میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ متعدد وجوہ سے برتری و فضیلت رکھتے ہیں۔

(۱) امام مالکؒ سے پوری موطا کا زبانی سُننا۔ رواۃِ مالک میں وہ تنہا ایسے راوی ہیں۔ جنھیں تین سال کی طویل مدت میں جمعہ کی خصوصی مجلس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے پوری موطا سُننے کی سعادت حاصل ہے، اس لئے کہ جمعہ کی مجلس میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ خود پڑھتے اور شاگرد سُنتے تھے[1]

(۲) رواتِ مالکؒ میں وہ سب سے بڑھ کر فقیہ ہیں۔

(۳) رواتِ مالکؒ میں ایسا راوی مشکل سے ملے گا جس نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی زبانِ مبارک سے پوری موطا کا سماع کیا ہو۔

(۴) موطا امام مالکؒ کے نسخوں میں یحییٰ بن یحییٰ اللیثی المتوفی ۲۳۴ھ کے نسخہ کو شہرت حاصل ہے، مگر اس میں اوہام ہیں[2] اور امام محمدؒ کے نسخہ میں اوہام نہیں ہیں جو امام محمدؒ کے حفظ و اتقان اور ثقاہت

[1] حافظ الدین محمد المعروف ابن البزار الکردی۔ مناقب الامام الاعظم۔ کوئٹہ، مکتبہ اسلامیہ، ب ت۔ ج ۲ ص ۱۴۰۔ یوسف بن عبد البر۔ الانتقاء فی فضائل الائمۃ الثلاثۃ الفقہاء القاھرہ، مکتبۃ القدسی ۱۹۳۰ء ص ۲۵۔ سیر اعلام النبلاء ۱۹۹۳ء ص ۲۵۔ ج ۸ ص ۷۵، مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ۔ ص ۵۲ [2] عبد الرحمٰن السیوطی۔ تنویر الحوالک علی موطاء مالک مصر عبد الحمید احمد حنفی۔ ۱۳۵۳ھ۔ ج ۱ ص ۱۵۔

کی نہایت روشن دلیل ہے۔

(۵) رواتِ مالکؒ میں امام محمدؒ نہایت قوی، معتبر اور ثقہ راوی ہیں۔ چنانچہ مورخ اسلام علامہ شمس الدین ذہبیؒ المتوفی ۷۴۸ھ "میزان الاعتدال" میں لکھتے ہیں:

کان من بحور العلم والفقہ	موصوف علم اور فقہ کے سمندروں میں سے
قویاً فی مالک[1]	تھے اور مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرنے والوں میں قوی تھے۔

حافظ ذہبی کے مذکورۂ بالا بیان سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کو اتفاق نہیں تھا اس لئے موصوف نے "تعجیل المنفعۃ" میں اس پر تنقید کی ہے[2]

(۶) موطأ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نسخہ میں بعض ایسی حدیثیں موجود ہیں جو موطأ کے دوسرے نسخوں میں نہیں[3]

(۷) روایت موطأ میں ایک امام مجتہد و فقیہ عراق محمد بن الحسن شیبانی، دوسرے امام مجتہد مستقل و فقیہ مدینہ امام مالکؒ سے راوی ہیں اس لئے معارضہ کی صورت میں اصول حدیث کی رو سے امام محمدؒ کی روایت کو ترجیح ہوگی۔

امام محمدؒ کی امام مالک اور دیگر محدثین حجاز سے روایت یہی وجہ ہے کہ امام محمدؒ جب عراق (بغداد) میں امام مالکؒ اور حجاز کے دوسرے حفاظ محدثین سے روایت کرتے تو ان کی حویلی طلبہ سے بھر جاتی تھی، امام ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ فرماتے ہیں:

وکان محمد بن الحسن اذا حدث	امام محمد عراق میں جب امام مالکؒ اور

[1] الذہبی۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال۔ سانگھل۔ شیخوپورہ۔ المکتبۃ الاثریۃ ۱۳۸۲ھ، ج ۳ ص ۵۱۳۔ ترجمہ ۷۳۴۳ [2] تعجیل المنفعۃ۔ ص ۱۴۰ [3] تنویر الحوالک ج ۱ ص ۱۰۔

بالعراق عن مالک والحجازیین	حجازی محدثین وحفاظ سے حدیث بیان
وتمتلی دارہ لہ	کرتے ان کا مکان طلبہ سے بھر جاتا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام محمدؒ امام مالکؒ کی روایات میں قوی نہ تھے بلکہ دوسرے حجازی علماء و محدثین کی روایت میں بھی قوی تھے اور ان کی روایات کے بھی حافظ تھے، اس لئے ان کے مکان میں طلبہ کا ٹھٹ لگا رہتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عراق میں امام مالک سے روایت کرنے والے کم تھے، عراقی محدثین سے روایت کرنے والے عراق میں ہر جگہ پائے جاتے تھے اس لئے امام محمدؒ جب عراقی محدثین سے روایت بیان کرتے تو طلبہ ان کے درس میں زیادہ نہیں ہوتے تھے۔

فقیہ کی روایت کی ترجیح

یہ اصول امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد محدث عراق امام وکیعؒ کی سند سے اصول حدیث کی کتابوں کی زینت بنا۔ چنانچہ حاکم نیشاپوری "معرفۃ علوم الحدیث" میں بسند متصل امام وکیعؒ سے نقل کرتے ہیں:

قال لنا وکیع ای الاسناد احب	وکیع رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے پوچھا تمہاری نظر
الیکم الاعمش عن ابی وائل	میں ان دو سندوں میں اعمشؒ از ابووائل از عبداللہ
عن عبداللہ، او سفیان عن	یا سفیان از منصور از ابراہیم از علقمہ از عبداللہ
منصور عن ابراہیم عن علقمۃ	میں کون سی سند زیادہ پسندیدہ و معتبر ہے؟ ہم نے
عن عبداللہ؟ قلنا: الاعمش	عرض کیا اعمش از ابووائل زیادہ دل کو بھاتی
عن ابی وائل فقال: سبحان اللہ!	ہے تو وکیع بولے سبحان اللہ! اعمش شیخ ہیں، ابووائل
الاعمش شیخ، وابووائل شیخ،	شیخ ہیں اور سفیان فقیہ ہیں، منصور فقیہ ہیں،
وسفیان فقیہ، ومنصور فقیہ،	ابراہیم فقیہ ہیں، علقمہ فقیہ ہیں اور وہ حدیث جو

لہ مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ۔ ج ۲۰ ص ۳۰۸۔

وابراهیم فقیه، وعلقمۃ	فقہاء میں متداول و قبول ہوا اور ان کی
فقیه، وحدیث یتداوله	سند سے آئے وہ اس روایت سے جسے
الفقهاء خیر من ان یتداوله	شیوخ کے یہاں تداول و قبول حاصل ہو
الشیوخ لہ	اور شیوخ کی سند سے آئے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

یہاں شیوخ حدیث کی سند عالی ہے اس لئے کہ اس میں واسطے کم ہیں اور فقہاء کی سند نازل ہے اس لئے کہ اس میں واسطے زیادہ ہیں پھر بھی اسے ترجیح دی جارہی ہے، وجہ ترجیح یہ ہے کہ حدیث و اثر پر فقیہ کی نظر احکام سے متعلق امور پر زیادہ رہتی ہے اور محدث و شیخ کی نظر سند و بیان روایت پر مبذول ہوتی ہے۔ فقہی باتوں پر نہیں ہوتی لہ

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ فقیہ اگر ایسی روایت سنتا ہے جسے اس کے ظاہری معنی پر قائم رکھنا ٹھیک نہیں ہوتا تو وہ اس پر غور کرتا اور اس حقیقت کو پالیتا ہے جس سے وہ اشکال جاتا رہتا ہے ۳

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے موطا پڑھی لیکن ان کا نسخہ نہ محفوظ ہے نہ منقول ہے۔ حیرت ہے کہ ارباب صحاح ستہ بھی اپنی کتابوں میں "الشافعی عن مالک"

لہ معرفۃ العلوم الحدیث۔ ص ۱۱-۱۲۔ الخطیب البغدادی، کتاب الکفایۃ فی علوم الروایۃ۔ حیدرآباد دکن، مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیۃ، ۱۳۵۷ھ، ص ۴۳۶۔ تهذیب الکمال۔ ج ۱ ص ۵۔ مقدمۃ ابن الصلاح۔ ص ۴۴۳۔ عبدالرحمٰن السیوطی۔ تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی۔ تحقیق عبدالوهاب۔ عبداللطیف۔ المدینۃ المنورۃ، المکتبۃ العلمیۃ، ۱۳۷۹ھ ص ۳۶۸۔ سیر اعلام النبلاء۔ ج ۱۲۔ ص ۳۲۸-۳۲۹ ۳ الکفایۃ ص ۴۳۶ ۳ تدریب الراوی۔ ص ۳۸۹۔

روایت نقل نہیں کرتے۔[1]

کتاب الآثار بروایت محمد کی وجہ ترجیح

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ جو صاحب ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے لقب سے ممتاز ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرنے میں زیادہ معتبر و زیادہ قوی ہیں، کتاب الآثار کی ہر روایت میں "محمد قال اخبرنا ابوحنیفۃ" موجود ہے، اس میں ظاہر ہے دو مجتہد فقیہ ایسے آگئے ہیں جس نے ہر روایت کو قوی تر بنا دیا ہے۔

کتاب الآثار کی تدوین اور اس کے رواۃ کا خیر القرون سے تعلق

یہ ایک حقیقت ہے کہ کتاب الآثار کی تدوین خیر القرون میں عمل میں آئی ہے۔

(۱) اس میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سندوں سے روایتیں نقل کی ہیں وہ تابعی ہیں، زبردست حافظ حدیث ہیں، فن رجال کے امام ہیں، مجتہد مطلق اور صاحب مذہب ہیں۔

(۲) امام ابوحنیفہ جن سے روایتیں اور آثار نقل کئے ہیں وہ بالاتفاق تابعی ہیں۔

(۳) یا وہ اکابر تابعین میں سے ہیں۔

(۴) اور موصوف کبھی راست صحابی سے روایت کرتے ہیں۔

(۵) یا اپنے معاصرین سے روایت نقل کرتے ہیں۔

(۶) ظاہر ہے کتاب الآثار کے تمام راویوں کا تعلق خیر القرون سے ہے۔

---

[1] بحمد اللہ اس عاجز نے اپنی نگرانی میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی قسم التخصص فی علوم الحدیث میں ایک انڈونیشی طالب علم لطفی بن محمد یوسف الشافعی (اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے، اور مزید کام کرنے کی توفیق بخشے) سے عنوان "ما رواہ الشافعی عن مالک" پر ۱۹۹۹ء میں تحقیقی مقالہ لکھوا کر اس علمی خلا کو جواب تک باقی تھا پر کرایا ہے، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی نے اس تحقیقی کارنامہ پر اسے تخصص فی علوم الحدیث کی سند سے سرفراز کیا، دعا ہے کہ یہ جلد چھپ جائے اور اس کا فیض عام ہو، وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ۔

(۷) وہ سب ثقہ ہیں۔

(۸) ان میں بہت سے حفاظ اور فقہائے امصار ہیں۔

تابعین کے دور میں ایسا راوی مشکل سے ملے گا جس پر انگلی اٹھائی جائے اس کے دو سبب ہیں۔

اولاً: حفاظ و محدثین ایسے راوی سے روایت ہی نہیں لیتے۔

ثانیاً: ائمہ جرح و تعدیل نے ایسے راویوں کی نشان دہی کی ہے اور کتاب الآثار ان باتوں سے بالاتر ہے۔

معمول بہا روایات و آثار مجتہدین صحابہ و تابعین کی آراء و فتاویٰ کا قدیم و معتبر ذخیرہ۔ کتاب الآثار

(۱) رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا (۲) معمول بہا روایات و آثار کا ذخیرہ ہے۔

معمول بہا احادیث و آثار سے وہ روایات اور اخبار احاد مراد ہیں جن پر سب مجتہدین نے عمل کیا ہو یا بعض نے کیا ہو، چنانچہ علامہ ابو اسحاق شیرازی المتوفی ۴۷۶ھ فرماتے ہیں:

"خبر واحد جسے امت نے قبول کیا اس کی صداقت یقینی ہے خواہ اس پر سب نے عمل کیا ہو، یا بعض نے عمل کیا ہو اور بعض نے اس کی تاویل کی ہو، اس قسم کی اخبار احاد عمل کو ضروری قرار دیتی ہیں اور ان سے علم استدلالی حاصل ہوتا ہے"۔[1]

(۳) مجتہدین صحابہؓ کے اقوال و آراء کا (۴) کبار و خیار تابعین مجتہدین کی آراء و فتووں کا قدیم ترین و معتبر ترین ذخیرہ کتاب الآثار ہے۔

کتاب الآثار، موطا امام اور شرح معانی الآثار کا مقام

شیخ تقی الدین ابو عمرو ابن الصلاح شافعی المتوفی ۶۴۳ھ نے کتب مسانید اور کتب مصنفات (وہ کتابیں جن کی فقہی ابواب پر ترتیب

---

[1] ابراہیم بن علی الشیرازی کتاب اللمع فی اصول الفقہ۔ مصر مصطفی البابی الحلبی ۱۳۵۸ھ ص ۲۹۔

پائی جاتی ہے) سے احتجاج واستدلال میں فرق ملحوظ رکھا ہے، وہ اپنی مشہور تصنیف "مقدمہ ابن الصلاح" میں رقم طراز ہیں:

کتب المسانید غیر ملتحقة بالکتب الخمسة التی هی: الصحیحان وسنن ابی داؤد وسنن النسائی وجامع الترمذی، وماجری مجراها فی الاحتجاج بها، والرکون الی ما یورد فیها مطلقاً: کمسند ابی داؤد الطیالسی ومسند عبداللہ بن موسیٰ ومسند احمد بن حنبل ومسند اسحاق بن راهویه ومسند عبد بن حمید ومسند الدارمی ومسند ابی یعلی الموصلی ومسند الحسن بن سفیان ومسند البزار ابی بکر واشباهها فهذه عادتهم فیها ان یخرجوا فی مسند کل صحابی ما رووه من حدیثه غیر متقید بن بان یکون حدیثا محتجا به فلهذا تاخرت مرتبتها وان جلت لجلالة مولفیها۔ عن مرتبة الکتب الخمسة وما التحق بها من الکتب المصنفة علی الابواب۔ واللہ اعلم[1]

کتب مسانید، کتب خمسہ: (۱ اور ۲) صحیحین (۳) سنن ابو داؤد (۴) سنن نسائی (۵) جامع ترمذی کے ہم پایہ نہیں اور وہ کتابیں جو احتجاج میں ان کے قائم مقام ہیں اور جن کی بیان کردہ روایتوں کی طرف بھی علماء کا ویسا ہی میلان ہے جیسا کہ ان کی روایات کی طرف ہے، کتب مسانید جیسے مسند ابی داؤد طیالسی، مسند عبید اللہ بن موسیٰ، مسند احمد بن حنبل، مسند اسحاق بن راہویہ، مسند عبد بن حمید، مسند دارمی، مسند ابی یعلی موصلی، مسند حسن بن سفیان، مسند بزار ابوبکر اور انہی جیسی مسندیں، تو اہل مسانید کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر صحابی کی مسند میں اس کی جتنی حدیثیں ملتی ہیں ان کی تخریج کرتے ہیں، اس کا لحاظ کئے بغیر کہ وہ روایت قابل احتجاج ہے یا نہیں، اس وجہ سے ان مسانید کا مرتبہ اگرچہ ان کے مصنفین کی جلالت قدر کی بنا پر بلند ہے کتب خمسہ اور ان کتابوں سے جو کتب خمسہ کی طرح ابواب فقہ پر مرتب ہیں فروتر ہوگیا ہے۔ واللہ اعلم۔

امام طحاوی کی شرح معانی الآثار، امام اعظم ابو حنیفہؒ کی کتاب الآثار اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الموطاء وغیرہ جو ابواب فقہ پر مرتب ہیں وہ اس زمرے میں داخل ہو جاتی ہیں۔

کتاب الآثار میں معاصرین سے روایتیں موجود ہیں، ان میں تبع تابعی بھی ہیں، ان کا تعلق خیر القرون سے ہے انہیں بھی ثقات میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ائمہ فن نے اصول حدیث کی کتابوں میں تبع تابعین کو عام طور پر ثقات کے زمرے میں شمار کیا ہے، حاکم نیشاپوری کتاب "معرفۃ علوم الحدیث" میں "اصح الاسانید" کی بحث میں لکھتے ہیں:

ان هولاء الائمة الحفاظ قد ذکر کل ما ادی الیه اجتهاده فی اصح الاسانید ولکل صحابی رواة من التابعین ولهم اتباع واکثرهم ثقات فلا یمکن ان یقطع الحکم فی اصح الاسانید[2]

بلاشبہ ان ائمہ حفاظ حدیث کا کسی ایک سند کو زیادہ صحیح قرار دینا اس اجتہاد کا ثمرہ ہے، جس کی طرف اس نے اپنے اجتہاد سے رہنمائی پائی ہے اور ہر صحابی کے تابعین میں سے بعض راوی ہیں اور تابعین سے تبع تابعین روایات کے ناقل ہیں، تبع تابعین اکثر ثقات و قابل اعتماد راوی ہیں اس لئے ممکن نہیں کہ "اصح الاسانید" میں کسی ایک روایت کے متعلق

---

[1] مقدمۃ ابن صلاح، ص ۱۸۳-۱۸۴ [2] معرفۃ العلوم الحدیث، ص ۵۴-۵۵۔

اصح ہونے کا حتمی حکم لگایا جائے۔

حدیث کو صحیح اور حسن وغیرہ کہنا حاکم نیشاپوری کے مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ ائمہ فن کو اس امر کا اعتراف ہے کہ کسی حدیث پر اصح، صحیح اور حسن وغیرہ کا حکم لگانا ایک اجتہادی بات ہے اور یہ ایسی بات ہے جیسی فقہاء کی بات ہے کہ یہ امر مباح، یہ مستحب، یہ واجب اور یہ فرض ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح فقہ کا تمام تر ذخیرہ اجتہاد کا ثمرہ ہے اسی طرح سنن و آثار کا تمام سرمایہ اصح، صحیح، حسن وضعیف وغیرہ کے اعتبار سے ائمہ فن حفاظ حدیث کے اجتہاد کا نتیجہ ہے اور جس طرح ائمہ اربعہ کے پیروکاروں کو تقلید ائمہ کے بغیر چارہ نہیں اسی طرح دنیا بھر کے اہل حدیث کو ائمہ فن حفاظ حدیث کی تقلید سے مفر نہیں۔ ان مذکورہ بالا تاریخی حقائق کی روشنی میں کسی کا یہ کہنا کہ ہم کسی کی تقلید نہیں کرتے، کیا حقائق کے خلاف نہیں؟

حاکم کے بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ائمہ فن کا جب کسی ایک سند کے اصح ہونے پر اتفاق نہیں ہوسکا تو بھلا حدیث کی کسی کتاب کے اصح ہونے کا دعویٰ کیونکر قابل قبول ہوسکتا ہے اور وہ بھی متاخرین کے دور میں؟

ثقات کی تدلیس مراسیل کو قبول کرنے سے انکار کیا معنی رکھتا ہے؟ ائمہ فن نے تصریح کی ہے کہ ثقہ کی تدلیس قابل قبول ہے چنانچہ ابن حبان نے اس کی مثالوں میں کبار تابعین کی مراسیل کو پیش کیا ہے حافظ جلال الدین سیوطیؒ "تدریب الراوی" میں فرماتے ہیں:

ثم مثل ذالک بمراسیل کبار التابعین	پھر ابن حبان نے اس کی مثال کبار تابعین
فانھم لا یرسلون الا عن صحابی	کی مراسیل سے پیش کی کہ وہ صحابی سے ارسال
سبقہ الی ذالک ابوبکر البزار	کرتے ہیں چنانچہ یہی بات اس سے پہلے

وابوالفتح الازدی وعبارۃ البزار	ابوبکر بزار اور ابوالفتح ازدی نے کہی ہے،
من کان یدلس عن الثقات کان	بزار رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے "من کان
تدلیسہ عند اھل العلم مقبولا[1]	یدلس عن الثقات الخ" جو کوئی ثقات سے
	تدلیس کرتا ہے اس کی تدلیس اہل علم کے
	یہاں مقبول ہے۔

امام ابوداؤد سجستانی المتوفی ۲۷۵ھ "رسالۃ الی اھل مکۃ فی وصف سننہ" میں لکھتے ہیں:

اما المراسیل فقد کان یحتج	لیکن مراسیل سے علمائے سلف نے استدلال
بھا العلماء فیما مضی مثل سفیان	کیا جیسے سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ اوزاعیؒ
الثوری ومالک والاوزاعی حتی	یہاں تک کہ امام شافعیؒ آئے اور انہوں نے
جاء الشافعی فتکلم فیہ وتابعہ	اس میں کلام کیا اور امام احمد بن حنبل وغیرہ
علی ذالک احمد بن حنبل وغیرہ[2]	نے ان کی پیروی کی۔

---

[1] تدریب الراوی، ۱۳۸۸ھ ص ۲۲۹ [2] ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی۔ رسالۃ الی اھل مکہ فی وصف سننہ تحقیق عبدالفتاح ابوغدہ۔ حلب، المطبوعات الاسلامیہ، ۱۴۱۷ھ ص ۳۲، یہ رسالہ ثلاث رسائل فی علم الحدیث کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔

مقالات

امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ

از جناب مولانا ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی صاحب ٭

(۲)

مراسیل خیر القرون اصحابہؓ و تابعین و تبع تابعین کے زمانے میں صحابہ اکابر تابعینؒ تبع تابعینؒ ائمہ متبوعینؒ - امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ امام اوزاعیؒ، مرسل حدیث کو حجت اور قابل استدلال مانتے تھے، ایک جلیل القدر تابعی جس نے سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھا، سنا بھلا وہ کتنوں کا نام لے کر بیان کرے گا۔

تعجب اس امر پر ہے کہ ایک مجتہد جو تابعی فقیہ اور حجت ہے، اس کے قول پر حلال و حرام میں اعتماد کیا جاتا ہے، ائمہ فن حدیث و آثار ان فقہائے مجتہدین کا مذہب نقل کرنا فرض منصبی سمجھتے ہیں، چنانچہ مصنف عبد الرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ اور خاص طور سے جامع الترمذی میں ان فقہائے امصار کا مذہب اور فتوے مذکور و منقول ہیں اور ان کی رائے اور مذہب کو نقل کرنا جامع الترمذی کے خصائص میں سے شمار کیا جاتا ہے، ایسے فقہائے امصار اگر ارسال کرتے اور سند بیان نہیں کرتے صحابی کا نام نہیں لیتے، ایسے قابل حجت و مستند ائمہ کے قول پر اعتبار و اعتماد کرنے سے گریز کیوں کر حق بجانب کہا جا سکتا ہے؟ یہ تضاد حیرت کا باعث ہے۔ چنانچہ حسن بصریؒ (۲۱-۱۱۰ھ/۶۴۲-۷۲۸ء) جیسے مجتہد کے متعلق ابن حزم اندلسی المتوفی ۴۵۶ھ کا بیان ہے:

٭ جامعۃ العلوم الاسلامیہ، کراچی، پاکستان۔

الحسن بن ابی الحسن أدرك خمس مائة من الصحابة[1]

حسن بن ابی الحسن بصریؒ نے پانچ سو صحابہؓ کو پایا ہے۔

ذرا غور فرمائیں وہ روایت بیان کرتے وقت کن کا نام بتائیں۔

یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ ابراہیم نخعیؒ (۴۶ - ۹۶ = ۶۶۶ - ۷۱۵ء) ۱۔ جلیل القدر تابعی، ۲۔ اپنے زمانے کے سب سے بڑھ کر مجتہد، ۳۔ صیرفی الحدیث[2] (حدیث کی پرکھ رکھنے والے اور کھرے کھوٹے کو جاننے والے) چنانچہ فقیہ کوفہ ابراہیم نخعی (۴۶ - ۹۶ھ = ۶۶۶ - ۷۱۵ء) کا معمول مرسل روایت کرنا تھا، امام ترمذی المتوفی ۲۷۹ھ "کتاب العلل" میں حضرت اعمش المتوفی ۱۴۸ھ کا جو "امامٌ من ائمة الحدیث" ہیں یہ بیان نقل کرتے ہیں:

"حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں میں نے ابراہیم نخعی سے عرض کی: آپ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی سند سے مجھے حدیث بیان فرمائیں تو حضرت ابراہیم نے جواب دیا کہ جب میں تم سے کہوں "حدثنی رجل عن عبد اللہ" اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہ ایک روایت مجھے حضرت عبداللہ کے شاگرد کے واسطے سے پہنچی ہے اور جب میں "قال عبد اللہ" کہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ روایت مجھے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بہت سے شاگردوں کے واسطے سے پہنچی ہے۔"[3]

یاد رہے خیر القرون کے تمام ائمہ فن مرسل روایت سے دلیل پیش کرتے تھے جیسے سفیان ثوریؒ

---

[1] علی بن حزم الاندلسی۔ الاحکام فی اصول الاحکام، مصر۔ مطبعة السعادة، ۱۳۴۵ھ ج ۲ ص ۷۰ [2] معرفة علوم الحدیث ص ۱۶ [3] ایضاً ص ۱۱

[4] محمد بن عیسی الترمذی۔ سنن الترمذی (کتاب العلل)۔ کراچی۔ میر محمد کتب خانہ ج ۲ ص ۳۹۵۔ کتاب العلل کے ہندوستانی اور پاکستانی مطبوعہ نسخوں میں مذکورہ بالا عبارت صحیح نہیں چھپی ہے ہم نے دوسری کتابوں سے تصحیح میں چند الفاظ بڑھا کر عبارت کو درست کیا ہے۔ [5] الطبقات الکبریٰ، ج ۶ ص ۲۷۲۔

مالکؒ اور اوزاعیؒ، تا آنکہ امام شافعیؒ آئے اور انہوں نے اس میں کلام کیا اور احمد بن حنبلؒ وغیرہ نے اس امر میں ان کی پیروی کی، عہد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین جس کے خیر و برکت ہونے کی خبر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اس زمانے میں تمام فقہائے امصار و ائمہ حدیث کا مرسل روایت سے حجت پیش کرنے پر اجماع و اتفاق ہے۔ چنانچہ امام ابن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ کا بیان ہے:

"تمام تابعین کا مراسیل کے قبول کرنے پر اجماع ہے، نہ ان میں سے کسی سے اور نہ دو سو برس تک ان کے بعد کے کسی امام سے مراسیل کا انکار مروی ہے، یہ دونوں صدیاں اس مبارک عہد میں داخل ہیں جس کی خیر و برکت کی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت دی ہے۔"[1]

اب عہد تابعین میں حضرت سعید بن المسیبؒ کی مراسیل کو قابل حجت قرار دینا اور دیگر ائمہ تابعین کی مراسیل کو قبول کرنے سے انکار کرنا کیا اصول انصاف کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے۔

چنانچہ امام ابو جعفر طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ "شرح معانی الآثار" میں رقم طراز ہیں:

"پس اگر وہ کہتا ہے کہ میں سعید بن المسیب (۱۳ - ۹۴ھ = ۶۳۴ - ۷۱۳ء) کی روایت کو اگرچہ وہ منقطع و مرسل ہے قبول کیا، اس لئے کہ ان کی منقطع و مرسل روایت متصل روایت کے قائم مقام ہے تو اسے پوچھا جائے گا کہ تجھے سعید بن المسیبؒ کی مرسل و منقطع روایت کی تخصیص کا حق کس نے دیا اور ان کے ہم پایہ مدینہ کے اور علماء کی مرسل و منقطع روایت قبول نہ کرنے سے کس نے روکا، جیسے ابو سلمہؒ (۰۰ - ۱۰۴ھ = ۷۲۳ء) سالمؒ (۰۰ - ۱۰۶ھ = ۰۰ - ۷۲۵ء) عروہؒ (۲۲ - ۹۳ھ = ۶۴۳ - ۷۱۲ء) اور سلیمان بن یسارؒ (۳۴ - ۱۰۷ھ = ۶۵۴ - ۷۲۵ء) ہیں اور شعبیؒ (۱۹ - ۱۰۳ھ = ۶۴۰ - ۷۲۱ء) اور ابراہیمؒ (۴۶ - ۹۶ھ = ۶۶۶ - ۷۱۵ء) اور ان کے

---

[1] محمد بن اسماعیل الامیر الیمانی۔ توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار، تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید۔ القاہرہ، مکتبۃ الخانجی ۱۳۶۶ھ، ج ۱ ص ۲۹۱۔

ہمسر کوئی علماء ہیں، حسنؒ (۲۱-۱۱۰ھ = ۶۴۲-۷۲۸ء) اور ابن سیرینؒ (۳۲-۱۱۰ھ = ۶۵۳-۷۲۹ء) موجود ہیں، اللہ کی ان پر رحمت نازل ہو، اہل بصرہ سے ہیں اور اس طرح ان کے زمانے میں جنھیں ہم نے نام بنام ذکر کیا ہے، باقی فقہائے امصار ہیں، اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت نازل ہو اور وہ جو تابعین کے طبقہ اولیٰ میں بھی بلند تر ہیں جیسے علقمہؒ (۰۰-۶۲ھ = ۰۰۰-۶۸۱ء) اسودؒ (۰۰-۷۵ھ = ۰۰-۶۹۴ء) عامر بن شراحیلؒ عبیدہؒ (۰۰-۷۲ھ = ۰۰-۶۹۱ء) اور شریحؒ (۰۰-۷۸ھ - ۰۰۰-۶۹۷ء) ہیں، اللہ کی ان پر رحمت نازل ہو اور اگر تمہیں حضرت سعید بن المسیبؒ کی منقطع و مرسل روایتوں کو مطلقاً متصل کے قائم مقام تسلیم کرنے کا حق حاصل ہے تو پھر تمہارے سوا دوسروں کو مذکورۂ بالا فقہاء کی منقطع و مرسل روایات کو مطلقاً متصل روایات کے قائم مقام تسلیم کرنے کا حق بھی حاصل ہے اور اگر انہیں حق حاصل نہیں تو پھر تمہیں بھی اس قسم کی بات کہنے اور کرنے کا حق نہیں، کیونکہ یہ سراسر ہٹ دھرمی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین میں کسی کو ہٹ دھرمی کا حکم کرنے کی اجازت نہیں ہے[1]۔

ابوبکر احمد بن علی الجصاص المتوفی ۳۷۰ھ "الفصول فی الاصول" میں رقم طراز ہیں:

"ابوبکر جصاص فرماتے ہیں۔ اور میرے نزدیک صحیح بات یہ ہے اور ہمارے اصحاب احنافؒ کا مذہب ہے کہ تابعینؒ کی مرسل روایتیں مقبول ہیں، جب تک راوی کا غیر ثقہ لوگوں سے روایت کرنا ثابت نہیں ہوتا، ہم نے جو بات کہی ہے اس کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ عہد تابعینؒ و تبع تابعینؒ میں لوگوں کا ظاہر احوال راست گوئی اور صلاح و تقویٰ تھا، اس پر حدیث رسولﷺ "خیر الناس قرنی" سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جن میں مجھے بھیجا گیا ہے شاہد ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ

---

[1] احمد بن الطحاوی۔ شرح معانی الآثار، لکھنؤ، مطبع مصطفائی ۱۳۰۰ھ ج ۲، ص ۳۵۳ "باب الرهن یعطلک فی ید المرتهن"۔

فقہاء میں سے جن فقہاء نے اپنی نسبت اس امر آگاہ کیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی احادیث و آثار کا ارسال کرتے ہیں جن کی صحت روایت کا انہیں جزم و یقین ہوتا ہے، چنانچہ اعمشؒ کا بیان ہے کہ میں نے ابراہیم نخعی سے عرض کی کہ آپ مجھ سے حدیث سند سے کیوں بیان نہیں فرماتے کہ میں اسے مرفوعاً بیان کروں، انہوں نے فرمایا جب میں تم سے "حدثنی فلان عن عبد اللہ" کہوں کہ فلاں نے مجھ سے بواسطہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کیا تو سمجھو کہ وہی ایک راوی ہے جس نے مجھ سے وہ حدیث بیان کی ہے اور جب میں تم سے کہوں "قال عبد اللہ" تو سمجھ لو کہ مجھ سے ایک جماعت نے اس روایت کو بواسطہ عبد اللہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اور حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ موصوف نے فرمایا جب میرے پاس صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے چار صحابی ایک روایت بیان کرتے ہیں تو میں حدیث کو مرسل بیان کرتا ہوں اور اس کی نسبت راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرتا ہوں، عروہ بن الزبیر نے حضرت عمر بن عبد العزیزؒ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث "من احیا ارضاً میتة فهی له" کہ جس نے مردہ زمین کو آباد کیا وہ زمین اس کی ہے بیان کیا اور اس کی سند بیان نہیں کی، حضرت عمر ابن عبد العزیز نے ان سے کہا کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس امر کی گواہی دیتے ہو، کہا جی ہاں مجھ سے یہ حدیث ایک پسندیدہ عادل شخص نے بیان کی ہے لیکن اس راوی کا نام نہیں بتایا ہے، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ان کے اس بیان کو کافی سمجھا، اس حدیث کو قبول کیا اور اس پر عمل کیا، حضرت سعید بن المسیبؒ اور حضرت حسن بصریؒ وغیرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مرسل بیان کرتے تھے اور جب اس کی سند دریافت کی جاتی تو وہ ثقات تک بتا دیتے تھے، صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسل روایتیں نقل کرنے میں بھی اسی طریقہ پر گامزن تھے۔" (ص ۵۱۹)

مراسیل کو نظر انداز کرنے سے سنن و آثار کے فقہی احکام کے عظیم ترین ذخیرہ سے ہمیں ہاتھ دھونا پڑے گا جو ہرگز روا نہیں، اس لئے ائمہ مجتہدین میں سے امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ و امام سفیان ثوریؒ نے اس پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔ محقق عبدالعزیز بخاری المتوفی ۷۳۰ھ لکھتے ہیں:

"اور مرسل کو رد کرنے میں بہت سی احادیث و سنن کو بیکار اور ناکارہ بنانا ہے اس لئے کہ مراسیل کو (جو احکام سے متعلق ہیں) جمع کی جائیں، تو وہ تقریباً پچاس جزء میں سمائی جائیں گی، یہ ان اہل علم پر طنز ہے جو اپنے آپ کو "اصحاب الحدیث و اہل حدیث" کے نام سے موسوم کرتے اور احادیث کی حفاظت و پاسبانی اور ان پر عمل کرنے کے لئے جمے بیٹھے ہیں پھر انہوں نے ان احادیث و سنن کو رد کیا ہے جو اقسام حدیث میں سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں اس طرز عمل سے تو احادیث و سنن کو ناکارہ کرنا اور اس کے دائرہ کو تنگ سے تنگ تر کرنا ہے، یہ ان کی حفاظت کرنا اور ان کا احاطہ کرنا ہے"[1]

صحابہؓ اور تابعینؒ کی سند میں تدلیس کو روا رکھنے کے اسباب کی نشان دہی کرتے ہوئے امام ابوبکر جصاصؒ "الفصول فی الاصول" میں رقم طراز ہیں:

"صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رابطہ موجود تھا، انہوں نے صرف قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہنے پر اکتفا کیا اسی طرح تابعینؒ نے عمل کیا مگر انہیں مدلسین کے نام سے یاد نہیں کیا جاتا، اس کے دو سبب ہیں:

ایک یہ کہ ان کا مقصد سند میں اختصار سے کام لینا اور سامعین سے سند کو قریب تر کرنا تھا۔

دوسرا ان کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث کی نسبت کو یقینی بنانا تھا تاکہ یقین ہو جائے

[1] عبدالعزیز البخاری، کشف الاسرار ج ۳ ص ۵۔

کہ یہ آپ کا ارشاد ہے اور ان کا مطمح نظر حدیث کو علو اسناد سے آراستہ کرنا تھا، اس طرح ہم ان لوگوں کے متعلق کہتے ہیں جو ان کے بعد آئے ہیں ان کا مقصد راوی و مروی عنہ کے مابین واسطہ ساقط کرنے سے یہی دو باتیں مقصود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو مدلس کے نام سے موسوم نہیں کرتے۔

مدلس وہ ہے جو اس واسطہ کو جس سے اس نے حدیث بلاواسطہ سنی ہے سند کو عالی بنانے کی غرض سے ساقط کردے اور اس قسم کی اغراض کی وجہ سے واسطہ ذکر نہ کرے، یہ قصد وارادہ پسندیدہ نہیں بجز اس کے کہ جس کی نسبت یہ ثابت ہو کہ وہ معتبر و ثقات راویوں سے تدلیس کرتا ہے، اس کی حدیث تو مقبول ہے، اگرچہ وہ "حدثنا" بھی نہ کہے اور جو غیر معتبر راویوں سے تدلیس کرتا ہے اس کی حدیث کا معاملہ ظاہر ہے کہ قابل قبول نہیں تاآنکہ اس امر کی وضاحت نہ ہو جائے کہ اس نے ثقہ سے روایت کی ہے۔" (الفصول فی الاصول ورق ۴۲ ۵ - ۴۳ ۵)

پاک وہند کے اہل حدیث کا مسلک

ہندوستان اور پاکستان کے اہل حدیث صحیحین کی حدیثوں کے سوا کسی حدیث کو قابل حجت و لائق اعتنا سمجھتے ہی نہیں اس لئے وہ صحیحین میں بھی صحیح بخاری کی روایتوں پر عمل کرتے اور دوسروں سے اس پر عمل کرنے پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ۔

(۱) صحیحین میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور حسن بھی ہیں۔

(۲) تمام صحیح حدیثوں کا احاطہ واستیعاب بھی ان میں نہیں کیا گیا[1]

[1] محمد بن طاہر المقدسی۔ شروط الائمۃ الستۃ، القاہرہ، ۱۳۵۷ھ ص ۱۳۔ محمد بن موسی الحازمی۔ شروط الائمۃ الخمسۃ، ص ۴۹-۵۱۔ مقدمۃ ابن الصلاح ص ۱۲۲۔ یحیی بن شرف النووی۔ ارشاد طلاب الحقائق الی معرفۃ سنن خیر الخلائق تحقیق عبدالباری فتح اللہ السلفی۔ المدینۃ المنورۃ، مکتبۃ الایمان، ۱۴۰۸ھ ص ۱۱۹۔ ابن حجر التلخیص الحبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر دھلی مطبع الفاروقی، ص ۲۔

(۳) یہ فی الجملہ صحیح حدیثوں کا انتخاب ہے[1]

(۴) اس میں بہت زیادہ صحیح حدیثوں کو چھوڑ دیا گیا ہے[2]

(۵) حسن حدیثوں کی تعداد بھی اس میں صحیح حدیثوں سے زیادہ ہے[3]

(۶) بلکہ ہماری تحقیق کے مطابق اس میں مراسیل بھی پائی جاتی ہیں۔

(۷) امام بخاری اور امام مسلم میں سے کسی نے اپنی کتاب کے اصح ہونے کا دعویٰ کیا نہیں۔

صحیحین کی ٹکر کی صحیح حدیثوں کا ذخیرہ حدیث کی دوسری کتابوں میں۔

اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے، کہ صحیح حدیثوں کا ذخیرہ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی پھیلا ہوا ہے اور ان میں بھی صحیحین کی ٹکر کی حدیثیں موجود ہیں جنھیں نظر انداز کرنا صحیح حدیثوں کے عظیم تر ذخیرہ سے دست بردار ہونا اور دلائل کے عظیم الشان ذخیرہ سے صرف نظر کرنا اصول انصاف کے تقاضوں کے خلاف اور حقیقت سے انحراف کرنا ہے، چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ الشافعی المتوفی ۷۷۴ھ فرماتے ہیں:

اور تخریجات صحیحین میں جس طرح مفید اضافے اور عمدہ سندیں پائی جاتی ہیں اسی طرح مسند امام احمدؒ میں بہت زیادہ متون و اسانید موجود ہیں جو صحیح مسلم کی حدیثوں کے مقابلے کی ہیں، بلکہ بخاری کی ٹکر کی موجود ہیں، جو صحیحین میں نہیں، یا ان میں سے کسی ایک میں نہیں بلکہ ارباب

---

[1] شروط الائمۃ الخمسۃ، ص ۵۱ - ھدی الساری، ج ۱ ص ۴ - تدریب الراوی ص ۴۲، ۴۴ احمد محمد شاکر، الباعث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث - دمشق، دار الفیحاء، ۱۴۱۴ھ ص ۵۳ [2] شروط الائمۃ الخمسۃ، ص ۵۱ - ھدی الساری ص ۵۳ [3] الذھبی - الموقظۃ فی علم مصطلح الحدیث تحقیق عبد الفتاح ابو غدہ - حلب، مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، ۱۴۰۵ھ - ص ۸۰ -

سنن اربعہ نے بھی ان کی تخریج نہیں کی ہے اور وہ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور سنن ابن ماجہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر و معجم اوسط طبرانی، مسند ابی یعلی و مسند بزار وغیرہ، مسانید و معاجم، فوائد اور اجزاء میں حدیثیں پائی جاتی ہیں جو اس فن میں متبحر عالم کو رجال سند کی حالت پر غور کرنے اور متن و سند کی تعلیل مفسد سے سلامتی کی صورت میں بہت سی حدیثوں کی صحت پر حکم لگانے کی قدرت بخشتا اور اس اقدام عمل کو جائز کرتا ہے اگرچہ اس سے پہلے کسی حافظ حدیث نے شیخ ابو زکریا یحییٰ نووی کی موافقت اور شیخ ابو عمرو بن صلاح کی مخالفت میں اس کی صحت کا حکم نہ لگایا ہو۔[1]

حافظ ابن کثیر کے بیان کی تائید شیخ الاسلام سراج الدین بلقینی شافعی المتوفی ۸۰۶ھ "محاسن الاصلاح و تضمین علوم الحدیث لابن الصلاح" میں اس طرح کرتے ہیں:

"اور "مسند امام احمدؒ" میں بہت زیادہ اسانید و متون ایسے پائے جاتے ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود نہیں ہیں اور وہ سنن میں بھی موجود نہیں ہیں۔ سنن چار ہیں، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور اسی طرح مسند بزار، مسند ابن منیع اور معاجم طبرانی وغیرہ میں حدیثیں اور اسانید موجود ہیں، مسند ابی یعلی اور اجزاء میں پائی جاتی ہیں جسے اس فن میں مہارت و قدرت حاصل ہے وہ بہ نظر صحیح بہت سی حدیثوں قرار دے گا اور اسے صحت کا حکم لگانا جائز ہوگا جیسا کہ گزر چکا ہے۔[2]

اس زمانے میں حافظ ابن کثیر کے بیان کی صداقت

محدث احمد شاکر المتوفی ۱۳۷۷ھ نے "الباعث الحثیث" میں حافظ ابن کثیر کے مذکورہ بالا بیان میں صرف "مسند احمد" کے متعلق جس کی جلد اول و جلد ثانی طبع قدیم کی ایک تہائی حدیثوں پر تحقیقی کام کیا، یہ فقرہ لکھا ہے:

"ھذا الکلام جید محقق"۔ ابن کثیر کی مسند احمد کے متعلق یہ بات بہت تحقیقی بات ہے اس لئے کہ

---

[1] احمد محمد شاکر الباعث الحثیث الشرح اختصار علوم الحدیث۔ دمشق۔ مکتبہ دار الفیحاء ۱۴۱۴ھ۔ ص ۳۷-۳۸ [2] البلقینی۔ محاسن الاصطلاح، ص ۱۶۵۔

میں نے (۱۵۱۱) چھ ہزار پانچ سو گیارہ حدیثوں کی تحقیق کی ان میں (۵،۲۳۳) پانچ ہزار سات سو تینتیس حدیثیں صحیح ہیں (بقیہ مختلف درجات کی ہیں) اور ان میں ایسی ضعیف جو نا قابل اعتبار ہو مشکل سے ملے گی (اس لئے حافظ ابن کثیر کے بیان کی اس زمانے میں بھی صداقت عیاں ہو جاتی ہے)۔"[1]

دوسری صدی ہجری میں امام محمدؒ کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ

امام محمدؒ نے حنفی فقہ کو کتابی صورت میں مرتب و مدون کیا، وہی کتابیں آج بھی فقہ کا اصل اور بنیادی سرمایہ ہیں، امام شافعیؒ نے ۱۶۴ھ میں امام مالکؒ سے موطا پڑھی پھر یمن سے عراق آکر ۱۸۴ھ میں امام محمدؒ سے فقہ پڑھی، مورخ اسلام شمس الدین ذہبیؒ نے تاریخ الاسلام میں موصوف کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

انفقت علی کتب محمد ابن الحسن	میں نے امام محمدؒ کی کتابوں پر ساٹھ دینار
ستین دینارا ثم تدبرتھا فوضعت	خرچ کئے، پھر میں نے ان پر غور و فکر کیا اور
الی جنب کل مسئلۃ حدیثا[2]	ہر مسئلہ کے پہلو میں حدیث لکھی۔

یہ ان مسائل کا تنقیدی جائزہ تھا جو امام شافعیؒ نے لیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ امام محمد کی مرتب کتابوں میں ائمہ مجتہدین بھی غور و فکر کرتے اور ان سے بہت کچھ حاصل کرتے رہے ہیں اور ان کی کتابیں امت میں مقبول رہی ہیں۔

اس سے اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ ان مسائل پر جس کی نظر سنن و آثار کے وسیع تر ذخیرہ پر محیط نہ ہو اور فقہی بصیرت سے محروم ہو ان مسائل کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

امام محمدؒ پر مخالفتِ حدیث کا الزام اور موصوف کی وضاحت

محدثین عموماً رائے و قیاس کے خلاف ہوتے ہیں اس لئے وہ فقہاء کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں چنانچہ عیسیٰ بن

[1] احمد شاکر: الباعث الحثیث ص ۳۰، ۳۸ [2] تاریخ البغداد ج ۲ ص ۱۷۲، یحییٰ بن شرف النووی۔ تہذیب الاسماء واللغات۔ القاھرۃ۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ ت ب، ج ۱ ص ۸۱۔

ابان المتوفی ۲۲۱ھ جن کا شمار مشہور حفاظ حدیث میں تھا اہل الرائے کی صحبت سے کتراتے اور فرماتے تھے:

ھولاء قوم یخالفون الحدیث[1]	یہ لوگ حدیث کے خلاف کرتے ہیں۔

حافظ محمد بن سماعہؒ (۱۳۰-۲۳۳ھ، ۷۴۸-۸۴۷ء) جو ان کے دوست تھے وہ چاہتے تھے کہ یہ امام محمدؒ کی مجلس درس میں کبھی شریک ہو جائیں تو ان پر حقیقت آشکارا ہو جائے، ایک بار ایسا ہوا کہ عیسیٰ بن ابان محمد بن سماعہؒ سے ملنے آئے، امام محمد کے درس کا وقت قریب تھا محمد بن سماعہ نے ان سے کہا ذرا مجلس درس میں بیٹھو اور دیکھو، عیسیٰ بیٹھ گئے، درس کے بعد وہ انہیں امام محمد سے ملانے لے گئے اور صاف کہا کہ یہ آپ کو حدیث کا مخالف سمجھتے ہیں، امام محمد نے ان سے فرمایا:

"تم نے ہم سے کون سی ایسی بات دیکھی کہ جس میں ہم نے حدیث کے خلاف کیا ہو، ہمارے خلاف شہادت نہ دو جب تک تم ہم سے خلاف حدیث کوئی بات نہ سنو، تو عیسیٰ نے ان سے پچیس باب کی حدیثوں کے متعلق سوال کیا انہوں نے عیسیٰ کو بتایا کہ ان میں حدیثیں منسوخ ہیں اور ان کے دلائل و شواہد پیش کئے۔"[2]

پھر یہ مجلس سے اٹھ کر آئے تو کہا جو پردہ حائل تھا وہ اٹھ گیا:

"میں سوچ نہیں سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مملکت میں اس طرح کا عالم اللہ تعالیٰ لوگوں کے فائدہ کی خاطر نمودار فرمائے گا اور امام محمدؒ کی صحبت میں ہر وقت کی حاضر باشی اختیار کی تا آنکہ فقیہ بن گئے۔"[3]

[1] عبد الکریم بن محمد السمعانی۔ الانساب۔ بیروت، دار الجنان، ۱۴۰۸ھ ج ۴ ص ۴۳۱، [2] (القاضی) حسین بن علی الصیمری۔ اخبار ابی حنیفہ و اصحابہ، بیروت۔ عالم الکتب، ۱۴۰۵ھ ج ۲۔ ص ۱۳۲ [3] الصیمری، ص ۱۳۲۔

محدثین کے یہاں ان کی مخالفتِ حدیث کا ایسا چرچا تھا کہ ابتدا میں اس کی صدائے بازگشت امام احمد بن حنبلؒ کے یہاں بھی سنائی دیتی تھی، چنانچہ موصوف فرماتے تھے:

"ابو یوسفؒ حدیث میں انصاف پسند و منصف تھے لیکن ابو حنیفہ اور محمد بن الحسن حدیث و اثر کے مخالف تھے۔"[1]

چنانچہ مورخ اسلام حافظ شمس الدین الذہبیؒ المتوفی ۷۴۸ھ نے حقیقتِ حال پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی:

"موصوف کا احادیث کے خلاف کرنا عموم قرآن پر عمل کرنے کی وجہ سے تھا (بظاہر حدیث کی مخالفت محسوس ہوتی ہے، حقیقت میں وہ قرآنی نصوص پر عمل کرتے تھے)۔"[2]

امام محمدؒ کے متعلق محدثین کرام کا طرز عمل

یہی وجہ ہے کہ محدثین نہ ائمۂ احناف کی کتابیں پڑھتے نہ ان کی مجلسوں میں بیٹھتے تھے بلکہ ان کی کتابوں کا مطالعہ کئے بغیر ہی ان کے متعلق رائے قائم کرتے اور لوگوں کو ان کی کتابوں کے مطالعہ سے روکتے تھے، چنانچہ حافظ ابن عدیؒ المتوفی ۳۶۵ھ کتاب الکامل فی ضعفاء الرجال" میں امام محمدؒ کی کتابوں کے متعلق رقم طراز ہیں:

"اور امام محمدؒ کی حدیثوں کے مطالعہ میں لگے رہنا ایک ایسا کام ہے جس کی حاجت ہی نہیں کیونکہ وہ اہل حدیث میں سے نہیں اس لئے مطالعہ سے روکا جاتا ہے۔"[3]

ذرا غور فرمائیں:

(۱) امیر المومنین فی الحدیث، سفیان ثوریؒ، شعبہ امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، حماد بن زید اور ابن عیینہؒ "اصول دین" کا شاگرد ہو۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۹ [2] تاریخ الاسلام، ص ۳۶۱ حوادث و وفیات ۱۸۱-۱۹۰ [3] عبد اللہ بن عدی الجرجانی، الکامل فی ضعفاء الرجال، بیروت، دار الفکر، ب، ت، ج ۶ ص ۲۱۸۴۔

(۲) ائمہ حدیث اسے رواۃ مالکؒ میں قوی قرار دیں۔

(۳) ثقات حفاظ میں اس کا شمار ہو۔

(۴) شافعیہ کے مقتدا، مجتہد مطلق، امام شافعی کا استاد ہو۔

(۵) امام شافعیؒ حدیث میں اس سے احتجاج کرتے ہوں۔

(۶) عالم کے اذکیاء میں اس کا شمار کیا جاتا ہو[1]

مذکورہ بالا صفات سے آراستہ حافظ و مجتہد وقت کے متعلق اس قسم کے ریمارک پاس کرنا کیا حق و انصاف قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہی طرز عمل عام محدثین نے امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، اور امام زفرؒ وغیرہم کے ساتھ روا رکھا ہے۔

ائمہ احناف پر مبہم جرح

انہی حقائق کے پیش نظر ائمہ احناف نے اصول فقہ کی کتابوں میں اس امر کی تصریح کی ہے کہ جو ائمہ حدیث ہمارے ائمہ پر مبہم جرح کرتے ہیں وہ جرح ناقابل اعتبار و لائق اعتنا نہیں اس لئے کہ وہ مذہبی تعصب اور طرفداری پر مبنی ہوتی ہے۔ چنانچہ فخر الاسلام بزدویؒ المتوفی ۴۸۲ھ "کنز الوصول الی معرفۃ الاصول" میں رقم طراز ہیں:

"لیکن ائمہ حدیث کی طرف سے مجمل و مبہم جرح و طعن قابل اعتبار نہیں اس لئے کہ عدالت مسلمانوں میں ظاہر ہے (مسلمان ایمان کی بدولت عادل ہوتا ہے) خاص طور پر قرون اولیٰ (جس میں خیر کی شہادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے، چنانچہ امام قاضی ابو یوسفؒ، امام زفرؒ، امام محمد تبع تابعی ہیں) اگر مطلق جرح و طعن کی بنا پر رد کیا جانے لگا تو سنن و آثار کا سارا ذخیرہ معطل اور بیکار ہو کر رہ جائے گا۔"[2]

---

[1] الذہبی، العبر فی خبر من غبر تحقیق صلاح الدین المنجد، الکویت، مطبوعہ حکومۃ الکویت ۱۹۶۰ء ج ۱ ص ۳۰۲ [2] علی بن محمد فخر الاسلام البزدوی، کنز الوصول الی معرفۃ الاصول، کراچی (بقیہ حاشیہ ص ۱ ۴۱ پر)

چنانچہ موصوف آگے بعض وجوہ طعن کی نشاندہی کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"(۱) اور کبھی طعن اس سبب سے واقع ہوتا ہے کہ وہ ایسا مجتہد ہے کہ اس پر مثلاً ارسال کا طعن کیا جاتا ہے۔

(۲) کثرت سے فقہ کے فروعی مسائل کے استخراج و استنباط کرنے پر جرح کی جاتی ہے، یہ طعن و جرح قابل قبول نہیں۔

(۳) اور اگر طعن مفسر فسق و فجور کی تہمت کے ساتھ ہو لیکن طعن کرنے والے پر عصبیت و عداوت کی تہمت لگی ہو تو بھی طعن قابل سماعت نہیں جیسے ملحد اور بے دینوں کا اہل سنت پر طعن کرنا۔

(۴) اسی طرح ان لوگوں کا جنھوں نے شافعی مذاہب اختیار کیا ہمارے ائمہ متقدمین پر جرح کا حکم ہے"[۱]

اس سے یہ حقیقت عیاں ہوئی کہ قدمائے حنفیہ پر عداوت کی وجہ سے جو جرح و طعن کیا جاتا ہے وہ قابل التفات نہیں۔

امام محمدؒ کے درسی افادات کی قدر و قیمت قاضی عیسیٰ بن ابانؒ کا بصرہ میں جب انتقال ہوا تو ان کے کتب خانہ کی کتاب کا ہر ورق جدا بکا، علامہ سمعانی کتاب الانساب میں اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"اور جب عیسیٰ بن ابان کا انتقال ہوا، ۲۲۱ھ میں ان کی کتابیں ورق ورق کرکے فروخت کی گئیں ہر ورق ایک درہم میں فروخت کیا گیا، اس لئے کہ موصوف نے امام محمد کے درس میں کتاب کے حاشیوں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۷) (۳) نور محمد کارخانہ تجارت کتب ۱۳۸۰ھ ص ۱۹۶۔ محمد بن احمد السرخسی = اصول السرخسی، حیدرآباد دکن لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ ۱۳۷۲ھ ج ۲ ص ۹ حاشیہ صفحہ ہذا [۱] کشف الاسرار ج ۳ ص، اصول السرخسی ج ۲ ص ۱۱۔ الانساب ج ۴ ص ۴۸۴ (القاضی)۔

پر مسائل کی تحقیق اور فوائد لکھے تھے"[۱]

مذکورہ بالا واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام محمدؒ کے درسی افادات کی اس دور میں کیا قدر و قیمت تھی۔

شکل و صورت اور حسن و جمال امام محمدؒ بہت زیادہ حسین و جمیل تھے، باپ انہیں امام ابوحنیفہؒ کی مجلس درس میں لائے، انہوں نے فرمایا لڑکے کے سر کے بال منڈوائیں، پرانے کپڑے پہنائیں تاکہ لوگ فتنہ میں نہ پڑیں۔

امام محمدؒ کا بیان ہے کہ والد نے میرا سر منڈایا، پرانے کپڑے پہنائے تو حسن اور دوبالا ہو گیا۔[۲]

امام شافعیؒ کی امام محمدؒ سے پہلی ملاقات امام شافعی کا بیان ہے:

"میں نے پہلی بار جب امام محمد کو دیکھا ان کے پاس اہل علم بیٹھے تھے میری نظر ان کے چہرے پر پڑی تو وہ سب سے زیادہ حسین و جمیل تھا، پیشانی تو گویا ہاتھی کے دانت کی طرح روشن و صاف تھی، لباس سب سے بہتر تھا۔ ایک اختلافی مسئلہ پوچھا تو اپنا مذہب زور دار انداز میں پیش کیا، بیان کرکے تیر کی طرح گزر گئے"[۳]

عادات و خصائل اور کمالات و فضائل اور امام شافعی کا اعتراف امام شافعیؒ ان کے عادات و خصائل اور کمالات و فضائل پر گوناگوں الفاظ میں متواتر روشنی ڈالتے رہے ہیں، چنانچہ فرمایا:

"میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس سے کوئی اختلافی مسئلہ پوچھا ہو اور اسے ناگوار نہ ہوا ہو سوائے امام محمد کے"[۴]

---

[۱] الانساب ج ۴ ص ۳۳۴ (قاضی)، اس طرح بیچنے میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مکمل کتاب کے فروخت کے مقابلہ میں رقم زیادہ ملتی ہے [۲] شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۲ [۳] ایضاً [۴] الصیمری اخبار ابی حنیفۃ و صاحبیہ، ص ۱۲۸، شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۲۔

امام موصوفؒ کا بیان ہے:

"میں نے امام محمدؒ سے بڑھ کر کتاب اللہ کا فصیح و بلیغ عالم، حلال و حرام کا جاننے والا، اسباب و علل کا واقف اور ناسخ و منسوخ پر نظر رکھنے والا نہیں دیکھا، لوگ اگر انصاف سے کام لیں تو یقین کریں کہ انہوں نے امام محمد بن حسن الشیبانیؒ کا نظیر نہیں دیکھا[1]...... ان سے بڑھ کر فقیہ کے پاس کبھی نہیں بیٹھا اور نہ فصیح زبان بولنے والا دیکھا[2] وہ فقہ اور اسباب و علل فقہ کی ایسی باتیں جانتے تھے جن کو بیان کرنے سے بڑے بڑے لوگ عاجز تھے۔[3]

امام شافعی رحمہ اللہ نے امام مالکؒ اور امام محمدؒ دونوں سے پڑھا اور سنا تھا اور انہیں ان کی ہم نشینی کا فخر حاصل تھا۔ ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ بتائیں ان میں کون زیادہ فقیہ تھا؟ فرمایا! محمد بن الحسن زیادہ فقیہ النفس تھے۔[4]

ابو عبید قاسم بن سلامؒ کا بیان ہے:

"میں امام محمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا امام شافعیؒ بھی مجلس میں بیٹھے مسئلہ پوچھ رہے ہیں، موصوف نے عمدہ جواب دے کر خاموش کر دیا اور درہم دے کر فرمایا، علم چاہتے ہو تو یہاں جمے رہو چنانچہ میں نے امام شافعیؒ کو فرماتے ہوئے سنا، واللہ میں نے امام محمدؒ سے ایک بار شتر علم قلم بند کیا ہے۔"[5]

اس زمانے میں ایک بارِ شتر علم بہت زیادہ سمجھا جاتا تھا۔ امام شافعیؒ کا قول ہے:

"امام محمدؒ اگر نہ ہوتے تو مجھ پر علم کا ایسا انکشاف اور فیضان نہ ہوتا جیسا کہ اب ہوا ہے۔"[6]

امام شافعی فرماتے ہیں:

---

[1] اخبار ابی حنیفہ و صاحبیہ و اصحابہ ص ۱۲۸، شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۲-۳۲۳۔
[2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳۲۳ [4] الصیمری اخبار ابی حنیفۃ و اصحابہ، ص ۱۲۸، شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۲ [5] شذرات الذہب۔

"میں نے فربہ انسان محمد بن الحسنؒ سے زیادہ سبک روح، چست اور مستعد نہیں دیکھا۔"[1]

امام محمدؒ کی علمی فیض بخشیاں اور مالی مدد و سخاوت

امام محمد بہت سخی تھے، ان کی فیض بخشیاں طلبہ پر عام تھیں، وہ ان کی علمی رہنمائی کرتے، ان کے اشکالات دور کرتے۔ غیر عراقی طالب علم اپنے وقت میں کمی کے باعث امام موصوف کے علوم سے پورے طور پر استفادہ کرنے سے قاصر رہتا تو وقت نکال کر تنہا رات میں دیر تک پڑھاتے تھے، چنانچہ اسد بن الفرات القیروانی نے امام محمد کو اپنے حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ وہ زیادہ قیام بھی نہیں کر سکتا، خرچ صرفہ بھی نہیں اور آپ کے علوم سے بہرہ ور ہونے کی آرزو بھی پوری نہیں ہو سکی، میرے لئے آپ سے استفادہ کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟ امام محمد نے فرمایا دن میں عراقی طلبہ کے ساتھ درس سنا کرو، میں نے رات صرف تمہارے لئے رکھی ہے، تم رات یہاں گزارو میں تمہیں سناؤں گا، اس کا بیان سنئے وہ کہتا ہے:

"میں رات کو امام محمد کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ تشریف لاتے، ان کے سامنے پانی سے بھرا پیالہ رکھا ہوتا، پھر وہ پڑھنا شروع کرتے جب رات زیادہ ہو جاتی مجھے اونگھ کے جھونکے آنے لگتے تو دست مبارک سے میرے منھ پر چھینٹے مارتے تو ہوش آتا، ان کا یہی دستور تھا اور میری وہی عادت تھی تا آنکہ میں نے ان سے کتابوں کا سماع پورا کیا اور ان سے رخصت ہوا۔"[2]

امام محمدؒ نے جب اسد بن الفرات قیروانی کو راستہ کی سبیل سے پانی پیتے دیکھا تو اس کی غربت کا اندازہ ہوا، موصوف نے اسے اسی دینار دئے[3] اور جب وہ قیروان جانے لگا تو سفارش کر کے سرکاری خزانہ سے دس ہزار درہم دلائے[4] تاکہ سفر آسانی سے کریں کسی قسم کی مالی پریشانی نہ ہو۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۵ [2] محمد زاہد الکوثری۔ بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی۔ کراچی۔ مطبعۃ ایجوکیشنل پریس، ۱۴۰۳ھ ص ۱۵ [3] ایضاً [4] سیر اعلام النبلاء ج ۱ ص ۲۲۰، عبد الرحمٰن بن محمد الدباغ۔ معالم الایمان فی معرفۃ اھل القیروان، القاہرہ، دار المعارف، ۱۳۰۲ء ج ۲ ص ۹-۱۱، یہ کتاب اس عاجز نے بیرو یونیورسٹی، کانو، نائیجیریا میں دیکھی تھی۔

طلبہ کی مالی مدد کرتے، ایک بار امام شافعیؒ کا تمام قرض ادا کیا[1]، وقت پر ان کے کام آتے تھے۔

امام شافعیؒ کی بغاوت کے الزام میں گرفتاری اور امام محمدؒ کی حق گوئی و مہربانی

مکہ میں نو علویوں کی ایک جماعت بغاوت کے الزام میں پکڑی گئی، انہوں نے امام شافعی کو بھی ملزم قرار دے کر اپنے ساتھ گرفتار کرایا، اس بات کی جب امام محمد کو خبر لگی بہت صدمہ ہوا فرمایا: وقت آنے دو، چنانچہ ان دس افراد کی جماعت کو دارالخلافہ بغداد لایا گیا، خلیفہ ہارون رشید، رقہ میں تھا، انہیں رقہ میں اس کے سامنے پیش کیا گیا، اس نے بیانات سُن کر نو کو قتل کرایا، امام شافعی کہتے تھے اب میری باری ہے آخر انہیں بھی خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا، وہاں امام محمد بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا میں علوی نہیں میں ہاشمی مطلبی ہوں، عالم ہوں، مجھے یہ علوی ظلماً یہاں گھسیٹ لائے ہیں، یہ مکالمہ امام شافعیؒ کی زبانی سُنئے، وہ فرماتے ہیں خلیفہ نے کہا:

"تم محمد بن ادریس ہو؟ میں نے عرض کی "جی" امیر المومنین! اس نے کہا محمد بن الحسن نے تمہارا مجھ سے ذکر نہیں کیا، خلیفہ محمد بن الحسن کی طرف متوجہ ہوا اور کہا اے محمد! جو یہ کہتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا وہ کہتا ہے، امام محمدؒ نے کہا جی ہاں حقیقت ایسی ہی ہے، اس کا علم میں بڑا مقام ہے اور جو ان پر تہمت دھری گئی ہے وہ ان کی شان کے منافی ہے، پھر خلیفہ نے کہا، یہ آپ کے حوالے، آپ پکڑیں تاکہ میں اس کے معاملے میں غور کروں، چنانچہ انہوں نے پکڑے رکھا اور وہ میری نجات کا سبب ہوگئے"[2]

بعض شافعیہ نے گرفتاری کا الزام امام محمدؒ پر دھرا اور بعض نے اس الزام میں امام ابو یوسفؒ کو بھی شریک کیا ہے، حالانکہ وہ اس واقعہ سے پہلے انتقال کر گئے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ

[1] شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، مصر مکتبۃ القدوسی ۱۳۵۰ھ ج ۱ ص ۳۲۴
[2] الانتقاء ص ۹۸ شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳۔

المتوفی ۸۵۲ھ توالی التاسیس میں رقم طراز ہیں:

"یہ روایت جھوٹی ہے اور اس کا بیشتر حصہ گھڑا ہوا ہے اور بعض حصے دوسری مختلط روایات سے ماخوذ ہیں اور جو کھلا جھوٹ اس میں ہے وہ یہ ہے کہ ابو یوسف اور محمد بن الحسن نے ہارون الرشید کو امام شافعی کے قتل پر ترغیب دی، یہ قصہ دو وجہ سے باطل اور جھوٹ ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ امام شافعی کی بغداد میں آمد (۱۸۴ھ) سے پہلے (۱۸۲ھ) میں انتقال کر گئے تھے اور امام شافعی کی ان سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرنے والے تھے، ان دونوں سے بعید ہے کہ کسی مسلمان کے قتل میں کوشش کریں خاص طور سے ایک مشہور عالم کے، ان دونوں کی جناب میں امام شافعی کا کوئی گناہ نہ تھا بجز اس کے کہ علم پر حسد تھا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کیا تھا"[1]

اگر ابن حجرؒ کی حسد کی بات صحیح ہے تو پھر ان کا تقویٰ کہاں رہا حسد تقویٰ کو کھا جاتا ہے اللہ تعالیٰ سب کو حسد کی آگ سے بچائے۔ (آمین)

مورخ عبد الحیٔ بن العماد الحنبلی المتوفی ۱۰۴۹ھ نے شذرات الذہب میں اسے افترا و بہتان قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر امام محمدؒ سفارش نہ کرتے تو نہ امام شافعی رہتے، نہ شافعی مذہب، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ہر شافعی پر قیامت تک لازم ہے کہ وہ امام محمدؒ کے اس احسان کو سمجھے اور موصوف کے لئے مغفرت اور بخشش کی دعا کرتا رہے"[2]

[1] ابن حجر العسقلانی۔ توالی التاسیس لمعالی محمد بن ادریس تحقیق عبد اللہ القاضی۔ بیروت: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۰۶ھ = ۱۹۸۶ء ص ۱۳۱
[2] شذرات الذہب۔ ج ۱ ص ۳۲۴۔

والدین کی میراث کا صحیح مصرف ابو عمرو شاگرد امام محمدؒ کا بیان ہے:

"امام محمدؒ نے فرمایا، والد نے تیس ہزار درہم چھوڑے تھے۔ ان میں سے پندرہ ہزار میں نے شعر و ادب پر اور پندرہ ہزار حدیث و فقہ پر خرچ کئے۔"[1]

امام محمدؒ کی کتابوں سے ائمہ لغت و نحو کا اعتنا موصوف نے حدیث و فقہ عربیت و ادب میں ایسی مہارت حاصل کی تھی کہ انہیں سند کا درجہ حاصل ہے، چنانچہ ابوبکر الجصاص الرازی [۳۰۵-۳۷۰ھ = ۹۱۷-۹۸۰ء] "باب معانی حروف العطف وغیرھا" کی بحث میں رقم طراز ہیں:

"محمد بن الحسن لغت کے متعلق جو نقل کرتے ہیں اس میں وہ حجت و سند ہیں، ائمہ لغت کی ایک جماعت نے موصوف کے اقوال سے حجت پکڑی اور دلیل پیش کی ہے، ان میں ابو عبید نے غریب الحدیث وغیرہ کتابوں میں ان کے اقوال سند کے طور پر پیش کئے ہیں، ابوبکر الجصاص کا بیان ہے ابو العباس تعلب (۲۰۰-۲۹۱ھ = ۸۱۶-۹۰۴ء) کی طرف سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ محمد بن الحسن الشیبانی لغت میں حجت و سند ہیں۔"[2]

ابو عبید قاسم بن سلام لغوی بغدادی (۱۵۴-۲۲۴ھ/ ۷۷۴-۸۳۸ء) کے اپنی کتابوں میں امام محمدؒ کے اقوال سے استدلال کرنے کا ذکر قاضی حسن بن عبدالرحمن الرامہرمزی (تقریباً ۲۶۰-۳۶۰ھ = ۸۷۴-۹۷۰ء) نے "المحدث الفاصل بین الراوی والواعی میں بھی کیا ہے"[3]

امام طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ اپنے شیخ محمد بن شاذان المتوفی ۲۷۲ھ سے نقل کرتے ہیں کہ

---

[1] اخبار الامام ابی حنیفۃ واصحابہ الصیمری ص ۱۲۹، تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۸۳، مناقب الامام ابی حنیفہ ص ۵۴، اخبار الامام ابی حنیفۃ واصحابہ، شذرات الذہب ج ۱ ص ۳۲۳ [2] اصول الجصاص ج ۱ ص ۳

[3] المحدث الفاصل ص ۲۵۱۔

اخفش نحوی سعید بن مسعدہ المتوفی ۲۱۵ھ فرماتے تھے:

"کوئی چیز کسی چیز کے لئے اس طریقہ پر ہرگز وضع نہیں کی گئی کہ وہ اس کے مطابق ہو مگر امام محمد بن الحسن کی کتاب الایمان جو "الجامع الکبیر" میں قسموں کے بیان میں ہے وہ عوام الناس کے کلام کے عین مطابق ہے۔"[1]

امام لغت ابو علی فارسی (۲۸۸-۳۷۷ھ/ ۹۰۰-۹۸۷ء) جو مبرد لغوی کا ہمسر سمجھا جاتا تھا امام محمد کی فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور انہیں عزیز رکھتا تھا، چنانچہ یاقوت رومی کا بیان ہے:

"ایک مرتبہ بغداد میں آگ لگی تو ابو علی کا وہ سارا علمی سرمایہ جو اس نے ایک زمانے میں اپنے استاد سے دوران سبق قلم بند کیا تھا، خاکستر ہو گیا ایک صندوق میں صرف امام محمدؒ کی کتاب الطلاق کا آدھا حصہ بچ گیا تھا، اس ذخیرہ کے جلنے کا اس کو ایسا صدمہ تھا کہ اس نے دو دن تک کسی سے بات نہیں کی تھی۔"[2]

ائمہ لغت و نحو میں امام صاحب کی کتابوں کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابو علی فارسی کا شاگرد ابو الفتح عثمان بن جنی المتوفی ۳۹۲ھ "کتاب الخصائص" میں رقم طراز ہے:

"اسی طرح محمد بن الحسن رحمہ اللہ کی کتابیں ہیں جن سے ہمارے نحوی علتیں نکالتے ہیں ان کے کلام میں علل منتشر اور جا بجا پھیلی ہوئی ہیں، انہیں خوش اسلوبی اور سلیقہ سے ایک ایک کر کے جمع کیا جاتا ہے، ہم ان کے کلام میں علت ایک جگہ پوری لکھی ہوئی نہیں پاتے، یہ بات نحویوں کی جماعت میں مشہور و مسلم ہے۔"[3]

---

[1] تاریخ البغداد ج ۲ ص ۱۷۷، مناقب الامام ابی حنیفہ ص ۵۱، مناقب الامام الاعظم ج ۲ ص ۱۵۹۔
[2] یاقوت الرومی معجم الادباء دہلی، ب ت ج ۲ ص ۲۰ [3] عثمان ابن جنی، کتاب الخصائص تحقیق محمد علی النجار، بیروت، دار الکتاب العربی، ب ت ج ۱ ص ۱۶۳۔ موفق الدین یعیش، شرح المفصل بیروت: عالم الکتب ب ت ج ۱ ص ۱۴۔

موصوف آگے لکھتے ہیں:

"علوم میں سے کسی علم میں غور و خوض نہیں کیا جاتا مگر صرف انہی متعین موجود ناگزیر مسائل میں جن کا علم کسی طور پر حاصل نہ ہو تو انسان ان مسائل میں مبہوت و پریشان رہتا اور بے سمجھے بات کہتا ہے کیا تم فقہ، فرائض، ریاضی اور ہندسہ وغیرہ کے بہت سے مرکبات اور مشکل مسائل کو نہیں دیکھتے کہ انسان ان پر وقتاً فوقتاً اور کچھ دن گزر جانے کے بعد بھی اہم و نادر مسائل پر غور و فکر کرتا رہتا ہے اور ان سے وہ اس وقت فائدہ اٹھاتا ہے جب اس کا مذاق مشقت و ریاضت سے پختہ ہو جاتا ہے"[۱]

امام محمدؒ کو جس طرح ادب و لغت میں سند کا درجہ حاصل تھا اسی طرح حساب و ریاضی میں بھی انہیں مہارت تامہ حاصل تھی، امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں "امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں میں امام محمد عربیت اور حساب میں سب سے بڑے عالم تھے"۔

کوفہ اور بصرہ کی علمی منافست و چشمک اور فخر و ناز کوفہ و بصرہ کی علمی برتری و چشمک میں فرار (جو امام محمدؒ کے خالہ زاد بھائی تھے)[۲] کی کتابیں اور امام محمدؒ کے ستائیس ہزار مرتبہ مسائل پیش کئے جاتے تھے، چنانچہ ابو علی حسن بن داؤد کا بیان ہے:

"اہل بصرہ کو چار کتابوں پر فخر و ناز ہے۔ جاحظ کی (۱) کتاب البیان والتبیین اور (۲) کتاب الحیوان۔ سیبویہ کی (۳) الکتاب (نحو میں) اور (۴) لغت میں خلیل کی کتاب العین۔

اور ہم ان ستائیس ہزار حلال و حرام کے مسائل پر فخر کرتے ہیں جنھیں اہل کوفہ میں ایک شخص نے مرتب و مدون کیا جسے محمد بن الحسن کہا جاتا ہے، یہ تمام مسائل قیاسی و عقلی ہیں جن سے لوگ بے نیاز نہیں رہ سکتے اور فرار کی کتاب معانی القرآن، مصادر القرآن، کتاب الوقف والابتداء

---

[۱] کتاب الخصائص تحقیق محمد علی النجار، بیروت، دار الکتاب العربی، ب ت ج ۲ ص ۹۲۔ [۲] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۵۲۔

اور کتاب الواحد والجمع فی القرآن ہیں"[۱]

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں کوفہ میں علوم قرآن و سنت اور لغت و نحو کے ایسے ماہر و ارباب کمال جمع تھے جن کی نظیر اسلامی قلمرو میں موجود نہیں تھی، مورخ اسلام شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ "سیر اعلام النبلاء" میں یحییٰ بن اکثم سے ناقل ہیں، وہ فرماتے تھے:

"لوگوں میں چوٹی (کے ماہر فن) علماء تھے چنانچہ حدیث کے فن میں سفیان ثوری ماہر تھے قیاس میں ابو حنیفہ ماہر تھے، قرأت کے فن میں کسائی تھے، آج کوئی بھی ان فنون میں ایسا ماہر باقی نہیں رہا"[۲]

مذکورہ بالا ائمہ فن کی شہادت و ارباب کمال کی تصریحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علوم قرآن و سنت اور علوم لغت و عربیت میں امام محمدؒ کو امت مسلمہ میں کیسا بلند مقام حاصل ہے۔

امام محمدؒ کی تعلیمی، تدریسی و تصنیفی خدمات کا عالم اسلامی کے فقہی مذاہب شافعی، مالکی اور حنبلی پر اثر امام محمدؒ کی تدریسی و تصنیفی خدمات کا دائرہ ایشیا تک محدود نہ تھا بلکہ اس سے افریقہ و دیار مغرب کو بھی فیض یابی کا موقع ملا ہے اور ان سے اسلامی قلمرو میں عظیم انقلاب رونما ہوا۔

شافعی مذہب شافعی مذہب افریقہ میں ان کے شاگرد محمد بن ادریس الشافعی کی بدولت معرض وجود میں آیا اور پنپا جو فرماتے تھے:

"مجھ پر لوگوں میں سب سے زیادہ احسان فقہ میں محمد بن الحسن الشیبانی کا ہے"[۳]

امام شافعی کی مجتہدانہ بصیرت سے سرزمین مصر کو (۱۹۸ھ = ۸۱۳ء) میں یہ فخر حاصل ہوا کہ وہاں اہلسنت والجماعت کے چار مشہور مذاہب میں سے تاریخی اعتبار سے تیسرا مذہب مذہب شافعی پہلے افریقہ میں پروان چڑھا، پھر دوسرے مذاہب کی طرح اسلامی دنیا (ایشیا) میں پھلا پھولا، چنانچہ

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۷۷ [۲] سیر اعلام النبلاء، ج ۷ ص ۲۴۹ (تذکرۃ سفیان ثوری) الانساب ج ۱ ص ۱۸۸ (الاعرابی) [۳] تاریخ البغداد ج ۲ ص ۱۷۷۔

تاج الدین سبکی المتوفی ۷۷۱ھ شافعیہ کی علمی راجدھانیوں مصر، شام، بغداد، خراسان، یمن کی نشاندہی کرنے کے بعد ان کے بلاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"مشرق میں اختلاف اقالیم اور وسعت بلاد کے باوجود دوسرے شہروں میں جیسے سمرقند، بخارا، شیراز، جرجان، رے، اصفہان، طوس، سادہ، ہمدان، دامغان، زنجان بسطام، تبریز، بیہق، میہنہ، استراباد وغیرہ شہر جو اقالیم ماوراء النہر میں داخل ہیں خراسان، آذربائیجان، مازندران، خوارزم، غزنہ، صحاب، غور، کرمان سے بلاد ہند تک اور تمام ماوراء النہر سے چین کے اطراف تک عراق عجم و عراق عرب وغیرہ میں ایسے شہر آباد تھے جنھیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی رہتی اور دل باغ باغ ہوتے تھے۔ لیکن افسوس تاتاریوں نے انہیں تباہ کر دیا۔

ثم انقضت تلك البلاد واهلها　　　فكانها وكانهم احلام [1]

(ترجمہ) پھر یہ شہر اور اہل شہر ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہو گئے گویا وہ شہر اور ان کے مکین سب خواب ہو گئے"۔

مالکی مذہب امام محمدؒ کے دوسرے نامور شاگرد علامہ قاضی اسد بن الفرات بن سنان الحرانی ثم القیروانی (۱۴۲-۲۱۳ھ = ۷۵۹-۸۲۸ء) ہیں جن کے تذکرہ کا آغاز مورخ اسلام علامہ شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے ان الفاظ سے کیا ہے:

الامام، العلامۃ، القاضی، الامیر، مقدم المجاهدین، ابو عبد اللہ الحرانی ثم القیروانی [2]

موصوف ۱۷۲ھ میں قیروان سے نکلے [3] امام مالکؒ سے اس سال الموطا کا سماع کیا [4] یہ دیار مغرب سے آئے تھے اس لئے امام مالک ان پر بہت مہربان تھے، موصوف نے جب فرضی مسائل (آئندہ پیش آنے

---

[1] عبد الوہاب السبکی۔ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ تحقیق محمود محمد الطناحی عبد الفتاح محمد الحلو مصر، عیسیٰ البابی الحلبی، ب ت، ج ۱ ص ۳۲۷-۳۲۸ [2] سیر اعلام النبلاء ج ۱ ص ۲۲۵ [3] بلوغ الامانی ص ۱۴ [4] سیر اعلام النبلاء ج ۱ ص ۲۲۵۔

والے مسائل) کے متعلق سوالات کئے تو امام مالکؒ نے فرمایا تم عراق جاؤ [1] ان کا دل ٹوٹا مگر امام مالکؒ کو کیا معلوم تھا کہ یہ سائل ان کے مذہب کو عالم اسلامی میں پروان چڑھانے کا اصل محرک ثابت ہوگا (جیسا کہ آگے آتا ہے) یہ عراق آئے، یہاں امام ابو یوسف حافظ و فقیہ یحییٰ بن ابی زائدہ کوفی ۱۱۹-۱۸۳ھ = ۷۳۷-۷۹۸ء) سے پڑھا [2] اور امام محمدؒ سے سب سے زیادہ استفادہ کیا [3] ان پر رائے و قیاس کا زیادہ غلبہ ہو گیا [4] اس لئے موصوف نے امام ابو حنیفہ کی فقہی مسائل پر کتابیں نقل کیں [5] اور ۱۷۹ھ = ۷۹۵ء میں جب امام مالکؒ کی وفات کی خبر ملی بغداد سے مدینہ آئے مختصر قیام کے بعد مصر کا رخ کیا، یہاں امام مالکؒ کے بڑے شاگرد موجود تھے، چنانچہ پہلے امام و مفتی عبد اللہ بن وہب مصری (۱۲۵-۱۹۷ھ = ۷۴۳-۸۱۲ء) جو بیس برس امام مالکؒ کی صحبت میں رہے تھے [6] امام ابو حنیفہؒ کی کتابوں میں مذکور مسائل کے متعلق امام مالکؒ کی رائے دریافت کرنے سے معلوم کئے [7] موصوف نہایت پرہیزگار بزرگ تھے ساتھ ہی اس سے معذرت کی [8] پھر امام مالک کے دوسرے ممتاز شاگرد عبد الرحمٰن بن القاسم المصری (۱۳۲-۱۹۱ھ = ۷۵۰-۸۰۶ء) کے سامنے اپنا مقصد پیش کیا انہیں جو زبانی یاد تھا بتایا اور جن مسائل میں تردد و شک تھا ان کے متعلق "اخال" (میرا خیال ہے) "احسب" (میں سمجھتا ہوں) "اظن" (میرا گمان اور میری رائے ہے) کے الفاظ سے اظہار خیال کیا، اسد بن الفراتؒ جو مسائل ان سے پوچھتے تھے وہ تمیں سو جز و ٹکڑوں میں ان کے پاس محفوظ تھے [9]

اس مجموعہ کا نام المسائل الاسدیہ ہے [10]۔

موصوف جب قیروان پہنچے اس کو پڑھایا؛ اخذوا عنه وتفقهوا به [11] لوگوں نے ان سے علم

---

[1] بلوغ الامانی، ص ۱۴ [2] الذہبی ج ۱ ص ۲۲۵؛ [3] بلوغ الامانی، ص ۱۵ [4] سیر اعلام النبلاء ج ۱ ص ۲۲۵ [5] ایضاً ۱۳۲ [6] ایضاً ج ۱ ص ۲۲۵ [7] ایضاً [8] ایضاً ص ۲۲۶ [9] طبقات الفقہاء ص ۱۳۲ [10] الانتقاء ص ۵۰-۵۱ و سیر اعلام النبلاء ج ۱ ص ۲۷۶ [11] ایضاً ص ۲۲۶ [12] ایضاً۔

حاصل کیا اور فقہ میں بصیرت پیدا کی، خوب پذیرائی ہوئی، ابو اسحاق الشیرازی لکھتے ہیں ان کتابوں کی بدولت انہیں علمی فرمانروائی ملی [1] (قضاء کا عہدہ ملا)

عبدالسلام بن سعید التنوخی المعروف سحنون (۱۶۰ - ۲۴۰ھ / ۷۷۷ - ۸۵۴ء) نے موصوف سے پڑھا [2] اسد بن الفرات کے چھ برس کے بعد (۱۸۸ھ / ۸۰۴ء) میں سحنون مصر آئے، امام عبدالرحمن بن القاسم العتکی سے "الاسدیۃ" کے مسائل میں مذاکرہ کیا اس وقت ابن القاسم نے کہا:

"ان میں بعض ایسی باتیں ہیں جن میں تبدیلی ناگزیر ہے اور ان کا جواب اسد بن الفرات کو بھی لکھا تم اپنی کتابوں کا سحنون کی کتابوں سے مقابلہ کر و لیکن اسد نے ایسا نہیں کیا جس سے انہیں صدمہ ہوا [3]

سحنون کے اس اصلاحی اور مقابلہ و اضافہ کئے ہوئے" نسخہ الاسدیہ لابن الفرات" کا دوسرا نام "المدونۃ الکبریٰ" ہے یہ الاسدیہ کا نقش ثانی ہے جسے سحنون ۱۹۱ھ / ۸۰۶ء میں قیروان لائے، یہی کتاب عالم اسلامی میں مقبول و مشہور ہے، چنانچہ علامہ شمس الدین الذھبی سیرا علام النبلاء میں رقم طراز ہیں:

"اصل المدونۃ اسئلۃ سالہا اسد بن الفرات لابن قاسم [4]

"المدونۃ الکبریٰ کی اصل وہ سوالات ہیں جو اسد بن الفرات نے ابن القاسم سے کئے تھے

امام ابن تیمیہؒ کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ المدونہ میں فقہائے اہل عراق کی تفریعات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اس لئے اس میں اہل عراق کے اصول کی جھلکیاں نمایاں ہیں، موصوف فرماتے ہیں:

---

[1] طبقات الفقہاء - ص ۱۳۲ [2] سیرا علام النبلاء ج ۱۰ ص ۱۲۶ - عبدالرحمٰن بن خلدون المغربی: تاریخ ابن خلدون (المقدمہ) بیروت: دارالکتاب للبنانی ۱۹۵۶ء ص ۸۱۱ - ۸۱۲ [3] سیرا علام النبلاء - ج ۱۰ ص ۱۶۲۲ - ۵ [4] ایضاً ج ۱۲ ص ۶۸ -

"یہ بات ہر پڑھے لکھے کو معلوم ہے کہ مدونہ ابن القاسم کی اصل و بنیاد "مسائل اسد بن الفرات" ہیں جن کی تفریع فقہائے اہل عراق نے کی ہے، ان مسائل کے متعلق اسد نے ابن القاسمؒ سے جواب پوچھے چنانچہ مسائل اسدیہ کی اصل سحنون کی روایت میں موجود ہے موصوف کے پاس امام مالکؒ سے منقول جواب تھے وہ بتائے اور کبھی اسد نے امام مالکؒ کے قول پر قیاس کر کے جواب دیا اس لئے ابن القاسم کے کلام میں قابل ذکر تعداد ان اقوال کی ہے جن میں ان کا میلان اہل عراق کی طرف نمایاں ہے اور وہ اہل مدینہ کے اصول کے مطابق نہیں ہے [1]

مذکورہ بالا تاریخی حقائق سے معلوم ہوا کہ المدونۃ کی جو چھتیس [2] ہزار جزئیات مسائل پر مشتمل ہے اس کی تدوین حنفی فقہ کے زیر اثر عمل میں آئی ہے اور اسے آج اسلامی دنیا میں المدونۃ الکبریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ دراصل امام محمد کے شاگرد اسد بن الفرات کی مساعی جمیلہ کا ثمرہ ہے۔ جس نے سرقسطہ کے محاذ پر میدان کارزار میں سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے جام شہادت نوش کیا یہاں اس کا مزار اور مسجد ہے [3]

حنبلی مذہب امت مسلمہ کے چار فقہی مذاہب میں سے چوتھے فقہی مذہب کے مقتدا و پیشوا مجتہد مستقل امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے شاگرد تھے امام موصوف نے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے تین [3] قمطر (بورے) لکھے تھے ان کا کبھی کبھی مطالعہ بھی کرتے تھے چنانچہ مورخ خطیب بغدادی المتوفی ۴۶۳ھ تاریخ بغداد میں بسند متصل روایت کرتے ہیں:

"مجھ سے الصوری نے بیان کیا وہ کہتے ہیں، مجھے عبدالغنی بن سعید نے بتایا کہ ہم سے ابو طاہر محمد بن احمد بن عبداللہ بن نصر نے کہا کہ مجھ سے عبداللہ نے بیان کیا کہ ان کے والد حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے علم کے تین [3] بورے لکھے تھے، میں نے ان سے پوچھا وہ ان میں غور

---

[1] مجموع فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج ۲۰ ص ۳۲۷ [2] الانساب ج ۱ ص ۱۶۷ (الاقریطی) [3] طبقات الفقہاء ص ۱۳۲ -

کرتے تھے نیز گاہ بگاہ ان کا مطالعہ کرتے تھے، زیادہ تر واقدی کی کتابیں پڑھتے تھے۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ امام محمدؒ کے جس طرح امام شافعیؒ شاگرد تھے اسی طرح امام احمد بھی ان کے شاگردوں میں سے تھے جو ان کے لکھے ہوئے نوشتوں سے فائدہ اٹھاتے رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ فقہ میں ان کے مختلف اقوال میں کوئی ایک قول حنفیہ سے اکثر مطابقت رکھتا ہے۔

مذکورۂ بالا سند کے تمام مشہور و معروف راوی معتبر و ثقہ ہیں اول الذکر دو راوی حافظ ہیں۔[۲]

غرض امام احمد بن حنبلؒ نے بھی دقت نظر اور فقہی بصیرت کا ملکہ امام محمدؒ کی تصنیفات و تالیفات سے سیکھا چنانچہ امام ابراہیم بن اسحاق الحربی المتوفی ۲۸۵ھ کا بیان ہے:

"میں نے امام احمد بن حنبل سے پوچھا یہ دقیق مسائل آپ نے کہاں سے سیکھے؟ فرمایا محمد بن الحسن کی کتابوں کا فیضان ہے۔"[۳]

اس زمانے میں فقہ حنفی کی عالمی قبولیت کا اندازہ امام سفیان بن عیینہ المتوفی ۱۰۸ھ کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے وہ فرماتے تھے:

"میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ دو چیزیں (۱) حمزہ کی قرات اور (۲) ابو حنیفہ کی رائے و فقہ کو فہ کا پل پار اتر سکیں گی لیکن یہ تو ساری (اسلامی) دنیا میں پھیل گئیں اور مقبول ہوگئیں۔"[۴]

یہ امام محمدؒ کی تدریسی و تصنیفی خدمات کا ناقابل فراموش ثمرہ و نتیجہ ہے جن کے اثرات شافعیؒ، مالکیؒ اور حنبلی مذہب پر روز روشن کی طرح ظاہر و باہر ہیں اور اسلامی تاریخ کے صفحات آج بھی مذکورۂ بالا امور پر شاہد عدل ہیں۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

---

[۱] تاریخ بغداد، ج ۳ ص ۵، ترجمہ محمد بن عمر الواقدی [۲] کتاب الکسب للامام محمد الشیبانی تحقیق عبد الفتاح ابو غدہ، حلب، مکتب المطبوعات الاسلامیہ ۱۴۱۷ھ اعدد الامام محمد دائرہ فی الفقہ الاسلامی ص ۳۳-۳۴ [۳] الخطیب البغدادی ج ۲ ص ۱۷۷ [۴] مناقب الامام ابی حنیفۃ ص ۲۰۳

ابن الندیم الوراقؒ

اور

ان کی "کتاب الفہرست"

ایک جائزہ

(مجلہ فکر و نظر، 1994ء)

Fikr-o-Nasar (Islamabad) 32:2 (1994)

ابن الندیم الوراق اور ان کی "کتاب الفہرست" ایک جائزہ
(اجمالی تعارف)

محمد عبدالحلیم چشتی

دنیا میں جو شخصیات گردوپیش کا جائزہ لیکر اپنی استعداد و صلاحیت کے پیش نظر مناسب و موزوں میدان انتخاب کرتی اور اس میں اپنے جوہر دکھاتی ہیں ان کا شمار دنیا کی کامیاب ترین شخصیات میں کیا جاتا ہے۔

ایسی نامور شخصیات میں ماہر فن کتابیات و کتاب شناس ابوالفرج محمد بن اسحاق الوراق البغدادی المعروف بابن الندیم والندیم کا شمار بھی کیا جا سکتا ہے تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں اس کے متعلق معلومات شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ اور شائد اسی وجہ سے اہل علم اس پر قلم اٹھانے سے پہلوتہی کرتے رہے ہیں۔

اسے وفات پائے ہوئے ہزار برس گزر چکے مگر ساتویں صدی ہجری سے اسے جو قبولیت و شہرت حاصل ہوئی وہ بڑھتی رہی اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا اس سے مستفید ہونے والوں کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ مشرق ہی نہیں مغرب بھی اس کا زیر بار احسان ہے۔

اس کی کتاب الفہرست کو مستشرقین نے قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا، جرمن مستشرق اگستس فلوگل (Gustav Flugul) (۱۸۰۲ - ۱۸۷۰ء) نے پچیس برس کی جانفشانی کے بعد اس کا متن شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا، لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی تو اس کے فرزند کی فرمائش پر اس کے دوست ڈاکٹر Johannes Roediger اور ڈاکٹر Muller کی مساعی سے ۱۸۷۲ء میں اسے لیپزک سے شائع کیا گیا۔ پھر اس کا فوٹو مکتبہ خیاط، بیروت سے شائع کیا گیا۔

محمد رضا (۱۸۸۶ء - ۱۹۷۳ء) نے چودہ سالہ عرق ریزی کے بعد اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اپنے حواشی کے ساتھ اسے شائع کرایا پھر اسے عربی میں چھپوایا' اس مطبوعہ نسخہ کا فوٹو اصح المطابع نور محمد نے کراچی سے شائع کیا۔

محمد اسحاق بھٹی نے اسے اردو میں منتقل کیا' موصوف کا یہ ترجمہ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔

بغداد میں اس کے عربی متن پر تحقیقی کام جاری تھا کہ خلیج کی جنگ نے اسے معرض التواء میں ڈالدیا۔

الفہرست کا انگریزی ترجمہ بیارڈ ڈوڈج (Bayar Dodge) نے جو امریکن یونیورسٹی بیروت میں (President Emeritus) ہیں کیا تھا' جسے دو جلدوں میں کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ نے (Record of civilization Sources and Studies) کے سلسلہ کی ایک کڑی کی حیثیت سے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا تھا اس کا پیش لفظ (W.T.H. Jackron) نے لکھا ہے۔

کتاب الفہرست کا سال تالیف

کتاب الفہرست کی تالیف کا آغاز کس سن میں ہوا اسکی تعیین مشکل ہے۔ لیکن ابن الندیم نے جن اہل علم و مصنفین سے اپنی ملاقات کا تذکرہ بقید سنین کیا ہے اس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تالیف کتاب کا آغاز ۳۴۰ھ سے پہلے ہوا تھا۔ اس وقت یہ کتاب اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور اسکی حیثیت یاد داشتوں سے زیادہ نہ تھی۔

الفہرست پر نظرثانی

اس کتاب پر نظرثانی اور اس کی ترتیب و تبویب کا کام ان کی وفات (۳۸۰ھ) سے تین سال قبل کیا گیا تھا جیسا کہ حسب ذیل قرائن سے عیاں ہے۔

۱۔ مقالہ النحویین یکم شعبان ۳۷۷ھ میں مکمل کیا گیا تھا۔ (۱)

فن دوم کا مقالہ سوم جو ملوک و خطباء کے بیان میں ہے وہ بھی ۳۷۷ھ میں اتمام کو پہنچا تھا۔ (۲)

مقالہ ششم میں فن چہارم کے خاتمہ پر مذکور ہے کہ اس زمانے (۳۷۷ھ) تک قاضی ابوالحسن عبدالعزیز الجزری شرقی بغداد میں محلہ سلم کا قاضی ہے (۳)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ ششم بھی اسی زمانے میں مکمل ہوا تھا۔

مقالہ ہفتم میں فن اول کے آخر میں یحیی بن عدی اور ابن زرعہ کے حالات بھی انہی ایام میں لکھے گئے تھے۔ (۴)

مقالہ نہم کا فن اول بھی ۳۷۷ھ میں قید تحریر میں آیا تھا۔ (۵) ابن الندیم کی مذکورہ بالا تصریحات سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ پوری کتاب ۳۷۷ھ میں اتمام کو پہنچی تھی' اس سے قبل کتاب الفہرست مسودہ کی صورت میں محفوظ تھی' الندیم کو جیسے جیسے معلومات ملتی رہتی تھیں بوقت فرصت انھیں مناسب و موزوں مقامات پر درج کرتا رہتا تھا جو بعد میں (یعنی ۳۷۷ھ میں) کتاب کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

چوتھی صدی ہجری میں کتابیات کا موضوع ایسا ترقی یافتہ نہیں تھا کہ اسے تمام مطلوبہ معلومات یکجا مل جاتیں اور وہ انھیں ایک لڑی میں پرو کر کتابیاتی ہار تیار کر کے ناظرین کے سامنے پیش کر سکتا۔ یہ بات کچھ اس دور سے مختص نہ تھی بلکہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی ترقی پذیر ممالک میں تحقیقی مقالے لکھنا مشکل کام ہے۔ محنت و جستجو کے باوجود مطلوبہ معلومات فراہم نہیں ہوتیں' ترقی یافتہ ممالک میں جہاں تمام سہولتیں میسر ہیں کسی ایک موضوع پر تمامتر مواد یکجا نہیں ملتا' کچھ مدت میں فراہم کیا جاتا ہے' معلومات کی فراہمی کا انتظار رہتا ہے اور محقق اپنے مسودہ میں اس کی گنجائش رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایسا ہی کچھ ابن الندیم کے ساتھ ہوا ہے۔ مسودہ صاف کرتے وقت بھی اسے پوری معلومات حاصل نہیں ہو سکی تھیں اس لئے اس نے مبیضہ میں جگہیں خالی چھوڑی تھیں اور ناظرین کو اس امر کا اختیار دیا تھا کہ جب انھیں یہ معلومات مل جائیں اس میں بڑھا دیجائیں۔ چنانچہ وہ حسن بن علی بن الحسن الداعی کے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

هذا مارا يناه من كتبه و زعم بعض الزيدية ان له نحو من مائة كتاب ولم نرها' فان راى ناظر فى كتابنا شئيا منها الحقها بموضعها۔ (۶)

یہ موصوف کی وہ کتابیں ہیں جنھیں ہم نے دیکھا ہے۔ بعض زیدیہ کا خیال ہے کہ موصوف نے تقریباً سو کتابیں تالیف کی ہیں لیکن ہم نے انھیں نہیں دیکھا ہے' مطالعہ

کرنے والا کوئی بات کہیں پائے تو اسے ہماری کتاب میں مناسب مقام پر بڑھا دے۔

بعد میں جن اہل علم نے اس قسم کا اضافہ کیا اس سے متاخرین کو یہ شبہ ہوا کہ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کی تالیف نہیں بلکہ پانچویں صدی ہجری کے اوائل کی تالیفات میں سے ہے اور ابن الندیم کا انتقال بھی پانچویں صدی ہجری میں ہوا ہے اس لئے کہ وہ ابو عبداللہ حسین بن علی بصری کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے ۳۹۹ ھ میں وفات پائی (۷)۔ اور ابو نصر بن نباتہ تمیمی کے حالات میں جو سیف الدولہ کے درباری شعراء میں سے تھا' رقمطراز ہے کہ اس نے چوتھی صدی ہجری کے بعد وفات پائی ہے (۸)۔ اس قسم کے اضافے مصنف کے قلم سے نہیں ہیں۔

وفات:

ابن الندیم کا انتقال بروز چہار شنبہ ۲۰ شعبان ۳۸۰ھ میں ہوا تھا۔ اس لئے یہ اضافے تمامتر الحاقی ہیں جو اسکی ہدایت کے مطابق بعد کے اہل علم نے کئے تھے' جن اہل علم کے پیش نظر اسکی یہ ہدایات نہیں تھیں انہیں ان اضافوں سے یہ غلط فہمی ہوئی کہ الفہرست اور اس کا مصنف ابن الندیم پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ یہ امر خلاف واقعہ ہے۔

ابن الندیم

ابن الندیم کسی خانوادہ علمی کا فرزند نہ تھا۔ وہ بلا شبہ ابو سعید سیرافی (۲۸۴۔ ۳۶۸ھ: ۸۹۷ ۔ ۹۷۰ء) ابو الفرج اصفہانی (۲۸۴ ۔ ۳۵۶ھ: ۸۹۷ ۔ ۹۶۷ء) اور ابو عبید اللہ المرزبانی (۲۹۷ ۔ ۳۸۴ھ: ۹۱۰ ۔ ۹۹۴ء) جیسے نادرہ روزگار اساتذہ و ارباب فن کا شاگرد تھا لیکن ایسا ہونہار شاگرد نہ تھا جو ان کا جانشین ہوتا اور اس سے ان کا سلسلہ روایت قائم رہتا' نہ کسی مشہور عالم کا بیٹا' نہ کسی معروف و نامور عالم کا وراق و کاتب' نہ بلند پایہ شاعر نہ نامور و ممتاز ادیب نہ کثیر التصانیف مصنف' نہ اسے اس دور کے علوم و فنون متداولہ میں سے کسی خاص علم و فن میں ایسی غیر معمولی مہارت و شہرت حاصل تھی کہ اس دور میں کتب تاریخ و تذکرہ میں جگہ پاتا انہی وجوہ سے اپنی زندگی میں کیا اس کے بعد کے دور میں بھی اسے اور اس کی کتاب "الفہرست" یا کتاب التشبیہات کو اہمیت و شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

غالبًا انہی وجوہ سے بالغ نظر مورخ ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی (۳۹۲ ۔ ۴۶۳ھ : ۱۰۰۳ ۔ ۱۰۷۱ء) کی تاریخ بغداد میں ہمیں کہیں اس کا نام نہیں ملتا' تاج الدین ابو سعد عبدالکریم

سمعانی (۵۰۶ـ ۵۶۲ھ: ۱۱۱۳ـ ۱۱۶۶ء) نے کتاب الانساب میں کہیں بھی اس کا یا اس کی الفہرست کا حوالہ نہیں دیا' ابن ابی یعلی المتوفی ۵۲۶ھ اور کمال الدین عبدالرحمن ابن الانباری المتوفی ۵۷۷ھ کی تصانیف میں بھی اس کا ذکر نہیں آیا۔

مذکورہ بالا مورخین و تذکرہ نگاروں کے متعلق یہ بدگمانی بھی نہیں ہونی چاہئے کہ ابن الندیم چونکہ شیعہ و معتزلی تھا اس لئے اس کا تذکرہ انہوں نے نہیں کیا' تاریخ بغداد اور کتاب الانساب میں شیعوں اور رافضیوں کا تذکرہ موجود ہے۔

بعد کے جن مورخین نے اس کا تذکرہ کیا ہے اس کے شیعی و معتزلی ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس کے شواھد و دلائل بھی پیش کئے ہیں چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی لسان المیزان میں رقمطراز ہیں۔

"میں نے اس کی کتاب الفہرست کا مطالعہ کیا تو حقیقت منکشف ہوئی کہ یہ اہل السنہ و الجماعہ کو حشویہ (تجسیم باری تعالی کا قائل) اور اشاعرہ کو مجبرہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔

اس نے امام شافعی کے تذکرہ میں من گھڑت باتیں نقل کی ہیں' جھوٹ بولا اور جھوٹ لکھا ہے' اس کی انوکھی باتوں میں یہ بات بھی ہے کہ وہ جھوٹے راوی جیسے عبدالمنعم بن ادریس' واقدی اور اسحاق بن بشر فرازی کی توثیق کرتا اور جو معتبر وثقہ راوی ہیں جیسے محمد بن اسحاق فرازی وغیرہ ان میں کلام کرتا ہے۔ اسی طرح مصعب بن عبداللہ زبیری کے باپ کے متعلق بھی بے سروپا باتیں لکھ گیا ہے جو اعتزال کی طرف اس کے میلان کا بین ثبوت ہے' مقالہ پنجم کا فن اول اس نے معتزلہ کے لئے مخصوص کیا ہے۔ (۹)

ساتویں صدی ہجری میں جب وہ علماء و محدثین جن کے سینے علوم کے دفینے تھے' اٹھنے لگے اور اسلاف کا علمی سرمایہ دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا تو مورخین و تذکرہ نگاروں نے کتاب الفہرست کی طرف توجہ کی اور مورخ محمد بن محمود المعروف بابن النجار المتوفی ۶۴۳ھ نے تاریخ بغداد کے ضمن میں اس کا چند سطروں میں تذکرہ قلمبند کیا۔ غالباً اس کی گمنامی کی وجہ سے موصوف کو اس کے متعلق زیادہ معلومات فراہم نہ ہو سکی تھیں اس لئے مبسوط تذکرہ نہیں کیا جا سکا۔

یاقوت رومی (۵۷۴ ـ ۶۲۶ھ: ۱۱۷۸ ـ ۱۲۲۹ء) نے معجم الادباء میں اس کا ذکر دو تین

سطروں میں کیا، جمال الدین علی بن یوسف قفطی (۵۶۸ - ۶۴۶ھ : ۱۱۷۲ - ۱۲۴۸ء) نے تاریخ الحکماء اور انباہ الرواۃ میں اس کا حوالہ دینا شروع کیا تو اس کی الفہرست کو اہمیت حاصل ہوئی تاآنکہ عہد حاضر میں اسے وہ قبول عام حاصل ہوا کہ باید و شاید۔

مذکورہ بالا تمام وجوہ شہرت سے عاری ہونے کے باوجود ابن الندیم ایک وراق کی پیشہ ورانہ خوبیوں سے آراستہ تھا، وہ فن وراقت سے طبعی مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اس فن میں محنت کی اور اپنی خداداد صلاحیت سے ایسی راہ اختیار کی جس نے اس دور میں نہ سہی بعد کے زمانے میں اسے حیات جاوید بخشی۔

ابن الندیم کی وراقتی، فنی و تخلیقی سرگرمیاں

وہ بڑی تندہی اور انہماک سے کتب خانوں کو دیکھتا اور ان کے متعلق نہایت قیمتی معلومات پیش کرتا تھا چنانچہ ابن ابی بعرہ کے متعلق جس کا ایک شخصی کتب خانہ تھا یوں تذکرہ کرتا ہے۔

كان جماعة للكتب له خزانة لم ار لاحد مثلها كثرة تحتوى من الكتب العربية فى النحو واللغة والكتب القديمة۔ فلقيت هذا الرجل دفعات فانس بى وكان نفورا ضنينا بما عنده خائفا من بنى حمدان۔

وہ کتابوں کے جمع کرنے کا دلدادہ تھا اس کا کتب خانہ ایسا تھا کہ میں نے کثرت کے اعتبار سے اس کے جیسا کتب خانہ نہیں دیکھا، وہ ادب و نحو و لغت کی عربی کتابوں اور قدیم الخط نسخوں پر مشتمل تھا۔ میں متعدد بار اس سے ملا تو وہ مجھ سے مانوس ہوا (پھر اس نے وہ ذخیرہ مجھے دکھایا) وہ لوگوں سے دور رہتا تھا اور بنی حمدان کے ڈر سے جو ذخیرہ اس کے پاس موجود تھا دکھانے میں بہت بخل کرتا تھا۔

ابن الندیم کے مذکورہ بالا الفاظ "لم ار لاحد مثلها كثرة" کہ اس نے بہت سے نجی کتب خانے دیکھے اور ان سے استفادہ کیا تھا لیکن بعض شخصی کتب خانوں تک اس کی رسائی ہفت خوان طے کیے بغیر نہیں ہوئی تھی۔

اس دور میں جب ہر جگہ علم کا چرچا اور ہر پڑھے لکھے کا گھر کتب خانہ تھا ہر شخص کی رسائی اس تک باسانی ہو جاتی تھی، اسے گاہ بگاہ کتابوں کی معرفت حاصل کرنے کے لئے بعض اور

ذخائر دیکھنے کے لئے وقت بھی لگانا اور ذھنی کوفت بھی اٹھانا پڑتی تھی اور اسے کبھی موانست و رفاقت کی راہ بھی اختیار کرنی ہوتی تھی تب کہیں نوادر تک رسائی ہوتی تھی۔

اس کتب خانہ میں ابن الندیم نے چینی، مصری اور تھائی کاغذ دیکھا تھا اور قدیم ترین کاغذوں کی معرفت حاصل کی تھی چنانچہ ابن الندیم کے علاوہ کسی قدیم مورخ کے یہاں تھائی کاغذ کا ذکر نہیں ملتا۔

اس کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین حجاز میں بھی کاغذ تیار کیا جاتا تھا۔ اس نے قدیم خط کے نمونے، ابن ابی معرہ کے ذخائر میں دیکھے تھے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کے شاگرد خالد بن ابی الھیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصحف یہیں دیکھا تھا حضرت حسنؓ و حسینؓ کی تحریریں اور دیگر کاتبان وحی کے نوشتوں کی اسی کے پاس زیارت ہوئی تھی، ابو عمرو بن العلاء (۷۰ ـ ۱۵۴ھ: ۶۹۰ـ۷۷۱ء) ابو عمرو شیبانی (۹۴ ـ ۲۰۶ھ: ۷۱۳ـ ۸۲۱ء) اصمعی (۱۲۲ ـ ۲۱۶ھ: ۷۴۰ـ ۸۳۱ء) ابن الاعرابی (۱۵۰ ـ ۲۳۱ھ : ۷۶۷ ـ ۸۴۵ء) سیبویہ (۱۴۸ ـ ۱۸۰ھ : ۷۶۵ـ ۷۹۶ء) فراء (۱۴۴ ـ ۲۰۷ھ : ۷۶۱ ـ ۸۲۲ء) ـ سفیان ثوری (۹۷ ـ ۱۶۱ھ : ۷۱۶ ـ ۷۷۸ء) سفیان بن عیینہ (۱۰۷ ـ ۱۹۸ھ : ۷۲۵ ـ ۸۱۴ء) اوزاعی (۸۸ ـ ۱۵۷ھ : ۷۰۷ ـ ۷۷۴ء) وغیرہ کے نوشتے بھی یہیں نظر آئے تھے۔ فاعل و مفعول کی بحث از ابو الاسود دوئلی (۱۱ ق ھ ـ ۶۹ھ ـ ۶۰۵ء ـ ۶۸۸ھ) اور اس پر علان نحوی اور نضر بن شمیل (۱۲۲ ـ ۲۰۳ھ : ۷۴۰ ـ ۸۱۹ء) کے دستخط تھے ـ اسی ذخیرے میں دیکھے تھے۔

ابن الندیم کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گوناگوں حوادث کے باوجود پہلی صدی ہجری سے تیسری صدی ہجری تک نمونہائے خط ابن ابی معرہ کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ تھے۔

اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوئی کہ چوتھی صدی ہجری میں بعض شخصی کتب خانے اپنی ندرت و اہمیت میں شاہی اور عوامی کتب خانوں سے بھی بازی لے گئے تھے، گو ان تک ہر کہ دمہ کی رسائی نہ تھی، اس لئے اس کا علم بھی خال خال اہل علم اور وراق کو تھا۔

شاھان وقت اور حکمران ذخائر کتب کے قدردان تھے، منہ مانگے دام دیتے تھے تاہم اس زمانے میں بعض نجی کتب خانوں کے مالکوں کو اپنا ثقافتی ورثہ جان سے زیادہ عزیز تھا حالانکہ اس کی

حفاظت کے ذرائع بھی ان کی دسترس سے باہر تھے۔ پھر بھی وہ اس علمی سرمایہ کی جدائی پسند نہیں کرتے تھے اور شاہی خزانے کی دولت و ثروت کے مقابلہ میں اپنے ثقافتی ورثہ کے زیادہ دلدادہ تھے۔ چوری و بربادی کے خیال سے اس کو زیادہ دکھاتے بھی نہیں تھے۔

۲۔ وہ خزانہ المامون میں جاتا تھا اس نے خط حمیری کا نمونہ مامون کے خزانہ الکتب میں دیکھا تھا۔ (۹) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہی و عوامی کتب خانوں میں جاتا اور ان سے استفادہ کرتا تھا' نیز چوتھی صدی ہجری تک خزانہ المامون کے دروازے ہر وارد و صادر کے لئے کھلے ہوئے تھے' ہر ایک اس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔

۳۔وہ موصل گیا وہاں علی بن احمد عمرانی کے کتب خانے میں اقلیدس کی کتاب اصول الھندسہ کا دسواں مقالہ جس کا ترجمہ اسحاق بن حنین نے کیا تھا اور ثابت بن قرۃ نے اس کی اصلاح کی تھی' دیکھا۔ (۱۰)۔

۴۔عوامی کتب خانہ قائم کرنے والوں سے مراسم و تعلقات رکھتا' ان سے مصنفین اور ان کی کتابوں کے متعلق معلومات فراہم کرتا تھا' چنانچہ ابو القاسم البستی کے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

میں نے اس کی کتابیں نہیں دیکھیں لیکن مجھے ابو علی بن سوار کاتب جس نے بصرہ میں خزانہ الکتب وقف کیا بتایا کہ اس کے خزانہ الکتب میں اس کی تالیفات موجود ہیں' میں نے اس سے دریافت کیا کہ بستی سین سے ہے یا شین سے۔ (۱۱)

۵۔ خلیل بن احمد کے استاذ عیسی بن عمر ثقفی کے حالات میں رقمطراز ہے کہ اس کی دو کتابیں کتاب الجامع اور کتاب المکمل عرصہ دراز سے ناپید ہیں ہم نہیں جانتے کہ یہ کسی کے پاس ہوں یا کسی نے ان کو دیکھا ہو۔ (۱۲)

یہ فقرے بتاتے ہیں کہ وہ اہل علم سے گہرا ربط رکھتا اور علمی کتابوں کے متعلق ان سے ہر نوع کی معلومات فراہم کرتا رہتا تھا۔

۶۔ابن الندیم کتابوں کی جستجو میں رہتا تھا چنانچہ بنی بویہ نے جب بغداد پر حملہ کیا اور خلیفہ معتضد مرا تو اس افراتفری کے زمانے میں اس کے کتب خانے سے برآمد شدہ کتابوں میں الجداول کی شرح بقلم زجاج کا ایک حصہ طلمی کاغذ پر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ (۱۳)

۷۔ یہ جن شائقین کتب سے ملتا ان کے علمی رجحان اور شخصی کتب خانوں کو دیکھتا اور ان کی نشاندہی کرتا تھا چنانچہ ابو سعید وہب بن ابراہیم کے متعلق رقمطراز ہے کہ ہم نے اس کو دیکھا وہ ادیب تھا نفیس کتابیں جمع کرتا تھا۔ (۱۴)

۸۔ابو الحسن علی ابن وصیف المعروف خشکناکہ کاتب کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ شیعہ میرا دوست تھا اس نے موصل میں وفات پائی تھی۔ (۱۵)

۹۔ابوالحسن علی بن محمد عددی سمیاطی ' جو ادیب و شاعر تھا اچھا حافظہ رکھتا تھا اور ابو ثعلب بن ناصر الدولہ کا اتالیق تھا' اس کے متعلق کہتا ہے۔ اس سے میرے دیرینہ مراسم ہیں اور ابتک بقید حیات ہے۔ (۱۶)

۱۰۔ابوالحسن علی بن نصر کے متعلق لکھتا ہے۔ یہ ادباء و مصنفین میں سے تھا اس نے مجھے بتایا کہ اس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں' میں سمجھتا ہوں کہ وہ اکثر مکمل نہیں کر سکا۔

۱۱۔ قاضی ابو محمد حسن بن عبدالرحمن ابن خلاد رامہرمزی المتوفی ۳۶۰ھ کے متعلق کہتا ہے کہ مجھے ابو علی ابن سوار کاتب نے بتایا کہ وہ شاعر و راوی حدیث تھا۔ (۱۷)

۱۲۔ ابوالعنبس محمد بن اسحاق عنبسی صمیری نحوی کے حالات میں کہتا ہے کہ میں نے ماہر فلکیات کو اس کی تعریف کرتے پایا ہے۔ (۱۸)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے فضلاء و ماہرین فلکیات کی ہم نشینی حاصل تھی۔

۱۳۔ ابو عبداللہ محمد بن احمد صفوانی کے تذکرہ میں رقمطراز ہے کہ میں اس سے ۳۴۶ھ میں ملا تھا یہ لمبا اور دبلا پتلا تھا اور اپنے آپ کو ان پڑھ ظاہر کرتا تھا مجھے معتبر آدمی نے بتایا کہ وہ بہانہ کرتا تھا' اس کی تصانیف ہیں۔ (۱۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل علم کے متعلق کتنی جستجو کرتا اور معلومات رکھتا تھا'

۱۴۔قاضی ابوالفرج المعافی بن زکریا نہروانی کے حالات میں رقمطراز ہے کہ وہ ہمارے معاصر ہیں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی پچاس سے زیادہ تصنیفات فقہ 'کلام' نحو وغیرہ میں موجود ہیں۔ (۲۰)

۱۵۔علم فلسفہ کی تاریخ کے متعلق لکھتا ہے کہ میں نے ابو القاسم عیسی بن علی کی مجلس

میں ابو الخیر بن الخمار سے دریافت کیا کہ فلسفہ میں سب سے پہلے کس نے کلام کیا تو اس نے کہا... (۲۱)

خالد بن' ابوبکر محمد بن ہاشم اور ابو عثمان سعید بن ہاشم موصلی جن کا حافظہ ایسا زبردست تھا کہ ایک مرتبہ کسی شاعر کا کلام سنتے یاد ہو جاتا تھا' ابوبکر محمد بن ہاشم کے متعلق اس کا بیان نقل کرتا ہے کہ وہ ایک ہزار سفر جو سو ورق پر مشتمل تھا یاد کرتا تھا (۲۲)

۱۷۔ یحیی بن عدی منطقی نصرانی کے تذکرہ میں رقمطراز ہے کہ وہ نصرانی ہے لیکن اسلام کی مذہبی کتابیں تفسیر ابن جریر وغیرہ نقل کر کے فروخت کرتا ہے' جب اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ شب و روز میں سو ورق نقل کرتا ہے۔ (۲۳)

۱۸۔ راہب نجرانی بغداد کے محلہ دار الروم میں آکر ٹھہرا تو اس نے اس سے چینی مذاہب و اہل چین کے عقائد کے متعلق معلومات فراہم کی تھیں۔ (۲۴)

۱۹۔ ابن الندیم کتابوں کا مطالعہ کرتا اور ان سے فوائد و معلومات نقل کرتا تھا (۲۵)۔ چنانچہ وہ کتاب الفہرست میں جابجا یہ لکھتا ہے کہ یہ بات میں نے فلاں کے قلم سے لکھی دیکھی اور یہ بحث فلاں کے قلم سے۔ (۲۶)

ابن الندیم کے مذکورہ بالا بیانات اس کی فنی و تخلیقی سرگرمیوں کے آئینہ دار ہیں۔

کتاب الفہرست کی نمایاں خصوصیات

اس باب میں سب سے زیادہ وقیع بیان صاحب کتاب کا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے۔

تصنیف را مصنف نیکو کند بیان۔

الفہرست مصنف کی نظر میں

ابن الندیم نے کتاب الفہرست کی خصوصیات پر آغاز کتاب میں کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"یہ الفہرست عرب و عجم کی تمام اقوام کی کتابوں کی (منتخب) فہرست ہے جو انہوں نے عربی زبان میں مختلف علوم و فنون میں یادگار چھوڑی ہیں۔

اس میں کتابوں کے نام' مصنفین کتب کے حالات' ان کے طبقات ' ان کے نام و نسب'

تاریخ ولادت، مدت حیات، وفیات، ان کے وطن، مناقب و مثالب اور ہر علم کے آغاز سے ہمارے زمانے ۳۷۷ھ تک، اس کی ترقی کا بیان ہے۔" (۲۷)

ابن الندیم کا دعویٰ تو عام ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک منتخب کتابیات ہے جس میں زیادہ تر بغداد اور اس کے بعض مشہور کتابوں کے نام اور ان پر تبصرہ ہے اور ان کے مصنفین کا مختصر تذکرہ ہے، یہ عباسی قلمرو کے تمام نامور علماء و ارباب کمال کی علمی یادگاروں کی بھی جامع نہیں، دیار مغرب کے دانشوروں کے وسیع علمی سرمایہ اور تاریخی و ثقافتی ورثہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

کتاب الفہرست

وزیر جمال الدین قفطی اور یاقوت رومی کی نظر میں

ساتویں صدی ہجری کے نامور کتاب شناس، ادیب و مورخ جمال الدین قفطی المتوفی ۶۴۲ھ نے جو علم و کتب کا شیدا و صاحب کتب خانہ بھی تھا، ابن الندیم کی تین خصوصیات کی طرف مندرجہ ذیل الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

محمد بن اسحاق ابی یعقوب، ابو الفرج المعروف بابن الندیم، کان کثیر البحث والتفتیش عن الامور القدیمۃ، کثیر الرغبۃ فی الکتب وجمعھا، و ذکر اخبار ھا و اخبار مصنفیھا۔ ومعرفۃ خطوطھا لمتقدمین۔ (۲۸)

محمد بن اسحاق ابو یعقوب ابوالفرج المعروف بابن الندیم ۱۔ کتاب و ورق سے متعلق قدیم امور کی زیادہ تحقیق و جستجو کرتا تھا۔ ۲۔ وہ کتابوں میں دلچسپی رکھتا انھیں جمع کرتا اور انکے اور مصنفین کتب کے متعلق معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا تھا۔ ۳۔ متقدمین کے نمونہائے خط کا شناساں تھا۔

جمال الدین قفطی کے معاصر وراق و کتاب شناس اور صاحب مکتبہ، مشہور ادیب و مورخ یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ نے معجم الادبا میں ابن الندیم اور اس کی کتاب الفہرست کی تین خصوصیات کی مندرجہ ذیل الفاظ میں نشاندہی کی ہے۔

ابو الفرج محمد بن اسحاق الندیم صاحب کتاب الفہرست، جودفیہ، و استوعب

استیعابا' یدل علی اطلاعه علی فنون العلم و تحققه بجمیع الکتب۔ (۲۹)

ابوالفرج محمد بن اسحاق الندیم' صاحب کتاب الفہرست نے ا۔ اس کتاب میں معلومات بہتر انداز میں پیش کی ہیں۔

۲۔ کتاب و مصنف کتاب سے متعلق تمامتر معلومات کا احاطہ کیا ہے۔

۳۔ جو انواع علوم میں اسکی کتابوں سے آگہی اور تمام کتابوں سے پختہ معلومات کی دلیل ہے۔

کتاب الفہرست' چودھویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی میں

اس کی ایک اور اہم و نمایاں صفت و خصوصیت کی طرف جیک روں نے Records of Civilization میں رہنمائی کی ہے' اس کا بیان ہے۔ :

"مجھے جب بیارڈ ڈووج نے بتایا کہ چند سال پیشتر Records of Civilization کے مصنف نے اس سے الندیم کی الفہرست کے ترجمہ کی فرمائش کی تو میں اسی لمحہ جذبہ مسرت سے معمور ہو گیا کہ یہ کڑی یہاں یقیناً اس سلسلہ کے مقصد کو نہایت موزوں طور پر پورا کرے گی' جس طرح چند دیگر کڑیاں پورا کر سکی ہیں' اس لئے کہ اس نے مختلف ثقافتوں کے مابین ایک منفرد نوع کا ربط قائم کیا ہے۔

بیسویں صدی میں یہ کام بغداد کے عرب محققین کے علمی کارناموں کے متعلق معلومات کا لب لباب ہے اور اس علم کے متعلق جو انہوں نے بڑی تعداد میں قدیم ثقافتوں خصوصاً یونانی و رومی ثقافت سے حاصل کیا تھا۔ (ا) یہ قرون وسطی کی اسلامی ثقافت اور (۲) اس دور کی علمی شخصیات کے متعلق نہایت قابل قدر معلومات ہی نہیں رکھتی بلکہ (۳) اس مستند علمی مواد کی بھی جو مسلم ثقافت کے ذریعہ مغربی دنیا تک پہنچا ہے نہایت اہم معلومات سے آراستہ ہے' اس طرح الفہرست صحیح معنی میں ثقافت کا ریکارڈ ہے۔ (۳۰)

فلوگل سے ڈووج تک ہر ایک نے ابن الندیم کو مختلف ثقافتوں کے علمی سرمایہ کے محافظ و مدون کی حیثیت سے متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست ایک ایسا کتابیاتی شاہکار ہے جس میں چوتھی صدی ہجری تک عربی زبان میں مختلف علوم و فنون میں جو کتابیں اور ترجمے ہوئے تھے ان کے نام محفوظ ہیں ترجمہ

نگاروں، محققوں، ان کے اساتذہ و شیوخ اور مکاتب فکر کا تذکرہ ایسے پسندیدہ اسلوب و علمی انداز میں پایا جاتا ہے جو حشو و زوائد سے پاک ہے۔ دست برد زمانہ سے اب تنہا یہی وہ کتابیاتی شاہکار محفوظ رہ گیا ہے، جس نے عربی ثقافت و علمی امانت کو اپنے دامن میں سمیٹ کر دوسروں تک پہنچایا اور اس دور کے جمیع انواع علوم و معارف میں علمی کارناموں کی نشاندہی کی (جن تک اس کی رسائی ہو سکی) اس لئے قدیم ثقافتوں اور اسلامی ثقافت سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ، اساتذہ، علماء مصنّفین، محققین، تذکرہ و تاریخ نگار، کتب خانہ ساز و فن کتابیات کے شیدائیوں کو اس کتاب کے بغیر چارہ نہیں، الفہرست کی یہی وہ خوبیاں ہیں جن کا سب کو اعتراف ہے، کتاب الفہرست کے مرتبین و ترجمہ نگاروں نے اس کے اصل فن کتابیات یا ماہر کتاب شناس کی حیثیت سے اس پر کچھ نہیں لکھا۔

اس دور میں جب کہ علم کتب خانہ اور فن کتاب داری اپنے ارتقائی منازل سے گزر رہی ہے اس کے کتابیاتی فن پر روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی تاکہ اسکی اصل حیثیت علمی دنیا میں اجاگر ہو سکے۔ لیکن جن ارباب علم نے اس کتاب سے اعتناء کیا وہ علم و فن کتاب داری سے عاری تھے۔ اور جنھیں اس فن سے وابستگی ہے وہ بھی اس میدان میں زور کر کے نکل گئے۔ کتاب کی فنی خصوصیات اور ابن الندیم کی فنی بصیرت پر روشنی نہیں ڈال سکے، بلاشبہ مختلف اہل علم نے ابن الندیم کو مختلف حیثیتوں سے اپنا موضوع بحث بنایا لیکن کتاب کی گوناگوں فنی خوبیوں سے بحث نہیں کی۔ علوجی نے اس سے کچھ اعتنا کیا، ہم نے اپنے تحقیقی مقالہ میں اس سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ہم نے اپنے تحقیقی مقالہ میں جس کا عنوان "اسلامی کتب خانے عہد عباسی میں" ہے۔ ابن الندیم کا ایک ماہر کتابیات و کتاب شناس اور کتابیاتی تقسیم علوم کے مرتب اول کی حیثیت سے متعارف کرانے کوشش کی ہے۔ ہم ابن الندیم کو اسکی ہزار سالہ برسی پر اسی طرح خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں کہ اس کے متعلق منتشر معلومات یکجا کریں، الفہرست کی خصوصیت پر روشنی ڈالیں تاکہ اسکی قدر و منزلت اور کتاب کی اہمیت و افادیت عوام و خواص پر عیاں ہو سکے اور اس دور میں اس سے اعتناء کے وجوہ و اسباب منظر عام پر آ سکیں۔

اس بحث سے قبل چوتھی صدی ہجری اور بعد کی چند صدیوں میں کتاب الفہرست سے عدم اعتناء کے وجوہ و اسباب پر سرسری نگاہ ڈالنا چاہئے تاکہ حقیقت حال واضح ہو سکے۔

کتاب الفہرست کے چوتھی، پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں گوشہ گمنامی کے وجوہ و اسباب

تیسری اور چوتھی صدی ہجری مسلمانوں کے علوم و فنون کی ترقی کا دور تھا۔ اس دور میں کسی عالم کی شہرت کے دو ہی ذریعہ تھے۔

۱۔ تصانیف ۲۔ تلامذہ

چنانچہ علامہ ابو الطیب عبدالواحد لغوی المتوفی ۳۵۰ھ مراتب اللغویین میں رقمطراز ہیں:

انما شہرۃ العالم بمصنفاتہ والروایۃ عنہ۔ (۳۱)

ایک عالم کی شہرت اس کی تصانیف اور اس سے روایت کرنے والوں سے ہے۔

اسی لئے محدثین نے کتابیات مرتبہ کرنا شروع کر دی تھیں، ان میں سے جو ہم تک پہنچی ہیں ان کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ عالم خود اپنی تالیفات پر کوئی کتاب یا رسالہ لکھتا اور اس میں اپنی مولفات و تصانیف کو نام بنام گناتا۔

۲۔ کوئی عالم کسی دوسرے عالم کی تالیفات پر کوئی رسالہ یا کتاب لکھتا اور اس میں اسکی زمانہ تالیف کتاب تک تصنیفات و تالیفات کو نام بنام شمار کراتا۔

۳۔ مولف اپنی تالیفات کے نام اپنے کسی "اجازہ" میں جو اس سے اجازت حدیث چاہتا لکھتا تھا۔

عہد عباسی میں کتابیات کے مذکورہ بالا اقسام ثلاثہ کا عام رواج تھا اور اس قسم کی کتابیات اس کثرت سے تیار کی گئی تھیں کہ ان کا شمار حیطۂ بیان سے باہر ہے۔

نوع اول کی کتابیات میں اسماء مولفات ابن ابی الدنیا (عبداللہ بن محمد قرشی المتوفی ۲۸۱ھ : ۱۸۹۴ء) کا ایک مخطوطہ فہرست کتب خانہ ظاہریہ دمشق میں محفوظ ہے جس کا مجموعہ نمبر ۴۲ ہے۔ یہ فہرست (۵۷ ۔ ۵۹) یعنی تین صفحات پر مشتمل ہے اس کا نام اسماء مصنفات ابی بکر عبداللہ بن محمد بن عبید بن ابی الدنیا علی حروف المعجم ہے۔ یہ حروف ہجا پر مرتب ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے (۳۲) ۔ فہرس کتب محمد بن زکریا الرازی المتوفی ۳۱۳ھ للبیرونی، المتوفی ۴۲۷ھ ہے (۳۳) شیخ

الاسلام قاضی ابوالعباس احمد بن عمر بن سریج بغدادی شافعی (۲۴۹-۳۰۶ھ) : ۸۶۲ - ۹۱۸ء) کی کتابیات ان کی چار سو تصانیف پر مشتمل تھی۔ (۳۴)

دارالخلافہ بغداد میں تیسری صدی ہجری میں ہر موضوع پر موضوعی کتابیات کی ترتیب و تدوین شروع ہو چکی تھی چنانچہ یعقوب بن اسحاق کندی المتوفی (۲۶۰ھ - ۸۷۷ء) کی موضوعی کتابیات اٹھارہ موضوعات اور (۲۳۶) دو سو چھتیس کتابوں پر مشتمل تھی (ابن الندیم ص ۳۵۸ - ۳۶۵)۔

موضوعی کتابیات ارباب فن اور نامور اہل علم سے تیار کرائی جاتیں، چنانچہ حنین بن اسحاق (۱۹۴ - ۲۶۰ھ : ۸۱۰ - ۸۷۳ء) نے علی بن یحیی کے لئے جالینوس کی کتابیات (فہرست تالیف جالینوس) مرتب کی تھی، اس کے مطالعہ کی روشنی میں ابن الندیم نے یہ کہا ہے کہ حنین کے بیشتر ترجمے سریانی زبان میں تھے، یہ (اس کی خوش قسمتی ہے کہ جیش اعم اور قیس بن یحیی نے جن کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے وہ بھی حنین سے منسوب کی گئی ہیں (ابن الندیم، ص ۴۰۳) ابوبکر محمد رازی المتوفی ۳۳۱ھ نے اس کتابیات پر استدراک "کتاب فی استدراک مالم یذکرہ حنین ولا جالینوس فی فہرستہ لکھا تھا (ابن الندیم، ص ۳۱۷)۔

یحیی بن عدی المتوفی ۳۶۴ھ نے ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) کی تصانیف اور ان کی شروح پر مشتمل فہرست کتب ارسطاطالیس" مرتب کی تھی۔ ابن الندیم نے یہ کتابیات یحیی کے قلم سے لکھی ہوئی تھی (ابن الندیم، ص ۳۵۱ - ۳۵۲)۔

فہرست اسماء الخطباء و البلغاء۔ یہ ابو علی ابن مقلد المتوفی ۳۲۸ھ نے طبقات پر مرتب کی تھی، یہ ابن مقلد کے ہاتھ کی لکھی ہوئی فہرست، ابن الندیم کی نظر سے گزری تھی، اسی ترتیب سے اس نے اسے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے (ابن الندیم، ص ۱۸۱ - ۱۸۲)۔

مورخ ہشام کلبی المتوفی ۲۰۶ ھ اور مدائنی المتوفی ۲۱۵ھ کی موضوعی فہرست بخط ابوالحسن بن الکوفی المتوفی ۳۴۸ھ کو بھی اسی ترتیب و عنوانات کے ساتھ الفہرست کی زینت بنایا (ابن الندیم، ص ۱۴۰ - ۱۴۳، ۱۴۷ - ۱۵۲)۔

تیسری صدی ہجری کے اوائل میں مصنفین کی موضوعی اور عام ہر دو قسم کی کتابیات تیار کئے جانے کا رواج ہو گیا تھا چنانچہ جابر بن حیان المتوفی ۲۰۰ھ کے نامور شاگرد خرقی کی تصانیف کی

دو فہرستیں تیار کی گئی تھیں ایک فہرست کبیر (Comprehensive) جو کیمیا اور دوسرے موضوعات پر مشتمل تھی اور دوسری فہرست صغیر (Abridge) جو صرف علم کیمیا کی کتابوں پر محیط تھی (ابن الندیم، ص ۵۰۰)۔

فرقہ جاتی کتابیات بھی مرتب کی جانے لگی تھیں، شیعی علماء و محدثین بھی اپنے اساتذہ کی کتابوں کی کتابیات مرتب کرتے رہتے تھے، چنانچہ ابو القاسم جعفر بن محمد بن قولویہ قمی المتوفی ۳۶۸ھ نے کتابیات مرتب کی تھی جس کا نام فہرست ما رواہ من الکتب والاصول تھا (ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی، الفہرست تحقیق محمد صادق، ط: ۲، النجف، المطبعہ الحیدریہ، ۱۳۸۰ھ، ص ۴۲ نمبر ۱۴۱)۔

۱۔ ابوالقاسم سعد بن عبداللہ قمی المتوفی ۳۰۱ھ نے فہرست کتاب ما رواہ لکھی تھی (الطوسی ص ۱۰۱ نمبر ۳۱۸)۔

۲۔ ابوالعباس عبداللہ بن جعفر حمیری قمی المتوفی بعد ۲۹۷ نے الفہرست کے نام سے کتابیات تیار کی تھی (الطوسی، ص ۱۲۸ نمبر ۴۴۱)۔

۳۔ ابو علی محمد بن احمد کاتب اسکافی المعروف بابن الجنید المتوفی ۳۸۱ھ نے فہرست کتب صنفھا باباً باباً مرتب کی تھی (الطوسی ص ۱۶۰ نمبر ۵۹۰)۔

ابوالحسن علی بن عدی شمشاطی جزری جو چوتھی صدی ہجری کا شاعر تھا، اس کی تصانیف کی ایک فہرست ابو نصر ریان نے اور دوسری فہرست ابو الخیر سلامہ بن زکریا موصلی نے تیار کی تھی (آغا بزرگ طہرانی، الذریعہ الی تصانیف الشیعہ ۱۶، ص ۳۷۶ و ۳۹۴، دانش پژدہ، گنجور د برنامہ او، ھنرو مردم، شمار ۱۲۶، (فروردیں، ۱۳۵۲ف، ص ۹۴۔

چوتھی صدی ہجری میں تذکرہ و تاریخ کی کتابوں میں علماء کی اہم و علمی تصانیف کو ذکر کیا جانے لگا تھا۔ اس دور میں ابن الندیم کی کتاب الفہرست کو جو صحیح معنی میں کسی ایک مصنف کی جملہ تصانیف کے احاطہ سے بھی قاصر تھی۔ (۳۵) ان کے علمی دربار میں کیونکہ بار پاسکتی تھی، وہ علماء فن داں تھے، ان کے حافظے نہایت قوی تھے، فنون سے متعلق تمامتر مواد، ان کے حافظوں میں محفوظ تھا، وہ اسلاف کے علمی سرمایہ کے پاسبان و قدرداں اور قدماء و اساتذہ کی تصانیف کے شناساں و نکتہ داں تھے، ان کی تالیفات و تصنیفات کے راوی تھے، ان کے علمی و تحقیقی کارناموں

اور ان پر تنقیدات سے طلبہ کو آگاہ رکھتے تھے' ان کی کتابوں اور تصانیف کی تصحیح کراتے اور تلامذہ کو سند دیتے تھے' وہ ارباب فن اپنے معاصرین و اساتذہ کے علمی کارناموں سے ابن الندیم کی بنسبت زیادہ علم رکھتے تھے۔

الفہرست میں شناخت کتب خانہ کے رہنما اصول

ابن الندیم نے دوسری' تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں شناخت کتب خانہ کے رہنما اصول کی طرف بھی اشارے کئے جن میں بعض صریح ہیں جہاں خزانہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بعض کتابیں غیر صریح ہیں جنھیں ہم نے کتاب الفہرست کے مطالعہ اور تتبع و استقراء سے معلوم کیا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جو شخص کتابیں جمع کرتا اور کتب خانہ بناتا تھا اس کے لئے جماعة الکتب (۳۶) کا لفظ بولا جاتا تھا۔ یعنی وہ کثرت سے کتابیں جمع کرتا ہے اس کے ذاتی کتب خانے میں بہت کتابیں ہیں لیکن اس میں نفیس نسخے کم ہیں۔

۲۔ بعض اشخاص صرف نفیس کتابیں کثرت سے جمع کرتے تھے ان کا کتب خانہ اہم سمجھا جاتا تھا۔ ایسے عالم شخص کے ذخیرہ کے متعلق تذکرہ میں "النفیسہ" کی صفت کا اضافہ کیا جاتا تھا چنانچہ ابن الندیم' ابو سعید وہب بن ابراہیم کے متعلق رقمطراز ہے:

کان فاضلا ادیبا جماعة الکتب النفیسة (۳۷)

وہ فاضل و ادیب تھا اور بکثرت نفیس کتابیں جمع کرتا تھا۔

۳۔ محمد بن الحسن المعروف بابن ․عرة کی نسبت لکھتا ہے۔

کان جماعة الکتب له خزانة لم ار لاحد مثلها کثرة۔ (۳۸)

ابن ابی ․عرة کتابیں جمع کرنے کا شوقین تھا اس کے جیسا کثیر و نادر کتابوں کا ذخیرہ میں نے کسی کے پاس نہیں دیکھا (اپنی معلومات کی حد تک)

۴۔ ابن الندیم کا کسی کے متعلق یہ لکھنا کہ وہ خود کتابیں تیار کرتا لکھتا' نقل کرتا اور کراتا تھا اس کے پاس کتب خانہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے چنانچہ وہ ابو حسان حسن بن عثمان زیادی کے بارے میں لکھتا ہے۔

كان قاضيا فاضلا اديبا ... جوادا كريما يعمل الكتب و تعمل له وكانت له خزانة حسنة كبيرة۔ (۳۹)

وہ قاضی ، فاضل ، ادیب ، سخی ، کریم تھا وہ خود بھی کتابیں تیار کرتا اور اس کے لئے بھی کتابیں تیار کی جاتی تھیں اس کے پاس عمدہ اور بڑا کتب خانہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ عہد عباسی میں کتب خانہ بنا کر چھوڑ دیا جاتا تھا بلکہ اس کا ذخیرہ بڑھانے کی برابر کوشش کی جاتی تھی'

۵۔ کسی کے کتب خانے کے لئے ایسے خازن (ناظم کتب خانہ) کا انتخاب کیا جاتا جو کتابوں کا شوقین اور ذاتی کتب خانہ رکھتا ہو ظاہر ہے کتب خانے کے نشیب و فراز کا اس سے بڑھ کر جاننے والا کون ہو سکتا ہے۔ یہ بہتر سے بہتر کتب خانہ بنائے گا۔ چنانچہ خلیفہ متوکل کے وزیر فتح بن خاقان نے اپنے کتب خانے کی ذخیرہ سازی اور تنظیم و ترتیب کے لئے ابو الحسن علی بن منجم کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے نہایت عظیم الشان اور نوادر پر مشتمل کتب خانہ ترتیب دیا تھا چنانچہ ابن الندیم لکھتا ہے۔

كان له خزانة جمعها على بن يحيى المنجم لم نر اعظم منها كثرة و حسنا۔ (۴۰)

فتح بن خاقان کا خزانہ کتب علی بن یحیی منجم نے جمع کیا تھا سر زمین بغداد میں ادیبوں کے کتب خانوں میں اس سے زیادہ عمدہ ذخیرہ نہیں دیکھا گیا۔

۶۔ کسی عالم کا ذخیرہ کتب خریدنا بھی کتب خانہ رکھنے کی دلیل سمجھا جاتا تھا چنانچہ نامور فقیہ و مورخ عمر بن شابہ بصری المتوفی ۲۶۲ھ کا کتب خانہ سر من رای میں تھا اس کے انتقال کے بعد ابو الحسن علی بن یحیی منجم نے موصوف کے فرزند ابو طاہر سے وہ ذخیرہ کتب خریدا۔ (۴۱) جو علی بن یحیی منجم کے پاس کتب خانہ ہونے کا نہایت بین ثبوت ہے۔

۷۔ کتابیں عاریہ لینے دینے والے ہر دو فریق کے پاس کتب خانہ ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ ابو عمرو شیبانی (۹۴ ۔ ۲۰۶ ھ : ۷۱۳ ۔ ۸۲۱ء) اور ابن السکیت (یعقوب بن اسحاق ۱۸۶ ۔ ۲۴۴ ھ : ۸۰۲ ۔ ۸۵۸ء) دونوں کے پاس کتب خانہ تھا۔ (۴۲)

۸۔ صاحب کتب خانہ کا اپنے کتب خانے کی کسی کے حق میں وصیت کرنا بھی موصی لہ (جس

کے حق میں وصیت کی گئی ہے) کتب خانہ ہونے کی نشانی تھا اور ہے۔ (۴۳)

۹۔ اسی طرح کسی عالم کا اپنے ذخیرہ کتب کو محو کرنے (دھونے یا ہوا میں اڑانے) یا جلانے کے لئے کہنا بھی اس کے پاس کتب خانہ ہونے کا واضح ثبوت تھا' چنانچہ سفیان ثوری (۹۷ - ۱۶۱ھ : ۷۱۶ - ۷۷۸ء) کا ذخیرہ کتب اسی طرح برباد ہوا تھا۔ (۴۴)

۱۰۔ اسی طرح کسی نامور مصنف کی تصانیف کا راوی ہونا اور ان کی تصانیف کا ذخیرہ اپنے پاس رکھنا بھی اس کے صاحب کتب خانہ ہونے کی دلیل تھا۔ (۴۵)

۱۱۔ اپنے پاس وراق اور کاتب رکھنا بھی کتب خانہ رکھنے کا شاھد تھا۔ (۴۶)

کتاب الفھرست میں بہترین کتب خانے کی شناخت کے چند بنیادی اصول

عہد عباسی میں بہترین کتب خانہ وہ سمجھا جاتا تھا جو حسب ذیل ایسے بنیادی امور کا جامع ہوتا تھا جن کی طرف ابن الندیم نے اشارے کئے ہیں:

ا۔ وہ کتب خانہ جس میں اصل' منفرد و یکتا نسخے رکھنے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔

ب۔ وہ کتب خانہ جس میں ایسی کتابیں محفوظ کی جاتی تھیں جو نامور علماء کے زیر مطالعہ رہی تھیں۔

ج۔ وہ کتب خانہ جس میں ایسی کتابیں جن پر نامور علماء کے حواشی اور تصحیحات ہوتی تھیں۔

د۔ وہ کتب خانہ جس میں وہ کتابیں رکھی جاتی تھیں جو اہل علم کی ملکیت میں رہتی ہیں۔

ہ۔ وہ کتب خانہ جس میں ایسی کتابیں جمع کی جاتی تھیں جن پر انکی تصدیق ثبت ہوتی تھیں۔

مذکورہ بالا صفات کا جو کتب خانہ جامع ہوتا تھا اسے بہترین کتب خانہ سمجھا جاتا تھا اور آج بھی اسے بہترین کتب خانہ قرار دیا جاتا ہے چنانچہ ابو الحسن عبدالعزیز بن ابراہیم حاجب نعمان کے پاس اسی قسم کا کتب خانہ تھا۔ چنانچہ ابن الندیم کا بیان ہے۔

لم یشاهد خزانة للكتب احسن من خزانته لانها كانت تحتوى على كل كتاب عين و ديوان فرد بخطوط العلماء النسوبة (۴۷)

اس کے کتب خانے سے بہتر کتب خانہ مشاہدہ میں نہیں آیا اس لئے کہ یہ اصل نسخہ کا

جامع تھا اور نامور علماء کی تحریروں اور دستخط والے نسخوں پر مشتمل تھا۔

کتاب الفہرست میں کتابوں کے ذخیروں کے ناپ تول کے پیمانوں کی طرف رہنمائی

اوائل عہد عباسی، دوسری تیسری صدی ہجری میں ذاتی کتب خانوں میں کتابیں زیادہ تر قمطروں (بوروں) میں رکھی جاتی تھیں، سفر اونٹوں پر کیا جاتا تھا۔ قمطر لیجانے میں زیادہ تر زحمت نہیں ہوتی تھی نقل مکانی اور حمل و نقل میں انھیں اس سے سہولت ہوتی تھی اس دور میں بار شتر معیار تھا اس لئے کتابوں کی ناپ تول قمطر کبیر سے یا چھوٹے قمطروں سے جو بار شتر پر مشتمل ہوتا تھا کی جاتی تھی اور اس کے لئے عدل بعید، وقدر بعید، حمل یا حمل جمل (ایک بار شتر) کے الفاظ بولے اور لکھے جاتے تھے۔ اس دور میں کتابوں کی پیائش اور ناپ تول کے یہی پیمانے تھے۔

اس زمانہ میں جن اہل علم کے پاس علمی ذخیرہ اور کتب خانہ ہوتا تھا وہ کتابوں کی نقل اور ذخائر کتب میں اضافہ کی خاطر وراق کاتب رکھتے تھے، چنانچہ محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ - ۲۰۷ : ۷۴۷ - ۸۲۳ء) نے "ہزار دینار کی کتابیں خرید کر اپنے کتب خانہ کی بنیاد رکھی تو دو غلام شب و روز نقل کتب پر مامور کئے تھے۔ انتقال کے وقت اس نے چھ سو قمطر کتابیں چھوڑی تھیں۔ ایک قمطر کا وزن اتنا تھا کہ اسے دو مرد اٹھاتے تھے۔ (۴۸) یہ ایک بار شتر کے برابر ہوتا تھا۔

ایک بار شتر کتابیں ایک نامور عالم و استاد ایک سال میں اپنے تلمیذ کو قلمبند کراتا تھا جیسا کہ امام محمد شیبانی نے امام شافعی کو لکھوایا تھا۔ (۴۹)

الفہرست میں ذخائر کتب میں اضافے کے تین اہم ذرائع کی نشاندہی

عہد عباسی میں کتابوں کے ذخیروں میں اضافہ عموماً حسب ذیل تین اہم ذرائع سے کیا جاتا تھا۔

ا۔ سوق الوراقین سے کتابیں خریدی جاتی تھیں۔

ب۔ کتب خانہ میں وراق وکاتب، نقل کتب پر مامور کئے جاتے تھے جو رات دن یہی کام کرتے تھے۔

ج۔ اساتذہ اپنے تلامذہ کو کئی بار شتر کتابیں املاء کرا کر کتابوں کی اشاعت کر کے، نظر ثانی شدہ

تازہ نسخے شاگردوں کو لکھوا کر کتابوں کا ذخیرہ بڑھاتے رہتے تھے' چنانچہ ابو عبداللہ محمد بن زیاد اعرابی (۱۵۰۔ ۲۲۵ھ) کی مجلس درس کے متعلق ابو العباس ثعلب کا بیان ہے کہ اسکی مجلس املاء و درس میں بیک وقت سو طلبہ شرکت کرتے تھے اور وہ ان اہل علم کو کئی بار شتر علم لکھاتا تھا۔ (۵۰)

ابن الندیم کی نظر میں ذاتی کتب خانوں کے ذخائر کا معیار

دوسری' تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں کسی کے پاس کم از کم ایک بار شتر کتابیں ذاتی کتب خانے کے لئے کافی سمجھی جاتی تھیں۔ امام محمد بن ادریس شافعی (۱۵۰ھ ۔ ۲۰۴ ھ : ۷۶۷ ۔ ۸۲۰ء) کا قیام امام محمد بن حسن شیبانی (۱۳۱ ۔ ۱۸۹ھ : ۷۴۸ ۔ ۸۰۴ء) کی خدمت میں ایک سال رہا اس مدت میں امام شافعی نے موصوف سے ایک بار شتر تقریباً دو سو پچاس کلو کتابیں لکھی تھیں۔ (۵۱)

مذکورہ بالا امور کتاب الفہرست کی نمایاں خصوصیات اور ان کی روشن دلیلیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد بن اسحاق بن الندیم' الفہرست' مصر' المطبعہ الرحمانیہ' ص ۱۲۹

۲۔ ابن الندیم ص ۱۹۰

۳۔ ایضاً' ص ۳۰۷

۴۔ ایضاً' ص ۳۶۹

۵۔ ایضاً' ص ۴۹۰

۶۔ ابن الندیم' ۲۷۴

۷۔ ایضاً' ص ۲۴۰

۸۔ ابن حجر العسقلانی' لسان المیزان' حیدر آباد الدکن' مجلس دائرۃ المعارف انتظامیہ ۱۳۲۹ھ' ۷۲/۵

۹۔ ابن الندیم' ص ۸

۱۰۔ ایضاً، ۱۷۳

۱۱۔ الفہرست، ص ۱۹۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۳

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۱۷۔ ابن الندیم، ص ۲۲۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۱۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۲۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۴۲

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۲۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۳۶۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۹۰

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۳۱، ۳۳۴

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۰، ۱۷، ۱۳۷، ۱۴۰، ۱۴۴، ۱۴۷، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۷۵، ۲۱۸، ۳۲۷، ۳۴۹، ۴۳۰۔

۲۷۔ ابن الندیم، ص ۱

۲۸۔ جمال الدین القفطی، انباء الرواۃ علی انباہ النحاۃ تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم، القاہرہ، دارالفکر العربی، ۱۴۰۶ھ، ج ۱/۴۲

۲۹۔ یاقوت الرومی معجم الادباء، مصر، مطبعہ ہندیہ، ۱۹۳۰ء، ج ۶/۴۰۸

۳۰۔ Al - Nadim. the fihrist of al - nadim a tenth Century Survey of Muslim Culture

ج ا ص ٦، ۱۹۷۰ء، پریس نیویارک۔

۳۱۔ عبدالواحد اللغوی، مراتب النحویین، القاہرہ، مکتبہ نہضتہ مصر، ۱۳۷۵ھ، ص ۴۹

۳۲۔ صلاح الدین المنجد، قواعد الفہرست المخطوطات العربیہ، بیروت: دارالکتاب العربی، ۱۹۷۰ء، ص ۳۱۔

۳۳۔ محمد بن احمد ابو ریحان البیرونی، الاثار الباقیہ عن القرون الخالیہ تحقیق سخاء، لپزک ۱۹۲۳ء، ص ۳۸ و ۴۰ و ۴۷۔

۳۴۔ شمس الدین محمد الذہبی، تذکرہ الحفاظ، ٦ : ۳ حیدر آباد دکن مجلس دائرہ المعارف العثمانیہ، ۱۳۷٦ھ، ج ۳ ص ۸۱۲

۳۵۔ مثلاً ابن الندیم نے کتاب الفہرست ص ۳۲۲ میں علی بن المدینی کا تذکرہ کیا اور ان کی تالیفات میں صرف سات کتابیں شمار کرائی ہیں، ابن الندیم کے معاصر ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری المتوفی ۴۰۵ھ نے معرفہ علوم الحدیث (القاہرہ، دارالکتب المصریہ، ۱۹۳۷ء ص ۷۱ و ۷۲) ہیں اپنے شیخ قاضی القضاۃ ابو الحسن محمد بن صالح ہاشمی سے ان کی تصانیف کی جو فہرست نقل کی ہے وہ انتیس کتابوں پر مشتمل ہے پھر لکھا ہے:

- انما اقتصر نا علی فہرست مصنفاتہ فی ھذا الموضوع لیستدل بہ علی تبحرہ و تقدمہ و کمالہ۔
- ہم نے اس مقام پر ان کی فہرست تصانیف پر اختصار کیا ہے جو ان کے کمال علمی اور فن میں برتری کی دلیل ہے۔
- اس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں کتابیات مرتب کرنا مختلف علوم و فنون میں تالیفات کی کثرت اہل علم کے علوم میں تبحروفن میں برتری کی دلیل سمجھی جاتی تھی اس لئے علماء کثرت سے علمی کتابیں لکھتے اور علوم و کتب کی اشاعت میں سرگرم عمل رہ کر ذخائر کتب میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔

۳٦۔ الندیم، ص ۱۱۷ و ۱۱۸

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۳۸۔ ایضاً، ص ۱٦۰

۳۹۔ ایضاً، ص ۱٦۰

۴۰۔ ابن الندیم، ص ۱٦۹

۴۱۔ ایضاً، ص ٦۹ و ۹۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۱۵

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۴٦۔ ایضاً، ص ۲۹۷

۴۷۔ ابن الندیم، ص ۱۹۳

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۲۹۵

۵۰۔ ابن الندیم، ص ۱۰۳

۵۱۔ ایضاً، ۱٦۲۔

پاکستان کا ایک محقق لغوی اور نامور محدث

حسن بن محمد الصغانی اللاہوریؒ

(ماہنامہ معارف، جنوری– ستمبر 1959ء)

مقالات

پاکستان کا ایک محقق لغوی اور نامور محدّث

حسن بن محمد الصّغانی اللاہوری

از
مولانا محمد عبدالحلیم چشتی فاضل دیوبند

امام حسن صغانی لاہوری کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، لیکن ان کے حالات زندگی اس قدر کم معلوم ہیں کہ تشنگان ذوق کے لب بھی تر نہیں ہو سکتے، اس پایہ کا محقق لغوی، ادیب، شاعر، مورخ و فقیہ، محدث و نسّاب، سیاست داں اور سیاح اگر کہیں مصر یا اندلس میں پیدا ہوتا تو اس کثرت سے اس کی سوانح عمریاں لکھی جاتیں کہ اس کی تصویر کا ایک ایک خد و خال آنکھوں کے سامنے آجاتا لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی ارباب تذکرہ بیس پچیس سطروں سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے، ہمارے تذکرہ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب جمع کر دیا جائے تب بھی ان کی زندگی کا کوئی پہلو نمایاں ہو کر نظر نہیں آتا، جبقدر تذکرے ہیں، سب ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں اور وہی چند واقعات ہیں جن کو بہ اختلاف الفاظ سب نقل کرتے آئے ہیں۔

شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ نے تاریخ الاسلام میں صغانی کا جو تذکرہ لکھا ہے

عموماً وہی تذکرہ نویسوں کی معلومات کا ماخذ رہا ہے، ابتدائی حالات چونکہ انھوں نے کچھ بہم نہیں پہنچائے، یہی وجہ ہے کہ تمام تذکرے اس باب میں یکسر خاموش ہیں،

علامہ ذہبی سے پہلے ان کے استاذ اور نامور حافظ الحدیث شرف الدین ابو محمد عبدالمومن الدمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ نے اپنے استاد حسن صغانی کی لائف لکھی تھی، جس کا تذکرہ شمس الدین السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ نے الجواہر و الدرر فی ترجمۃ شیخ الاسلام ابن حجر میں کیا ہے، مگر ہمیں اس کا پتہ مشہور مستشرق روزنتھال (Rosenthal) کی کتاب A History of Muslim Historiography سے چلا، جب یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں لندن سے شائع ہو کر پاکستان آئی تو ہماری نظر سے بھی گذری،

ہم نے مستشرق موصوف کو خط لکھا کہ ہم صغانی کی سوانح حیات پر کام کر رہے ہیں، اگر آپ کو اس نسخہ کا کہیں پتہ چلا ہو تو ہمیں مطلع فرمائیں، موصوف نے لکھا

مع الاسف لا توجد نسخة من اخبار الصغانی فی مکاتب الشرق والغرب فیما اظن وعسی ان توجد نسخة منها فی المستقبل

ہمیں اس کا اب تک سراغ نہیں مل سکا، امام حسن صغانی کی تصانیف میں جابجا واقعات کے جو اشارے ملے ہیں، اور ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے وہ نذر احباب ہے۔

حسن نام، ابو الفضائل[1] کنیت اور رضی الدین لقب تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:

[1] صغانی کے تذکرہ نگاروں میں سے اسماعیل پاشا نے ہدیۃ العارفین (طبع استنبول ۱۹۵۱ء ج ۱ کالم نمبر ۲۸۱) میں ابو الفضائل کے بجائے ابو العباس کنیت ذکر کی ہے، جو صحیح نہیں، ابو العباس جن کی کنیت ہے ان کا نام فضل بن عباس بن یحییٰ بن الحسین الصاغانی ہے جو خطیب بغدادی کے استاد اور نہایت بلند پایہ محدث تھے۔ فن حدیث وغیرہ میں متعدد تالیفات انکی یادگار ہیں۔

حسن بن محمد بن الحسن بن حیدر بن علی[1] بن اسماعیل القرشی العدوی العمری الحنفی الصغانی اللاہوری، ابن ابی الوفا نے الجواہر المضیہ میں تصریح کی ہے کہ آپ نسباً فاروقی تھے، اسی نسبت سے العمری لکھتے تھے۔[2]

[1] ارباب تذکرہ میں سے ابن الفوطی البغدادی، شمس الدین الذہبی، قاسم بن قطلوبغا الحنفی، جلال الدین السیوطی، ابن شاکر الکتبی، مورخ کفوی، ابو رافع محمد السلمی، ابن العماد الحنبلی، ابن تغری بردی، سید مرتضیٰ زبیدی، محمد باقر الخوانساری، آزاد بلگرامی، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور حکیم عبدالحئی لکھنوی نے صغانی کا سلسلۂ نسب اتنا ہی لکھا ہے یاقوت حموی، نواب صدیق حسن خاں قنوجی اور مولوی رحمان علی نے اور بھی اختصار و اجمال سے کام لیا ہے، لیکن محدث عبدالقادر القرشی الحنفی المتوفی ۷۷۵ھ نے الجواہر المضیہ (طبع حیدرآباد دکن ۱۳۳۲ھ ج ۱ ص ۲۰۱) میں اور ڈاکٹر ہفنر (Haffner) نے کتاب الاضداد (طبع بیروت ۱۹۱۲ء) کے مقدمہ میں علی کے بعد اسماعیل کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے۔

صغانی کی مشہور کتاب، الاضداد کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ پیر جھنڈو سندھ (ضیاء الدین مرحوم) میں ہماری نظر سے گذرا ہے، یہ نسخہ غالباً دسویں صدی ہجری سے قبل کا لکھا ہوا ہے، اس کے سرورق پر امام صغانی کا نہایت مختصر تذکرہ بھی منقول ہے، اس میں بھی موصوف کا سلسلۂ نسب اتنا ہی مذکور ہے جس کے الفاظ یہ ہیں

کتاب الاضداد من تالیف الشیخ الامام العلامة الفقیه المحدث اللغوی ابی الفضائل الحسن بن محمد بن الحسن بن حیدر بن علی بن اسمٰعیل القرشی العدوی الخ

خود امام صغانی نے بھی العباب کے مقدمہ میں اپنا سلسلۂ نسب اس سے زیادہ نقل نہیں کیا ہے، لکھتے ہیں:

قال الملتجی الی حرم اللہ تعالیٰ الحسن بن محمد بن الحسن بن حیدر بن علی بن اسمٰعیل العمری ثم الصغانی الخ

العباب الزاخر کا مقدمہ ہمارے کرم فرما ہندوستان اور پاکستان کے نہایت نامور محقق لغوی اور ادیب مولانا عبدالعزیز صاحب میمنی نے استنبول کے کتبخانہ سے نقل کیا تھا، اسکی نقل ہم نے بھی موصوف سے حاصل کی ہے جس کے ہم نہایت ممنون ہیں۔

[2] ملاحظہ ہو الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ، طبع حیدرآباد دکن ۱۳۳۲ھ ج ۱ ص ۲۰۱

الصغانی۔ صغانیان کی طرف نسبت ہے۔ اہل عرب دریائے وخش (جسے اب سرخ آب کہتے ہیں) کے مغربی اور دریائے جیحون کے جنوبی علاقہ کو صغانیان کہتے ہیں، یہی علاقہ جسے اہل عجم چغانیان کے نام سے پکارتے ہیں، اس علاقہ کے مشرقی حصہ کو قبادیاں بولتے ہیں، صغانیاں وہ شہر ہے جسے اب سرآسیا کہتے ہیں، یہ دریائے صغانیان کے بالائی حصہ پر واقع ہے۔

مجد الدین فیروز آبادی جو صغانی کے بدو واسطہ شاگرد ہیں، القاموس المحیط (مادہ صغن) میں لکھتے ہیں:

> صغانیاں ماوراء النہر میں ایک بڑا ملک تھا، اس کی طرف امام لغت الحسن بن محمد بن الحسن صاحب التصانیف منسوب ہیں، اس کی طرف نسبت میں صغانی اور صاغانی دونوں طرح بولتے ہیں۔

سید مرتضی زبیدی، تاج العروس شرح القاموس میں تحریر فرماتے ہیں:

> میں نے العباب اور التکملہ میں امام صغانی کے قلم سے لکھا ہوا دیکھا ہے، وہ اپنی نسبت ہر جگہ یہی لکھتے ہیں "یقول محمد بن الحسن الصغانی" بلا الف ذکر بالالف (تعجب ہے کہ امام صغانی کا نام حسن بن محمد بن الحسن ہے، پھر وہ محمد بن الحسن کیونکر لکھ سکتے تھے، معلوم ہوتا ہے سید مرتضی زبیدی سے نقل میں حسن کا لفظ رہ گیا ہے، یا تقدم و تاخر ہوگیا ہے) صاحب القاموس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ نسبت میں صغانی اور صاغانی دونوں طرح جائز ہے، جس کی طرف نسبت ہے وہ جگہ ایک ہی ہے، اور اسی پر میرا عمل ہے، چنانچہ میں کبھی قال الصغانی اور کبھی قال الصاغانی لکھتا ہوں۔

سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ (کراچی) کے کتب خانہ میں حسن صغانی کی کتاب مجمع البحرین کا جو روٹوگراف (Rotograph) ہمارے مطالعہ سے گذرا ہے،

اس میں مادہ صغن کے تحت صغانی رقمطراز ہیں:

صغن اهمله الجوهری والصغانة مثال سحابة من الملاهی معروف وهی معربة چغانه ومحمد بن اسحٰق الصغانی من ثقاة المحدثین وغیره من الصغانیین منسوبون الی بلد یسمی چغانیان بماوراء النهر کثیر الخیر مخصب فی کل دار من دورهم ماء جار، قال البشاری به ستة عشر الف قریة فابدلت الجیم صادا کقولهم الجص واصله کچ والصنج واصله چنگ

لفظ صغن کو جوہری نے صحاح میں چھوڑ دیا ہے، صغانہ بروزن سحابہ، یہ آلات سرود میں سے ایک مشہور آلہ ہے، صغانہ چغانہ کا معرب ہے۔ اور ثقاۃ محدثین میں سے محمد بن اسحٰق الصغانی وغیرہ صغانیان کے باشندے ہیں اور اسی شہر کی طرف منسوب ہیں جو ماوراء النہر میں چغانیان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ نہایت سرسبز و شاداب مقام ہے، یہاں ہر گھر میں چشمہ بہتا ہے، بشاری کا بیان ہے یہاں چھوٹی چھوٹی سولہ ہزار بستیاں تھیں، چغانیان میں جیم کو صاد سے بدلا گیا ہے، جیسے اہل عرب کے قول جص میں کہ اسکی اصل کچ تھی اور صنج میں کہ اسکی اصل چنگ تھی۔

صغانی کے اس جملہ "محمد بن اسحٰق الصغانی من ثقاة المحدثین وغیرہ من الصغانیین منسوبون الی بلد یسمی چغانیان" سے ثابت ہوتا ہے کہ موصوف کا آبائی وطن چغانیان تھا۔

فابدلت الجیم صادا سے صغانی نے اس قاعدہ کو بتایا ہے کہ اہل عرب کاف فارسی کو

جیم سے اور جیم فارسی کو صاد سے بدلتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر وہ کلمہ جس میں صاد اور جیم جمع ہو جائیں، وہ معرب ہوتا ہے، کیونکہ صاد اور جیم عربی الاصل کلمہ میں جمع نہیں ہوتے ہیں۔

مذکورۂ بالا بیان سے پتہ چلتا ہے کہ چنانہ اور چنگ بھی چغانیوں کی ایجاد ہے۔

سنہ ولادت: حسن صغانی کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے، شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں:

ولد بمدینة لوهور فی عاشر	صغانی دس صفر ۵۷۷ھ کو شہر
صفر سنة سبع وسبعین	لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔
وخمس مائة[1]	

عبد القادر القرشی نے الجواہر المضیئہ[2] میں یہی سال ولادت نقل کیا ہے، مگر یوم ولادت روز چہار شنبہ بتایا ہے، الاعلام الاخیار میں مورخ کفوی نے تاریخ پیدائش ۱۰ صفر کے بجائے ۱۵ صفر قرار دی ہے[3]۔

یہی سال ولادت ابن شاکر الکتبی، ابو رافع السلامی، طاش کبری زادہ، سیوطی، کفوی، آزاد بلگرامی، سید صدیق حسن خاں قنوجی، مولانا عبد الحی فرنگی محلی، الخوانساری، ڈاکٹر ہنفر وغیرہ نے نقل کیا ہے، مگر ان سب نے حوالہ شمس الدین الذہبی کا دیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، ہمارے کرم فرما جناب امتیاز علی صاحب عرشی نے اس کی نقل ہمیں بھیجی ہے، جس کے ہم بہت ممنون ہیں۔ [2] الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۲۰۱ [3] الاعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار، از مورخ محمود بن سلیمان کفوی، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اس کا ایک مخطوطہ ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، ہمارے دوست محمد عمران خاں نے اسی کتاب سے صغانی کا ترجمہ نقل کرکے ہمیں بھیجا ہے جس کے ہم بہت ممنون ہیں۔

بارے میں ناقلین کی معلومات کا تمام تر دارومدار علامہ ذہبی کے بیان پر ہے، سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی کے کتب خانہ میں صغانی کی کتاب مجمع البحرین کا جو فوٹو گراف ہمارے مطالعہ سے گذرا ہے، اس کے سرورق پر صغانی کا تذکرہ بھی موجود ہے، اس میں بھی صغانی کا سال ولادت یہی منقول ہے۔

ارباب تذکرہ نے بالاتفاق سال وفات ۶۵۰ھ نقل کیا ہے، اس حساب سے موصوف کی عمر پچھتر سال قرار پاتی ہے۔

ہمیں جمہور مورخین کے اس بیان سے اتفاق نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ خود صغانی نے اپنے قیام غزنہ ۵۸۰ھ کا ایک نہایت علمی واقعہ اپنے والد کی زبانی نقل کیا ہے، جمہور مورخین کے قول پر اس وقت صغانی کی عمر مشکل سے تین سال کی ہوتی ہے، تین برس کا بچہ جو اچھی طرح سے بول بھی نہیں سکتا، وہ عربی ادب کی بلند پایہ کتاب حماسہ کو کیا سمجھ سکتا ہے، اور اس کے اشعار کو کیونکر یاد رکھ سکتا ہے، یہ واقعہ خود صغانی کی زبانی سننے کے لائق ہے۔ موصوف العباب میں رقمطراز ہیں:

سمعت والدی المرحوم بغزنة	میں نے ۵۸۰ھ میں غزنہ میں اپنے
فی شهور سنة ثمانین وخمسمائة	والد مرحوم سے سنا تھا، وہ فرماتے
یقول کنت اقرأ کتاب الحماسة	تھے کہ جس زمانہ میں اپنے استاد سے ابو تمام
لابی تمام علی شیخی بغزنة	کا حماسہ پڑھتا تھا، مجھے یاد ہے کہ
ففسر لی هذا البیت:	انھوں نے اس شعر:
بیض مفارقنا تغلی مراجلنا	ہمارے سر کے بال مشک کے استعمال کی وجہ سے سفید ہو گئے، ہماری دیگیں (مہمانوں کیلئے) جوش کھا رہی ہیں
نأسوا باموالنا آثار ایدینا	ہمارے ہاتھوں کے زخموں کا علاج ہم اپنے اموال سے کرتے ہیں یعنی ہم سزا نہیں دیت دیتے ہیں یا ہم سے قصاص

واوّل لی قوله بیض مفارقنا
مائتی تاویل فاستغربت
ذالک حتی وجدت الکتاب
الذی یبین فیه هذا الوجه
ببغداد فی حدود سنة
اربعین وستمائة والحمد
لله علی نعمه[1]

کا مطلب بتایا، پھر شاعر کے اس قول بیض
مفارقنا کی دو سو تاویلیں بیان کیں، مجھے
بڑی حیرت ہوئی کہ کہیں اتنے سے جملہ کی
دو سو تاویلیں کی جا سکتی ہیں، تا آنکہ مجھے
۶۴۰ھ میں بغداد میں وہ کتاب مل گئی
جس میں اس کے یہ وجوہ مذکور تھے
الحمد للہ علی احسانہ

صغانیؒ کے اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سن شعور کا ہے، لہٰذا سال ولادت ۵۵۵ھ ہرگز صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مولانا سید عبد الحیؒ لکھنوی نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں۔

ولد بمدینة لاهور فی خامس
عشر من صفر سنة سبع وخمسین
وخمسمائة فی ایام خسرو ملک
بن خسرو شاه الغزنوی[2]

صغانی خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی
کے عہد حکومت میں ۱۵ صفر
۵۵۷ھ کو لاہور میں پیدا
ہوئے تھے۔

مولانا عبد الحیؒ لکھنوی نے ماخذ کا اگرچہ حوالہ نہیں دیا ہے، مگر ہمارا خیال ہے کہ ان کا یہ بیان مشارق الانوار کے اس نسخہ سے منقول ہے جو ۱۳۲۹ھ میں استنبول سے شائع ہوا تھا، اس کے سرورق پر ترکی زبان میں ان کا جو تذکرہ شائع ہوا ہے، اس میں یہی سال ولادت مذکور ہے مگر اس کے بھی اصل ماخذ کا کچھ پتہ نہیں، لہٰذا اس پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

[1] ملاحظہ ہو العباب بحوالہ تاج العروس مادہ ب، ی، ض [2] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۳۷

سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں شمس الدین الذہبی کے حوالہ سے صغانی کا سال ولادت ۵۵۵ھ نقل کیا ہے[1] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ زبیدی کے پیش نظر تاریخ الاسلام کا جو نسخہ تھا اس میں یہی سال ولادت مذکور تھا، سید مرتضیٰ زبیدی نے چونکہ سال ولادت ہندسوں میں نقل کیا ہے، حروف میں ضبط نہیں کیا، اس لیے احتمال ہے کہ اصل میں وہ ۵۷۵ھ ہو جو ادنیٰ تغیر سے ۵۵۵ھ بن گیا ہو، تاج العروس میں اکثر ایسا ہوا ہے، مگر یہاں کچھ قرائن ایسے موجود ہیں جن سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ جو سال ولادت سید مرتضیٰ زبیدی نے نقل کیا ہے، وہی صحیح ہے،

کمال الدین الدمیری المتوفی ۸۰۸ھ حیوۃ الحیوان میں لفظ حصور کے تحت العباب سے ناقل ہیں:

الحصور الناقة الضیقة
الاحلیل والحصور من الرجال
الذی لا یقرب النساء (فائدة
اجنبیة) ذکرها الصاغانی
فی العباب قال سألنی والدی
تغمده الله تعالی برحمته
واسکنه بحبوحة جنته
بغزنة قبل سنة تسعین
وخمس مائة وانا اذ ذاک

حصور وہ اونٹنی ہے جس کا احلیل نہایت
تنگ ہو، اور حصور وہ مرد بھی ہے جو مرد ہی
کے باوجود عورت کے پاس نہ پھٹکے، ایک
غیر متعلق فائدہ، صغانی نے العباب میں
لکھا ہے کہ میرے والد نے اللہ تعالیٰ کی
رحمت ہمیشہ ان پر سایہ فگن رہے اور انہیں
جنت کے وسط میں ان کو جگہ دے، غزنہ
میں ۵۹۰ھ سے قبل جب کہ میں نہایت
خوشحال زندگی کے دور میں شباب کی

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ ص، غ، ن

اصحب مطارف الشباب فی	چادر گھسیٹ رہا تھا، وہ مجھے تابناک فوائد سے
رغد العیش اللباب وھویفیدنی	بہرہ اندوز ہونے کا موقعہ دیتے اور یکتا
غرر الفوائد ویقرر قنی درر	موتیوں سے مالا مال فرماتے رہتے تھے،
الفرائد وکان رحمۃ اللہ	میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فضائل کا ابربارا ں
ریان من الفضائل ظما نا	اور رذائل سے کوسوں دور تھے، مجھ سے
عن الرذائل عن معنی قولھم	اہل عرب کے اس قول قد اثر حصیرا لحصیر
قد اثر حصیرالحصیر فی حصیر	فی حصیرالحصیر کے معنی پوچھے، مجھے اسکے
الحصیر فالمراد ما قول	معنی معلوم نہ تھے، انھوں نے بتایا، پہلا حصیر
فقال الحصیر الاول الباریۃ	بوریہ کے معنی میں ہے، دوسرا بمعنی قید خانہ ہے
والثانی السجن والثالث	اور تیسرے کے معنی پہلو کے ہیں اور چوتھا بادشاہ
الجنب والرابع الملک [۱]	کے معنی میں ہے جس کا ترجمہ ہے قید خانہ کے
	بوریہ نے بادشاہ کے پہلو میں نشان ڈال دیا.

موصوف کے اس بیان سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ ۵۹۰ھ سے قبل تک صغانی کا قیام غزنہ میں رہا ہے اور یہ ان کا دور شباب تھا.

محمد بن حبیب نے تصریح کی ہے کہ لڑکپن کا زمانہ سترہ برس تک رہتا ہے، پھر شباب کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے، اور بڑھاپے سے پیشتر کا زمانہ شباب ہی کا زمانہ کہلاتا ہے [۲].

محقق کمال الدین بن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ لغت میں ۱۹ برس

[۱] حیاۃ الحیوان، مصطفی البابی الحلبی مصر ج ا ص ۱۹۹ نیز الاعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار (قلمی) ترجمہ حسن بن محمد الصغانی [۲] ملاحظہ ہو تاج العروس (مادہ شبب)

سے ۳۴ برس تک کے جوان کو شباب کہتے ہیں، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تو ۱۵ برس کی عمر سے شباب کا زمانہ شروع ہو جاتا ہے [۱].

ابو منصور الثعالبی المتوفی ۴۲۹ھ فقہ اللغہ میں رقمطراز ہیں:

فاذا اجتمعت لحیتہ وبلغ غایۃ	جب داڑھی بھر آئے اور انسان اپنے
شبابہ فھو مجتمع ثم ما دام	شباب کی انتہا کو پہنچ جائے تو اس کو مجتمع
بین الثلاثین والاربعین	کہتے ہیں، پھر ۳۰ سال سے چالیس سال تک
فھو شاب [۲]	کی عمر کے انسان کو شاب (جوان) کہتے ہیں،

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ یہی زمانہ شباب کا زمانہ ہوتا ہے، اس لحاظ سے بھی سید مرتضیٰ زبیدی کا بیان کردہ سال ولادت ہی زیادہ معتبر ہے.

خود صغانی نے العباب الزاخر میں تصریح کی ہے کہ کچھ اوپر چالیس سال تک ہندوستان اور سندھ میں موصوف کا قیام رہا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

انی شرقت وغربت فی الھند	میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب
والسند نیفا واربعین سنۃ [۳]	میں چالیس سال سے اوپر گھوما پھرا ہوں،

اس بیان کے پیش نظر بھی سید مرتضیٰ زبیدی کا قول ہی صحیح قرار پاتا ہے، کیونکہ خود صغانی نے تصریح کی ہے کہ پہلی بار ان کا ورود بغداد میں ۶۱۵ھ میں ہوا ہے، چنانچہ سید مرتضیٰ زبیدی، تاج العروس میں موصوف سے ناقل ہیں،

قال الصاغانی قدمت بغداد	صاغانی کا بیان ہے کہ ۶۱۵ھ میں جب بغداد

[۱] فتح القدیر، طبع امیریہ بولاق ۱۳۱۶ھ ج ۴ ص ۱۷ [۲] ملاحظہ ہو فقہ اللغۃ و سر العربیۃ، مطبوعہ مصطفیٰ البابی الحلبی مصر ۱۹۵۴ء ص ۹۲ [۳] العباب الزاخر بحوالہ تاج العروس (لفظ دکنکض)

سنة ۶۱۵ وهی اول قدمتی الیها فسألنی بعض المحدثین عن معنی القراریط فی هذا الحدیث نقلت المراد به قراریط الحساب فقال سمعنا الحافظ الفلانی یقول ان القراریط اسم جبل او موضع فانکرت کل الانکار وهو مصر علی ما قال کل الاصرار اعاذنا الله من الخطاء والخطل والتصحیف والزلل[1]

میں آیا اور یہ میری پہلی آمد تھی، تو بعض محدثین نے مجھ سے قراریط کے معنی پوچھے جو حدیث میں وارد ہے، میں نے کہا اس سے مراد حساب کے قراریط ہیں، اس (سائل) نے کہا ہم نے فلاں حافظ الحدیث کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ قراریط پہاڑ یا کسی جگہ کا نام ہے، میں نے اس کا نہایت سختی سے انکار کیا، مگر اس نے جو کہا تھا اس پر بڑا اصرار کیا، اللہ تعالیٰ ہمیں غلطی اور خطاء، لغزش اور تغیر سے بچائے۔

صغانی کا ہندوستان میں چالیس سال سے زیادہ قیام اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب ان کی ولادت ۵۵۵ھ میں صحیح قرار دی جائے،

تیرہویں صدی ہجری کے وسیع النظر عالم اور نامور مورخ اسماعیل پاشا بن محمد امین البغدادی نے ہدیۃ العارفین میں صغانی کا سال ولادت ۵۵۵ھ نقل کیا ہے، اس سے بھی سید مرتضیٰ زبیدی کے قول کی مزید تائید ہوتی ہے۔[2]

صغانی کا مولد تمام ارباب تذکرہ اور مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ صغانی کی ولادت برصغیر پاکستان

[1] العباب الزاخر بحوالہ تاج العروس (مادہ قرط) [2] ملاحظہ ہو ہدیۃ العارفین اسماء المؤلفین وآثار المصنفین، طبع استنبول ۱۹۵۱ء ج ۱ کالم ۲۸۱

کے مشہور شہر لاہور میں ہوئی، چنانچہ موصوف کے بیک واسطہ شاگرد شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں:

الحسن بن محمد بن الحسن بن حیدر بن علی العلامة رضی الدین ابوالفضائل القرشی العدوی العمری الصغانی الاصل الهندی اللهوری المولد[1]

علامہ رضی الدین، ابوالفضائل حسن بن محمد بن الحسن بن حیدر بن علی القرشی العدوی العمری صغانی الاصل اور ہندی اور لاہوری المولد ہیں،

عبدالقادر القرشی المتوفی ۷۷۵ھ الجواہر المضیہ میں تحریر فرماتے ہیں:

اللهوری بفتح اللام وسکون الواوین بینهما هاء مفتوحة وآخرها راء ونسبة الی لوهر مدینة کبیرة من بلاد الهند وکثیرة الخیر ویقال لهاوور بهاولد[2]

لوہوری میں لام مفتوح اور ہر دو واؤ ساکن ہیں اور ان کے درمیان ہاء مفتوح اور اس کے آخر میں راء ہے اور یہ لوہر کی طرف نسبت ہے جو ہندوستان (پاکستان) کے بڑے شہروں میں سے ہے۔

اس سے بھی واضح طور پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ صغانی کا مقام پیدائش پاکستان کا مشہور شہر لاہور ہے،

مورخ کفوی الاعلام الاخیار میں لکھتے ہیں:

کان فی اصله لاهور یا دهی

آپ کی اصل جائے پیدائش لاہور ہے اور

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام ترجمہ حسن بن محمد الصغانی [2] ملاحظہ ہو الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۲۰۱

بلدة من بلاد الهند ولد بها[۱]	یہ ہندوستان (پاکستان) کے شہروں میں سے ایک شہر ہے

سید مرتضیٰ زبیدی، اصلاً ہندوستانی تھے، بلگرام موصوف کا مرز بوم تھا، نہایت بلند پایہ محدث، لغوی، فقیہ اور مورخ تھے، امام صغانی کی کتابوں پر نظر تھی، ان کی لکھی ہوئی کتابیں آپ کے زیر مطالعہ رہ چکی تھیں، موصوف لفظ لہبرۃ پراستدراک کے تحت تاج العروس میں لکھتے ہیں

لَهُوَرَ لجعفَرَ ویقال لَاهُوْرَ	لَهُوَر، جَعْفَرَ کے وزن پر ہے اور اس کو
کَساجوَرَ ویقال ایضاً لَهَاوُرَ	سَاجوَر کے وزن پر لاہور بھی بولتے ہیں، نیز
مدینة عظیمة بالهند بها ولد	لہاور بھی بولا جاتا ہے، یہ ہندوستان (پاکستان)
الصاغانی صاحب العباب و	کا عظیم الشان شہر ہے، یہیں صغانی صاحب العباب
الیها ینسب جماعة من المحدثین[۲]	پیدا ہوئے تھے اور اسی خاک سے محدثین کی ج

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں:

مسقط راسه لاهور جاء واحد	علامہ صغانی کا مسقط الراس لاہور ہے، ان کے
من اسلافه من صغان الیها	اسلاف میں سے کوئی صغان (صغانیاں) سے
وتوطن بها ولهذا یقال له	یہاں آیا تھا اور لاہور کو وطن بنا لیا تھا، اسی لیے
الصغانی[۳]	ان کو صغانی کہتے ہیں.

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ صغانی کا خاندان صغان (صغانیاں) کا تھا جو لاہور چلا آیا تھا، اس طرح سے حسن صغانی بھی تھے اور لاہوری بھی.

صغانی کی کتاب الاضداد کا مخطوطہ پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں ہماری نظر سے گذرا ہے.

اس کے سرورق پر صغانی کا جو تذکرہ منقول ہے، اس میں بھی آپ کا مولد لاہور ہی مذکور ہے، و ہو ہذا

---

[۱] الاعلام الاخیار بحوالہ سبحۃ المرجان طبع بمبئی ۱۳۰۳ھ ص ۲۸ [۲] تاج العروس لفظ لهبرة [۳] ملاحظہ ہو سبحۃ المرجان ص ۲۸

الصغانی المحتد اللاهوری	علامہ حسن صغانی الاصل اور لاہوری المولد
المولد البغدادی الوفاة المکی	تھے، بغداد میں وفات پائی مکہ میں دفن ہوئے،
الملحد[۱] الحنفی المذهب رحمة	مسلک کے اعتبار سے حنفی تھے، اللہ تعالیٰ
الله تعالیٰ..... مولد مولف	اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، آمین.....
هذا الکتاب یعنی الصغانی	اس کتاب (الاضداد) کے مولف کا مقام
بلاهور من بلاد الهند	پیدائش لاہور ہے جو ہندوستان (پاکستان) کے
	مشہور شہروں میں ہے.

سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی میں صغانیؒ کی کتاب مجمع البحرین کا جو روٹوگراف ہے، اس کے سرورق پر صغانی کا مختصر تذکرہ بھی منقول ہے، اس میں بھی صغانی کا مولد لاہور ہی مذکور ہے.

متاخرین اہل لغت میں سے نامور لغوی علامہ احمد آفندی نے الجاسوس علی القاموس میں بصراحت لکھا ہے کہ میں نے العباب کے نسخہ میں جو امام صغانی کی آخری تالیف ہے. دیکھا ہے، اس میں خود صغانی نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ وہ لاہور میں پیدا ہوئے تھے، علامۂ موصوف کے الفاظ یہ ہیں

قرأت فی نسخة من العباب	میں نے العباب کے نسخہ میں پڑھا ہے کہ مولف لوہور
انه ولد فی لوهور (کذا)[۲]	(اسی طرح لکھا ہوا ہے) میں پیدا ہوئے تھے، جو
من الهند الکثیرة الخیرات	ہندوستان (پاکستان) کے شہروں میں ایک نہایت
ویقال ایضاً لهاور[۳]	عمدہ اور آباد شہر ہے اس کو لہاور بھی کہتے ہیں۔

---

[۱] فی الاصل اللحد [۲] ملاحظہ ہو الجاسوس علی القاموس، مطبعۃ الجوائب قسطنطنیہ ۱۲۹۹ھ، ص ۲۴

اس لیے اس امر میں کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ امام حسن صغانی کے مولد ہونے کا فخر پاکستان کے نہایت مشہور شہر لاہور ہی کو حاصل ہے۔

فوائد الفواد میں خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی صاحب مشارق الانوار کے متعلق ایک فقرہ " او از بداؤن بود " منقول ہے[1]، جب یہ کتاب طبع ہو کر منظر عام پر آئی تو متاخرین تذکرہ نگاروں میں غالباً سب سے پہلے یہ فقرہ مولانا سید عبد الحئی لکھنوی صاحب نزہۃ الخواطر کی نظر سے گذرا، انھیں شبہہ ہوا، چنانچہ حضرت محبوب الٰہی رحمہ کی شہادت اور امیر حسن کی روایت کے باوجود انھوں نے رضی الدین حسن صغانی کو بدایونی ہرگز تسلیم نہیں کیا، بلکہ انھیں لاہوری قرار دیا اور ان کا تذکرہ ان ہی اوصاف کے ساتھ جو متقدمین سے منقول تھا نزہۃ الخواطر میں قلم بند کیا، اور حضرت نظام الدین رحمہ کے بیان کے پیش نظر محض احتراماً رضی الدین بدایونی کے نام سے ایک اور جداگانہ شخصیت کا تذکرہ بھی کر دیا اور اس تذکرہ میں صرف ان ہی باتوں کو نقل کیا جو حضرت نظام الدین اولیاء رحمہ سے فوائد الفواد میں منقول ہیں، یہی وجہ ہے کہ ماخذ میں صرف فوائد الفواد ہی کا نام لیا ہے۔

مولانا عبد الحئی لکھنوی کے شبہہ کی وجہ غالباً یہ ہے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء کے پورے بیان میں حسن کا لفظ نہیں ہے، نیز جو معلومات اس کتاب میں ملتی ہیں وہ کسی اور کتاب میں نہیں پائی جاتی ہیں، جن سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رضی الدین بدایونی کوئی اور نامور شخصیت ہیں، پھر ہندوستان میں چونکہ مفرد نام کم پائے جاتے ہیں، اس لیے بہت ممکن ہے کہ رضی الدین نام کے یہ بزرگ بدایونی ہوں، یہی وجہ ہے کہ مولانا عبد الحئی لکھنوی نے رضی الدین حسن صغانی کو علم کے تحت حسن کے اندر اور رضی الدین بدایونی کو رضی الدین میں علم کی حیثیت سے

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد مطبع نولکشور لکھنؤ طبع سوم ۱۳۱۲ھ ص ۱۰۳

ذکر کیا ہے جس سے ہمارے مذکورۂ بالا خیال کی مزید تائید ہوتی ہے،

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک نام کے بیک وقت کئی صاحب کمال ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، لیکن دو ہمعصر مصنف ایک ہی موضوع پر کتابیں لکھیں اور نام بھی ایک ہی رکھیں، ایسا نہیں ہوا ہے، نیز یہاں داخلی شہادتیں اس کے قطعاً منافی ہیں کہ رضی الدین کے نام سے ایک جداگانہ شخصیت کا تذکرہ کیا جائے،

حضرت نظام الدین اولیاء نے حسن رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار کا تذکرہ کیا ہے، وہ بلاشبہہ یہی رضی الدین حسن صغانی ہیں جن کو صاحب نزہۃ الخواطر نے لاہوری قرار دیا ہے، کیونکہ انھوں نے ان کے جو فضائل و مناقب بیان کیے ہیں ان کے یہی حامل تھے، یہ اوصاف حضرت نظام الدین اولیاء کی زبان سے سننے کے لائق ہیں، امیر حسن حضرت محبوب الٰہی سے ناقل ہیں:

> بعد از آں نسبت حدیث سخن در فضیلت مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار افتاد، رحمۃ اللہ علیہ وانچہ نوشتہ است کہ ایں کتاب حجت است میان من وخدای[1]

اس حقیقت کا انکشاف خود صغانی نے مشارق الانوار کے مقدمہ میں کیا ہے، فرماتے ہیں:

هذا الكتاب حجة بيني وبين الله تعالىٰ في الصحة والرصانة والاتقان والمتانة[2]	یہ کتاب صحت و ثبوت، اتقان و متانت میں میرے اور خدا کے درمیان حجت ہے،

حضرت محبوب الٰہی پھر فرماتے ہیں،

> اگر حدیثے برا و مشکل شدے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام را در خواب دیدے و صحیح کردے

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۰۳ [2] مشارق الانوار مطبع رشادیہ استنبول ۱۳۲۹ھ ص ۴

اس وصف میں بھی حسن صغانی لاہوری منفرد ہیں، مشارق الانوار میں حدیث ذیل پر لکھتے ہیں:

عن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) ان الفتنة ھٰھنا من حیث یطلع قرن الشیطان قال الصغانی مولف ھذا الکتاب سمعته من النبی صلی اللہ علیہ وسلم قاله وھو یشیر الی المشرق[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فتنہ وفساد ادھر ہے جہاں سے شیطان کا سینگ یعنی آفتاب نکلتا ہے، اس کتاب کا مؤلف صغانی کہتا ہے کہ میں نے خواب میں یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی اور آپ پورب کی طرف اشارہ

ایک اور حدیث پر تحریر فرماتے ہیں

عائشة (رضی اللہ عنہا) اذا وضع العشاء واقیمت الصلٰوة فابدأوا بالعشاء قال الصغانی مولف ھذا الکتاب جعله اللہ ممن احیی سنن رسوله وکان ذالک اکبر سؤله کنت اتمنی مدة ان اری النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المنام واسئله عن صحة حدیث ما فیخبرنی به لاکون راویا عنه صلی اللہ علیہ وسلم باعلی سند یمکن

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر رات کا کھانا سامنے رکھا جائے اور عشا کی نماز کی اقامت ہو تو تم پہلے کھانا کھاؤ، اس کتاب کا مولف صغانی کہتا ہے (اللہ تعالیٰ اس کو اپنے رسول کی سنتوں کے زندہ کرنے والوں میں کردے اور یہ اسکی سب سے بڑی درخواستوں میں ہے) مجھے مدت سے آرزو تھی کہ میں رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھوں اور کسی حدیث کی صحت کی تحقیق آپ سے کروں تاکہ مجھے اعلیٰ رتبے کی سند

[1] مشارق الانوار مطبوعہ رشادیہ استنبول ص ۲۱

ومضٰی علی ذالک سنون حتی اذا کانت لیلة السبت الثامنة عشر من ذی القعدة سنة احدی عشرة وستمائة عند السحر رأیت کانی علی سطح وقد شرعت فی صلٰوة المغرب والنبی صلی اللہ علیہ وسلم قاعد یتعشی ومعه نفر فدعانی الی العشاء فاردت ان اتم الصلٰوة ثم اجیبه فذکرت قوله لابی سعید بن المعلی وقد ناداه النبی صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی الصلٰوة فلم یجبه حتی فرغ الم یقل اللہ استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم فذھبت الیه وقعدت عنده فقلت یا رسول اللہ اصحیح اذا وضع العشاء واقیمت الصلٰوة فابدأوا بالعشاء

حاصل ہو، اس آرزو میں کئی برس گذر گئے آخر ہفتہ کی شب کو ذی قعدہ کی ۱۸ تاریخ ۶۱۱ھ میں فجر کے قریب میں نے خواب دیکھا کہ میں نے چھت پر مغرب کی نماز شروع کی اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے رات کا کھانا تناول فرمارہے تھے اور آپ کے ساتھ اور بھی چند صحابہ ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کھانے کے واسطے بلایا، میں نے چاہا کہ نماز پوری کرکے جواب دوں، اتنے میں مجھے حضرت ابو سعید بن معلی کی وہ بات یاد آئی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں آواز دی تھی اور وہ نماز میں تھے، انھوں نے بغیر نماز پڑھے جواب نہیں دیا، حضور نے فرمایا، کیا خدا نے نہیں کہا ہے استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم (حکم مانو اللہ اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو ۹/۲۴) اس لیے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ حدیث صحیح ہے کہ جب رات کا کھانا سامنے رکھا جائے اور نماز کی اقامت ہو تو پہلے کھانا

قال نعم [1]

شروع کر حضور نے فرمایا، ہاں یہ حدیث صحیح ہے۔

ایک اور حدیث کی نسبت رقمطراز ہیں

ابو عبیدة بن الجراح (رضی اللہ عنہ)
هو رزق اخرجه الله لكم فهل
معكم من لحمه شئ فتطعمونا
قال ابو عبيدة فارسلنا الى
رسول الله صلى الله عليه وسلم
منه فاكل قاله فى حوت ميت
رماه البحر قال الصغانى مؤلف
هذا الكتاب حقق الله بسلطانه
آماله وصدق ببرهانه اقواله
اخذت مضجعى ليلة الاحد
الحادية عشرة من شهر
ربيع الاول سنة اثنتين
وعشرين وستمائة وقلت
اللهم انى الليلة نبيك
محمدا صلى الله عليه وسلم فى
المنام فانك تعلم اشتياقى

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ
سے روایت ہے کہ رسول خدا نے فرمایا وہ
(مردہ مچھلی) روزی ہے جو خدا نے تمہارے
واسطے نکالی ہے کیا تمہارے پاس اس کے
گوشت کا کچھ حصہ باقی ہے (اگر ہے) تو
ہمیں کھلاؤ، اس ارشاد پر ہم نے اس کا
کچھ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں
بھیجا، آپ نے تناول فرمایا، اور یہ مردہ مچھلی کے
بارے میں فرمایا ہے جس کو سمندر نے باہر
خشکی میں ڈال دیا ہو، اس کتاب کا مولف صغانی
کہتا ہے (خدا اسکی امیدیں اپنی قدرت سے
برلائے اور اپنی حجت اور دلیل سے اسکے
اقوال کو سچا کرے) کہ میں ۱۱ ربیع الاول ۶۲۲ھ
میں اتوار کی رات کو اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا
میں نے دعا کی بار الہا! آج رات خواب میں مجھے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف فرما

[1] مشارق الانوار طبع استنبول ص ۵۔

اليه فرأيت بعد هجعة من
الليل كانى والنبى صلى الله
عليه وسلم فى مشربة ونفر من
اصحابى اسفل منا عند درج
المشربة فقلت يا رسول الله
ما تقول فى حوت ميت رماه
البحر احلال هو فقال وهو
يتبسم الى نعم فقلت وانا
اشير الى من باسفل الدرج
فقل ان اصحابى لا يصدقونى
فقال لقد شتمتنى وعابونى
فقلت كيف يا رسول الله
فقال كلاما ليس يحضرنى
لفظه وانما معناه عرضت
قولى على من لا يقبله ثم اقبل
عليهم يلومهم ويعظهم فقلت
صبيحة تلك الليلة وانا
اعوذ بالله من ان اعرض
حديثه بعد ليلتى هذه

میرے اشتیاق سے آپ باخبر ہیں، رات کو
آنکھ لگنے کے بعد میں نے دیکھا کہ میں اور
رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم ایک بالاخانہ پر
ہیں اور چند میرے ساتھی نیچے بالاخانہ کی
سیڑھی کے پاس ہیں، میں نے عرض کیا،
یا رسول اللہ! اس مردہ مچھلی کے بارے میں
کیا ارشاد ہے جب سمندر نے باہر ڈال دیا ہو
آیا وہ حلال ہے؟ حضور نے مسکراتے ہوئے
فرمایا ہاں حلال ہے، میں نے عرض کیا جو لوگ
سیڑھی کے نیچے ہیں، انکی طرف اشارہ کیا
کہ میرے ان ساتھیوں سے بھی فرما دیجئے،
یہ لوگ میری اس بات کو سچا نہیں سمجھتے ہیں،
حضور نے فرمایا تم نے مجھے گالی دی اور
ان لوگوں نے مجھے عیب لگایا، میں نے
عرض کیا یا رسول اللہ کیسے؟ آپ نے کچھ
فرمایا، وہ الفاظ یاد نہیں رہے، مگر اسکا
مطلب یہی تھا کہ تم نے میری حدیث ان
لوگوں سے بیان کی جو اس کو قبول نہیں
کرتے یعنی نااہلوں کے سامنے حدیث بیان کرنا

الا على الذين يحكمون فيما شجر بينهم ثم لا يجدون فى انفسهم حرجا مما قضى و يسلمون تسليما واصلى على رسوله وانبيائه واسلم تسليما[1]

کمال بے ادبی ہے، پھر حضورؐ ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور انھیں ملامت اور نصیحت کرنے لگے میں نے اسی رات کی فجر کو کہا کہ میں اب ایسی بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں اور اس تذبذب کے بعد سے میں حضورؐ کی حدیث ان ہی لوگوں سے بیان کرونگا جو اپنے اختلافات میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حَکَم مانتے ہیں اور وہ حضورؐ کے فیصلہ سے تنگ دل نہیں ہوتے اور اپنے تمام معاملات حضورؐ ہی کو سونپتے ہیں۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مکہ معظمہ کے کنویں ادام کے متعلق سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں العباب سے نقل کیا ہے،

ادام اسم بئر على مرحلة من مكة حرسها الله تعالى[2] على طريق السرين كما فى العباب قال الصاغانى رأيت النبى صلى الله عليه وسلم وهو يقول ادام من مكة[3]

ادام براہ سرین مکہ سے ایک منزل کی مسافت پر ایک کنویں کا نام ہے جیسا کہ العباب میں مذکور ہے، صغانی کا بیان ہے میں نے رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپ فرما رہے تھے ادام مکہ کے حدود میں داخل ہے۔

[1] ملاحظہ ہو مشارق الانوار ص ۱۴، ۲ [2] ملاحظہ ہو تاج العروس (مادہ ادم)

یہ ایسے بین دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رضی الدین صغانی جن کو بدایونی قرار دیا گیا ہے در اصل یہی رضی الدین حسن صغانی لاہوری ہیں،

حسن صغانی لاہوری، ہندوستان اور پاکستان میں علم کی نسبت، لقب سے زیادہ مشہور رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تالیفات میں حسن صغانی کے بجائے رضی الدین صغانی کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، لہذا رضی الدین کو علم کی حیثیت دے کر بدایونی کہنا صحیح نہیں، چنانچہ "سرور الصدور" میں جو فوائد الفواد کے زمانہ کی تالیفات میں ہے شیخ فرید الدین ناگوری نے حسن صغانی کا جہاں بھی ذکر کیا ہے، ان کے لقب رضی الدین ہی سے انھیں یاد کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں

ہمدریں ذکر مولانا رضی الدین صغانی افتاد[1]

آگے فرماتے ہیں:

ایں صحاح لغت را مولانا رضی الدین صغانی نبشتہ جلد کردہ بود[2]

مشارق الانوار کی نسبت نے تو صغانی کو لقب تک سے مستغنی کر دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ شیخ کمال الدین نے مشارق الانوار کی جو سند خواجہ نظام الدین اولیاء کو دی تھی، اس میں لقب تک کا ذکر ضروری خیال نہیں کیا، بلکہ صرف اتنا ہی لکھنا کافی سمجھا،

وهما يرويانه عن مولفه[3]

اور مذکورہ بالا ہر دو شیخ اس کتاب (مشارق الانوار) کو اسکے مولف سے روایت کرتے ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو سرور الصدور و نور البدور میں ملفوظات حمید الدین المہرور قلمی ورق ۱۴۱/۲، سرور الصدور کا یہ مخطوطہ کراچی کے ایک مقامی تاجر کتب عباسی کے یہاں آیا ہوا تھا، یہاں کی علمی کساد بازاری کا یہ عالم ہے کہ یہ نسخہ عرصہ تک اسکے یہاں پڑا رہا، ان ہی دنوں یہ نسخہ ہمارے مطالعہ میں آیا تھا، آخر میں میں نے یہ نسخہ ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کو کوڑیوں کے مول دلوایا جو آج بھی وہاں محفوظ ہے، یہ حوالے اسی نسخہ کے ہیں [2] ایضاً کتاب مذکور ورق ۲/۴۸ [3] ملاحظہ ہو سیر الاولیاء از محمد مبارک العلوی مطبع محب ہند دہلی ۱۳۰۲ھ ص ۱۰۴

اب بات صاف ہو جاتی ہے کہ رضی الدین صغانی سے مراد رضی الدین حسن صغانی لاہوری ہیں، مگر یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ جب رضی الدین صغانی سے وہی رضی الدین حسن صغانی لاہوری مراد ہیں، تو پھر خواجہ نظام الدین اولیا، نے انھیں بدایونی کیونکر کہا، اس سلسلہ میں زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ یہاں تصحیف ہوگئی ہے، فوائد الفواد کے اصل نسخہ میں غالباً "او از لاہور بود" تھا جس کو ناقل نے خط شکستہ میں ہونے کے باعث "او از بداؤن بود" پڑھا، اور چونکہ خود نظام الدین اولیا، کا وطن بھی بداؤن تھا، اس کو بداؤن سمجھنے میں کوئی تردد بھی نہ ہوا، خط شکستہ میں لاہور کو بداؤن یا بدایون سے ایک گونہ تجنیس خطی کی وجہ سے ان میں تصحیف ہو جانا چنداں مستبعد نہیں، کیونکہ لا کی بد سے اور ہو کی او سے اور ر کی ن سے مشابہت خط شکستہ میں ایسی قوی اور اتنی قریب ہے کہ اس تصحیف کے قبول کرنے میں انکار کی گنجایش باقی نہیں رہتی جن لوگوں کی نظر سے مخطوطات کا ذخیرہ گذرا ہے وہ ہماری اس رائے کی تائید کرینگے۔

یہ ایسی قابل قبول توجیہ ہے کہ اس پر حضرت نظام الدین اولیا، کی شہادت بھی غلط قرار نہیں پاتی اور امیر حسن پر بھی خلط ملط اور سہو کا الزام عائد نہیں ہوتا، امیر حسن پر خلط ملط یا سہو کا الزام کسی طرح درست نہیں، کیونکہ یہ کتاب ایک زمانہ تک صوفیاء کی دستور العمل رہ چکی ہے، شیخ عبد الحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں،

"میر حسن را کتابیست مسمی بفوائد الفواد در آنجا ملفوظات شیخ را جمع کردہ در غایت متانت الفاظ و لطافت معانی آں کتاب در میان خلفا و مریدان شیخ نظام الدین دستور است، گویند میر خسرو گفتے کاشکے تمام تصانیف من بنام حسن بودے و ایں کتاب از من بودے"[1]،

تصریحات بالا کے بعد ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو مورخین کے تمام بیانات کو

۱؎ ملاحظہ ہو اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۲ھ ص ۱۰۱

نظر انداز کر کے صرف اس جملہ "او از بداؤں بود" سے حسن صغانی کے بدایونی قرار دینے پر زور قلم صرف کرتے رہے ہیں، جن میں جناب خلیق احمد نظامی بہت نمایاں ہیں، چنانچہ حیات شیخ عبد الحق میں لکھتے ہیں:

مولانا رضی الدین حسن صغانی صاحب مشارق الانوار کے متعلق نظام الدین اولیا کا بیان ہے،

"او از بداؤن بود"

فوائد الفواد ص ۲۰، شیخ نظام الدین کا بیان ان وجوہات کی بنا پر سب لوگوں سے زیادہ قابل اعتبار ہے، جنھوں نے ان کا وطن لاہور بتایا ہے (۱) شیخ نظام الدین اولیا خود بدایون کے تھے اور بدایوں کے متعلق اچھی معلومات رکھتے تھے[2] (۲) ان کے استاد مولانا کمال الدین زاہد مولانا برہان الدین بلخی تلمیذ شیخ رضی الدین حسن صغانی تھے، اس بنا پر استاذ الاستاذ کے متعلق ان کا بیان زیادہ معتبر ہے"[1]

موصوف نے اسی تحقیق کو "تاریخ مشائخ چشت" میں پھر دہرایا ہے، فرماتے ہیں:

حضرت رضی الدین حسن صاحب مشارق الانوار جن کا نام ہندوستان کے علماء حدیث میں سرفہرست آتا ہے، محمد غوری کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہونے سے تقریباً دس سال قبل بدایون میں پیدا ہوئے تھے، وہیں انھوں نے دینی تعلیم حاصل کی اور وہیں اپنا ابتدائی زمانہ گذارا[3]، جب بداؤں سے یہ عظیم المرتبت فرزند بغداد پہنچا تو بڑے بڑے عالموں کی گردنیں اسکے سامنے جھک گئیں۔[4]

۱؎ حسن صغانی کو بدایونی قرار دینے کے متعلق جو شبہے جناب خلیق احمد نظامی کو پیش آئے ہیں اس سے ہمارے اس خیال کی مزید تائید ہوتی ہے کہ لاہور کو بداؤن سمجھنے میں کاتب کو بھی ایسے ہی شبہے ہوئے ہونگے اور بہت ممکن ہے کہ وہ بھی بدایوں کا ہو۔ ۲؎ ملاحظہ ہو حیات شیخ عبد الحق، شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۳۷۲ھ ص ۱۲ ۳؎ رضی الدین حسن صغانی کے متعلق یہ تحقیق کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذری ہے حسن صغانی نے کہاں کہاں پڑھا اور کن کن اساتذہ سے پڑھا، انشاء اللہ تعلیم و تربیت کے عنوان میں آئے گا۔ ۴؎ ملاحظہ ہو تاریخ مشائخ چشت شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۳ء ص ۱۴۳

جناب خلیق احمد نظامی نے خواجہ نظام الدین اولیاء کے مذکورۂ بالا جملہ پر جو تبصرہ قائم کی ہیں وہ زیادہ تر مضمون کی سجاوٹ کی خاطر ہیں، تاریخی عنصر ان میں بہت ہی کم ہے،

خواجہ نظام الدین اولیاء بلاشبہہ بدایوں میں پیدا ہوئے تھے اور بارہ برس تک بدایوں میں رہے، مگر بدایوں سے پھر زیادہ وابستگی نہیں رہی، بدایوں کے متعلق معلومات فراہم کرنا ان کے موضوع اور مسلک سے خارج تھا، نیز یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ فوائد الفواد تذکرہ یا تاریخ کی کتاب نہیں ہے،

پھر خواجہ نظام الدین اولیاء صغانی کے بدو واسطہ شاگرد ہیں شمس الدین الذہبی مشہور مورخ اور حافظ الحدیث دمیاطی کے شاگرد ہیں اور وہ صغانی کی جملہ مرویات اور مصنفات کے نہایت ثقہ اور نامور راوی ہیں، خود شمس الدین الذہبی عالم اسلام کے فن رجال اور تاریخ کے نادرۂ روزگار، ناقد اور وسیع النظر عالم تھے، ان کا بیان ہر لحاظ سے قابل ترجیح تھا اور ہے۔

جناب خلیق احمد نظامی سے زیادہ تعجب مولوی ضیاء احمد بدایونی پر ہے جنھوں نے وطنیت کے جذبہ سے مغلوب ہوکر ذوالقرنین کے بدایوں نمبر میں حضرت نظام الدین اولیاء کے اس مختصر سے جملہ پر چھ سات صفحے کا ایک مستقل مضمون لکھ ڈالا اور رضی الدین حسن صغانی کو بدایونی قرار دیکر ہمیشہ کے لیے اس بحث کا دروازہ ہی بند کر دیا اور یہاں تک لکھ دیا ہے،

> حضرت محبوب الٰہی کی شہادت اور امیر حسن کی روایت کے بعد علامہ کی وطنیت میں شک اور ان کے بدایونی ہونے میں تامل کرنا ایک ایسا وہم ہے جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔
>
> بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست [1]

اسی طرح تذکرۃ الواصلین میں رضی الدین صدیقی فرشوری کا بیان تاریخی حقایق سے یکسر خالی ہے۔[2] اسی لیے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ (باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو ذوالقرنین کا بدایوں نمبر اپریل ۱۹۵۶ء [2] تذکرۃ الواصلین، نظامی پریس بدایوں ج ۱ ص ۹۶ تا ۱۰۰

امام لغت حسن بن محمد الصغانی اللاہوری

از مولانا عبدالحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۲)

تعلیم و تربیت جیسا کہ اوپر گذر چکا، صغانیؒ کی ولادت لاہور میں ہوئی ہے، لیکن تعلیم و تربیت غزنہ میں پائی، ہر تعلیم کیسے حاصل کی، تربیت کس طرح ہوئی، کن کن اساتذہ سے پڑھا اور کیا کچھ پڑھا، اس قسم کی معلومات سے تمام تذکرے یکسر خالی ہیں، اور امام حسن صغانی کے بچپن کے حالات اور تعلیم و تربیت کے واقعات پر پردہ پڑا ہوا ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں باقاعدہ مدارس بہت کم تھے، مگر خانگی درسگاہیں نہایت کثرت سے تھیں، بڑے بڑے نامور علماء اور ائمۂ فن اپنے گھروں پر یا مساجد میں درس دیتے تھے، صغانی نے بھی اسی طرح گھر پر رہ کر پڑھا اور اپنے والد سے تعلیم حاصل کرکے جملہ فنون میں دستگاہ کامل حاصل کی[۱]، مورخ کفوی المتوفی ۹۹۰ھ اعلام الاخیار میں رقمطراز ہیں:

نشاء بغزنة واشتغل بها فی	صغانی نے غزنہ میں نشو و نما پائی، وہیں علوم
العلوم واخذ عن والدہ	کی تحصیل کی اور علوم دینیہ اپنے والد سے پڑھکر
وحصل ووصل وکمل[۲]	نہایت اعلیٰ استعداد پیدا کی اور ہر فن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

---

[۱] دنیائے علم کا یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہو کہ لغت کے سب سے بڑے امام ابن سیدہ نے بھی ابتدا میں اپنے باپ کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی تھی اور صغانیؒ نے بھی اپنے والد بزرگوار ہی سے کسب کمال کیا۔ [۲] ملاحظہ ہو الاعلام الاخیار تذکرۂ حسن بن محمد الصغانی، اس کا قلمی نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

کفوی کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ صغانی نے جملہ فنون کی تکمیل اپنے والد محمد سے کی تھی، شیخ محمد کے تذکرے سے تاریخ و سیر کی کتابیں یکسر خالی ہیں، لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے فاضل اور جید عالم تھے، خصوصاً ادب و لغت میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا، انھوں نے ایسے ایسے ائمۂ فن سے تعلیم پائی تھی جن کی نظیر دور دور نہ تھی، جب وہ اپنی تعلیم کا ذکر کرتے تھے تو صغانی جیسا ذہین و فطین بھی حیران و ششدر رہ جاتا تھا، ہم ایک واقعہ مثال کے طور پر خود صغانی کی زبانی نقل کرتے ہیں، جس سے موصوف کے والد محمد کی جلالت علمی کا اندازہ ہو سکے گا، صغانی العباب الزاخر میں لکھتے ہیں،

سمعت والدی المرحوم بغزنة فی شهور	تقریباً ۵۸۵ھ میں میں نے غزنہ میں اپنے والد مرحوم
سنة نیف وثمانین وخمسمائة، یقول	سے سنا تھا، وہ فرماتے تھے کہ میں غزنہ میں اپنے استاد
کنت اقرأ کتاب الحماسة ربی تمام علی	سے ابوتمام کا حماسہ پڑھتا تھا، استاد نے مجھے حسب
شیخی بغزنة فنسر لی هذا البیت	ذیل شعر کے معنی سمجھائے۔
بیض مفارقنا تغلی مراجلنا	ہمارے سروں کے بال سفید ہوگئے اور ہماری دیگیں جوش مار رہی ہیں۔
ناسوا باموالنا آثار ایدینا	ہم تمہارے ہاتھوں سے پہنچے ہوئے زخموں کا علاج اپنے اموال
واول لی قوله بیض مفارقنا	سے کرتے ہیں یعنی دیت ادا کرتے ہیں قصاص میں خود قتل نہیں ہوتے،
مائتی تاویل فاستغربت ذالک	اور شاعر کے قول "مفارقنا" کی دو سو تاویلیں بیان کیں،
حتی وجدت الکتاب الذی بین	صغانی کا بیان ہے کہ مجھے اس پر بڑا تعجب ہوتا تا آنکہ ۶۴۰ھ
فیه هذه الوجوه ببغداد فی حدود	میں بغداد میں وہ کتاب مجھ کو مل گئی جس میں اس کی دو سو
وسنة اربعین وستمائة الحمد لله علی نعمه[1]	تاویلیں مذکور تھیں، الحمد للہ علی ذالک،

[1] العباب الزاخر مادہ بیض بحوالہ تاج العروس۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صغانی کی تربیت کیسے فاضل روزگار باپ کے زیر سایہ ہوئی تھی۔

صغانی کی تحصیل علوم کا بیشتر زمانہ غزنہ میں گذرا، اسی لیے تذکرہ نگاروں نے ان کے متعلق نشأ بغزنة کے الفاظ لکھے ہیں، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ طالبعلمی کے زمانہ میں والد کے ساتھ لاہور میں بھی ان کی آمد و رفت بکثرت رہی ہوا اور یہاں کے قیام کی مجموعی مدت غالباً پانچ برس سے کم نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے مولد کے ساتھ منشاء بھی لاہور کو قرار دیا ہے، مولوی رحمان علی "تذکرۂ علماء ہند" میں لکھتے ہیں،

در لاہور متولد شدہ نشو و نما یافت[1]

صغانی نے ابتدا میں بلاشبہہ سب کچھ اپنے والد محمد سے پڑھا تھا، البتہ حدیث بعض اساتذہ سے لاہور میں بھی پڑھی ہے، چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاء فرماتے ہیں،

گمر درانچہ بداؤن (بلاہور) بود انجا او استادے بودہ است مردے بزرگ وصاحب ولایت بود[2]

تحصیل علوم کے بعد سنہ ۵۹۰ھ سے بیشتر صغانی کا تمام تر زمانہ اپنے والد کے ساتھ غزنہ میں گذرا، ان کی تربیت نے صغانی میں لغت اور ادب کے مذاق کو ابھارا اور علمی استعداد کو پختہ کیا، وہ وقتاً فوقتاً ان سے کوئی علمی مسئلہ یا ادبی نکتہ دریافت فرماتے، اگر انھیں معلوم نہ ہوتا

[1] ملاحظہ ہو تذکرۂ علماء ہند، طبع نولکشور لکھنؤ بار دوم ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء ص ۸۹۔ [2] ملاحظہ ہو فوائد الفواد، طبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ ص ۱۰۵۔ ہمارے خیال میں یہاں بھی بلاہور ہے اور یہ ایک حقیقت ہو کہ بداؤں ۵۹۳ھ میں قطب الدین ایبک کے دور میں فتح ہوا ہے، جب صغانی کی تحصیل علوم کے دن ختم ہو چکے تھے، اور وہ نائب مشرف کے عہدہ پر فائز تھے، اسلیے یہ بعید از قیاس ہو کہ صغانی کی تحصیل علم کے زمانہ میں کوئی بلند پایہ محدث لاہور جیسے مرکز علم و سیاست شہر کو چھوڑ کر بداؤں میں حدیث کا درس دے، دراصل یہاں بھی خط شکستہ میں "بلاہور بود" تھا، جو تصحیفی غلطی کے باعث بداؤن بن گیا ہے

تو خود بتا دیتے جس سے ان میں مطالعہ اور تحقیق کا شوق پیدا ہوتا اور وہ تحصیل کمال کے شوق میں سایہ کی طرح والد کے ساتھ رہتے تھے، انسانی زندگی میں سب سے نازک زمانہ عنفوان شباب کا ہوتا ہے، مگر صغانی کا یہ زمانہ بھی علمی استفادہ اور اکتساب کمال سے خالی نہیں ہے، وہ اپنے ایام جوانی کا تذکرہ اور والد کے فیضان علمی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

سألني والدي تغمده الله تعالى	میرے والد نے (اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمتوں
برحمته واسكنه بحبوحة	سے نوازے اور اپنی جنت کے وسط میں جگہ دے)
جنته بغزنة قبل سنة	مجھ سے غزنہ میں ۵۹۰ھ سے قبل جبکہ میں
تسعين وخمسمائة وانا اذاك	نہایت خوش حال اور آسودہ زندگی میں
اسحب مطارف الشباب في	شباب کی چادر گھسیٹ رہا تھا، وہ مجھے تابناک
رغد العيش اللباب وهو	اور درخشاں فوائد سے بہرہ مند فرماتے تھے
يفيد في غرر الفوائد	اور یکتا موتیوں سے مالامال کر رہے تھے
ويزين قلبي درر الفرائد	والد رحمۃ اللہ علیہ فضائل کا ایک ابر
وكان رحمه الله ريانا من	باراں اور رذائل سے کوسوں دور
الفضائل ظمآنا من الرذائل	تھے، مجھ سے اہل عرب کے اس قول
عن معنى قولهم قد اثر	(پہیلی) کے قد اثر حصیر الحصیر فی
حصير الحصير في حصير الحصير	حصیر الحصیر (جیل کے بوریہ نے
فالهادرما اقول فقال الحصير	بادشاہ کے پہلو میں نشان ڈال دیا) کے معنی پوچھے
الاول البادية والثاني	میں نہ بتا سکا تو انھوں نے خود بتایا کہ پہلا حصیر
السجن والثالث الجنب	بوریہ کے معنی میں ہے، دوسرا جیل خانہ کے، تیسرے

والرابع الملك[1] کے معنی پہلو کے ہیں اور چوتھا بادشاہ کے معنی میں ہے۔

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ شیخ محمد بڑے پایہ کے شخص تھے، اور علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے۔

ہم نے ابتدا میں علامہ کفوی کا جو بیان نقل کیا ہے وہ اگرچہ تین مختصر جملوں "حصل و وصل وکمل" پر مشتمل ہے مگر بڑا معنی خیز اور نہایت جامع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صغانی نے جملہ فنون کی محض تکمیل ہی اپنے والد سے نہیں کی تھی بلکہ ان کے پاس رہ کر ہر فن میں دستگاہ کامل کرلی تھی،

مگر تحقیق وتلاش کا جو ذوق صغانی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا وہ اس پر قانع نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ جب ان کو موقعہ ملا تو ان فنون کی تکمیل کے لیے سفر بھی کیے اور اساتذۂ وقت اور ائمۂ فن سے ان کی تکمیل کرکے باقاعدہ ہر فن کی سند حاصل کی، ہندوستان میں نامور محدثین سے حدیث کا سماع کیا، ان میں حسب ذیل دو نامور روزگار ہستیوں کا نام فہرست آتا ہے، شمس الدین الذہبی المتوفی ۷۴۸ھ تاریخ الاسلام میں لکھتے ہیں۔

سمع بالهند من القاضي سعد	صغانی نے ہندوستان میں قاضی سعد الدین
الدين خلف بن محمد الحسناباذي	خلف بن محمد الحسناباذی اور النظام محمد بن الحسن
والنظام محمد بن الحسن المرغيناني[2]	المرغینانی سے حدیث کا سماع کیا ہے۔

ان ہی دو ناموں کو سید مرتضیٰ زبیدی نے بھی تاریخ الاسلام کے حوالہ سے تاج العروس

---

[1] العباب الزاخر مادہ حصر بحوالہ حیوۃ الحیوان از کمال الدین الدمیری مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی مصر ج ۱ ص ۱۹۹ و اعلام الاخیار تذکرہ حسن بن محمد الصغانی [2] تاریخ الاسلام، تذکرہ حسن بن محمد الصغانی، اس کا مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔

مادہ "صغن" میں نقل کیا ہے۔

قاضی سعد الدین بڑے متبع شریعت اور بلند پایہ محدث تھے، فقہ میں بھی انھیں یدطولیٰ حاصل تھا، غالباً شہاب الدین محمد غوری کے عہد میں ہندوستان آئے تھے، التتمش کے عہد میں عہدۂ قضاء آپ کے سپرد تھا، صغانی نے العباب الزاخر میں ان کا سلسلۂ نسب یہ لکھا ہے

کردر ناحیۃ تتاخم (بیاض)	کردر ایک قصبہ ہے جو متصل ہے
منھا شیخنا ابو محمد خلف بن	.... ہمارے شیخ ابو محمد
محمد بن محمد بن ابراھیم بن	خلف بن محمد بن محمد بن ابراہیم بن
یعقوب الکردری ثم الحناباذی	یعقوب الکردری ثم حنا بازی
تغمدہ اللہ برحمتہ[1]	رحمۃ اللہ علیہ یہیں کے رہنے والے تھے۔

عصامی نے فتوح السلاطین میں حلت و حرمت سماع کے متعلق قاضی حمید الدین ناگوری اور قاضی سعد الدین و عماد الدین کا جو واقعہ قلم بند کیا ہے، اس سے بھی موصوف کے اجتناب بدعت پر روشنی پڑتی ہے، اس واقعہ کا یہ پہلو عجیب ہے کہ اس مباحثہ میں ایک طرف صغانی کے استاد ہیں اور دوسری طرف ان کے شاگرد،

---

[1] العباب الزاخر مادہ کردر، العباب میں چونکہ بیاض ہے، اسلیے صاحب قاموس نے بھی صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ کردر بجحف ناحیۃ بالعجم۔ کردر جعفر کے وزن پر ہے اور یہ عجم میں ایک موضع ہے لیکن یاقوت حموی نے معجم البلدان میں تصریح کی ہے ھی ناحیۃ من نواحی خوارزم وما یتاخمھا من نواحی الترک۔ یہ خوارزم کے اطراف میں اور ترکستان کی سرحدوں سے متصل ایک قصبہ ہے۔ ابن ابی الوفا المتوفی ۷۷۵ھ فقیہ محمد بن عبدالستار بن محمد بن العمادی الکردری کی نسبت لکھتے ہیں "نسبۃ الی الجد المنسب الیہ البرانیقی من اھل براق تصبۃ من قصبات کردر من اعمال جرجانیۃ خوارزم۔ ان کی نسبت ان کے دادا کی طرف ہے جن کے انتساب میں برانیقی لکھا جاتا ہے، وہ اہل براق میں سے تھے اور یہ کردر کے قصبات میں سے ایک قصبہ ہے جو خوارزم جرجانیہ کے اعمال میں سے ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ قاضی سعد الدین تورانی النسل تھے، طبقات ناصری میں ان کی نسبت میں کردری اور اسی طرح راورٹی کے نسخہ میں گردیزی نسبت صحیح نہیں،

النظام محمد بن الحسن المرغینانی کا تذکرہ کتابوں میں کہیں نظر سے نہیں گزرا،

ہندوستان کے علاوہ اور بھی مختلف شہروں میں صغانی نے حدیث کا سماع کیا ہے، چنانچہ حافظ عبدالقادر القرشی المتوفی ۷۷۵ھ الجواہر المضیہ میں رقمطراز ہیں:

سمع بمکۃ وعدن والھند[1]	صغانی نے مکہ، عدن اور ہندوستان میں حدیث کا سماع کیا ہے،

تذکرہ نگاروں نے نہ کتابوں کی تفصیل بیان کی ہے اور نہ سنہ کا تعین کیا ہے لیکن صغانی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سنن ابی داؤد وغیرہ کا سماع مکہ مکرمہ میں کیا تھا، چنانچہ العباب میں لکھتے ہیں:

قال الصاغانی کنت سمعت	صغانی کا بیان ہے۔ میں نے اس حدیث
ھذا الحدیث بمکۃ حرسھا	(بئیر بضاعہ) کو مکہ معظمہ میں (اللہ تعالیٰ
اللہ تعالیٰ وقت سماعی	اس کو سلامت با کرامت رکھے) سنن
سنن ابی داؤد .... و	ابی داؤد کے سماع کے زمانہ میں سنا تھا،
ذلک فی سنۃ ستمائۃ[2]	اور یہ چھٹی صدی کا واقعہ ہے۔

ابتدا میں یہ بات نہایت وضاحت سے بیان ہو چکی ہے کہ صغانی نے جملہ علوم کی تحصیل اپنے والد محمد سے کی تھی، لیکن حدیث کا سلسلہ ایسا ہے کہ جب بھی کسی طالب حدیث کو اس کی سند عالی ہاتھ آتی ہے تو وہ اس کو حاصل کرنا باعث سعادت سمجھتا ہے، یہی جذبہ تھا جس نے صغانی کو باکمال سے کسب فیض پر آمادہ کر دیا تھا، چنانچہ ۵۹۹ھ میں جب حج کے لیے مکہ معظمہ گئے تو اس زمانہ کے نامور محدثین سے حدیث کا درس لیا،

---

[1] الجواہر المضیہ، طبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدر آباد دکن ج ا ص ۲۰۲

[2] ملاحظہ ہو العباب الزاخر مادہ "بضع" بحوالۂ تاج العروس۔

صغانی نے حرم میں اس فن کو جس تحقیق اور دقتِ نظر سے حاصل کیا اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے ہوگا جو انھوں نے العباب الزاخر میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

عربی	اردو
بئر بضاعة بالمدينة قد جاء	بئر بضاعہ (کنواں) مدینہ میں ہے اور اس کا
ذکرها فی حديث ابی سعيد	تذکرہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ
الخدری رضی الله عنه قطرها	عنہ کی حدیث میں ہے، اس کنویں کا
ستة اذرع قال ابو داؤد	قطر چھ ذراع ہے، امام ابو داؤد
سليمان بن الاشعث قدرت	سلیمان بن الاشعث سجستانی کا بیان ہے
بئر بضاعة بردائی، مددته	کہ میں نے اپنی چادر سے بئر بضاعہ کو ناپا،
عليها، ثم ذرعته، فاذا عرضها	پہلے میں نے اس پر چادر پھیلائی اور
ستة اذرع قال وسألت	پھر ہاتھ سے اسے ناپا تو اس کا عرض
الذی فتح لی باب البستان	چھ ہاتھ نکلا، (ابو داؤد) کا بیان ہو کہ
فادخلنی اليه هل غير بناءها	باغ کے جس نگراں نے اس کا دروازہ
عما کانت عليه؟ فقال لا	کھولا اور جو مجھے اندر لے کر گیا تھا میں نے
ورأيت فيها ماء امتغير	اس سے پوچھا کہ کیا اس کی پہلی اور اب کی
اللون قال الصاغانی کنت	حالت بنا میں کچھ تغیر ہوا ہے، اس نے
سمعت هذا الحديث بمكة	جواب دیا، نہیں، ابو داؤد کہتے ہیں میں نے
حرسها الله تعالی وقت	اس کنویں میں پانی کی رنگت بدلی ہوئی دیکھی،
سماعی سنن ابی داؤد	صغانی فرماتے ہیں کہ میں نے سنن ابی داؤد کے
فلما تشرفت بزيارة	سماع کے وقت جب اس حدیث کو مکہ مکرمہ

عربی	اردو
النبی صلی الله عليه وسلم	میں سنا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم
وذالك فی سنة ستمائة	کے روضہ کی زیارت کے لیے مدینہ حاضر
دخلت البستان الذی	ہوا، یہ ۶۰۰ھ صدی کا ذکر ہے تو میں بھی
فيه بير بضاعة وقدرت	اس باغ میں گیا جس میں بئر بضاعہ واقع تھا،
راس البئر بعمامتی فکان کما قال	اور اپنے عمامہ سے کنویں کے دہانے کو ناپا تو اتنا ہی
ابو داؤد	پایا جتنا امام ابو داؤد نے بیان کیا تھا۔

"وقت سماعی" کی قید احترازی ہے کیونکہ بیر بضاعہ کی یہ حدیث تنہا سنن ابی داؤد ہی میں نہیں بلکہ صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے، امام ترمذی نے "جامع ترمذی" میں اور نسائی نے سنن المجتبیٰ میں اس کی تخریج کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ صغانی نے صحاح کی دوسری کتابوں کا بھی سماع نہیں کیا تھا، اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ صغانی کا قیام یہاں پانچ برس رہا ہے، حجاز میں اس طویل قیام کا مقصد جہاں محاورات عرب پر عبور حاصل کرنا تھا، وہاں کتب صحاح کا سماع بھی تھا،

صغانی نے حدیث کی صرف مشہور کتابوں ہی کا سماع نہیں کیا تھا بلکہ ایسی کتابوں کا سماع بھی کیا تھا جن کا سماع اس دور میں عموماً نہیں کیا جاتا تھا، ان کتابوں میں ابوالہیثم ابن کلیب[1] المتوفی ۳۳۵ھ کی المسند الکبیر بھی ہے، صغانی نے اس کا پورا سماع کیا تھا، چنانچہ العباب الزاخر میں لکھتے ہیں،

عربی	اردو
الهيثم بن کليب بن شريح	ہیثم بن کلیب بن شریح بن معقل الشاشی
بن معقل الشاشی صاحب	صاحب مسند کبیر، اس کتاب العباب

---

[1] موصوف کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الانساب مطبوعہ لیدن ۱۹۱۲ء نسبت الشاشی

المسند الكبير قال الصغانی	کا مؤلف صغانی کہتا ہے کہ ہیثم بن
مولف هذا الكتاب مسند	کلیب کی مسند میرے پاس موجود ہے
عندی وھو سماعی و لم	اور مجھے اس کا سماع حاصل ہے،
أجد ببغداد نسخة منه سوی	بغداد میں میرے سوا کسی کے پاس
ما عندی[1]	اس کا نسخہ موجود نہیں تھا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ صغانی نے فن حدیث کو روایۃً اور درایۃً کس طرح حاصل اور جزئی سے جزئی امور کا کتنی ژرف نگاہی سے مشاہدہ کیا تھا، اس واقعہ سے صغانی کی افتاد طبع پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ انھوں نے کیسی مجتہدانہ طبیعت پائی تھی، اور ان کی فطرت میں تحقیق اور جستجو کا کیسا مادہ ودیعت کیا گیا تھا، اس سے یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسرے فنون کی تحصیل بھی کس ذوق و شوق سے کی ہوگی،

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

شیوخ حدیث | تذکرہ نگاروں نے صغانی کے شیوخ کی تفصیل بیان نہیں کی ہے، جس نے سیکڑوں ارباب کمال اور ائمۂ فن سے علوم کی تکمیل کی ہو ظاہر ہے کہ جب تک وہ خود اپنے شیوخ کا تذکرہ نہ لکھے، کون ضبط تحریر میں لاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ کام محدثین رحمہم اللہ نے خود کیا اور ان ارباب صدق و صفا کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ آج بھی ہزارہا محدثین کا تذکرہ محفوظ ہے، مگر صغانی نے نہ خود اپنے حالات لکھے ہیں اور نہ اپنے شیوخ کا تذکرہ تحریر کیا، تلاش و تفحص سے جو چند نام دریافت ہو سکے وہ ہدیۂ ناظرین ہے،

(۱) ابو الفتوح الحصری - پورا نام برہان الدین ابو الفتوح نصر بن ابی الفرج

۱؎ ملاحظہ ہو العباب الزاخر مادہ شوش

محمد بن علی البغدادی الحنبلی المتوفی ۶۱۹ھ ہے، موصوف بغداد میں پیدا ہوئے، مکہ میں سکونت اختیار کی اور یہیں حدیث کا درس دیا، اسی مناسبت سے امام الحرم اور امام الحطیم کے لقب سے مشہور تھے، امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں موصوف کا نہایت مبسوط ترجمہ لکھا ہے اور اس میں ابن النجار کے حوالہ سے ان کے متعلق یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

كان حافظاً حجة نبيلاً من	وہ حافظ الحدیث اور حجۃ اور دین کے
اعلام الدين جما لعلم	علمائے اعلام میں تھے، ان کا علم نہایت
كثير المحفوظ، كثير التعبد و	وسیع تھا، یادداشت نہایت قوی تھی، بڑے
التهجد[1]	مرتاض اور شب زندہ دار بزرگ تھے،

"شذرات الذہب" میں مورخ ابن العماد نے بصراحت لکھا ہے سمع منه خلق كثير من الائمة الحفاظ. حفاظ حدیث کی بہت بڑی جماعت نے آپ سے حدیث کا سماع کیا تھا،

علامہ ذہبی المتوفی ۷۴۸ھ تاریخ الاسلام میں لکھتے ہیں:

قد سمع بمكة من ابي الفتوح	صغانی نے حرم میں شیخ ابو الفتوح نصر
نصر بن الحصيری[2]	ابن الحصیری سے حدیث کا سماع کیا تھا،

سید مرتضی زبیدی نے تاج العروس میں تصریح کی ہے کہ ابو الفتوح الحصری نے قطب الاقطاب شیخ عبد القادر جیلانی کو دیکھا تھا، اخیر زمانہ میں اشاعت علم کی غرض سے مکہ معظمہ سے یمن میں آگئے تھے اور یہیں وفات پائی، ان کا مزار آج بھی زیارت گاہ خلائق اور مزار شیخ برہان کے نام سے مشہور ہے۔[3]

۱؎ ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ، طبع دوم دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۳۴ھ ج ۴ ص ۱۹۹ ۲؎ تاریخ اسلام واقعات ۶۵۰ھ تذکرہ حسن بن محمد الصغانی ۳؎ ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ "حصر"

(۳) ابو منصور ابن الرزاز سعید بن محمد البغدادی المتوفی ۶۱۶ھ، علامہ ذہبی نے تاریخ الاسلام میں بصراحت لکھا ہے کہ صغانی نے بغداد میں ان سے حدیث کا سماع کیا تھا،[۱]

ابن العماد الحنبلی نے ابو الفتوح الحصری اور ابن الرزاز کا ذکر صغانی کے تذکرہ میں کیا ہے اور ان کا جداگانہ تذکرہ بھی لکھا ہے۔

قاضی سعد الدین خلف بن محمد الحسناباذی اور النظام محمد بن الحسن المرغینانی کا ذکر اوپر گذر چکا،

علامہ کفوی نے اعلام الاخیار میں شیوخ حدیث کو نام بنام نہیں گنایا ہے، مگر یہ لکھا ہے:

سمع الحدیث بمکة وعدن	صغانی نے مکہ معظمہ، عدن اور ہندوستان
والھند من شیوخ کثیرة	میں بیشمار شیوخ حدیث سے سماع کیا ہے،

شیوخ فقہ | صغانی نے فقہ بھی یگانۂ فن فقہاء سے پڑھی تھی، جن میں صاحب ہدایہ کے فرزند شیخ الاسلام نظام الدین عمر بن علی المتوفی بعد ۶۰۰ھ کا نام سر فہرست ہے، مولانا عبید اللہ سندھی، التمہید لتعریف ائمۃ التجدید میں لکھتے ہیں:

حسن الصاغانی الحافظ	حافظ الحدیث صغانی بواسطہ ابو حفص عمر
عن ابی حفص عمر المرغینانی	مرغینانی اپنے والد شیخ الاسلام علی بن
عن ابیه شیخ الاسلام علی	ابی بکر المرغینانی سے حدیث روایت
بن ابی بکر المرغینانی	کرتے ہیں اور فقہ میں بھی صاحب ہدایہ
وفی الفقه فانه اخذ عن	سے بواسطہ عمر المرغینانی راوی ہیں
صاحب الھدایه بواسطة	اور آپ ہی ہندوستان کے

[۱] ذہبی کا یہ بیان ابھی تحقیق طلب ہے، بغداد کے قیام میں ان شاء اللہ اس پر کچھ عرض کیا جائے گا۔

ولدہ عمر المرغینانی فھو شیخ الھند الاول[۱]	پہلے شیخ الحدیث والفقہ ہیں۔

وہ ان فقہاء میں سے تھے جنھیں نزاع اور خصومات کے طے کرنے میں یدطولیٰ حاصل تھا، اور والد کی طرح شیخ الاسلام کے لقب سے مشہور تھے اور فتاوی میں حرف آخر سمجھے جاتے تھے، فقہ میں متعدد کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔

فن لغت کی تحصیل | فن لغت بھی ابتداء میں فن حدیث کی طرح ائمۂ لغت کے حافظوں میں محفوظ تھا اور سنداً روایت کیا جاتا تھا، مگر جب یہ فن کتابی صورت میں مدون ہو گیا تو اس کی روایتی حیثیت کم ہو گئی اور زمانۂ مابعد میں اگرچہ مدون و مرتب ہو کر کتابی علوم میں داخل ہو چکا تھا، مگر بعض قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ صغانیؒ نے علم لغت کی تحصیل بھی ابتدا میں اپنے والد محمد سے کی تھی، جیسا کہ گذشتہ واقعات سے ظاہر ہے، صغانی نے ائمۂ لغت کی بعض اہم کتابوں کو حفظ کیا تھا، چنانچہ یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ صغانی سے ناقل ہیں کہ

کان یقول لاصحابه احفظوا	صغانی اپنے شاگردوں سے کہتے تھے تم
غریب ابی عبید فمن حفظه	ابو عبید کی الغریب کو یاد کرو جس نے بھی
ملك الف دینار، فانی حفظته	اسے یاد کیا وہ ایک ہزار دینار کا مالک ہوا،
فملکتھا واشرت علی بعض	میں نے بھی اسے یاد کیا تھا، میں بھی ایک ہزار
اصحابی بحفظه فحفظه	دینار کا مالک بنا اور میں نے بعض دوستوں کو بتایا،
وملکھا[۲]	انھوں نے بھی اسکو یاد کیا وہ بھی ہزار دینار کے مالک ہوئے،

محاورات عرب پر عبور حاصل کرنے کے لیے سرزمین نجد میں پانچ برس قیام کیا

[۱] ملاحظہ ہو التمہید لتعریف ائمۃ التجدید، اس کا قلمی نسخہ مولانا عبید اللہ سندھی کے ربیب عزیز مولوی عزیز احمد صاحب کے پاس ہماری نظر سے گذرا ہے [۲] ملاحظہ ہو ارشاد الاریب طبع سوم، مطبعہ ہندیہ مصر ۱۹۲۶ء ج ۳ ص ۲۱۸

اور اس طرح اس فن کی تکمیل کی اور ایسا کمال بہم پہنچایا کہ امام لغت قرار پائے،

لاہور میں آمد اور عہدۂ قضا کی پیشکش

صغانی کے والد محمد کی صحیح تاریخ وفات کا پتہ نہ چل سکا، مگر بعض واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۵۹۰ھ کے لگ بھگ ہوا کیونکہ ان کے متعلق جو واقعات صغانی سے منقول ہیں وہ ۵۹۰ھ سے پیشتر کے ہیں، ۵۹۰ھ اس کے بعد کا کوئی واقعہ نہیں ملتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنہ میں ان کا انتقال ۵۹۰ھ میں ہو گیا تھا، والد کے انتقال کے بعد آپ غزنہ کو خیرباد کہکر لاہور آگئے، اس وقت ہندوستان کے تخت سلطنت پر قطب الدین ایبک تھا، جو نہایت خلیق، مردم شناس اور صائب الرائے بادشاہ تھا، اس کا بچپن چونکہ ایک نامور فقیہ قاضی فخر الدین بن عبد العزیز کوفی کے گھر میں گذرا تھا اور وہ عہدۂ قضا کی اہمیت شرائط اور اہلیت سے پوری طرح واقف تھا، اس لیے صغانی کو لاہور کا جسے شاہان وقت کی فیاضیوں نے علم و ہنر کا نشیمن بنایا تھا، عہدۂ قضا پیش کیا، مولانا عبد الحئی لکھنوی نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں،

عرض علیہ قطب الدین ایبک	قطب الدین ایبک نے لاہور کا
القضاء بمدینۃ لاہور	عہدۂ قضاء آپ کو پیش کیا مگر آپ نے
فلم یجبہ[1]	اسے قبول نہیں کیا،

عجیب اتفاق ہے کہ جس مرکز علم و سیاست میں صغانی نے جنم لیا تھا اسی شہر کا عہدۂ

---

[1] نزہۃ الخواطر میں مولانا عبد الحئی لکھنوی نے اس کے بعد لکھا ہے

رحل الی غزنۃ یدرس ویفید	پھر آپ غزنہ چلے گئے اور وہاں درس و تدریس
ثم دخل العراق	کا مشغلہ اختیار کیا، پھر عراق آگئے،

یہ بیان محل نظر ہے، کیونکہ غزنہ میں درس و تدریس کا شغل اختیار کرنا اور وہاں سے عراق جانا کہیں تاریخ سے ثابت نہیں، اس غلطی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مولانا عبد الحئی نے حسن صغانی اور رضی الدین صغانی کو دو جداگانہ شخصیتیں قرار دیا ہے، اسی لیے حسن صغانی کے تذکرہ میں کول کے قیام کا ذکر تک نہیں کیا ہے،

قضا بھی ان کو پیش کیا گیا، دور شباب میں جب عموماً انسان عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا ہے، صغانی نے امیرانہ اور آمرانہ عیش و عشرت پر فقیرانہ زندگی کو ترجیح دی اور سلطان وقت کی اس پیش کش کو رد کر دیا، یہ واقعہ اس امر کا بین شاہد ہے کہ اس زمانہ میں صغانی کی علمی شہرت ایوان شاہی تک پہنچ چکی تھی،

صغانی درویشانہ طبیعت رکھتے تھے، وہ لاہور سے ہوتے ہوئے کول (علی گڑھ) آئے، اس زمانہ میں کول نیا نیا مسلمانوں کے تصرف میں آیا تھا، محمد قاسم فرشتہ کا بیان ہے،

در سنہ تسع و تسعین و خمسمائہ قلعہ کول را مسخر کردہ و دہلی را دار الملک ساختہ انجا قرار گرفت و اطراف و نواحی آں را در ضبط آوردہ شعائر اسلام ظاہر ساخت[1]

کول میں آمد اور نائب مشرف کے عہدہ پر تقرر

کول آنے کے بعد یہاں کے نائب مشرف مقرر ہوئے، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا بیان ہے،

بعد ازاں در کول آمد و نائب مشرف شد[2]

صغانی ایک عرصہ تک اپنے فرائض منصبی کو تندہی کے ساتھ انجام دیتے رہے، اتفاقاً ایک دن کسی معاملہ پر مشرف کی زبان سے کوئی نامناسب بات نکل گئی، صغانی اس کی نادانی پر مسکرا دیے، مشرف اگرچہ اس منصب کا اہل اور قابل شخص تھا، مگر انسان تھا، آپ کے مسکرانے پر اور غضبناک ہو گیا اور غصہ میں دوات اٹھا کر پھینک ماری، آپ جگہ سے ذرا ہٹ گئے اور دوات دور جا کر گری، آپ اسی وقت یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ ایسے جاہلوں کے ساتھ نشست و برخاست نہیں رکھی جا سکتی، خواجہ نظام الدین اولیاؒ فرماتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ مطبوعہ بمبئی ۱۸۳۲ء ج ۲ مقالہ دوم ص ۱۲۶ [2] ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۰۴

مشرف کہ منسوب او بود ہم اہل بود مگر روزے ایں مشرف سخنے گفت مولانا رضی الدین

تبسم کرد مشرف دوات جانب او فرستاد او متحرف شد بہ وزیر رسید چوں آنجناں بدید ازاں مقام

برخاست و گفت ما را پیش با جاہل نشست و برخاست نمی باید کرد۔"

حاکم کول کے یہاں اتالیق مقرر ہونا | صغانیؒ نے جب مشرف کی اس نازیبا حرکت کے باعث ملازمت ترک کر دی تو حاکم کول (حسام الدین اوغلبک) نے سوٹنکوں پر اپنے فرزندوں کی تعلیم کے لیے آپ کو اتالیق مقرر کیا، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ہے:

بعد از آں دنبال زیارت تحصیل شد پسر والی کول را تعلیم کردے۔

حضرت محبوب الٰہی کا بیان ہے کہ آپ اسی قلیل آمدنی پر گذر بسر کرتے رہے، موصوف کے الفاظ ہیں:

"بداں فارغ بودے"

صغانیؒ کا جب تک کول میں قیام رہا، درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اور پھر ۵۹۹ھ میں حج کے لیے روانہ ہو گئے،

امام لغت حسن بن محمد الصغانی اللاہوری

مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۳)

جیسا کہ اوپر گذر چکا، صغانیؒ کول میں حاکم کول حسام الدین او غلبک کے فرزند کے اتالیق تھے، ۵۹۵ھ میں حج کی ادائیگی اور دربار رسول کی حاضری کا خیال ہوا، فوراً رخت سفر باندھا، عسرت کا یہ حال تھا کہ پاؤں میں جوتے تک نہ تھے، بازار جا کر نیا جوتا خریدا اور بغیر اطلاع کیے کول سے روانہ ہو گئے، وارفتگی کے عالم میں ایک منزل کی مسافت تو طے کر لی مگر تھک کر چور ہو گئے، اور یہ اندازہ ہو گیا کہ راستہ پا پیادہ طے نہیں ہو سکتا، اسی فکر میں تھے کہ غیب سے سامان ہو گیا، آپ کی روانگی کی خبر والی کول کے فرزند کو ہو گئی، وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا حاضر خدمت ہوا، صغانی نے دیکھ کر دل میں خیال کیا کہ اگر یہ گھوڑا دیدے تو سفر بآسانی طے ہو جائے، لڑکے نے واپس چلنے کی درخواست کی، صغانیؒ نے انکار کر دیا وہ اصرار کرتا رہا، مگر مولانا انکار فرماتے رہے، جب اسے یقین ہو گیا کہ واپس نہیں جائیں گے تو اس نے عرض کیا، اگر مراجعت کی درخواست قبول نہیں ہوتی تو اس گھوڑے کو قبول فرمائیں، صغانیؒ نے گھوڑا لے لیا اور روانہ ہو گئے، خواجہ نظام الدین اولیاء کا بیان ہے

چوں از کول عزیمت حج کرد، نعلین بخرید در پائے کرد، چوں یک منزل رسید ماندہ شد، دانست کہ پیادہ نتواند رفت، ہمدراں اندیشہ بود کہ پسر والی کول سوار شدہ

روان بیاید، تا او را باز گردانید چوں آنجا آمد، مولانا را نظر بروے افتاد و او را دید کہ بر اسپ
سوار شدہ می آید در خاطر کرد کہ اگر ایں اسپ مرا دہد من آسودہ توانم رفت دریں
فکرت بود کہ پسر والی بیاید، مولانا را بجہت باز گردانیدن بسیار الحاح کرد، مولانا
باز نگشت چوں پسر والی دید کہ البتہ باز نخواہد گشت گفت حالا ایں اسپ کہ
بر و سوار آمدہ ام قبول کن، مولانا اسپ بستد و رواں شد[1]

صغانیؒ نے ہندوستان کی پوری مسافت اسی گھوڑے پر طے کی اور سندھ کے
راستہ سے عراق ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے۔

حجاز میں قیام | حجاز ہمیشہ سے علماء و صلحاء کا مرکز رہا ہے، یہیں صغانی نے شیخ الحرم
ابو الفتوح الحصری سے صحاح ستہ وغیرہ کا سماع کیا اور مدینہ جا کر بئر بضاعہ کی پیمائش
کی جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

صغانیؒ کا ایک مدت تک یہاں قیام رہا، مگر بیشتر زمانہ حرم کی مجاورت میں
گذرا، مورخ کفویؒ کا بیان ہے،

قد اقام بمکۃ مجاورۃ	صغانی ایک زمانہ تک مکہ معظمہ میں
مدۃ[2]	مجاور رہے ہیں۔

صغانیؒ کا قیام حجاز میں کم و بیش پانچ برس رہا ہے۔ جس کا بیشتر حصہ حرم بیت اللہ
میں گذرا، اسی لیے وہ اپنی تحریروں کے آغاز اور اختتام پر عموماً الملتجی الی حرم اللہ
کے الفاظ لکھتے تھے۔ ابن ابی مخرمہ المتوفی ۹۰۳ھ کا بیان ہے۔

جاور بالحرمین الشریفین	آپ نے کئی برس حرمین شریفین کی مجاورت

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد طبع نولکشور لکھنؤ ۱۳۱۲ھ ص ۴۰۔ [2] الاعلام الاخیار مخطوطہ ٹونک ترجمہ
حسن بن محمد الصغانی

سنین عدیدۃ و تسمی	کی اور الملتجی الی حرم اللہ
بالملتجی الی حرم اللہ[1]	کے نام سے موسوم ہوئے۔

صغانیؒ کے حجاز میں اس طویل قیام کا مقصد جہاں مجاورت بیت اللہ اور حج و
زیارت کی نعمت سے بار بار سرفراز ہونا تھا وہاں نامور محدثین سے حدیث کا سماع، محاورت
عرب و امثال عرب کی تحقیق اور مقامی چیزوں کا مشاہدہ بھی کرنا تھا۔

قیام حجاز ہی کے زمانہ میں صغانی نے پہلی مرتبہ ارینۃ گھاس کا مشاہدہ کیا تھا،
العباب الزاخر میں لکھتے ہیں،

قال شمر الارینۃ وھی	علامہ شمر کا بیان ہے کہ ارینہ
نبات یشبھا الخطمی عریض	ایک ایسی گھاس ہے جس کے پتے
ورق وقال الصغانی	چوڑے ہوتے ہیں اور وہ خطمی سے
مولف ھذا الکتاب اول	مشابہ ہوتی ہے، اس کتاب کا مولف
ما رأیت الارینۃ سنۃ	صغانی کہتا ہے، میں نے پہلی مرتبہ
خمس و ستمائۃ دون	۶۰۵ھ میں ارینہ کو جمرۃ العقبہ
جمرۃ العقبۃ بینھا و	کے پار اور جبل حراء کے درمیان
بین جبل حراء[2]	دیکھا تھا،

یہی وجہ ہے کہ صغانی نے ان لغت نویسوں کی جنھیں اہل عرب سے بالمشافہہ اخذ
لغت کا فخر حاصل ہے، بہت سی ایسی چیزوں میں ان کی تردید کی ہے جن کا تعلق سرزمین

[1] کتاب تاریخ ثغر عدن، طبع لیڈن ۱۹۳۶ء ج ۲ ص ۵۸ [2] العباب الزاخر، روٹوگراف
سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، لفظ (خلق)، نیز تاج العروس مادہ حق

عرب ہی سے ہے، چنانچہ جوہری نے صحاح میں لفظ اعلیط کے معنی ورق المرخ کے لکھے ہیں، صغانی اسی کے متعلق لکھتے ہیں کہ جوہری کا یہ بیان صحیح نہیں، سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں ناقل ہیں،

قال الجوهری الاعلیط ورق	جوہری نے کہا ہے اعلیط، مرخ (درخت)
المرخ قال الصاغانی وهو غیر	کے پتوں کو کہتے ہیں، صاغانی نے کہا
سدید لان المرخ لا ورق	ہے، جوہری کے یہ معنی لکھنا ٹھیک نہیں،
له وعیدانه سلبة	مرخ کے تو پتے ہی نہیں ہوتے، اسکی
وهی قضبان دقاق[1]	ٹہنیاں خشک ہوتی ہیں اور وہ بھی
	باریک باریک اور لمبی۔

یہی انداز صغانی کا امثال عرب کی تحقیق میں بھی ہے، عرب میں ایک مثل مشہور ہے،

فی کل شجر نار واستمجد	ہر درخت میں آگ ہے مگر مرخ اور عفار
المرخ والعفار[2]	دیعنی درخت ہیں، کو حاصل کرو، (کیونکہ یہ دونوں جلد آگ پکڑنے والے ہیں)۔

یہ ضرب المثل ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جہاں کسی چیز کو کسی دوسری چیز پر ترجیح دینی ہوتی ہے، نیز حجاق کا اوپر والا حصہ مرخ اور نیچے والا حصہ عفار کے نام سے پکارا جاتا ہے، صغانی اس کے متعلق اپنا مشاہدہ نقل کرتے ہیں کہ میں نے مرخ کو مکہ کے راستہ میں مقام قدید[3] میں دیکھا تھا، سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں؛

---

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ (علط) [2] تفصیل اور تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو مجمع الامثال للمیدانی المتوفی ۵۱۸ھ طبع مصر ۱۳۴۲ھ ج ۲ ص ۱۸ [3] قدید، سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس (مادۂ قد) میں ابن الاثیر الجزری کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ قدید، مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کے ایک گھاٹ کا نام ہے، یہ مقام غار ثور سے آگے ہے۔ ہجرت کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار ثور سے آکر یہیں قیام فرمایا تھا، صغانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری تک یہ مقام متعین تھا، سال کے تغیرات نے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے۔

قال الصغانی اول دمار رأیت	صغانی فرماتے ہیں مرخ میں نے پہلی مرتبہ
سنة خمس وستمائة بقدید	۶۰۵ھ میں قدید کے اندر خیمتی ام معبد
عند موضع خیمتی ام معبد[1]	رضی اللہ عنہا کے پاس دیکھا تھا، اور

---

[1] ام معبد۔ آپ کا نام عاتکہ اور کنیت ام معبد ہے، آپ وہی مشہور صحابیہ ہیں جن کے یہاں ہجرت کے موقع پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ غار ثور سے آکر فروکش ہوئے تھے، ان کا مکان مقام قدید میں تھا۔ شاعر کے حسب ذیل شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے

جزی الله رب الناس خیر جزائه	رفیقین قالا خیمتی ام معبد
اللہ تعالیٰ ان دونوں رفیقوں کو جزائے خیر دے	جنھوں نے ام معبد کے خیموں میں دوپہر کو آرام کیا۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کے یہاں رونق افروز ہوئے تو انھوں نے ایک بکری ذبح کرنے کے لیے پیش کی جو دودھ دیتی تھی۔ آپ نے اس کے تھن چھوئے اور فرمایا، اس کو ذبح نہ کرو، ام معبد رضی اللہ عنہا دوسری بکری لے آئیں اور اسے ذبح کرکے آپ کو اور آپ کے اصحاب کو کھانا کھلایا، ام معبد رضی اللہ عنہا کا بیان ہے۔ جس بکری کے تھن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ لگایا تھا، وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت تک ہمارے پاس رہی، ہم اسے صبح و شام دوہا کرتے اور اس کا دودھ پیا کرتے تھے۔

حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کس سنہ میں مشرف باسلام ہوئیں، اس میں اختلاف ہے، بروایت محمد بن عمر آپ اسی زمانہ میں مسلمان ہو چکی تھیں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئیں۔ (ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد مطبوعہ یورپ ج ۸ ص ۲۱۲)

رضی اللہ عنہا واتخذت منہ الزناد لما کان بلغنی من قولھم فی کل شجر نار واستمجد المرخ والعفار[1]

میں نے اسی کی چقماق بنائی تھی، کیونکہ مجھے اہل عرب کی اس مثل فی کل شجر نار واستمجد المرخ والعفار کا علم تھا۔

یمن میں آمد | حجاز ہی میں ۶۰۵ھ میں غالباً صغانی نے یمن کے مشہور محدث قاضی ابراہیم بن احمد کا شہرہ سنا، چنانچہ اسی سال حجاز سے یمن آگئے اور وہاں احادیث کا سماع کیا، مورخ ذہبی تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں:

سمع بالیمن من القاضی ابراھیم بن احمد بن سالم القرنیطی[2]

یمن میں قاضی ابراہیم بن احمد بن سالم القرنیطی سے صغانی نے حدیث کا سماع کیا ہے،

قاضی ابراہیم نہایت بلند پایہ محقق، فقیہہ اور محدث تھے، ابن ابی مخرمہ المتوفی ۹۰۳ھ تاریخ ثغر عدن میں لکھتے ہیں:

ابو اسحق ابراھیم بن احمد بن عبد اللہ بن محمد بن سالم القرنطی الفقیہہ الشافعی کان فقیھا نبیھا بارعاً محققاً قرأ الفقہ علی ابیہ وغیرہ

ابو اسحق ابراہیم بن احمد بن عبد اللہ بن محمد ابن سالم القرنطی، الفقیہ الشافعی نہایت بلند پایہ فقیہ اور محقق تھے، فقہ وغیرہ کی تحصیل اپنے والد اور دیگر فضلاء کی تھی، عدن کی خطابت ان کے خاندان

---

[1] نیز مجمع الامثال مولفہ نجم کرمانی طبع طہران ۱۲۹۰ھ ص ۵۱۴۔ ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ (علط) سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں اول رؤیتی فی المرخ والعفار بالدریھمی وھی قریۃ بالیمن سنۃ ۱۱۶۶ مرخ اور عفار کو میں نے پہلی مرتبہ ۱۱۶۶ھ میں دریھمی میں دیکھا تھا، یہ یمن میں ایک بستی ہے۔ [2] فی الاصل ابراہیم ابن احمد بن ابی سالم القرنیطی، ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام مخطوطہ رضا لائبریری رام پور، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی

..... ولم تزل خطابۃ عدن بایدی ذریتہ ... واظن وفاتہ کانت فی العشر ین الاولی من

میں رہی ہے، میرا خیال ہے، ان کا انتقال ساتویں صدی کے اوائل میں ۶۲۰ھ کے مابین ہوا ہے۔

فقیہہ ابراہیم کی حیثیت محض شیخ اور استاد ہی کی نہیں ہے، جیساکہ علامہ ذہبی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے، بلکہ انھیں بھی صغانی سے اخذ و تلمذ کی نسبت حاصل ہے، ابن ابی مخرمہ نے تاریخ ثغر عدن میں ایک موقعہ پر اس حیثیت کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں،

ابو محمد سعد بن مسعود المنجوی .... لم یذکر الجندی ولا الخزرجی ما یدل علی وصول الادیب سعد بن سعید المنجوی الی ثغر عدن وانما ذکرتہ ھنا لانی رایت فی ثبت شیخ المحدثین فی عصرنا بالدیار الیمنیۃ عماد الدین یحیی العامری ما یدل علی دخولہ الی ثغر عدن وذلک انہ ذکر فیہ ان الادیب الرئیس سعد بن سعید المنجوی اخذ

ابو محمد سعد بن مسعود المنجوی .... ان کے بارے میں مورخ جندی اور خزرجی دونوں نے کوئی ایسی بات بیان نہیں کی جس سے سعد بن سعید المنجوی کے ثغر عدن میں آنے کا حال معلوم ہوسکتا، میں نے ان کا ذکر یہاں اس لیے کیا ہے کہ میں نے اپنے دور کے یمنی شیخ المحدثین عماد الدین یحییٰ العامری کا ثبت[2] دیکھا ہے جس سے ان کی عدن میں آمد کا پتہ چلتا ہے، اس میں مذکور ہے کہ ادیب سعد بن سعید المنجوی خطب نباتیہ (مولفہ ابو یحییٰ عبد الرحیم ابن محمد بن محمد الفارقی المتوفی ۳۷۴ھ)

---

[1] تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۲۔ [2] جس میں محدث اپنے شیوخ حدیث کے مختصر حالات اور اسناد جمع کرتا ہے،

الخطب البناتية عن القاضي ابراهيم بن محمد القريظي بعدن باخذه لها عن الحسن بن محمد الصغاني بعدن، كذا وجدته في ثبت الحافظ العامري و الظاهر ان قوله بعدن ظرف لاخذ المنجوي عن القريظي وليس هو ظرف للقضاء المتصف به القريظي بدليل ذكره ذلك ايضاً في اخذ القريظي عن الصغاني فالظاهر ان المنجوي المذكور دخل عدن عند خروجه الى مكة والشام فاخذ عن القريظي الخطب النباتية ذلك ذكرته هنا[1]

قاضی ابراہیم بن محمد القریظی سے عدن میں پڑھتے تھے جس کی سند انھیں حسن بن محمد الصغانی سے عدن میں حاصل ہوئی تھی، اسی طرح میں نے حافظ عامری کے ثبت میں لکھا ہوا دیکھا ہے اور اس عبارت کے سیاق سباق سے ظاہر ہے کہ اس میں بعدن لاخذ المنجوی عن القریظی کا ظرف ہے اور یہ قضا کا ظرف نہیں ہے جس سے قریظی متصف ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ایسا ہی اخذ القریظی عن الصغانی میں ہے، جس سے ظاہر ہے کہ منجوی مذکور کی عدن میں آمد، صغانی کے مکہ اور شام کی طرف نکلنے کے بعد ہوئی ہے اور پھر منجوی نے قریظی سے خطب نباتیہ کی سند لی ہے، اسی لیے میں نے ان کا ذکر اس کتاب میں کیا ہے،

ان ہی ایام میں صغانی کی کشتی یمن کی حسب ذیل بندرگاہوں پر لنگر انداز رہی ہے، (۱) کنیسہ: یہ زبید سے متصل بحر یمن کی ایک بندرگاہ ہے، صغانی العباب لزاخر میں رقمطراز ہیں۔

الكنيسة مرسى من مراسي بحر

کنیسہ، بحر یمن کی بندرگاہوں میں سے ہے[1]

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۹۱

اليمن مما يلي زبيد للجائي من مكة حرسها الله تعالى قال الصغاني مولف هذا الكتاب ارسيت بها سنة خمس وستمائة[1]

جو یمن سے مکہ کی راہ آنے والے کے لیے زبید سے متصل ہے، صغانی اس کتاب العباب کا مولف کہتا ہے ۶۰۵ھ میں میں بھی یہاں آیا ہوں،

(۲) فرسان، یہ بھی جزائر بحر الیمن میں ایک خوفناک جزیرہ ہے اور مخلاف سلیمانی کے مقابل واقع ہے، صغانی فرماتے ہیں،

فرسان مثال غطفان جزيرة ماهولة من جزائر بحر اليمن قال الصغاني مولف هذا الكتاب ارسيت بها ايام سنة خمس وستمائة[2]

فرسان بروزن غطفان، جزائر یمن میں سے ایک خوفناک جزیرہ ہے، صغانی اس کتاب کا مؤلف کہتا ہے ۶۰۵ھ میں میں یہاں آیا ہوں۔

(۳) مراک، یہ بھی عدن سے متصل بحر یمن میں ایک بندرگاہ ہے، یہاں کئی مرتبہ صغانی گئے ہیں، سید مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں:

مراك كسحاب قال الصاغاني هو باليمن على ساحل البحر وفيه ترفأ السفن على مرحلة من عدن مما يلي مكة حرسها الله تعالى وقد ارسيت به مراراً و اول ذلك كان ۶۰۵ھ[3]

مراک بروزن سحاب ہے، صغانی کہتا ہے یہ مقام یمن میں سمندر کے کنارہ واقع ہے یہاں کشتیاں لنگر انداز ہوتی ہیں، یہ عدن کے اس علاقہ سے جو مکہ سے متصل ہے تقریباً ایک منزل کی مسافت پر واقع ہے، اس کشتی سے یہاں بار بار آیا گیا ہوں اور پہلی مرتبہ (۶۰۵ھ میں آیا ہوں)

[1] ملاحظہ ہو العباب لزاخر (روٹوگراف) مادہ کنس، نیز تاج العروس مادہ (کنس) [2] ایضاً ... (فرس) ...... (زبس)
[3] " تاج العروس مادہ (مرک)

(الف) ان ہی ایام میں کچھ دنوں یمن میں صغانی کا قیام محدث محمد بن بطال کے ساتھ بھی رہا ہے، اور ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہے،

محدث محمد بن احمد بطال الرکبی، علم وفضل اور زہد وتقویٰ میں یگانۂ عصر تھے، ارباب کمال سے کسب کمال کیا تھا، ابن ابی مخرمہ نے تصریح کی ہے کہ ایک نے دوسرے سے کسب فیض کیا ہے، ان کے الفاظ ہیں

واجتمع به الایام الحسن	یمن میں حسن بن محمد الصغانی اور
بن محمد الصغانی فاخذه	محدث ابن بطال کا کچھ عرصہ ساتھ رہا ہے
کل منهما عن الآخر[1]	اور ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہے،

(ب) بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حج کے قرب کی وجہ سے صغانی یہاں سے مکہ معظمہ واپس چلے گئے اور حج ادا کرنے کے بعد ٦٠٦ھ میں پھر یمن ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، اس مرتبہ حجاز سے آتے ہوئے جدہ میں عنبر مچھلی کی کھال کی جوتیاں بنوائی تھیں، چنانچہ العباب الزاخر میں فرماتے ہیں،

قال الصغانی مولف هذا الکتاب	اس کتاب کا مولف صغانی کہتا ہے کہ میں نے
رأیت اهل نجدة منصرفی من	٦٠٦ھ میں حجاز سے یمن جاتے وقت اہل جدہ
الحجاز الی الیمن سنة ست	کو دیکھا تھا کہ وہ عنبر مچھلی کی کھال کی جوتیاں
وستمائة یحتذون احذیة	استعمال کرتے تھے، اسکی کھال کی جوتیاں
من جلد العنبر فتکون اقوی	نہایت مضبوط اور پائیدار ہوتی ہیں
وابقی وامتن وارض ما تحذ	میں نے بھی اس کا بنا ہوا جوتا خرید اتھا،

(حاشیہ: ...ت منها نعلا ...[2])

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن ترجمہ محمد بن احمد بطال الرکبی [2] ملاحظہ ہو العباب لز اخر مادہ (عنبر) نیز تاج العروس اور مذکور، مگر تاج العروس میں اختصار ہے،

ہندوستان میں آمد اور یہاں کی سیاحت

(ت) ٦٠٦ھ میں صغانی ہندوستان واپس تشریف لائے، اس سے پہلے جتنے عرصہ یہاں رہے معلوم ہوتا ہے انھیں ملازمت کی وجہ سے سیر و سیاحت کا زیادہ موقع نہ مل سکا، اس مرتبہ آپ نے کہیں مستقل قیام نہیں کیا اور غالباً سارا وقت سیر و سیاحت میں گذرا،

یہ زمانہ ہندوستان کی سیاحت کے لیے یوں بھی موزوں تھا کہ صغانی علوم میں اب پوری مہارت حاصل کر چکے تھے، طلبہ کی جماعت سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہتی تھی، اسے پڑھاتے تھے، اور سیاحت کرتے تھے، صغانی کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا، ابن ابی مخرمہ کا بیان ہے

کان جوابا للبلاد	ملکوں، ملکوں سیر کرتے تھے،

صغانی خود ایک شعر میں فرماتے ہیں،

وکنت اسیر فی الآفاق من ملاء	ففرق الدهر افراسی وارسانی

میں رفقا کی ایک جماعت کیساتھ عالم کی سیر کرتا تھا، گردش دوراں نے آخر میری شہسواروں کو مجھ سے جدا کر دیا اور مجھے ایک جگہ ...

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کم سفر کرتے تھے، اور سفر و حضر میں رفقاء کی ایک جماعت ساتھ رہتی تھی، یہ وہ جماعت تھی جو صغانی سے کسب کمال کرتی تھی، اس سے انکی قبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اہل طلب انھیں سفر تک میں نہیں چھوڑتے تھے،

صغانی نے ہندوستان (دوآبہ گنگ وجمن، سندھ اور پنجاب) کی سیاحت اس طرح کی ہے کہ شاید ہی کوئی جگہ ایسی ہو جہاں سے ان کا گذر نہ ہوا ہو، یہی وجہ ہے کہ جن مقامات کے متعلق کوئی بات لکھی ہے وہ حقیقت اور مشاہدہ پر مبنی ہے،

(ث) ابن عباد نے خلیل لغوی کے حوالہ سے المحیط میں اور ابن عزیز نے دیوان الادب و میدان العرب میں نقل کیا ہے کہ دَگَنْگَصْ[1] بروزن سَفَرْجَلْ ہندوستان کا ایک دریا ہے،

[1] دگنگص معلوم ہوتا ہے کہ اہل فرنگ نے اسی لفظ گنگص سے Ganges بنایا ہے، اس لفظ میں چونکہ ایک نوع کا ثقل تھا، غالباً اسکے ازالہ اور تحسین صوت کی غرض سے اہل عرب نے ابتدا میں دال کا اضافہ کیا ہے،

اس پر بحث کرتے ہوئے صغانی العباب الزاخر میں لکھتے ہیں،

انی شرقت وغربت فی الهند
والسند ينفا واربعين سنة
وشاهدت اكثر انهارها
وبلغني اسماء مالم اشاهد
منها وهي تربي على تسعمائة
نهر فلم ار هذا النهر ولم اسمع
به غيران لهم نهرا عظيما
اذا زاد الماء يكون عرضه
فرسخا واذا نقص يكون مثلي عرض
دجلة في زيادة الماء وكفار
الهند يحجون اليه من اقطار
الهند فيتبركون به ويحلقون
عنده رؤسهم ولحاهم و
يسترجون فيه موتاهم على
السرر رجاء تمحيص ذنوبهم
على زعمهم ومن احترق من
ماتاهم يذرون جماجمه
ورماده فيه وهو من اشهر

میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب
میں تقریباً چالیس برس گھوما پھرا ہوں اور
میں نے یہاں کے بیشتر دریاؤں کو دیکھا ہے
اور جن کو میں نے نہیں دیکھا ہے، انکے ناموں
کا مجھے علم ہے، وہ نو سو سے اوپر دریا اور
نہریں ہیں، میں نے دکنکس نام کی کوئی نہر
دیکھی ہے اور نہ سنی، سوائے اہل ہند کے
اس بڑے دریا کے کہ جس کا پانی جب بڑھ
جاتا ہے تو اس کا عرض ایک فرسخ ہو جاتا ہے
اور جب گھٹ جاتا ہے تو نہر دجلہ کے عرض
سے دوگنا رہ جاتا ہے، ہندوستان بھر کے
کفار ہند سے بہ نیت ثواب جاتے
ہیں اور اسے متبرک سمجھکر برکت حاصل
کرتے ہیں، اس کے کنارے اپنی داڑھیاں
اور سر منڈاتے ہیں اور تختوں پر اپنی میتوں
کو رکھکر دریا برد کرتے ہیں اور ایسا
اس امید پر کرتے ہیں کہ ان کے اس عمل
سے ان کے گناہ دھل جاتے ہیں اور جو

انهارهم واسمه كنك
العباب الزاخر بحواله تاج العروس
ماده (رفص)

ان میں جو لوگ اپنے مردے جلا دیتے ہیں
وہ انکی کھوپڑیاں اور انکی راکھ لاکر دریا میں ڈال دیتے ہیں
یہ انکا مشہور دریا ہے اور اسی کا نام گنگ ہے۔

دیبل، سندھ کی مشہور بندرگاہ تھی، یہاں کے امرا کے متعلق صغانی کا بیان سننے کے قابل ہے فرماتے ہیں،

ديبل ...... قصبة بلاد
السند التي ترفاء اليها السفن
قال الصاغاني اهلها صلحاء
وامراءها طلحاء قديما وحديثا
يشاركون قطاع طريق سفن
البحر ويضربون معهم بسهم
(تاج العروس ماده "دبل")

دیبل[1] ...... بلاد سندھ میں ایک قصبہ ہے
جہاں یہ بندرگاہ واقع ہے، یہاں کشتیاں
لنگر انداز ہوتی ہیں، یہاں کے عام باشندے
نیک طینت ہیں، مگر قدیم امراء اور حکام ہی
نہیں بلکہ حال کے امراء و حکام بھی بد طینت ہیں،
قزاقان بحری کیساتھ رسم و رہ رکھتے ہیں اور لوٹ
کے مال میں اپنا حصہ بھی لیتے ہیں،

حدیثاً کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ دیبل ۶۴۷ھ تک آباد تھا،

---

[1] فتح سندھ کے اسباب میں ایک بڑا سبب اہل دیبل کی یہی بحری قزاقی کی دیرینہ عادت بھی تھی، یہ تاریخ سندھ کا مشہور واقعہ ہے کہ یہاں کے بحری قزاقوں نے خلیفہ عبدالملک کے عہد خلافت میں حاجیوں کے جہاز پر ڈاکہ ڈالا اور قبیلہ یربوع کی بیوہ عورت کا بھی مال لوٹ لیا اور اس نے بے اختیار حجاج کو مدد کے لیے پکارا، جب اس واقعہ کی خبر اس کو ہوئی تو وہ غصہ سے بے تاب ہو گیا اور جوش میں آکر کہہ اٹھا کہ "میں آیا"
یہی واقعہ آخر فتح سندھ کی تاریخی یادگار بنا، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو فتوح البلدان از ابو الحسن البلاذری مطبوعہ مصر ۱۹۳۲ء نیز چچنامہ مولفہ علی بن حامد الکوفی، مطبع لطیفی دہلی ۱۹۳۹ء

اسی سیر و سیاحت کا نتیجہ تھا کہ صغانی کو خصوصیت سے ہندوستان کے متعلق اپنی معلومات پر فخر تھا، چنانچہ العباب لزاخر میں جہاں کہیں ہندوستان کے متعلق کوئی بات کہی ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے، ایک موقعہ پر رقمطراز ہیں:

قال الليث رهطة ركايا	امام لغت لیث کا بیان ہو کہ رهطة
بالهند معربة يستقى منها	یہ لفظ معرب ہے اور ہندوستان کے
بالثيران قال الصاغانى	ایسے کنوؤں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے
اما ارض الهند فانا	جن سے پانی بیلوں کے ذریعہ کھینچا جاتا ہی،
ابن بجدتها وطلاع انجدتها	صغانی کہتا ہے: سرزمین ہند سے تو
ولیت بها هذه الركايا	میں خوب واقف اور اسکی پست و بالا
وانما الدولاب يسمى	زمینوں سے اچھی طرح باخبر ہوں .
بالهند ارهت فسمع بعض	ہندوستان میں رہٹ کنوؤں کو نہیں
السفر المستعربين المترددين	کہتے ہیں بلکہ دولاب کا نام ہے اور اسی کو
الى تلك البلاد يقولون	ہندی رہٹ بولتے ہیں، بعض ایسے مسافروں
ارهت فقال ارهط	نے جو عرب میں باہر سے آکر آباد ہوئے تھے
بالطاء فغيرها ليس	اور یہاں بھی گھوم پھر کر گئے انھوں نے یہ
فى كلامهم طاء ولا ينبئذ	کلمہ اہل ہند سے سنا تو انھوں نے رہط کہا
مثل خبير[1]	اور انھوں نے ٹ کو ط سے بدل لیا، کیونکہ
	اہل ہند کے یہاں طاء نہیں ہے، کوئی

---

[1] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ رهط

جن پرانے مورخین سے ہندوستان یا سندھ کے متعلق ان کی کتابوں میں غلط معلومات درج ہو گئی ہیں تو صغانی نے موقعہ بموقعہ اس کی تصحیح کر دی ہے، چنانچہ مورخ ابوالحسن البلاذری المتوفی ۲۷۹ھ نے کتاب البلدان میں لکھا ہے کہ بیلمان ہندوستان یا سندھ میں کوئی مقام ہے، اسی کی طرف سیوف بیلمانیہ منسوب ہیں، صغانی مجمع البحرین میں رقمطراز ہیں:

قال البلاذری فی الكتاب	بلاذری نے کتاب البلدان میں لکھا ہے
البلدان بيلمان بالسند	کہ بیلمان، ہندوستان یا سندھ میں
او الهند واليه ينسب	کوئی جگہ ہے اور اسی کی طرف بیلمانی تلواریں
السيوف البيلمانيه قال	منسوب ہیں، اس کتاب کا مولف صغانی
الصغانى مؤلف هذا الكتاب	کہتا ہے، ہندوستان اور سندھ میں
لا اعرف بالسند ولا بالهند	کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جو بیلمان کے
موضعاً يقال له بيلمان[1]	نام سے مشہور ہو،

یہاں کم و بیش تین برس سیر و سیاحت میں گذارے، پھر صغانی حج کے لیے روانہ ہوئے، ۶۱۰ھ میں حج ادا کیا اور مکہ معظمہ سے عدن آگئے۔ (باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو مجمع البحرین، روٹوگراف، سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی، مادہ 'بلم' معلوم ہوتا ہے سید مرتضی زبیدی کو مجمع البحرین کا یہ حصہ نہیں ملا تھا، اس لیے تاج العروس میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ، مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات، خلافت راشدہ کے زمانے سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، انکی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی، تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے،

قیمت: ۔/۷ مینجر

امام لغت حسن بن محمد الصغانی اللاہوری

از

مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۳)

عدن میں قیام

صغانی جب عدن میں آئے تو مسجد ابن البصری میں قیام فرمایا، ان کے پاس چونکہ ہمہ وقت طلبہ کا ہجوم رہتا تھا۔ اس لئے آپ درس و تدریس کی غرض سے مسجد میں قیام کرتے تھے، ابن ابی مخرمہ نے مورخ جندی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ صغانی جب عدن میں آتے تھے تو مسجد ابن البصری میں قیام کرتے تھے، لکھتے ہیں،

قال الجندی وکان وقوفه فی	مورخ جندی کا بیان ہے صغانی کا
عدن فی المسجد الذی یعرف	قیام اس مسجد میں ہوتا تھا جو مسجد ابن البصری
بمسجد ابن البصری احد تجار	کے نام سے مشہور ہے، ابن البصری
عدن ولیس هو الذی اسسه	عدن کے سوداگروں میں سے تھے.
وانما کان یقوم به ویصلح[۱]	یہ اس مسجد کے بانی نہ تھے، بلکہ اس کی مرمت
ماتشعث منه وکان الذی	اور دیکھ بھال کرتے تھے، یہ مسجد وزیر یاسر
اسسه الشیخ الوزیر یاسر بن	ابن بلال محمدی نے بنوائی تھی

بلال المحمدی

---

[۱] تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۵۲

صغانی جب یہاں آئے تو اپنے ساتھ پورا کتب خانہ لیکر آئے تھے، ان کے پاس نقد روپیہ بھی کافی تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی امیر کبیر شاگرد نے نذر کیا ہوگا، عدن کے دوران قیام کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے۔

ابو الربیع سلیمان بن الفقیہ
بطال محمد بن احمد بن محمد بن
سلیمان ابن بطال الرکبی
کان فقیہاً دیناً عالماً فاغلب
علیہ العلم والحدیث
والادب وغالب اخذہ
عن ابیہ وعن الامام الصغانی
مقدم الذکر ان الصغانی
لما دخل عدن کتب الیہ یستحثہ
علی الوصول الیہ وقد کانت
بینہما الفۃ ایام وقوفہ
عند الفقیہ بطال بسبب
القراءۃ فکان یعجبہ ما یری
فیہ النجابۃ والشہامۃ متوقفا
لہ صلنی معجلا ولا یصحبک
غیر زاد الطریق فعندی

ابو الربیع سلیمان بن الفقیہ بطال محمد بن
احمد ۔۔۔۔۔۔ الرکبی بڑے فقیہ،
نہایت دیندار اور عارف کامل تھے۔
ان پر علم حدیث، ادب اور علم دین کا غلبہ
تھا، علوم کی تحصیل بیشتر اپنے والد اور
امام صغانی رح کا تذکرہ گزر چکا ہے سے
کی تھی، صغانی جب عدن آئے تھے تو
انھیں ایک خط لکھا تھا جس میں ملنے کی
تاکید کی تھی، ان میں باہم دوستی اور محبت
اسی وقت سے قائم ہوگئی تھی جب صغانی رح
کا قیام ان کے والد کے یہاں تھا اور یہ
اس وقت پڑھتے تھے، ان کی شرافت،
ذکاوت اور تندہی نے صغانی کو حیرت
میں ڈال رکھا تھا، صغانی رح نے اپنے
مکتوب میں لکھا تھا کہ جلد آکر مجھ سے
ملو اور زاد راہ کے سوا اپنے ساتھ کچھ لو

عشرۃ احمال من الورق
والورق فلما وقف علی کتابہ
بادر ونزل فلما دخل عدن
واقام عند الفقیہ الصغانی
کان الناس یصلون المسجد
یتعجبون من حسنہ زمراً
زمراً لیس غرضہم الا
التعجب من حسنہ وجمالہ
وکان النساء یصلن لیلا
یظہرون ان غرضہم
زیارۃ الامام الصغانی فلما
کثر ذلک منہم واشتہر امر
والی عدن یومئذ بحبسہ
خشیۃ الفتنۃ فلما صار فی
الحبس کان یکتب حروف
ابجد مقطعۃ ویامر بکل
ورقۃ تباع فیشتروہ
اولاد التجار کل ورقۃ
بخمسۃ دنانیر یتحرزون

کیونکہ میرے روپیہ پیسے اور کتابوں کا
وزن دس اونٹ سے کم نہیں ہے جونہی
ابو الربیع کو یہ خط ملا وہ فوراً روانہ ہوگئے اور
عدن آکر دم لیا، عدن میں صغانی کے پاس
آکر قیام کیا، ان کی آمد کے بعد لوگ جوق
درجوق اس مسجد میں آتے اور ان کے حسن
وجمال کو دیکھکر حیرت میں پڑ جاتے، ان لوگوں
کے آنے کی غرض صرف ان کے حسن خدا
داد کو دیکھنا تھا، عورتیں بھی رات کو آتی
تھیں، اور ظاہر کرتی تھیں کہ انکا مقصد
امام صغانی رح کی زیارت ہے جب یہ آمد ورفت
بہت بڑھ گئی اور اس کا چرچا ہونے لگا تو
حاکم عدن نے ان کو فتنہ کے خوف سے
قید کرنے کا حکم صادر کردیا، انھوں نے
جیل میں ابجد کے حروف مقطعات کو
لکھنا شروع کیا جب ایک ورق ہوجاتا
تو باہر بیچنے کے لیے بھیجدیا کرتے تھے
سوداگروں کے لڑکے ہر وصلی پانچ دینار
میں خرید لیتے تھے، اور آپ اسی کی

علیها فکان یستعین بذالك[1]	آمدنی پر بسر کرتے تھے، جب صغانیؒ نے
علی امرہ فلما عزم الصغانی	عدن سے نکلنے کا ارادہ کیا تو حاکم عدن
علی الخروج من عدن	نے انھیں بھی چھوڑ دیا، چنانچہ دونوں
اخرجه الوالی فخرجا جامعاً	عدن سے ایک ہی ساتھ نکلے۔

عدن کے قیام کے زمانہ میں یہاں کے علماء اور فضلاء نے آپ سے حدیث وغیرہ کی تحصیل کی تھی، ابن ابی مخرمہ لکھتے ہیں۔

قدم الیمن مرارا، فاقام فی	صغانیؒ بارہا یمن آئے اور عدن میں ٹھہرے،
عدن فقصده جمع من الفضلاء	علماء فضلاء کی ایک بڑی جماعت نے
العلماء واخذ واعنه	حاضر خدمت ہو کر علوم کی تحصیل کی۔

یہاں صغانی امام خطابی کی معالم السنن کا درس دیتے تھے جو ان کی نہایت پسندیدہ کتاب تھی، یاقوت رومی کا بیان ہے۔

کان یقرأ علیه بعدن معالم	عدن میں معالم السنن کا درس دیتے
السنن للخطابی وکان معجبا	تھے، وہ اس کے مولف اور اس کے
بهذا الکتاب وبکلام مصنفه	مباحث علمیہ کو بہت پسند کرتے تھے،
ویقول ان الخطابی جمع	اور فرمایا کرتے تھے کہ خطابی نے اس
هذا الکتاب جرامیزه[2]	کتاب میں دریا کو کوزے میں بند کیا ہے،

درس و تدریس کے بعد جو وقت ملتا تھا، اس میں صحیح بخاری کی نقل کرتے تھے، چنانچہ اسکے

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن جلد ۲ ترجمہ سلیمان بن بطال، [2] ملاحظہ ہو معجم الادباء طبع دوم مطبعہ ہندیہ مصر ۱۹۲۷ء جلد ۳ صفحہ ۲۱۸۔

کئی نسخے لکھکر یہاں وقف کئے تھے، ابن ابی مخرمہ تحریر فرماتے ہیں۔

کتب بیده نسخ من صحیح البخاری	صغانیؒ نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری کے
واوقفها[1]	نسخے کئے اور انھیں وقف کر دیا،

عدن سے صغانیؒ یمن آئے یہاں بھی ان کے علم و فضل کا بازار گرم رہا، یاقوت حموی، ارشاد الاریب میں رقمطراز ہیں۔

دخل الیمن نفق بها سوق	جب یمن آئے تو یہاں بھی ان کے علم کی بڑی
	گرم بازاری رہی۔

عدن میں صغانیؒ کا قیام دو ڈھائی سال رہا تھا، ۶۱۳ھ میں یمن سے مکہ معظمہ حج کرنے چلے گئے، اسی سال حج کے موقع پر یاقوت رومی سے آپکی ملاقات ہوئی تھی، جس کا یاقوت نے ارشاد الاریب میں تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں

فی سنة ۶۱۳ کان بمکة وقد	۶۱۳ھ میں صغانی مکہ میں تھے، اور یمن سے
رجع من الیمن واخر العهد به[2]	واپس آئے تھے ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔

مکہ سے مراجعت ۶۱۳ھ میں صغانی حج و زیارت سے فراغت کے بعد ہندوستان واپس آگئے، اور دو برس تک یہیں رہے، مگر یہ معلوم ہو سکا کہ اس دوران میں کیا شغل رہا، اور کہاں کہاں رہے، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ درس و تدریس کا شغل یہاں بھی جاری رہا ہوگا،

۶۱۴ھ میں صغانیؒ نے پھر حج کی نیت سے رخت سفر باندھا، اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے بیان کے مطابق حج کے بعد مکہ معظمہ سے خلافت اسلامیہ کے مرکز بغداد کا ارادہ فرمایا، ۶۱۵ھ میں بغداد پہنچے، یہ بغداد میں ان کی پہلی آمد تھی، العباب الزاخر میں فرماتے ہیں۔

[1] ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۲ [2] ملاحظہ ہو الارشاد الاریب ج ۳ ص ۲۱۸

قال الصاغانی قدمت	صغانی کہتا ہے کہ میں بغداد میں پہلی
بغداد سنة ٦١٥ وهی اول	مرتبہ ۶۱۵ھ میں آیا تھا۔
قدمتی الیها[1]	

مورخ ذہبی نے بھی تاریخ اسلام میں ان کی بغداد میں آمد کا سال ۶۱۵ھ نقل کیا ہے[2]۔

بغداد صدیوں سے علم و ہنر کی نمایش گاہ بنا ہوا تھا، محدثین، فقہاء اور ادباء کا بہت بڑا مرکز تھا، بعض محدثین صغانی سے بھی زیادہ عالی اسناد کے حامل تھے، لیکن ...... ان سے بڑے حافظ حدیث نہ تھے۔ صغانی العباب الزاخر میں رقمطراز ہیں۔

قال الصاغانی قد سمعت	صغانی کہتا ہے میں نے چار سو سے زیادہ
من الاحادیث السلسلة	مسلسل حدیثیں ہندوستان، مکہ معظمہ، یمن
بمکة حرسها الله تعالی	اور بغداد میں سنی ہیں، مجھے معلوم نہیں
والهند والیمن وبغداد	کہ کسی کو اتنی مسلسلات یاد ہوں۔
ماینیف علی اربعمائة حدیث	....
ولم یبلغنی ان احدا اجتمع	....
ت هذا القدر من السلسلا	....
الحمد لله حمدا دائما ابدا	تمام تعریفیں ابد تک اللہ تعالیٰ ہی کیلئے
اعطانی الله مالم یعط احدا	ہیں جس نے مجھے وہ کچھ عطا کیا ہے جو اور
	کسی کو عطا نہیں کیا۔

اس بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صغانی نے بغداد میں بعض محدثین سے مسلسلات کا

[1] العباب الزاخر بحوالہ تاج العروس مادہ (قرط) [2] تاریخ الاسلام ترجمہ حسن بن محمد الصغانی

سماع کیا تھا، باقاعدہ حدیث نہیں پڑھی تھی، ذہبی نے تاریخ الاسلام میں جو یہ لکھا ہے سمع ...... ببغداد من ابی منصور سعید بن محمد بن الرزاز اس سے مراد مسلسلات ہی کا سماع ہے، فن حدیث کی تحصیل نہیں ہے۔

بغداد میں بھی صغانی کے قدرشناسوں کی کمی نہ تھی، چنانچہ ان کی حدیث دانی اور اہل علم کی قدرشناسی نے صغانی کو خلیفہ بغداد المستنصر باللہ تک پہنچا دیا، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا بیان ہے کہ جب صغانی بغداد پہنچے، وہاں کسی درس حدیث کی مجلس میں گئے تو دیکھا کہ ایک محدث حدیثیں بیان کر رہا ہے اور لوگ اسے لکھ رہے ہیں، آپ بھی وہیں بیٹھ گئے، اس وقت وہ یہ حدیث بیان کر رہا تھا کہ جب موذن اذان کہے تو سامعین کو چاہیے کہ اذان میں اسکی موافقت کریں، حدیث کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا: اذا اسکب المؤذن الخ سکوب کے معنی ڈالنے کے ہیں، صغانی نے پاس بیٹھے ہوئے شخص سے کہا، حدیث میں اذا سکت المؤذن ہے، آناً فاناً یہ بات محدث صاحب کے کانوں تک پہنچ گئی، انھوں نے پوچھا یہ کس نے کہا، صغانی بولے، میں نے، انھوں نے کہا دونوں جلے بامعنی ہیں، جب مجلس ختم ہوگئی تو کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا، اس میں دونوں طرح موجود تھا لیکن اذا سکت المؤذن کی بابت لکھا تھا کہ زیادہ صحیح ہے۔

اس واقعہ کی خبر جب خلیفۂ وقت کو ہوئی تو اس نے آپ کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور آپ سے حدیث پڑھکر سند لی، فوائد الفواد میں یہ واقعہ اس طرح سے منقول ہے:

بعد ازاں خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر فرمود کہ کار او بیک حدیث پیش نہ رفت ......
الغرض چوں بحج رفت و از آنجا بہ بغداد آمد، در بغداد عالمے بود محدث بس بزرگ
اورا ابن زہری گفتندے، برائے او منبرے کردہ بودند او بر آنجا بر آمدے و حدیث
بیان کردے و علمائے در مجلس او حاضر شدندے، دگر در گرد او حلقہ کردندے آنہا کہ

اہل تر بودندے، پیش او بودندے و آنہا کہ از ایشان کمتر در حلقہ دوم، و دیگراں در حلقہ دیگر، ہمچنیں تو بر تو نشستندے او حدیث املا کردے، و ایشان می نبشتندے تا مولانا رضی الدین، روزے در آں مجمع در آمد و در حلقہ کہ دور تر بود بنشست، ابن زہری حدیثے بیان می کرد، در باب موافقت نمودن با موذن تا جائے کہ موذن می گوید مستمع را می باید کہ ہمچناں بگوید آغاز حدیث بریں لفظ کرد اذا سکب المؤذن، سکوب ریختن است یعنی چوں سخن موذن در گوش شما برسد شما ہمچناں بگوئید کہ او می گوید چوں ابن زہری ایں حدیث بگفت مولانا رضی الدین در مقامے کہ نشستہ بود آہستہ با دیگراں گفت کہ اذا سکت المؤذن یعنی چوں موذن کلمہ بگوید و ساکت شود بر آں گفتہ باید کرد آنکہ ایں سخن بشنید با دیگرے گفت داد با دیگرے تا ایں سخن بسمع ابن زہری رسید، آواز داد کہ آں کیست کہ ایں سخن بگفت مولانا رضی الدین گفت کہ من گفتم بعد ازاں ابن زہری گفت کہ ہر دو سخن معنی دارد بکتاب رجوع کردند ہر دو سخن موجہ بود، چوں ازاں مجلس برخاستند در کتب باز دید ہر دو سخن موجہ نبشتہ بودند و اذا سکت اصح، ایں خبر بخلیفہ رسید مولانا رضی الدین را پیش بردند خلیفہ او را اعزاز کرد و چیزے پیش او بخواند۔"

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان میں محدث ابن زہری کا ذکر تاریخی اعتبار سے محلِ نظر ہے، جس زمانہ میں صغانی کا بغداد میں ورود ہوا ہے اس دور میں ہمیں اس نام کا کوئی محدث تاریخ و سیر کی کتاب میں نہیں ملتا، ابن زہری کے نام سے جن محدثین کا تذکرہ تاریخ و رجال کی کتابوں میں ہے، ان کی ولادت صغانی کی وفات کے بعد ہے، ہمارے خیال میں یہاں نقل میں تصحیف ہو گئی ہے۔

ابن زہری دراصل ابن جوزی ہے، اس میں غالباً ج کا شوشہ واؤ میں مندرج ہو گیا اور ز کا نقطہ ر کی شکل اختیار کر گیا، اس طرح ابن زہری پڑھا گیا۔

جن کتابوں میں اس دور کے علماء کا تذکرہ تھا، افسوس ہے کہ وہ کتابیں دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں، صرف یہی نہیں بلکہ اس دور کے محدثین اور علماء کے بہت سے ناموں میں بھی تصحیف ہوئی ہے، چنانچہ سید ناجی معروف نے، ایسے متعدد نام گنائے ہیں، ہم بھی قارئین کی توجہ کے لئے انکو ذیل میں درج کرتے ہیں، جس سے یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ ناموں میں کس کس طرح سے تصحیف ہو جاتی ہے، سعید ناجی معروف لکھتے ہیں

لقد اصاب التحریف والتصحیف
من اسماء رجالها والقابهم
اوکناهم کلها او بعضها کان
لابد للباحث من الوصول
الی اشکالها الصحیحة
بالرجوع الی المظان المختلفة
لیخرج بصورة صحیحة عن
هذه المدرسة بقدر الامکان
فان ابن الطبال احد شیوخ
الحدیث ..... یذکر بصورة
البطال مرة والطفال حینا
الطحال حینا آخر وابن

مدرسہ مستنصریہ کے علماء کی کنیتوں، لقبوں
اور ناموں میں جزئی اور کلی ہر طرح کی تحریف
اور تبدیلی ہوئی ہے، ان علماء کے ناموں
سے بحث کرنے والے کے لیے ناموں
کی صحیح اور اصلی شکلوں تک پہنچنا ضروری
ہے اور یہ تراجم و رجال کی مختلف کتابوں
سے رجوع کرنے کے بعد ہی اس مدرسہ کے
علماء کے ناموں کی صحیح شکلوں سے واقفیت ممکن ہے،
دیکھو ابن الطبال جو اس مدرسہ کے شیوخ
حدیث میں سے تھے ان کا نام کبھی بطال
کی صورت میں اور کبھی طفال کی شکل
میں اور کبھی طحال کی صورت میں ذکر کیا جاتا ہے

الغویرۃ شیخ دار الحدیث بالمستنصریۃ یذکر علی صورۃ الغویرۃ والعویدۃ والقویزۃ تارۃ اخری وابن ایاز قد تحول الی سراباز [1]

اسی طرح سے ابن الغویرہ جو مدرسہ مستنصریہ کے شیخ الحدیث تھے، ان کا نام بھی کبھی غویرہ اور کبھی عویدہ اور کبھی قویزہ کی شکل میں مذکور ہے اور اسی طرح ابن ایاز کو سراباز کردیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ ابن زہری اصل میں ابن جوزی ہے یہ واضح رہے، یہ ابوالفرج عبدالرحمن ابن الجوزی نہیں ہیں جو عام طور پر مشہور ہیں بلکہ ان کے فرزند ابوالمحاسن محی الدین یوسف بن ابی الفرج عبدالرحمن التیمی البکری، الحنبلی البغدادی ہیں، جو استاد دار مستعصم باللہ اور ابن الجوزی کے نام سے بھی مشہور تھے، مورخ ابن کثیر لکھتے ہیں

محی الدین یوسف وکان انجب اولادہ واصغرہم ولد سنۃ ثمانین و وعظ بعد ابیہ واشتغل وحرر واتقن وساد اقرانہ ثم باشر حسبۃ بغداد ثم صار رسول الخلفاء الی الملوک باطراف البلاد ولاسیما الی بنی ایوب بالشام وقد حصل منہم من الاموال

محی الدین یوسف، عبدالرحمن الجوزی کے سب سے چھوٹے اور لائق فرزند تھے ۵۸۰ھ میں پیدا ہوئے اپنے والد کے بعد وعظ کہتے تھے، انھوں نے علوم کی تحصیل کی اور بڑے اچھے ادیب اور متقن عالم ہوئے اپنے ہمعصروں میں سب سے فائق تھے، بغداد میں احتساب کے عہدہ پر فائز ہو گئے تھے ان کو بادشاہوں کے پاس سفیر بنا کر اسلامی ممالک

[1] مجلۃ کلیۃ الآداب العلوم شمارہ نمبر ۳ ۱۹۵۸ء مضمون بعنوان مقدمۃ فی تاریخ المستنصریۃ وعلمائہا

والکراعات ما ابتنی، من ذلک بناء المدرسۃ الجوزیۃ التی بالنشابین بدمشق ثم صار استاذ دار الخلیفۃ المستعصم فی سنۃ اربعین وستمائۃ واستمر مباشرہا الی ان قتل مع الخلیفۃ عام ہلاکو من تولی بن جنکیز خان [1]

بھیجا گیا خاص طور سے شام میں شاہان بنی ایوب کی طرف، اور ان سے انکو بڑے تحفے اور دولت ملی جس سے انھوں نے دمشق میں نشابین میں مدرسہ جوزیہ بنوایا اور ۶۴۰ھ میں خلیفہ مستعصم باللہ کے شاہی خاندان کے اتالیق مقرر ہوئے اور اسی خدمت پر مامور رہے تاآنکہ خلیفہ کے ساتھ ہی ہلاکو خان کے حملہ بغداد میں شہید ہو گئے

جس سال صغانی کا بغداد میں ورود ہوا اسی سال موصوف کو انکے احتساب کا محکمہ ... سپرد ہوا مگر ان کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا، درس و تدریس اور وعظ و تقریر کا سلسلہ برابر جاری رہا ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ۶۱۵ھ کے واقعات میں اس کا ذکر کیا ہے اور ۶۲۳ھ کے واقعات میں اس کی تصریح کی ہے کہ ۶۳۲ھ میں مدرسہ مستنصریہ میں فقہ کی تعلیم کے لئے آپ کا تقرر عمل میں آیا تھا، اسی تذکرہ میں ان کے قلم سے یہ بھی نکل گیا ہے

وکانت لہ مدارس اخر

وہ اور درسگاہوں میں بھی پڑھاتے تھے،

مورخ ابن العماد الحنبلی المتوفی ۱۰۸۹ھ، شذرات الذہب میں لکھتے ہیں

وعلا امرہ وعظم شانہ وولی الولایات الجلیلۃ ثم عزل

شیخ موصوف کو بڑے اختیارات حاصل تھے آپ کا رتبہ نہایت بلند تھا اور بڑے بڑے

[1] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ بحوالہ الدارس فی المدارس تالیف عبدالقادر النعیمی المتوفی ۹۲۷ھ مطبوعہ دمشق ۱۹۵۱ء ج ۲ ذکر مدارس حنابلہ

عن جميع ذالك وانقطع فی دارہ — عہدوں پر فائز تھے، پھر آپ کو ان عہدوں

یعظ ویفتی ویدرس ثم اعید — سے معزول کر دیا گیا اور آپ نے اپنے مکان میں

الی الحسبة[1] — درس و تدریس اور وعظ و تقریر کا سلسلہ شروع

کر دیا، پھر ۶۱۵ھ میں آپ کا تقرر احتساب کے عہدہ پر ہوا

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ احتساب کے عہدہ پر تقرر سے قبل آپ کے گھر میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، غالباً مذکورۂ بالا واقعہ انہی کی مجلس میں پیش آیا ہے۔

ابن کثیر کے مذکورۂ بالا جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ درس و تدریس کا شغل برابر جاری رہا اور یہ درس بغداد میں کئی جگہ ہوتا تھا، اس لیے بہت ممکن ہے کہ مذکورۂ بالا واقعہ ان ہی کی مجلس درس میں پیش آیا ہو، اور انھوں نے خلیفۂ وقت سے صغانی کا تعارف کرایا ہو، کیونکہ وہ بلند پایہ محدث، فقیہ، ادیب، اچھے شاعر اور اہل علم کے بڑے قدردان تھے، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ آپ نے صغانی کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر ان کا خلیفہ سے تعارف کرایا ہو۔

محی الدین یوسف ابن جوزی (جن کا تذکرہ اوپر گذر چکا) جیسے بلند پایہ محدث کی مجلس درس میں ایسا واقعہ پیش آنا چنداں مستبعد نہیں، کیونکہ اس زمانہ میں علوم کا ذخیرہ محدثین اور علماء کے حافظہ یا ان کی امالی میں محفوظ ہوتا تھا، استاد وقت جو کچھ پڑھاتا یا املا کراتا وہ اکثر و بیشتر زبانی کراتا تھا، مذکورۂ بالا واقعہ بھی اسی قسم کا تھا، یہی وجہ ہے کہ جب اصل کتاب کی طرف رجوع کیا گیا تو صغانی کے قول کے راجح اور صحیح ہونے کا ثبوت کتاب کے اندر ہی مل گیا اور انھیں صغانی کے حافظہ اور ژرف نگاہی کا قائل ہونا پڑا۔

---

[1] ملاحظہ ہو شذرات الذہب، مکتبۃ القدسی مصر ۱۳۵۱ھ ج ۵ ص ۲۸۷

مقالات

امام لغت حسن بن محمد الصغانی اللاہوری

از

مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۴)

علمائے بغداد اور صغانی

بغداد میں گو اہل علم اور محدثین کی کمی نہ تھی، مگر ایسے محدثین اور علماء جو فن حدیث اور لغت میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے ہوں بہت کم تھے، معلوم ہوتا ہے جب صغانی کا ورود بغداد میں ہوا اور ان کے علم و فضل کا شہرہ اہل علم نے سنا تو بعض محدثین نے کچھ ایسی باتیں بھی آکر ان سے دریافت کیں جن میں متقدمین محدثین میں بھی باہم اختلاف تھا، انہی میں سے ایک لفظ قراریط بھی ہے، یہ لفظ قراط اور قیراط کی جمع ہے، جو دینار کا ۱/۲۴ حصہ ہے،[1] بغداد میں جو محدث حافظ الحدیث کے لقب سے مشہور تھے، انھوں نے اس لفظ کے متعلق ایک غیر محقق قول (کہ قراریط

---

[1] واضح رہے کہ صغانی نے قراریط کے ایک معنی دانۂ تمر ہندی کے لکھے ہیں، چنانچہ مجمع البحرین (مادہ قرط) میں رقمطراز ہیں:

القراط ویقال القراریط حب الحمص وھو التمر الھندی قرأته فی شرح شعر حسان ابن ثابت

قراط اور اسکو قراریط بھی کہتے ہیں، یہ چھاڑی کا دانہ ہے اور یہی تمر ہندی ہے، یہ لفظ میں نے حضرت حسان رض ابن ثابت کے ایک شعر کی شرح میں پڑھا ہے،

مکہ معظمہ میں ایک جگہ کا نام ہے جو تاریخ سے ثابت نہیں ہے) کو قول محقق سمجھ رکھا تھا، اور یہی اپنے شاگردوں کو بھی باور کرایا تھا، صغانی نے ان کے اس خیال کو قطعی غلط قرار دیا، مگر انھوں نے غالباً اپنے شیخ کی ہتک کی وجہ سے اس قول کے قبول کرنے سے انکار کیا، جیسا کہ سید مرتضیٰ زبیدی العباب کے حوالہ سے تاج العروس میں ناقل ہیں،

قال الصاغاني قدمت بغداد	صاغانی کا بیان ہے کہ ۶۱۵ھ میں جب
سنة ٦١٥ وهي اول قدمتي	بغداد میں آیا اور یہ میری پہلی آمد تھی تو بعض
اليها[1] فسألني بعض المحدثين	محدثین نے مجھ سے قراریط کے معنی پوچھے
عن معنى القراريط في هذا الحديث	جو اس حدیث میں وارد ہیں کہ حضرت ابوہریرہؓ
عن ابي هريرة عن النبي صلى الله	حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے راوی ہیں کہ آپ نے
عليه وسلم قال ما بعث الله نبيا	فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس نے
الا رعى الغنم فقال اصحابه	بکریاں نہ چرائی ہوں تو صحابہ نے عرض کیا کہ آپ نے
وانت؟ فقال نعم كنت ارعاها	بھی بکریاں چرائی ہیں؟ فرمایا ہاں میں بھی
على قراريط لاهل مكة	کچھ قراطوں کے عوض مکہ والوں کی بکریاں
(الجامع الصحیح، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۵۴ھ	چرایا کرتا تھا) میں نے کہا کہ اس سے مراد
ج ۱ ص ۳۰۱) فقلت المراد به	حساب کے قراریط ہیں، اس (سائل) نے کہا
قراريط الحساب فقال سمعنا	ہم نے فلاں حافظ الحدیث کو کہتے ہوئے

[1] سید مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس (مادہ صغن) میں علامہ ذہبی کے حوالہ سے صغانی کی بغداد میں آمد کا سال ۵۹۵ھ نقل کیا ہے، لیکن یہ تاریخ الاسلام میں شمس الدین الذہبی کے بھی نقل کردہ سنہ کے خلاف ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تصحیف ہو گئی ہے۔

الحافظ الفلاني يقول ان القراريط	سنا ہے کہ قراریط پہاڑ یا کسی جگہ کا نام ہے،
اسم جبل او موضع فانكرت	میں نے اس کا نہایت سختی سے انکار کیا
كل الانكار وهو مصر على ما قال	مگر اس نے جو کہا تھا اس پر اصرار کرتا رہا،
كل الاصرار اعاذنا الله	اللہ تعالیٰ ہمیں غلطی، خطا، لغزش
من الخطاء والخطل والتصحيف	اور تحریف سے بچائے۔
والزلل[1]	

صغانی نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کیے، ان کا ذکر انھوں نے گو اس موقعہ پر نہیں کیا، لیکن ظاہر ہے کہ انھوں نے جن کتابوں کو سامنے رکھکر ان کتابوں کو مرتب کیا ہے (جن کا تذکرہ انشاء اللہ تالیفات اور تصانیف کے عنوان میں آئے گا، جن کا بیشتر حصہ بغداد کی تباہی میں ضائع ہو گیا اور محققین کو پھر ان کا دیکھنا بھی نصیب نہ ہو سکا) ان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صغانی کی تحقیق صحیح ہو گی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لغت کی کتابوں کے آخر میں لکھا ہے کہ اصول اور امہات الکتب کی طرف مراجعت کے بغیر یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ کوئی ضعیف اور کمزور قول ان کتابوں میں نقل کر دیا گیا، مجمع البحرین کے آخر میں رقمطراز ہیں:

فمن رابه شئ مما في هذا	جسے ان الفاظ میں جو اس کتاب میں درج
الكتاب فلا يتسارع الى القدح	ہیں کوئی شک و شبہ ہو تو اسکو جرح و قدح
والتزييف والنسبة الى	کرنے اور تصحیف و تحریف کی طرف نسبت
التصحيف والتحريف حتى يعاود	کرنے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے جب تک
الاصول التي استخرجته	کہ وہ ان اصولی کتابوں کو نہ ٹٹول لے

[1] ملاحظہ ہو العباب الزاخر بحوالہ تاج العروس (مادہ قرط)

منها والماخذ التی علی تلک الاصول وانها تربی علی الف مصنف[1]

جن سے میں نے ان الفاظ کو لیا ہے اور ان ماخذوں کو دیکھ لے جن سے میں نے ان الفاظ کو مرتب کیا ہے، اور وہ ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔

صغانی کے مذکورۂ بالا قول کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ بعد کے نامور محققین اور محدثین نے اس قول کو اختیار نہیں کیا جس کو صغانی نے غلط قرار دیا ہے، اور انھوں نے مخالفین کے دعویٰ کے ثبوت میں جو دلائل نقل کیے ہیں ان کا معقول جواب دیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث پر مختصر اور جامع کلام کیا ہے، ہم اس کو یہاں اس لیے نقل کرتے ہیں کہ اس میں مخالفین کے دلائل اور ان کا جواب ہے جس سے اس بحث کی اصل حقیقت ناظرین کے سامنے واضح ہوجائے گی، موصوف تحریر فرماتے ہیں:

قوله علی قراریط اهل مكة فی روایة ابن ماجة عن سوید بن سعید عن عمرو بن یحیی كنت ارعاها لاهل مكة بالقراریط ...... قال سوید احدا ردلته یعنی كل شاة بقیراط یعنی القیراط الذی هو جزء من الدینار او الدراهم قال ابراهیم الحربی قراریط اسم موضع بمكة ولم یرد

بخاری کی روایت میں علی قراریط لاهل مكة کے الفاظ ہیں اور سنن ابن ماجہ میں سوید بن سعید عن عمرو بن یحیی (جو ابن ماجہ کے شیخ ہیں) کی سند سے كنت ارعاها لاهل مكة کے الفاظ وارد ہیں، سوید جو اس روایت کے راویوں میں سے ہیں، انھوں نے قراریط کا ترجمہ كل شاة بقیراط سے کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ میں ہر بکری قیراط کے عوض چراتا تھا جو دینار اور درہم کا ایک جزء ہے، ابراہیم

[1] ملاحظہ ہو مجمع البحرین (فوٹو گراف)، سنٹرل اسلامک ریسرچ انسٹیوٹ کراچی،

القراریط من الفضة وصوبه ابن جوزی تبعا لابن ناصر وخطاء سوید فی تفسیره لكن رجح الاول لان اهل مكة لایعرفون بها مكانا یقال[1] قراریط واما ما رواه النسائی من حدیث نصر بن حزن .... قال افتخر اهل الابل واهل الغنم فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم بعث موسی وهو راعی غنم وبعث داؤد وهو راعی غنم وبعثت وانا ارعی غنم اهلی بجیاد فزعم بعضهم ان فیه ردا لتاویل سوید بن سعید لانه ما كان یرعی بالاجرة لاهله فیتعین انه اراد المكان فعبر تارة بجیاد وتارة بقراریط ولیس المراد بجیاد اذن مانع من

الحربی کا بیان ہے کہ قراریط مکہ معظمہ میں ایک جگہ کا نام ہے، اور انھوں نے حدیث مذکور میں قراریط سے یہی معنی مراد لیے ہیں، ابن الجوزی نے محدث ابن ناصر کی اتباع میں اسی قول کو صحیح قرار دیا ہے اور سوید کی تفسیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا، لیکن سوید ہی کی تفسیر قابل ترجیح ہے، کیونکہ مکہ معظمہ میں اس نام کی کوئی جگہ نہیں، ورنہ اہل مکہ اس سے ناواقف نہ ہوتے، اور امام نسائی نے نصر بن حزن کی سند سے جو روایت بایں الفاظ نقل کی ہے کہ انھوں نے کہا اونٹ والے اور بکریوں والے فخر کرنے کے لائق ہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے اور وہ بھی بکریاں چرانے والے تھے، اور حضرت داؤد علیہ السلام مبعوث ہوئے اور وہ بھی بکریاں چرانے والے تھے، اور مجھے نبی بناکر بھیجا گیا اور میں اپنے گھر کنبہ کی بکریاں جیاد[1] پر چراتا تھا، اس روایت سے بعض

[1] جیاد، اسی کا نام اجیاد بھی ہے یہ کوہ صفا سے متصل ایک پہاڑی ہے،

الجمع بین ان یرعی لاهله
بغیر اجرة ولغیرهم باجرة
او المراد بقوله اهلی اهل
مکة فیتحد ان الخبران ویکون
فی احد الحدیثین بین
الاجرة وفی الآخرین
المکان فلا ینافی ذلک
والله اعلم وقال بعضهم
لم تکن العرب تعرف
القیراط الذی هو من
النقد ولذلک جاء فی
الصحیح ستفتحون ارضا
یذکر فیها القیراط و
لیس الاستدلال لما ذکر
من نفی المعرفة بواضح[2]

علماء کو یہ خیال ہوا ہے کہ اس حدیث کے
پیش نظر شیخ سوید بن سعیدؒ کی تاویل
اور تشریح درست نہیں، اپنے گھر کنبہ کی
بکریاں اجرت پر نہیں چرائی جاتیں جس سے
ثابت ہوتا ہو کہ حدیث مذکور میں قراریط سے
مراد مقام اور جگہ ہے جسے کبھی جیاد کے نام
سے اور کبھی قراریط کے نام سے تعبیر کیا گیا ہو؛
مگر اس سے شیخ سوید کے قول کی پوری تردید
نہیں ہوتی، کیونکہ ان دونوں روایتوں
میں تعارض نہیں، آپ نے اپنے گھر کنبہ کی
بکریاں بغیر اجرت کے اور مکہ والوں کی
بکریاں اجرت پر چرائی ہوں گی یا لفظ اہلی[1]
سے مراد اہل مکہ ہوں، اس طرح دونوں
حدیثیں متحد المعنی ہو جاتی ہیں، اور ممکن ہے
ایک حدیث میں اجرت کو بیان کیا گیا ہو اور
دوسری میں مکان اور جگہ کا بتانا مقصود ہو
اس لیے ان میں کسی قسم کا تعارض باقی نہیں رہتا،
واللہ اعلم اور بعض علماء کا خیال ہو کہ قیراط

[1] یعنی اہلی میں اضافت یائے متکلم کی طرف اضافت ادنیٰ ملابست ہے [2] فتح الباری طبعۂ اول مطبع المیریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ ج ۴ ص ۳۶۴

جو نقود میں سے ہے اہل عرب اس سے واقف
نہ تھے اور اسی وجہ سے حدیث صحیح میں وارد ہے
کہ عنقریب تم اسی سرزمین (ملک) کو فتح کروگے
جہاں قیراط کا ذکر ہوتا ہوگا، اس سے اہل عرب
کی عدم واقفیت پر استدلال کرنا صحیح نہیں؛
کیونکہ عدم معرفت کی تصریح واضح اور
صاف نہیں ہے[1] لہذا شیخ سوید کا قول صحیح

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قراریط کے نام کی کوئی جگہ مکہ معظمہ میں موجود نہیں ہے،
لہذا حدیث مذکور میں قراریط سے مراد نقود ہیں۔

شیخ علی بن برہان الدین الحلبی نے انسان العیون میں بصراحت لکھا ہے کہ امام بخاری
کا حدیث مذکور کو باب الاجارہ میں ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ قراریط سے مراد نقود ہیں جگہ نہیں[2]
مذکورۂ بالا واقعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو علما اس وقت مسند درس پر متمکن تھے
اور حافظ الحدیث کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، ان کی معلومات بھی زیادہ وسیع اور ٹھوس
نہ تھیں، یہی وجہ ہے کہ بعض مشہور مولفین کے ناموں میں بھی بقول صغانی یہاں تصحیف ہو گئی تھی،
ان ہی میں سے صاحب غریب القرآن، علامہ ابو بکر محمد بن عزیز السجستانی المتوفی ۳۳۰ھ
کا نام بھی ہے، اہل بغداد آپ کو ابن عزیز کے نام سے یاد کرتے تھے، یہاں کے نامور عالم حافظ
ابن ناصر نے اس موضوع پر مستقل رسالہ لکھا تھا، اور جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ ان کے باپ

[1] اس حدیث میں یہ بتانا ہے کہ جس سرزمین کو تم فتح کروگے وہاں قیراط کا بڑا چرچا ہے، کیونکہ وہاں اسی کا رواج ہے [2] ملاحظہ ہو انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون مطبع مصطفی البابی الحلبی مصر ۱۳۴۹ھ ج ۱ ص ۱۲۱

کا نام عزیز نہیں ہے بلکہ عزیر ہے، یہ رسالہ صغانی کی نظر سے بھی گذرا ہے، مگر آپ کی نظر چونکہ نہایت غایر تھی، یہ رسالہ نظروں میں نہیں سمایا، اور آپ کی وہی رائے رہی کہ عزیر بالراء المہملہ ہرگز صحیح نہیں، موصوف العباب میں رقمطراز ہیں:

عزیز مصغر، محمد ابن عزیز ابوبکر السجستانی مؤلف غریب القرآن علی حروف المعجم واھل بغداد یقولونہ بالراء وھو تصحیف ورأیت بعضھم جمع فیہ شیأ وذکر اختلاف الناس فیہ

عزیز مصغر ہے اور ابوبکر محمد بن عزیز السجستانی مولف غریب القرآن کو جسکو حروف معجم پر مرتب کیا ہے[1]، اہل بغداد آپ کو بالراء یعنی محمد بن عزیر کے نام سے یاد کرتے ہیں جو تصحیف ہے اور میں نے بغداد کے بعض علماء کو دیکھا ہے، انھوں نے اس موضوع پر مواد اکٹھا کیا اور رسالہ لکھا ہے، اور اس میں لوگوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے۔

اس رسالہ کے متعلق مجد الدین فیروزآبادی نے القاموس میں لکھا ہے:

قد ضرب فی حدید بارد

مولف نے سرد لوہے پر چوٹ لگائی ہے یعنی بے اثر کلام کیا ہے۔

سید مرتضی الزبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں:

---

[1] عبد الرحمن بن محمد الانباری المتوفی ۵۷۷ھ نے نزہۃ الالبا فی طبقات الادبا، (طبع مصر ۱۲۹۴ھ ص ۳۸۶) میں لکھا ہے کہ یہ رسالہ پندرہ برس میں مرتب کیا تھا، پہلی مرتبہ یہ رسالہ سید جمال الدین بھوپالی کی ساعی سے تبصیر الرحمن وتیسیر المنان مولفہ مخدوم علی مہائمی مطبوعہ بولاق مصر ۱۲۹۵ھ کے حاشیہ پر طبع ہوا تھا، پھر بدر الدین النعسانی کی تصحیح کے ساتھ مطبعۃ السعادہ مصر سے ۱۳۲۵ھ میں علیحدہ شائع ہوا تھا اور اب مصری مصحف کے حاشیہ پر شائع ہوا ہے۔

ان جمیع ما احتج بہ فیھا راجع الی الکتابۃ لا الی الضبط من قبل الحروف بل ھو من قبل الناظرین فی تلک الکتابات ولیس فی مجموعہ ما یفید العالم بان آخرہ راء بل الاحتمال یطرق ھذہ المواضع التی احتج بھا

وہ تمام اقوال جن سے مؤلف نے اس رسالے میں استدلال کیا ہے وہ سب کتابت اور نقول سے تعلق رکھتے ہیں، ان باتوں کو اصل نام کے حروف میں ضبط کرنے سے کوئی علاقہ نہیں، بلکہ یہ تو ان ناظرین کا قدیم نوشتوں کے متعلق بیان ہے، اس پورے مجموعہ میں ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے یقین ہوسکے کہ عزیز کے آخر میں حرف (ر) ہے بلکہ جن مواقع پر یہ لفظ بالراء لکھا ہوا ہے ہو اور ان سے استدلال کیا گیا ہے ان میں احتمال کی گنجائش ہے۔

امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں اور حافظ ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے تبصیر المنتبہ فی تحریر المشتبہ میں حافظ ابن ناصر کے اس رسالہ پر سیر حاصل بحث کی ہے جس کا کچھ حصہ سید مرتضی الزبیدی نے بھی تاج العروس میں نقل کر دیا جس کا خلاصہ وہی ہے جو الزبیدی کے الفاظ میں اوپر نقل ہو چکا، مگر بحث کے آخر میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے:

والقلب الی ما نص (اوما) اتفق علیہ الدارقطنی امیل[1]

اور میرا دل تو اسی بات کی طرف زیادہ مائل ہے جس کی تصریح امام دارقطنی سے ثابت ہے اور جس پر موصوف کا اتفاق ہے اور عزیز بالزاء المعجمہ ہے۔

مرکز خلافت میں درس وتدریس کا شغل

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس سال آپ یہاں تشریف لائے اور آپ کے علم کا شہرہ ہوا تو ہر طرف سے طلبہ کی آمد ہوئی اور آپ نے یہاں بھی

---

[1] ملاحظہ ہو تبصیر المنتبہ بحوالہ تاج العروس (مادہ عزز)

درس و تدریس کا شغل اختیار کیا اور اہل بغداد کو اس سے بڑا فیض پہنچا، مورخ عبدالرزاق ابن الفوطی البغدادی کا بیان ہے

قدم بغداد سنة خمس عشرة	۶۱۵ھ میں بغداد آئے اور اہل بغداد نے آپ سے
وقراء الناس عليه وانتفعوا به[1]	پڑھا اور بڑا استفادہ کیا،

صغانی کا معدلین کے زمرہ میں الحاق

قاضی بغداد محمود بن احمد الزنجانی[2] نے جو نہایت مردم شناس بزرگ تھے۔ صغانی کو معدلین کی فہرست میں شامل کر لیا تھا، معدّل وہ ثقہ اور متدین شخص ہوتا تھا جو عدالت میں قاضی کے سامنے شہادتیں ہو جانے کے بعد بطور صفائی کے گواہ کے شہادت دیتا ہے،

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ والتجارب النافعہ فی المائۃ السابعۃ، طبع بغداد ۱۳۵۱ھ

[2] محمود بن احمد بن محمود بن بختیار الزنجانی الشافعی نام، ابو البقا اور ابو المناقب کنیت ہے، ۵۷۳ھ میں زنجان میں جو قزوین اور ابہر کے مابین ایک شہر ہے) میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی، نہایت نامور مفسر، لغوی اور فقیہ تھے، ذہبی کا بیان ہے کان بحر العلم، آپ علم کے سمندر تھے، ابن النجار نے لکھا ہے برع فی المذاهب والخلاف والاصول علم اصول، اختلافی مسائل اور امور مذہبی میں ماہر تھے، بغداد میں عہدۂ قضا پر فائز ہوئے مگر پھر اس سے علیحدہ ہو گئے اور مدرسۂ نظامیہ اور اس کے بعد مدرسۂ مستنصریہ میں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، آپ کو خلیفہ ناصر لدین اللہ سے روایت حدیث کی اجازت حاصل تھی، حافظ دمیاطی بھی آپ کے شاگردوں میں ہیں، ۶۵۶ھ میں ہلاکو کے حملۂ بغداد میں شہید ہوئے، متعدد تالیفات آپ سے یادگار ہیں، آپ کی نہایت کامیاب تالیف تہذیب الصحاح ۱۹۵۲ء میں قاہرہ سے شائع ہو گئی ہے، حالات کے لیے ملاحظہ ہو الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ، طبع مصر ج ۵ ص النجوم الزاہرہ ج ۷ ص اور مقدمہ تہذیب الصحاح،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صغانی کے زہد و تقویٰ کا بغداد کے اہل علم پر بڑا اثر تھا، باوجودیکہ صغانی کو قاضی بغداد نے معدلین کے زمرہ میں شامل کر لیا تھا، لیکن آپ نے عدالت میں جا کر قاضی کے سامنے کبھی شہادت نہ دی، مورخ ابن الفوطی رقمطراز ہیں،

الحقه القاضى محمود بن احمد	قاضی محمود بن احمد الزنجانی نے آپ کو
الزنجانى بالمعدلين فلم يحضر	معدلین کے زمرہ میں شامل کر لیا تھا، مگر
مجلس قاض ولا شهد[1]	آپ قاضی کی مجلس میں حاضر نہیں ہوئے اور نہ کبھی شہادت دی،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ صغانی اس منصب کو بھی فروتر سمجھتے تھے۔

حضرت معروف کرخیؒ کے مزار پر حاضری

صغانی کو بغداد میں آئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ کوئی ایسی حاجت درپیش ہوئی جس کا کوئی حل نظر نہ آیا تو آپ حضرت معروف کرخی کے مزار پر پہنچے، یہ مزار قبولیت دعا کے لیے بہت مشہور ہے، آپ نے دعا کی اور کار برآری ہو گئی، سید مرتضیٰ زبیدی، العباب الزاخر کے حوالہ سے ناقل ہیں،

ابو محفوظ معروف بن فیروز	حضرت ابو محفوظ معروف بن فیروز کرخیؒ[2]

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ طبع بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۶۳، اور یہ عبارت بھی اس طرح ہو فلم یحضر مجلس قاض ولا شهد

[2] حضرت معروف کرخی نصرانی النسل تھے، بچپن ہی میں حضرت علی بن موسیٰ الرضاؒ کے ہاتھ پر اسلام لائے، پھر آپ کے والدین بھی مسلمان ہو گئے، آپ زہد و ورع میں شہرت رکھتے تھے، علوم ظاہری و باطنی کے جامع اور نہایت مستجاب الدعوات ولی تھے، خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ امام احمد بن حنبلؒ کے فرزند عبداللہ نے اپنے والد سے پوچھا کہ حضرت معروف کرخیؒ کو کچھ علم بھی حاصل ہے، آپ نے فرمایا بیٹا ان کے پاس تو علم کی جان ہے اور وہ خشیت باری تعالیٰ ہے ۲۰۰ھ میں انتقال ہوا، حضرت سری سقطیؒ آپ کے مرید و خلیفہ تھے، کرخ بغداد کا مشہور محلہ ہے، آپ یہیں رہتے تھے، اسی نسبت سے کرخی مشہور ہیں، اہل علم میں یہ بات نہایت مشہور ہے کہ آپ کا مزار قضائے حاجات کے لیے تریاق مجرب ہے، ابن الجوزی جیسے اکابر علماء نے آپ کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، حالات کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ بغداد مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۳۱ء ج ۱۳ ص ۱۹۹، کتاب الانساب از علامہ سمعانی طبع لیڈن نسبت کرخ، صفۃ الصفوہ مؤلفہ ابن الجوزی، طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۵۵ھ ج ۲ ص ۱۸۰

الکرخی قدس الله روحه من اجلة الاولیاء قبره التریاق المجرب ببغداد لقضاء الحاجات قال الصاغانی عرضت لی حاجة وحیرتنی فی سنة خمس عشرة وستمائة فاتیت قبره وذکرت له حاجتی کما تذکر للاحیاء معتقدا ان اولیاء الله لا یموتون ولکن ینقلون من دار الی دار وانصرفت فقضیت الحاجة قبل ان اصل الی مسکنی[1]

نہایت جلیل القدر اولیاء اللہ میں سے تھے، آپ کی قبر قضائے حاجات کے لیے تریاق مجرب ہے، صغانی کا بیان ہے کہ ۶۱۵ھ میں مجھے ایک حاجت درپیش ہوئی اور اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، تو میں آپ کے مزار پر آیا اور اپنی حاجت کا تذکرہ کیا، اسی طرح سے جس طرح سے زندوں سے کیا جاتا ہے اس اعتقاد کی بنا پر کہ اولیاء اللہ مرتے نہیں ہیں، بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو جاتے ہیں، دعا کر کے گھر واپس ہو گیا، ابھی گھر پہنچا بھی نہ تھا کہ وہ حاجت پوری ہو گئی۔

خلیفۂ وقت الناصر لدین اللہ نے جب حسن صغانی سے حدیث پڑھی تو وہ آپ کے فضل و کمال، زہد و تقوی، فراست اور ذہانت سے بڑا متاثر ہوا، آپ کی ذات ایسی زندہ کتاب خانہ تھی جس میں تمام علوم و معارف بہ ترتیب جمع تھے، تفسیر، حدیث، فقہ، انساب، لغت، ادب اور شاعری وغیرہ کوئی علم ایسا نہ تھا جس میں ان کو یدطولیٰ حاصل نہ ہو، ان ہی اوصاف و کمالات نے خلیفہ کو آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

[1] ملاحظہ ہو اللباب بحوالہ تاج العروس (مادہ عرف) جس مقام پر اولیا مدفون ہوتے ہیں وہاں ان کے اعمال حسنہ کی بارگاہ الٰہی میں قبولیت کی وجہ سے انوار الٰہی کا فیضان خوب ہوتا ہے جس کی وجہ سے دعا اکثر اوقات بڑی جلدی قبول ہو جاتی ہے،

ابھی صغانی کو بغداد میں آئے ہوئے سال بھر بھی پورا نہیں گذرا تھا کہ خلیفہ الناصر لدین اللہ نے ہندوستان میں سفارت کے لیے آپ کا انتخاب کیا، اس انتخاب کی غالباً یہ دو وجہیں تھیں۔

(۱) آپ ہندوستان کے باشندے تھے، یہاں کے حالات سے خوب واقف تھے، علماء اور امرا کی نظروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اور ایک خاص مقام اور شہرت کے مالک تھے۔

(۲) آپ کی ذات ایسی جامع کمالات تھی جو سفارت کے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتی تھی، چنانچہ اس نے ۶۱۶ھ میں آپ کو سفیر بنا کر التمش کے دربار میں بھیجا، مورخ عبدالرزاق ابن الفوطی الحوادث الجامعہ میں رقمطراز ہیں:

نفذه الخلیفة الناصر رسولا الی ملک الهند[1]

خلیفہ الناصر لدین اللہ نے (۶۱۶ھ میں جیسا کہ آگے چل کر بحث آئے گی) آپ کو سفیر بنا کر ہندوستان کے بادشاہ کے دربار میں بھیجا۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس عہد کے ہندوستانی مورخوں نے ہندوستان کے ان مسلمان حکمرانوں کے نہ ذاتی حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور نہ ملکی امور کے خد و خال کو نمایاں کیا ہے، اس لیے اس دور کے بعض اہم تاریخی واقعات پر پردہ پڑا ہوا ہے، بیرونی مورخوں کی کتابوں میں چند جملے مل جاتے ہیں، ان ہی کے ذریعہ کسی نتیجہ تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے،

ان امور میں سے جن پر یکسر پردہ پڑا ہوا ہے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے مرکز خلافت سے تعلقات بھی ہیں، اس سلسلہ میں چند باتوں کا پہلے عرض کر دینا ضروری ہے،

خلافت بغداد جب اپنا وقار اور دبدبہ قائم نہ رکھ سکی تو دور و نزدیک ہر جگہ مسلمان حکمرانوں کی چھوٹی بڑی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں،

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ طبع بغداد ص ۲۶۳

خلافت بغداد اور ہندوستان کے باہمی تعلقات

الناصر لدین اللہ ابو العباس احمد بڑا مدبر، بیدار مغز، سخت گیر اور نہایت شان و شکوہ اور دبدبہ کا خلیفہ تھا، جب وہ ۵۷۵ھ میں سریر آرائے خلافت ہوا تو اس کے سیاسی تدبر اور ہیبت و جلال سے خلافت کے تن مردہ میں از سر نو جان آگئی اور مرکز خلافت کو استحکام حاصل ہوگیا، مورخ الموفق عبد اللطیف کا بیان ہے،

کان الناصر قد ملأ القلوب	الناصر لدین اللہ وہ خلیفہ تھا جس کا خوف
هيبة وخيفة فكان يرهبه	اور رعب لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا تھا،
اهل الهند ومصر كما يرهبه	اس سے اہل ہند اور اہل مصر اسی طرح
اهل بغداد فاحيا بهيبته	ڈرتے تھے جس طرح اہل بغداد ڈرتے تھے،
الخلافة وكانت قد ماتت	اس نے خلافت کی ہیبت کو جو خلیفہ المعتصم
بموت المعتصم ثم ماتت	کے مرجانے سے فنا ہو چکی تھی زندہ کیا،
بموته [1]	مگر وہ اس کی موت کے بعد پھر ختم ہوگئی،

اس نے ہر جگہ وقائع نگاروں کا ایسا جال پھیلا دیا تھا کہ اطراف کے تمام ممالک کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہتا تھا، علامہ ابن واصل کا بیان ہے،

كان الناصر شهما، شجاعا	الناصر ہوشیار، شجاع، صائب الرائے،
ذا فكرة صائبة وعقل رصين	صاحب فکر، دانشمند اور سیاسی چالوں
ومكر ودهاء وله اصحاب	سے خوب واقف تھا، اس کے پرچہ نویس
اخبار في العراق وسائر الاطراف	عراق بلکہ اکناف عالم میں پھیلے ہوئے تھے،

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الخلفا، مولفہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ مطبعۃ السعادہ مصر ۱۹۵۲ء، ص ۴۵

يطالعونه بجزئيات الامور [1]	جو اسے جزئیات کی اطلاع دیتے تھے.

مورخ الذہبی رقمطراز ہیں،

كان مع سعادة جده شديد	الناصر خوش نصیبی کے ساتھ ساتھ ملکی امور
الاهتمام بمصالح الملك	کی انجام دہی میں بڑی سعی اور اہتمام کرتا
لا يخفى عليه شئ من احوال	تھا، اسے اپنی رعایا کے ہر چھوٹے بڑے معاملے
رعيته كبارهم وصغارهم	کی خبر رہتی تھی، اس کے وقائع نگار سارے
واصحاب اخبار في اقطار	شہروں میں پھیلے ہوئے تھے جو بادشاہوں کے
البلاد يوصلون اليه احوال	ظاہری اور باطنی احوال تک کی خبریں اسکو
الملوك الظاهرة والباطنة	بھیجتے رہتے تھے. اس کی تدبیریں ایسی لطیف
وكانت له حيل لطيفة و	اور اس کی چالیں ایسی گہری ہوتی تھیں
مكائد غامضة وخدع	کہ کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا،
لا يفطن لها احد [2]	

خلیفہ کے باخبر رہنے کا اندازہ مورخ سیوطی کے نقل کردہ حسب ذیل واقعہ سے بھی ہوتا ہے

وصل اليه رجل معه ببغاء	ایک شخص الناصر لدین اللہ کے واسطے
تقرأ قل هو الله احد، تحفة	ہندوستان سے ایک طوطا لیکر چلا جو
للخليفة من الهند فاصبحت	قل ہو اللہ احد پڑھتا تھا جب وہ بغداد
ميتة واصبح حيران، فجاءه	پہنچا تو رات کو طوطا مرا ہوا پایا، صبح کو

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الخلفا، مولفہ جلال الدین السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ ص ۵۱۴ [2] ایضاً ص ۴۴۸

فراش، یطلب منه البخاء	یہ شخص نہایت حیران ہوا کہ اتنے میں خلیفہ
فبکی وقال اللیلة ماتت	کا ایک خادم آیا اور اس سے وہ طوطا
فقال قد عرفنا ها انها میتة	مانگا، یہ رو کر کہنے لگا کہ وہ رات کو مر گیا،
وقال کم کان ظنك ان یعطیك	خادم نے کہا ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ مر چکا،
الخلیفة قال خمسمائة دینار	مگر مرا ہوا ہی دیدو، اور یہ بتلاؤ کہ تم کو
قال هذه خمسمائة دینار	خلیفہ سے کتنے انعام کی توقع تھی، کہنے لگا
فقال ارسلها الیك الخلیفة	پانچ سو دینار کی، خادم نے پانسو دیکر
فانه اعلم بحالك منذ خرجت	کہا، یہ خلیفہ نے تم کو عنایت کیے ہیں، جب وقت
من الهند [1]	تم اسے ہندوستان سے لیکر چلے تھے اسی وقت
	سے خلیفہ کو تمھاری خبر تھی۔

اسی بنا پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ کو کشف ہوتا ہے، یا کوئی جن ان کے تابع ہے۔ علامہ ذہبی کا بیان ہے

قیل ان الناصر کان مخدوما	لوگوں میں عام خیال تھا کہ الناصر لدین اللہ
من الجن [2]	کے جن تابع ہیں،

یہ خلیفہ کا سیاسی تدبر ہی تھا کہ اس نے مرکز خلافت کو برقرار اور اسے استوار و مستحکم رکھنے کے لیے مسلمان بادشاہوں کے دربار میں اپنے قاصد اور سفراء بھیجے، اور انھیں ہدایا اور خلعتوں سے سرفراز کر کے ان کو اپنی نیابت اور خلافت سے وابستہ رکھا، البتہ ان مسلمان حکمرانوں سے جنھیں بغداد سے ہمسری کا دعویٰ تھا (جیسے خوارزم شاہ وغیرہ) ان سے

---

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۴۴۹ [2] ایضاً

خلیفہ کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے،

خلیفہ الناصر لدین اللہ نے مسند خلافت پر متمکن ہونے کے دوسرے سال سلطان صلاح الدین ایوبی کے دربار میں اپنے قاصد تحفے اور خلعت دیکر بھیجے، حافظ عماد الدین ابن کثیر الدمشقی البدایہ والنہایہ میں تحریر فرماتے ہیں،

وفی رجب منها (سنة ست	اسی سال رجب ۵۷۶ھ میں خلیفہ الناصر
وسبعین) قدمت رسل الخلیفة	لدین اللہ کے سفراء خلعتیں اور ہدایا لیکر
الناصر بخلع وهدایا الی	سلطان الناصر[1] صلاح الدین ایوبی کے
الناصر صلاح الدین فلبس	دربار میں دمشق پہنچے اور سلطان نے خلیفہ
خلعة الخلیفة بدمشق	کی خلعت کو پہن کر شہر کو آراستہ کر کے
وزینت له البلد وکان	یادگار دن منایا،
یوما مشهودا [2]	

اس سے سلطان کی خلعت کی عظمت کا پتہ چلتا ہے،

جب خلیفہ نے سراویل الفتوہ (جامۂ سخاوت و مردانگی) زیب تن فرمایا تو اپنے سفرا اور قاصدوں کے ذریعہ یہ لباس شہاب الدین غوری کے پاس بھی بھیجا، ابن تغری بردی (خدا بخش) کا بیان ہے:

فالبسوا الملك العادل	ملک عادل ابو العباس احمد الناصر لدین اللہ

---

[1] سلطان صلاح الدین کے الناصر کا لقب اختیار کرنے پر الناصر لدین اللہ نے ایک خط اس کو لکھا کہ جب میں نے یہ لقب اختیار کر لیا ہے تو تمھیں اختیار نہیں کرنا چاہیے، اس خط پر سلطان صلاح الدین نے الناصر کا لکھنا موقوف کر دیا تھا، ملاحظہ ہو تاریخ الخلفاء سیوطی احوال الناصر لدین اللہ [2] ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادۃ مصر، ج ۱۲ ص ۳۰۷

(ابوالعباس احمد الناصر لدین اللہ) ثم اولادہ من اویل الفتوۃ ولبسھا ایضاً الملک شہاب الدین صاحب غزنۃ والھند من الخلیفۃ الناصر لدین اللہ ولبسھا جماعۃ آخر من الملوک[1]

کو جامۂ سخاوت و مردانگی پہنایا گیا اور پھر اس کی اولاد کو بھی یہی لباس پہنایا گیا، سلطان شہاب الدین نے بھی جو غزنہ اور ہندوستان کا بڑا بادشاہ تھا اسکو پہنا جو خلیفہ الناصر لدین اللہ نے اسکو بھیجا تھا، یہ جامہ سخاوت و مردانگی اور بھی بادشاہوں نے پہنا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزنی اور ہندوستان کے اس حکمراں کے دربار میں بھی خلیفہ کے سفیر آئے تھے، اور اس کے تعلقات بھی خلیفہ سے خوشگوار تھے،

قطب الدین ایبک کا زمانہ نہایت مختصر اور پر آشوب تھا، گو ہمیں تاریخ سے اس کے دربار میں سفراء کی آمد کا سراغ نہیں ملتا، لیکن بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے بھی اپنے آقا شہاب الدین محمد غوری کے خلیفہ بغداد سے تعلقات کا پاس و لحاظ رکھا تھا اور اس حقیقت کا انکشاف ان القاب سے ہوتا ہے، جو اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں اس میں عضد الخلافۃ[2] اور نصرۃ امیر المومنین[3] کے الفاظ بصراحت موجود ہیں،

ہندوستانی مورخین اس باب میں خاموش ہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ قطب الدین ایبک سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی،

بعض قرائن اور شواہد ایسے موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمس الدین التمش سے خلیفہ الناصر لدین اللہ کے تعلقات حسن صغانیؒ کی آمد سے بھی پہلے سے تھے، چنانچہ ۶۱۴ھ

---

[1] النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر و القاہرہ مطبعۃ دار الکتب المصریہ ۱۹۳۶ء جلد ۶ ص ۱-۳۶۱ [2] و [3] تاج المآثر بحوالہ نجوم حطوکیہ [3] تاریخ مبارک شاہ از فخر الدین مبارک شاہ ص ۳۲

کے چاندی کے ایک سکہ پر حسب ذیل عبارت موجود ہے،

السلطان المعظم شمس الدنیا والدین ابو المظفر التمش القطبی ناصر امیر المومنین[1]

اس امر کا نہایت بین ثبوت ہے کہ ۶۱۴ھ میں خلیفہ الناصر لدین اللہ کے تعلقات سلطان التمش سے نہایت خوشگوار تھے، اور یہاں کے حکمراں خود مختار ہونے کے باوجود خلافت بغداد سے وابستہ تھے، ان ہی تعلقات کو استوار کرنے کی غرض سے صغانی کو سفیر بنا کر التمش کے دربار میں بھیجا گیا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو The Coinage and Metrology of The Sultans of Dehli: by H. N. wright. Dehli 1936. P. 15

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از

مولانا محمد عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۵)

قدیم ترین مورخین کمال الدین عبد الرزاق ابن الفوطی المتوفی ۷۲۳ھ نے صغانیؒ کی بغداد سے ہندوستان میں پہلی بار آمد کا تذکرہ الحوادث الجامعہ میں کیا ہے لیکن سنہ کا تعین نہیں کیا ہے، علامہ شمس الدین الذہبی نے پہلی سفارت کا سال ۶۱۷ھ نقل کیا ہے، چنانچہ تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں:

ذهب منها بالرسالة الشريفة الى صاحب الهند سنة سبع عشرة (وستمائة)

۶۱۷ھ میں آپ کو بغداد سے ہندوستان کے بادشاہ کے پاس سفارت پر بھیجا گیا،

جمہور مورخین نے بالاتفاق یہی سنہ نقل کیا ہے، سید مرتضیٰ زبیدی نے بھی تاج العروس میں ذہبی کے حوالہ سے ۶۱۷ھ نقل کیا ہے مگر جمہور مورخین کا یہ قول صحیح نہیں جیسا کہ صغانی لفظ قنوج پر بحث کرتے ہوئے مجمع البحرین میں لکھتے ہیں:

قَنَّوج وهو موضع في بلاد الهند[1] قنوج ہندوستان کے شہروں میں ایک

---

[1] قنوج نہایت قدیم شہر ہے، اس کا ذکر ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی آیا ہے، عرب کے قدیم مورخین نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، صغانی کے معاصر یاقوت رومی نے اس کو بفتح القاف ضبط کیا ہے، موصوف معجم البلدان

لونیز دعلیہ، قال الصغانی
مؤلف ھذا الکتاب وزنہ
فعّول مثل سِنّور وعجّول وَ
ھُو معرب کَنُوج[۱] بفتح الکاف

مقام ہے (ازہری) نے اس سے زیادہ کچھ
نہیں لکھا ہے، اس کتاب کا مؤلف صغانی
کہتا ہے کہ وہ سنور اور عجول کی طرح فعّول
کے وزن پر ہے، اور یہ لفظ کنوج کا معرب ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۵) میں تحریر فرماتے ہیں:

قنّوج بفتح اوّلہ وتشدید ثانیہ
واٰخرہٗ جیم موضع فی بلاد
الھند عن الازھری،

قنوج کا حرف اوّل مفتوح اور دوسرا
حرف مشدد ہے اور آخر میں جیم ہے ازہری
کے بیان کے مطابق بلادِ ہند میں ایک مقام ہے

حموی نے معجم البلدان کا جو خلاصہ مراصد الاطلاع فی معرفۃ الامکنۃ والبقاع کے نام سے کیا ہے، اور وہ ۱۳۱۵ھ میں طہران سے شائع ہو چکا ہے اس میں انھوں نے معجم البلدان کی بہت سی فروگذاشتوں اور غلطیوں کی تصحیح کی ہے، لیکن اس کتاب میں بھی قنوج کو ان ہی الفاظ میں ضبط کیا ہے،

شمس الدین محمد الجزری المتوفی ۸۳۳ھ نے غایۃ النہایۃ (طبع مصر ج ۱ ص ۲۸۰) میں اپنے ہم عصر مقری داؤد بن محمد بن شہاب ظہیر الدین القنوجی المتوفی ۷۹۰ھ کے تذکرہ میں اسی طرح ضبط کیا ہے جس طرح سے صغانی نے کیا ہے،

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ قنوج بفتح القاف اور بکسر القاف دونوں طرح صحیح ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس لفظ کو دونوں طرح (Knnawdg اور Kinnawdj) لکھا گیا ہے،

[۱] ابوریحان البیرونی نے اپنی کتاب فی تحقیق ما للھند من مقولۃ مقبولۃ فی العقل او مرذولۃ (طبع لیزگ ۱۹۲۵ء) میں ہر جگہ قنوج کو کنوج ہی لکھا ہے،

وَالنُّون وَضَمّ الواو وکان قد
فتحہ السُّلطان محمود بن سبکتگین
ثم استولی علیہ الکفار بعد
فتح فی زمن الامام الناصر لدین
اللہ ابی العباس احمد امیر المومنین
قدس اللہ روحہ ففتحہ السلطان
شمس الدین اَیلتُتمش[۱] تغمدہ
اللہ تعالیٰ برحمتہ، حین ارسلت

جو بفتح قاف ونون اور بضم واؤ ہے اس
کو سلطان محمود بن سبکتگین نے فتح کیا
تھا، پھر امام امیر المومنین ناصر لدین اللہ
ابو العباس احمد قدس اللہ سرہ کے زمانہ
میں کافروں نے اس پر قبضہ کر لیا تو
سلطان التمش غفر اللہ لہ نے اس کو
اس زمانہ میں فتح کیا تھا جب ۶۱۶ھ
میں مجھے ایوان شاہی کی طرف اس کے

[۱] التمش، اس لفظ میں تاریخ نگاروں کا سخت اختلاف ہے، مورخ عبد القادر بدایونی کا خیال ہے کہ لفظ التمش ہے، وہ منتخب التواریخ (طبع کلکتہ ج ۲ ص ۶۲) میں لکھتے ہیں:

"وجہ تسمیہ بہ التمش (التمش) آنست کہ تولد وے در شب گرفت ماہ واقع شدہ بود ترکان این چنین مولود را التمش (التمش) خوانند"

یہ معنی اس وقت تو درست ہو سکتے تھے جب یہ لفظ التمش ہوتا یعنی اس میں لام نہ ہوتا کیونکہ ای کے معنی ماہ کے ہوتے ہیں، التمش کے ساتھ یہ معنی درست نہیں، میجر اور ٹی (Raverty) کی تحقیق یہ اعتبار سے ساقط ہے،

ہمارے فاضل و محترم دوست عبد الحئی حبیبی جنھوں نے طبقات ناصری کو بڑی محنت اور نہایت تحقیق سے مرتب کیا ہے، وہ بعض وجوہ سے اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ اس لفظ کا صحیح املا التمش ہے، طبقات ناصری کے مولف منہاج الدین جوزجانی نے اپنے حسب ذیل شعر میں اس لفظ کو اسی طرح باندھا ہے،

آن شہنشاہی کہ حاتم بذل و رستم کوشش است
ناصر دنیا و دین محمود بن التمش است

الیہ من الدیوان العزیز مجدہ — پاس بھیجا گیا تھا، اللہ تعالیٰ اسے اعزاز
اللہ تعالیٰ فی سنۃ ست عشرۃ — بخشے، اسی بادشاہ نے قنوج کے گرد نہایت
وستمائۃ وسور علیہ سور ا — مضبوط فصیل بنوائی ہے اور یہ بلاد اسلامیہ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) بلاشبہہ تقطیع شعر میں یہ لفظ التتمش ہی درست ہے اور اس اعتبار سے ان کا یہ استدلال کچھ غلط نہیں،

تعجب ہے خلیق احمد صاحب نظامی نے سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات شائع کردہ ندوۃ المصنفین دہلی میں التمش کے تذکرہ میں اس کے نام کی صحت پر منہاج الدین کے اسی شعر سے استدلال کیا ہے، "التتمش کو التیتمش بنا دیا ہے، جس سے شعر بھی خارج الوزن ہو گیا، پھر اس سے استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے"

صغانیؔ نے اس لفظ کو جس طرح نقل کیا ہے، اور اس پر جو اعراب لگائے ہیں، اس میں التیتمش کی پہلی ت پر ضمہ صاف نہیں ہے، اگر ضمہ ہی ہے تو یہ لفظ کی صحت کا بیّن ثبوت ہے، صغانی کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ انھیں ترکی زبان پر دسترس حاصل تھی یا نہیں، لیکن وہ لغت کا نہایت عمدہ مذاق رکھتے تھے، اور صحت الفاظ کا بڑا اہتمام کرتے تھے، انھوں نے اس لفظ کے اعراب کو اگرچہ حروف میں ضبط نہیں کیا ہے لیکن جس طرح سے لکھا ہے اور اس پر اعراب لگائے ہیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اسی طرح درست ہے،

سید مرتضیٰ زبیدی نے بھی جنھیں ترکی زبان پر عبور حاصل تھا تاج العروس میں ایک موقع پر صغانی کے سلسلہ میں اس لفظ کو اسی طرح سے نقل کیا ہے،

ایلتُتْمش دراصل اسم مرکب ہے ایل اور تُتْمش دو جداگانہ کلمے ہیں، ایل کے معنی قبیلہ اور قوم کے ہیں، تُتْمش تُتمک یا تُتمق کا حاصل مصدر ہے جس کے معنی گرفتن اور انتخاب کردن کے ہیں، اس لئے اس اسم مرکب کے معنی قوم کا منتخب اور برگزیدہ انسان ہوتے ہیں، چونکہ لفظ ایل کا تلفظ یائے معروف اور یائے مجہول کے درمیان ہے، اسی لئے صغانی نے اِیل پر ہمزہ بھی لگایا ہے اس لفظ کا صحیح تلفظ کچھ اہل زبان کے ساتھ ہی

حصیناً وھو الآن من بلاد — میں داخل ہے،
الاسلام،

صغانیؔ کے مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ۶۱۵ھ میں بغداد سے روانہ ہوئے، اور اسی سال یہاں پہونچے،

اس قسم کے مواقع پر مجمع البحرین میں سنین کی وضاحت نے اب لفظ نیف کا ابہام اٹھا دیا ہے،

انی شرقت وغربت فی الھند — میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب
والسند نیفا واربعین سنۃ[2] — میں چالیس سال سے اوپر گھوما پھرا ہوں،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) خاص ہے، ہر شخص اس کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہے بہرحال اِیل مکسور نہیں ہے اگر مکسور ہوتا تو اہل زبان ی پر نقطہ لگاتے جو کسرہ کی علامت ہے،

جب سے ترکی زبان رومن خط میں لکھی جانے لگی ہے اور مدار صوت پر ہوا ہے، اس کے تلفظ میں بھی فرق آگیا ہے، اہل زبان اب اس کی ت دوم کو ساکن نہیں، بلکہ مضموم کر دیتے ہیں، چنانچہ اس طرح سے Illutmug لکھتے ہیں،

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شمس الدین التیتمش نے قنوج کو ۶۱۶ھ میں فتح کیا تھا، اور اس کے چاروں طرف نہایت مضبوط فصیل بنوائی تھی، منہاج الدین جوزجانی نے طبقات ناصری میں التیتمش کی فتوحات کے سلسلہ میں صرف فتح قنوج کا نام گنایا ہے اور اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں قنوج پر فاضل مقالہ نگار (A. L. Dames) نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ محمد بن سام غوری کی فتح کے بعد قنوج سے متعلق کوئی ایسا واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو،

[2] ملاحظہ ہو تاج العروس (لفظ کنکس)

صغانیؒ کے اس بیان سے ہندوستان میں اُن کے قیام کی مدت ۴۳ سال پوری ہو جاتی ہے جس کی تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

صغانی سفارت میں ہندوستان تنہا بھیجے گئے تھے، یا اُن کے ساتھ اور بھی علما رتھے، اس کی تصریح کہیں نہیں مل سکی، مورخین نے رسول کا لفظ بھی استعمال کیا ہے جس کا اطلاق مفرد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ اور بھی علماء ساتھ رہے ہوں اور صغانی رئیس الوفد ہوں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صغانیؒ اس مرتبہ تنہا آئے تھے، گو مورخین نے ہدایا اور خلعت وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے مگر ظاہر ہے یہ چیزیں ضرور ساتھ رہی ہوں گی، کیونکہ کبھی کوئی سفیر کسی کے دربار میں خالی ہاتھ نہیں جاتا تھا، ہندوستان کی تاریخیں اس باب میں بالکل خاموش ہیں، اس لئے ان باتوں پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، حیرت ہے کہ مقامی تاریخوں میں صغانیؒ کی پہلی آمد کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

جس زمانہ میں صغانی کا ورود ہندوستان میں ہوا تھا، اس زمانہ میں دار الحکومت دہلی نادرۂ روزگار علماء و فضلاء کا مرکز بنی ہوئی تھی، اس کے باوجود یہاں صغانیؒ کے پایہ کا کوئی محدث نہ تھا، بد قسمتی سے ہندوستان کی زبان کسی دور میں بھی عربی نہیں رہی ہے، اس لئے یہاں لغت و ادب کا چرچا بھی نہیں ہو سکا، مگر اس ملک کو مذہب سے ہمیشہ وابستگی رہی ہے، اس لئے حدیث کا کم اور فقہ کا زیادہ چرچا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ صغانیؒ کی حدیث دانی کا تذکرہ یہاں کی کتابوں میں خصوصیت سے کیا گیا ہے، حالانکہ صغانیؒ کا ادبی اور لغوی مذاق حدیث سے کہیں زیادہ تھا، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا بیان ہے،

"باز بحضرت دہلی رسید در آں ایام در حضرت دہلی علماء کبار بودند با ہمہ در علوم تساوی بود اما در علم حدیث از ہمہ ممتاز و ہیچ کس مقابل او نبود"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد مطبوعہ نولکشور ۱۳۱۲ھ ص ۱۰۴۔

فوائد الفواد سے ایک آخری اقتباس اور پیش کرنا ہے مگر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہمیں صغانیؒ کا بدایوں سے انتساب تسلیم کرنے میں اس لئے تامل ہے کہ اس بارہ میں امام صغانیؒ اور اُن کے تذکرہ نگاروں میں سے کسی ایک حتّٰی کہ ہندوستان کے آخری تذکرہ نگار مولانا حکیم عبد الحئی لکھنوی اور مولوی محمد عبد الشکور عرف رحمان علی صاحب تحفۃ الفضلاء فی تراجم الکملاء نے بھی حسن صغانی کے بدایوں سے کسی قسم کے علاقہ اور نسبت کا تذکرہ ان کے حالات میں صراحۃً یا کنایۃً نہیں کیا ہے،

سید مرتضیٰ بلگرامی ثم الزبیدی نے دس ضخیم جلدوں میں قاموس کی نہایت مبسوط شرح تاج العروس لکھی ہے، اس تالیف کے موقع پر صغانی کی لغت کی دونوں کتابیں التکملہ اور العباب الزاخر بھی انکے پیش نظر رہی ہیں، اور انھوں نے صغانی کے متعلق بعض مفید باتیں العباب الزاخر سے تاج العروس میں نقل کی ہیں، گو العباب کی تالیف کے وقت صغانی کا انتقال مادہ "بکم" پر ہو گیا تھا لیکن العباب میں انھوں نے کہیں ضمناً بھی بدایون سے کسی تعلق کا اظہار نہیں کیا، اور نہ التکملہ میں اس طرف کوئی اشارہ کیا ہے، ورنہ سید مرتضیٰ بلگرامی جیسا محقق اور ناقد مورخ تاج العروس میں ضرور اس کا تذکرہ کرتا،

تاج العروس کو ہم نے حرفاً حرفاً پڑھا ہے، اس لئے ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ سید مرتضیٰ بلگرامی نے کہیں بھی بدایوں سے امام صغانی کے کسی تعلق اور نسبت کا کسی نوع سے کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، حالانکہ حضرت نظام الدین اولیاء سے اُن کی عقیدت بھی ہم جیسے لوگوں سے کہیں زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ تاج العروس میں بدن کے مادہ کی تشریح میں انھوں نے پہلے بدیون سے علمی دنیا کو روشناس کرایا ہے، پھر نہایت احترام و تعظیم کے ساتھ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے مرز بوم بداؤن کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے،

بداؤن بفتح الباء وضم الواو	بداؤن، بفتح با، اور بضم واو، ہندوستان
مدینۃ بالھند منھا الشیخ العارف	میں ایک شہر ہے جہاں کے رہنے والے

شیخ عارف باللہ محمد بن احمد خالدی المعروف باللہ تعالیٰ محمد بن احمد الخالدی

بہ نظام الاولیا رہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی الشہیر بنظام الاولیاء نفعنا

برکات سے ہمیں بہرہ ور فرمائے، اللہ تعالیٰ ببرکاتہ ؛

العباب الزاخر اگرچہ پوری ہماری نظر سے نہیں گذری ہے لیکن اس کی متفرق سات جلدیں بالاستیعاب مطالعہ سے گذر چکی ہیں اس میں بھی صغانی کے متعلق بعض مفید باتیں ملتی ہیں مگر کہیں بدایوں یا اس سے نسبت کا نام تک نہیں آیا ہے،

مجمع البحرین صغانی کی حدیث کے علاوہ ایک کتاب لغت میں بھی مشہور ہے جو سید مرتضیٰ بلگرامی کو نہیں مل سکی تھی، یہ کتاب بھی پوری ہمارے مطالعہ سے گذر چکی ہے، اس میں صغانی نے بدن کے مادہ میں بھی بدایون سے نسبت کا کیا ذکر اس کا نام تک نہیں لیا ہے، ان وجوہ سے ہمیں ان کے بدایوں سے انتساب میں تامل رہا ہے،

خواجہ نظام الدین اولیا، کو صغانیؒ سے دو واسطوں سے تلمذ کی سعادت حاصل رہی ہے اس لئے جمہور مورخین کے قول پر خواجہ نظام الدین اولیاء کے سابقہ بیانات اور آگے آنیوالے اقتباس کی مجبوراً معقول تاویل کرنا پڑتی ہے، اور تصحیف کے بجائے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صغانی نے بدایون میں بھی جاکر کسی "مردے بزرگ و صاحب ولایت" سے کچھ پڑھا ہوا گر ایسا ہے تو یہ غالباً کول کی آمد سے پہلے کا واقعہ ہے، جمہور مورخین کے قول پر اس وقت صغانی کی عمر مشکل سے ۱۶ - ۱۷ برس کی ہوتی ہے، گویا یہ زمانہ اُن کی تحصیل علم کا زمانہ تھا، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے بعض بیانات سے ہماری اسی تاویل اور توجیہ کی مزید تائید ہوتی ہے، چنانچہ ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:

"بعد ازاں و نیاں زیادت تحصیل شد"[1]

۱؎ ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۰۴

قیام کول کے زمانہ میں صغانی کو تحصیل علم کا شوق ہوا اور انھوں نے مکہ میں جاکر حدیث کا درس لیا، ۶۰۶ھ میں جب وہاں سے واپس آئے تو قطب الدین ایبک نے آپکے سامنے لاہور کا عہدۂ قضا پیش کیا، مگر آپنے اُسے قبول نہیں کیا،

فوائد الفواد کے ان اقتباسات سے بعض اہل علم کو یہ شبہہ بھی ہوا ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں کہ بدایوں اس زمانہ میں اتنا مشہور نہ تھا، جتنا لاہور تھا، اس لئے ہوسکتا ہے بیرونی مورخوں نے آپ کا تولد بدایون کے بجائے لاہور لکھ دیا ہو، یہ شبہہ اس وقت درست ہوسکتا تھا جب صغانی کے تذکرہ نگار تنہا غیر ہندوستانی ہوتے یا صغانی کی اس بارے میں کوئی تصریح موجود نہ ہوتی، یا ہندوستان کا کوئی تذکرہ نگار اُن کا تذکرہ قلمبند نہ کئے ہوتا، مگر ان کی تذکرہ نگاری کا فخر ہندوستان کے بعض نہایت نامور مورخوں اور ادیبوں کو بھی حاصل رہا ہے، اور خود صغانی کی تصریح بھی موجود ہے، ایسی حالت میں گمان کیونکر کیا جاسکتا ہے؟

خلیق احمد صاحب نظامی اور جناب ضیا احمد بدایونی نے فوائد الفواد کے جس جملہ سے صغانی کے بدایونی المولد ہونے پر استدلال کیا ہے، اس کی واضح تردید اوپر گذر چکی، اور یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ صغانی کا مولد لاہور ہے جیسا کہ خود صغانی کے بیان سے ثابت ہے؛

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کا یہ بیان "او از بداؤن بود" مولد ہونے کی دلیل نہیں ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ یہ پیرایۂ بیان ہمیشہ مولد ہونے کی دلیل نہیں ہوتا، اس لئے اس جملہ سے صغانی کے بدایونی الاصل ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، صغانی کو صغان سے جو آبائی تعلق رہا ہے وہی اُن کا طرۂ امتیاز اور سرمایۂ افتخار ہے جیسا کہ اُن کے اس شعر سے عیاں ہے،

فقلت یا دھرُ سالمنی مسالمۃ فاننی عمریٌ ثم صاغانی[1]

۱؎ تاریخ ثغر عدن ص ۵۸،

اے زمانہ تو میرے ساتھ مصالحت کرلے کیونکہ میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کی

اولاد سے ہوں اور وطن میرا صغان ہے،

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تا دمِ مرگ اپنے اس خاندانی اور آبائی تعلق کو کبھی فراموش نہیں کیا، ا
ہر جگہ اپنی نسبت الصغانی لکھا اور مورخین اور تذکرہ نگاروں نے بھی اس نسبت کا ہر جگہ خیال رکھا ہے،

خواجہ نظام الدین اولیاء کی بزرگی اور صغانی سے بواسطہ تلمذ کے پیشِ نظر ان کے مذکورہ بالا کی یہی
توجیہ کیجا سکتی ہے کہ اس جملہ میں صغانی کے بدایون سے محض تعلق کا اظہار ہے،

"او از بداؤن بودؒ" سے اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ یہ تعلق اتنا معمولی تھا کہ جو قابلِ ذکر
ہی نہ تھا، اور خود حسن سجزی بدایونی جامع ملفوظات کو بھی اس کا علم نہ تھا، حضرت محبوب الٰہی نے انھیں
بتایا کہ انھیں ہمارے وطن بدایون سے بھی ایک گونہ تعلق رہا ہے، مگر اس تعلق کی وضاحت سے جامع
ملفوظات اور اربابِ تذکرہ دونوں خاموش ہیں،

صغانیؒ جب پہلی مرتبہ بسلسلۂ سفارت دہلی آئے تو یہاں انکی ملاقات ایک دیرینہ دوست سے ہوئی، دورانِ گفتگو
میں زمانہ طالب علمی کا ذکر چھڑ گیا، صغانی نے بھی اپنے تحصیلِ علم کے زمانہ کا ایک واقعہ انھیں سنایا اور
اللہ تعالیٰ کے ان انعاموں کا تذکرہ کیا جو اس نے ان پر کئے تھے، بقول حضرت نظام الدین اولیاء
فرمانے لگے جب ہم بدایون میں پڑھتے تھے اس وقت ہمارے استاد کے پاس حدیث کی ایک کتاب
ملخص نام کی تھی، ہمیں اس کے دیکھنے کا بڑا شوق تھا، یہ کتاب ہم نے ان سے مانگی تھی، مگر انھوں نے
نہیں دی، ایک وہ وقت تھا کہ ہمیں کتابیں دینے سے بھی گریز کیا جاتا تھا، اور ایک یہ وقت ہے کہ
ہم پر اللہ تعالیٰ نے ایسا کرم کیا ہے کہ اب اس جیسی کتاب کے سینکڑوں لکھنے والے اگر ہم سے پڑھ
سکتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے صغانیؒ کو جو جاہ و منزلت عطا کی تھی، اس نے انھیں معاصروں کی نگاہوں میں

محسود بنا دیا تھا، اس لئے کسی بدخواہ نے اُن کا یہ قول اُن کے استاد سے جو اس وقت بقیدِ حیات تھے
نقل کر دیا کہ صغانی تو اب آپ کی نسبت بھی یہ کہتا ہے کہ ہمارے استاد نے ملخص دینے سے انکار کیا تھا،
مگر اب اس کتاب کے مصنف جیسے سو آدمی اگر مجھ سے پڑھ سکتے ہیں، یہ سُن کر انھوں نے کہا معلوم
ہوتا ہے اس کا حج قبول نہیں ہوا، ورنہ وہ ایسی بات نہ کہتا،

حضرت محبوب الٰہی فوائد الفواد میں فرماتے ہیں،

"القصہ چوں از آنجا بدہلی آمد، مگر در آنچہ بداؤں بود آنجا او را استادے بودہ است مردے
بزرگ و صاحب ولایت بود، بر وکتابے بود، در حدیث کہ آنرا ملخص گویند، مولانا رضی الدین
از و طلب نمودہ بود او را دورا از نسخہ مضائقت نمود، چوں مولانا با حصول علم و نبوغ معنی در
در دہلی آمد مگر بایارے می گفت کہ وقتے استاد من ملخص از من دریغ داشتہ بود ایں ساعت
صد ہمچو صاحب آن کتاب باید کہ پیش من چیزے بخواند کسے ایں سخن با استاد او رسانید او
گفت نہ ہمانا کہ حج او قبول افتادہ باشد کہ اگر حج او قبول شدہ بودے ایں چنیں سخن نہ گفتے"[1]

یہاں یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے کہ حضرت نظام الدینؒ اولیاءؒ کا مذکورہ بالا بیان تمام تر
انہی الفاظ پر مشتمل ہے جو کسی بدخواہ نے صغانیؒ کے استاد سے جا کر کہے تھے،

تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سفراء جب دربار میں آتے تھے تو وہ
اپنے فرائض ادا کرنے کے بعد بار بار دربار میں حاضری کے پابند نہیں رہتے تھے، اور عموماً ایسے علما
اور اربابِ کمال کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا جنھیں حدیث، فقہ، سیرا ور کلام میں کمال حاصل ہوتا تھا، اور
وہ سفارت کی حالت میں درس و تدریس اور علم و فن کی خدمت سے گریز نہیں کرتے تھے، اس لئے طالبان
علوم جوق در جوق اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر پڑھتے اور حدیث کا سماع کرتے تھے، اسی وجہ سے سفیر کی

[1] ملاحظہ ہو فوائد الفواد ص ۱۰۴،

آمد ایک یادگاری حیثیت اختیار کرلیتی تھی، اور عوام و خواص میں خلیفہ کی ہردلعزیزی اور شہرت بڑھ جاتی تھی، ارباب تذکرہ اس قسم کے اہل علم سفیروں کے حالات میں اُن کی اس علمی فیض رسانی کا تذکرہ خصوصیت سے کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ہم یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں، تاج الدین عبد الوہاب السبکی المتوفی ۷۷۱ھ فخر الدین ابو علی یحییٰ بن الربیع العمری (جنھیں خلیفہ الناصر لدین اللہ نے سلطان غیاث الدین محمد بن سام المتوفی ۵۹۹ھ کے دربار میں خلعت دے کر غزنہ بھیجا تھا) کے حالات میں رقمطراز ہیں،

حدث بالکثیر۔۔۔۔ بھراۃ	جب انھیں ایوان شاہی کی طرف سے
وبغزنۃ لما توجہ الیھا	غزنہ سفیر بنا کر بھیجا گیا تو انھوں نے غزنہ
رسولا من الدیوان العزیز[۱]	اور ہرات میں بکثرت حدیثیں بیان کیں،

مورخ ابن النجار نے ان کے فضل و کمال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے،

کان اماماً کبیراً وفوراً نبیلاً	آپ بلند پایہ اور باوقار امام تھے، مذہب
حسن المعرفۃ بمذھب الشافعی	شافعیؒ کے بڑے واقفکار اور محقق و مدقق
محققاً مدققاً علیمواً بالکلام مرف	تھے، جدل و مناظرہ میں بھی دلکش گفتگو
المناظرۃ والجدل مجوداً فی	کرتے تھے، علم کلام، ریاضی، اور تقسیم
علم الکلام والحساب وقسم	میراث کے بھی ماہر تھے، اور علم حدیث
الترکات ولہ معرفۃ حسنۃ	میں بڑی معرفت او بصیرت حاصل
بالحدیث[۲]	تھی،

۱؎ ملاحظہ ہو الطبقات الشافعیۃ الکبریٰ طبع اول مطبعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۴ھ ج ۵ ص ۱۶۵ ۲؎ ایضاً کتاب مذکور،

سلطان غیاث الدین کے دربار میں ابن الربیع کی آمد کا تذکرہ منہاج الدین جوزجانی نے بھی کیا ہے، چنانچہ اپنی کتاب طبقات ناصری میں لکھتے ہیں،

"چند کرت از حضرت دار الخلافہ از امیر المومنین الناصر لدین اللہ خلعت فاخرہ بحضرت سلطان غیاث الدین طاب ثراہ واصل شد کرت اوّل ابن الربیع آمد و قاضی مجد الدین قدوہ با او بدار الخلافہ رفت[۱]"

عبد اللہ بن عمر المکی نے بھی ظفر الوالہ میں اُن کی آمد کا ذکر ۵۹۹ھ کے واقعات میں کیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن الربیع سلطان غیاث الدین کے دربار میں اسی سال آئے تھے، لکھتے ہیں،

کان الناصر لدین اللہ ابو العباس	"الناصر لدین اللہ ابو العباس احمد بن المستضیٔ
احمد بن المستضیٔ راسل غیاث الدین	سلطان غیاث الدین کے یہاں قاصد اور سفیر
واوّل من وصل الیہ حاجباً من	بھیجا کرتے تھے اور سب سے پہلے جو سفیر خلیفہ
الخلیفۃ ابن الربیع ومعہ خلعۃ	کی طرف سے گیا، وہ محدث ابن الربیع تھے،
الخلیفۃ وفی رجوعہ استصحبہ	وہ اپنے ساتھ خلعت بھی لائے تھے، اُن
القاضی مجد الدین قدوہ بمالیق	کی واپسی کے وقت انکے ساتھ قاضی مجد الدین
من جانبہ للخلیفۃ[۲]،	قدوہ سلطان غیاث الدین کی طرف سے خلیفہ
	کے شایان شان تحائف لے کر بغداد گئے تھے"

ابن الربیع کو سلطان شہاب الدین محمد بن سام غوری المتوفی ۶۰۲ھ کے دربار میں بھی سفیر بنکر جانے کا فخر حاصل ہے، مورخ سبکی، طبقات الشافعیہ میں تحریر فرماتے ہیں،

۱؎ ملاحظہ ہو طبقات ناصری، طبع کلکتہ ۱۸۶۳ء ص ۷۰، ۲؎ ملاحظہ ہو ظفر الوالہ بمظفر و آلہ طبع لیڈن ۱۹۳۰ء ج ۲ ص ۶۶۶،

انہ توفی فی یوم الاحد السابع والعشرین من ذی القعدۃ سنۃ ست وستمائۃ وصلی علیہ یوم الاثنین بالمدرسۃ النظامیہ (قلت) ھذا ھو الصواب فی تاریخ وفاتہ و ذکر غیرہ انہ توفی فی طریق خراسان لما توجہ رسولاً الی السلطان شہاب الدین الغوری الی غزنۃ وھو وھم فانہ عاد من عند السلطان المذکور الی بغداد فی سنۃ ثلاث وستمائۃ واقام بہا الی ان توفی سنۃ ست وستمائۃ[1]

ان کا انتقال، ۲۷ ذی قعدہ ۶۰۶ھ میں ہوا، نماز جنازہ مدرسہ نظامیہ میں پڑھی گئی، میرے نزدیک یہی تاریخ وفات صحیح ہے، ابن النجار کے علاوہ بعض مورخوں نے لکھا ہے، کہ انھوں نے خراسان کے راستہ میں وفات پائی، جب انھیں سلطان شہاب الدین کے دربار میں سفیر بنا کر غزنہ بھیجا گیا تھا، مگر یہ محض وہم ہے کیونکہ وہ سلطان شہاب الدین کے دربار سے ۶۰۳ھ ہجری میں بغداد واپس آگئے تھے اور سال وفات ۶۰۶ھ ہجری تک یہیں رہے،

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سفارت کی خدمت کے لئے کیسے کیسے صاحب فن علما کا انتخاب کیا جاتا تھا، ابو شامہ المقدسی المتوفی ۶۶۵ھ ہجری نے محدث ابو الحسن علی بن ابراہیم الحنفی المعروف بہ ابن نجیہ المتوفی ۵۹۹ھ کے حالات میں لکھا ہے،

یعثہ نور الدین رحمۃ اللہ علیہ رسولاً الی بغداد فی سنۃ اربع وستین وخمسمائۃ فسمع بہا عبد الخالق بن احمد بن یوسف وغیرہ[1]

سلطان نور الدین رحمہ اللہ نے ابن نجیہ کو ۵۶۴ھ ہجری میں سفیر بنا کر بغداد بھیجا تھا، اور بغداد میں شیخ عبد الخالق ابن احمد بن یوسف وغیرہ نے اُن سے حدیث کا سماع کیا تھا،

ایسا ہی صغانی کے ساتھ ہندوستان میں بھی ہوا، یہاں اُن کے طویل قیام سے قیاس ہوتا ہے کہ سفارت کے عہدہ پر ان کا تقرر عارضی نہ تھا، بلکہ طویل مدت کے لئے بھیجا گیا تھا، چنانچہ صغانی کا قیام ہندوستان میں سات آٹھ برس سے کم نہیں رہا اتنی مدت میں یہاں کہاں کہاں قیام رہا، یہ بتانا مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کسی ایک جگہ مستقل قیام نہیں رہا، بلکہ انھوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سیاحت کی، جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے،

انی شرقت وغربت فی الھند والسند نیفا واربعین سنۃ[2]

میں ہندوستان اور سندھ کے شرق و مغرب میں چالیس سال سے اوپر گھوما پھرا ہوں،

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں کسی ایک جگہ مستقل نہیں رہے، بلکہ خلیفہ البغداد کا پیغام سلطان التتمش کو پہنچانے اور فرائض منصبی کی انجام دہی کے بعد مختلف شہروں کی سیاحت کی،

---

[1] ملاحظہ ہو طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۶۵،

[1] ملاحظہ ہو: الذیل علی الروضتین، طبع اوّل قاہرہ ۱۳۶۶ھ ص ۳۴،

[2] ملاحظہ ہو تاج العروس لفظ رکنکی

ہندوستان کے اہل علم صغانی کی حدیث دانی سے پوری طرح واقف تھے، اس لئے انھوں نے
اُن کی آمد کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا، چنانچہ وہ جہاں جاتے امراء اور علماء و مشائخ پروانہ کی طرح آپکے
گرد جمع ہوجاتے تھے، اور آپ سے حدیث ولغت کی تحصیل کرتے تھے، درس و تدریس کے اس سلسلہ
نے عوام وخواص دونوں سے آپ کا رابطہ استوار کر دیا تھا، اور وہ خلیفہ بغداد کے نام اور کام اور کی
ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی و محبت سے پوری طرح واقف ہو گئے تھے، (باقی)

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از

جناب مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۶)

ہندوستان میں صغانی کے طویل قیام کے اثرات

صغانی کے اس طویل قیام نے خلافت بغداد سے ہندوستان کے رشتہ کو مزید استحکام بخشا اور رجب ۶۲۲ھ میں خلیفہ الناصر لدین اللہ کا انتقال ہو گیا اور خلیفہ الظاہر لدین اللہ سریر آرائے خلافت ہوا تو اس کے سکون پر بھی بجز خلیفہ کے نام کی تبدیلی کے وہی عبارت ثبت رہی جو خلیفہ الناصر لدین اللہ کے دور میں ہوتی تھی، خلیفہ الظاہر لدین اللہ کا زمانۂ خلافت سال بھر سے کم رہا، ۶۲۳ھ میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا المستنصر باللہ مسند خلافت پر بیٹھا، تب بھی ان تعلقات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، اور حسب دستور وہی عبارت جو گذشتہ خلفاء عباسیہ کے سکون پر رقم ہوتی تھی، اسکے دور میں بھی باقی رہی،[1]

المستنصر باللہ نے تخت نشین ہونے کے بعد صغانیؒ کو بغداد طلب کیا، ہندوستان سے ان کی روانگی کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ۶۲۳ھ کے اواخر یا ۶۲۴ھ

[1] ملاحظہ ہو The Sultans of Dehli their coinage and metrology by wright P.U. 1936

کے اوائل میں یہاں سے روانہ ہوئے اور ۶۲۴ھ میں بغداد پہنچے، جیسا کہ مورخ ذہبی کا بیان ہے:

ذھب منھا بالرسالة الشریفة	ان کو دار الخلافت بغداد سے سفارت
الی صاحب الھند فبقی مدة	کے عہدہ پر ہندوستان کے بادشاہ کے
وقدم سنة اربع وعشرین	دربار میں بھیجا گیا جہاں ایک مدت دراز تک
وستمائة [1]	انکا قیام رہا اور ۶۲۴ھ میں وہاں سے واپس آئے،

صغانی کی بغداد میں آمد

مورخ بغداد کمال الدین ابن الفوطی نے الحوادث الجامعہ میں سال کا تعین نہیں کیا ہے، لیکن اس امر کی تصریح کی ہے کہ صغانی المستنصر باللہ کے زمانہ میں آئے تھے، لکھتے ہیں:

نفذہ الخلیفة الناصر رسولا	آپ کو خلیفہ الناصر ... نے ہندوستان
الی ملك الھند، فعاد بعد	کے بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا،
مدة طویلة فی خلافة	تو ایک مدت دراز کے بعد مستنصر باللہ
المستنصر باللہ [2]	کے دور خلافت میں واپس آئے،

صغانی کو بعض امور پر گفت و شنید کے لیے بغداد طلب کیا تھا، اس لیے ان کا وہاں زیادہ قیام نہیں رہا اور اسی سال ہندوستان بھیج دیا گیا، الذہبی تاریخ الاسلام میں لکھتے ہیں:

ثم اعید الیھا رسولا عامئذ [3]	پھر اسی سال (۶۲۴ھ) میں انکو ہندوستان واپس بھیجدیا گیا،

صغانی شعبان ۶۲۴ھ میں بغداد سے روانہ ہوگئے تھے، ابن ابی الوفا، القرشی، المتوفی

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی مخطوطہ کتب خانہ ریاست رامپور [2] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ طبع بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۲۲ [3] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی

۷۷۵ھ الجواہر المضیہ میں لکھتے ہیں:

رجع منھا سنة اربع وعشرین	وہ ہندوستان سے ۶۲۴ھ میں بغداد آئے
واعید الیھا رسولا فی	اور پھر اسی سال شعبان میں سفیر
شعبان من السنة [1]	ہوکر واپس ہندوستان چلے گئے۔

مورخین کے بیانات اور صغانی کی تصریح کے پیش نظر (جو آگے مذکور ہے) مولانا عبد الحی صاحب کا یہ بیان کہ موصوف رضیہ سلطانہ کے دور میں سفیر ہوکر یہاں آئے تھے، کسی طرح صحیح نہیں، کیونکہ رضیہ سلطانہ ربیع الاول ۶۳۴ھ میں تخت نشین ہوئی، اور صغانی اس وقت بغداد میں نہ تھے، نزہتہ الخواطر میں ہے:

ثم خرج من الھند سنة اربع	پھر وہ ۶۲۴ھ میں ہندوستان سے روانہ
وعشرین وستمائة فحج ودخل	ہوئے، حج کیا اور یمن پہنچے، پھر بغداد
الیمن ثم عاد الی بغداد	آئے، اس کے بعد مستنصر باللہ کے دربار
ثم اعید الی الھند رسولا	سے آپ کو ہندوستان سفارت پر
من حضرة المستنصر باللہ	سلطانۂ ہند رضیہ بنت التمش
العباسی الی رضیة بنت	کے دربار میں بھیجا گیا،
الایلتمش ملکة الھند [2]	

بصرہ میں ورود اور حضرت صحار عبدیؓ کے مزار پر حاضری

بغداد سے واپسی پر جب صغانی بصرہ میں ٹھہرے تو حضرت صحار العبدی رضی اللہ عنہ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے، مجمع البحرین میں لکھتے ہیں:

[1] ملاحظہ ہو الجواہر المضیہ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ج ۱ ص ۲۰۲ [2] نزہتہ الخواطر ج ۱ ص ۱۳۸

صحار العبدی رضی اللہ عنہ[1]	حضرت صحار العبدی رضی اللہ عنہ کو
له صحبة ودفن بظاهر البصرة	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت
نائيا عن البلد قال الصغاني	کا شرف حاصل ہے، بصرہ سے باہر
مؤلف هذا الكتاب وقد زرت	شہر سے ذرا دور آپ کا مزار ہے،
قبره في شعبان من سنة	صغانی اس کتاب کا مولف کہتا ہے
اربع وعشرين وستمائة	میں نے شعبان ۶۲۴ھ میں آپ کی
وصحار بلدة وهي قصبة	قبر کی زیارت کی، صحار چھوٹا سا شہر ہے جو
عمان مما يلي الجبل وتؤام	عمان کے توابع میں پہاڑ سے متصل ہے
قصبتها مما يلي الساحل[2]	اوران حدود سے ملا ہوا ہے جو ساحل بحر سے متصل ہے

[1] حضرت صحار رضی اللہ عنہ قبیلۂ عبدالقیس سے تھے، اسی نسبت سے العبدی مشہور ہوئے، آپ کو حضور اکرمؐ کی زیارت اور صحبت کی سعادت حاصل تھی، انساب پر آپ کی گہری نظر تھی، نہایت سحر طراز خطیب اور بڑے فصیح اللسان بزرگ تھے، جاحظ نے اپنی زندۂ جاوید کتاب البیان والتبیین اور کتاب الحیوان میں فصاحت و بلاغت سے متعلق بہت سی باتیں آپ ہی کے حوالہ سے نقل کی ہیں، آپ بعض کتابوں کے مصنف بھی تھے، ابن الندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں:

له من الكتب كتاب الامثال	آپ کی تصانیف میں سے کتاب الامثال بھی ہے

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو چکا تھا، اور ان ہی کے زمانہ میں علم لغت کی تدوین بھی شروع ہو گئی تھی علم الامثال کی تدوین کا سہرا آپ ہی کے سر ہے،

حضرت صحار عبدیؓ کا تذکرہ طبقات ابن سعد سے لیکر اصابہ تک طبقات کی سب کتابوں میں موجود ہے لیکن آپ کے مزار کی اتنی صراحت کہیں نہیں ہے، مجمع البحرین، سید مرتضی الزبیدی کو نہیں ملی، اسلیے تاج العروس بھی ان معلومات سے خالی ہے،

[2] مجمع البحرین، زوگرافی کاپی اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی مادۂ صحر،

صغانی کے بعض بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بحر فارس کے راستہ سے ہندوستان آئے تھے، چنانچہ آتے وقت جزیرۂ خارک میں بھی ٹھیرے تھے، سید مرتضی الزبیدی المتوفی ۱۲۰۶ھ العباب الزاخر کے حوالہ سے تاج العروس میں لکھتے ہیں،

قال الصغاني وقد دخلت	صغانی کہتا ہے کہ میں ۶۲۴ھ میں خارک
خارك سنة ستمائة و	میں بھی گیا ہوں، جب دوبارہ مجھے
اربع وعشرين حين	دارالخلافہ بغداد (اللہ تعالی اس کی
ارسلت ثانية من دار الخلافة	عظمت کو دوبالا کرے) سے سفیر بنا کر
عظمها الله تعالى رسولا	ہندوستان کے بادشاہ شمس الدین
الى ملك الهند شمس الدين	ایلتتمش انار اللہ برہانہ کے دربار
ايلتتمش انار الله برهانه[1]	میں بھیجا گیا تھا،

واضح رہے اس مرتبہ صغانی کو تنہا نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ ایک پورا وفد آپ کی سرکردگی میں آیا تھا، یہ وفد ۶۲۵ھ میں ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا، اور ۶۲۶ھ میں دہلی پہنچا، یہاں اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا، منہاج الدین جوزجانی، طبقات ناصری میں رقم طراز ہیں:

چون پائے آن قلعہ (اچہ) انصراف فرمود در موافقت حشم منصور آن پادشاہ غازی (التمش) بحضرت دہلی اجلہا اللہ آمد، و در ماہ رمضان سنہ خمس وعشرین وستمائۃ بحضرت دہلی اعلی وصول بود، دریں وقت رسل دارالخلافت بتشریفات وافرہ بحدود ناگور رسیدہ بود، و در روز شنبہ بیست و دوم ماہ ربیع الاول

[1] ملاحظہ ہو العباب بحوالہ العروس مادہ خرک

ستۃ و عشرین ستمائۃ بحضرت دہلی رسیدند و شہرہا آذین بستند و آں پادشاہ و ملوک و فرزندان آں عالی نژاد ہم و دیگر ملوک و خدم و بندگاں ہمہ بخلعت دار الخلافت مشرف گشتند۔[1]

یہ وفد خلافت بغداد سے خلعت فاخرہ اور علم وغیرہ لیکر خشکی کی راہ سے آیا تھا، مگر صغانی بحری راستہ سے اس سے پہلے پہنچ گئے تھے، اسی وفد کے متعلق عبد اللہ بن عمر المکی ظفر الوالہ میں لکھتے ہیں :-

کان وصوله الیها فی رمضان	رمضان ۶۲۵ھ میں سلطان التمش دہلی
من سنۃ خمس و عشرین و	پہنچا تو اسے خلیفہ بغداد کے ایلچیوں کی آمد کی
فیها بلغہ وصول رسول الخلیفۃ	اطلاع ملی کہ وہ بغداد سے براہ خشکی بڑے
الی ناگور بجهز من بغداد الیہ برد	ساز و سامان کے ساتھ ناگور آ گئے ہیں اور
فی سنۃ و عشرین وصل حاجب الخلیفۃ	۶۲۶ھ میں خلیفہ عباسی امیر المومنین
العباسی امیر المومنین المستنصر باللہ	مستنصر باللہ ابو جعفر بن الظاہر کی خلعت
ابو جعفر بن الظاهر بخلعۃ	اور علم لیکر سلطان شمس الدین التمش کے دربار
الخلافۃ ولوائها الی شمس الدین	میں پہنچے تو خلیفہ نے اس وفد کا استقبال کیا
فاستقبلہ وامرہ بالزینۃ	اور شہر اور دربار کو آراستہ کرنے کا حکم دیا اور
وکان یوما مشهودا"[2]	یہ ایک یادگار دن تھا،

فخر الدین مبارک شاہ نے تصریح کی ہے کہ سلطان التمش نے اس وفد کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور خلیفہ بغداد کی خدمت میں کچھ تحائف بھی بھیجے تھے، مگر صغانی واپس نہیں گئے، ان کا قیام یہیں رہا، تاریخ مبارک شاہی میں ہے :

---

[1] ملاحظہ ہو طبقات ناصری مرتبہ آقائے عبد الحی حبیبی طبع کوئٹہ ۱۳۴۹ھ ج ۲ ص ۴۴۰
[2] ملاحظہ ہو ظفر الوالہ بمظفر و آلہ طبع لنڈن ج ۲ ص ۷۰۸

در سنہ ست و عشرین و ستمائۃ رسولان دار الخلافت جا بجا مرحمت خلیفہ خلد اللہ خلافتہ برائے سلطان مرحوم آوردند سلطان مرحوم چنانچہ شرط اطاعت و خدمت گاری باید بجا آورد با فرزندان و ملوک بزرگ بجملۃ چندان فرحت و بہجت کردے دادکہ در تحریر نیاید، در شہر قبہا بستند و طبل و شادیانہ کوفتند، بعد چند گاہ رسولان دار الخلافت را با عزاز و اکرام روان کرد و خدمت بسیار در حضرت دار الخلافت فرستاد[1]

اس مرتبہ بھی صغانی کا قیام مستقل ایک جگہ نہیں رہا، مگر جہاں بھی رہا درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور جس خطہ میں بھی آپ کے قدم گئے وہ قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے معمور ہو گیا، ملوک و سلاطین سے لیکر فقراء و مساکین تک سب نے زانوئے تلمذ تہ اور حدیث رسول کے نور سے اپنے قلب و نظر کو منور کیا، شیخ فرید الدین محمود بن علی الناگوری المتوفی ۷۵۲ھ سرور الصدور میں لکھتے ہیں :

ہم دریں ذکر مولانا رضی الدین صغانی افتاد رحمۃ اللہ علیہ صاحب کتاب مصابیح[2] کہ ایشان در ناگور آمدند، می گویند، دستار سخت بسر بستندے،[3] و دو دار باتینها داد[4]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی مولفہ یحییٰ بن احمد السہرندی مطبع بیپٹسٹ مشن کلکتہ ۱۹۳۱ء ص ۱۹،
[2] مصابیح الدجی بھی صغانی کی حدیث میں ایک مشہور اور مقبول کتاب تھی جو اب مشارق الانوار میں محفوظ ہے، اس کا تذکرہ صغانی نے مشارق الانوار کے مقدمہ (طبع آستانہ ص ۴) میں کیا ہے اور لکھا ہے، لوگ اس کے سماع پر ٹوٹے پڑتے تھے اور اس کے ساتھ بڑا انہماک اور شغف رکھتے تھے[3] ناگور ایک مشہور شہر تھا اب جو جودھپور کے حدود میں واقع ہے، مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلے معز الدین بہرام شاہ نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا، طبقات ناصری (طبع کلکتہ ۱۲۶۴ھ ص ۲۳) میں مذکور ہے :

(باقی ص ۱۲ پر)

پوشیدہ نماند، سخت فاضل و عالم، محدث تام، چنانچہ می گفتند[1] کہ ایں مصباح الدجیٰ

دریک روز دیک محفل تمام فرد خواندگرد، و بزرگان ناگور، قاضی حمید الدین ناگوری

و قاضی کمال الدین و بزرگان دیگر از صدور و ملوک از خدمت ایشان سماع کردند

و اجازت در روایت یافتند[2]،

مصباح الدجیٰ کا درس اس طرح ہوتا تھا کہ درس کے وقت جب کوئی نیا اور مشکل لفظ آجاتا اور شاگردوں میں سے کوئی اس کے متعلق کچھ پوچھتا تو آپ فرماتے، یہ لفظ صحاح جوہری کی فلاں جلد، فلاں صفحہ اور فلاں سطر میں ہے، دیکھ لو، شیخ فرید الدین ناگوری لکھتے ہیں:

ایں صحاح لغت را مولانا رضی الدین صغانی بنشستہ جلد کردہ بود، ہر جا کہ

نشستے پیش او بودے، ہر کہ را لغتے مشکل شدے، بگفتے در فلاں جلد و فلاں صفحہ و فلاں

سطر ایں لغت است، یک سبق ہمچناں بود کہ مولانا گفتے، ایں چنیں ملکہ کردہ بود مردان[3]

رنجہا بردہ اند و زحمتہا کشیدہ اند، تا بجا بجاہی رسیدہ، شما رائیگاں می طلبید و ابجہ

(بقیہ حواشی ص ۱۱) معز الدولہ بہرام شاہ ...... بطرف ہندوستان غزو یا کرد و محمد باہلیم را در بست و ہفتم رمضان سنہ اثنی عشر و خمسمائۃ بگرفت و بند کرد و بجا قبتش بگذاشت و ولایت ہندوستان تمام او را داد و بار دیگر عاصی شد و قلعہ ناگور در ولایت سوالک بحد بیرہ بنا کرد۔“

چونکہ شیخ حمید الدین ناگوری کے وطن ہونے کا فخر اس شہر کو حاصل رہا ہے، اس لیے یہ ایک خاص شہرت کا مالک ہے، صاحب تاج العروس نے اسی نسبت سے اس کو تاج العروس میں بھی جگہ دی ہے اور لکھا ہے۔

ناگور بفتح الکاف مدینۃ بالھند و منھا الشیخ حمید الدین الصوفی الناگوری الملقب بسلطان التارکین من قدماء الشیوخ	ناگور بفتح الکاف (گ) ہندوستان میں ایک شہر ہے شیخ حمید الدین ناگوری یہیں کے رہنے والے تھے جن کا لقب سلطان التارکین ہے اور آپ قدماء مشائخ میں سے ہیں،

[2] فی الاصل نیرابنہ ہی [3] فی الاصل و داع، اگر لفظہ ہوتا تو ورع بمعنی ورا، درست تھا

(حواشی صفحہ ہذا) [1] فی الاصل فی آوند [2] ملاحظہ ہو سرور الصدور من ملفوظات حمید الدین المبرور و تتمہ تکملہ نور البدور (مخطوطہ) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ص ۱۸۱، ۲ [3] فی الاصل مرا ہان،

یافتہ آید آنرا ہم شکر نمی گوئید[1]

صحاح جوہری کا درس

اسی طرح صغانیؒ نے ہندوستان اور سندھ میں صحاح جوہری کا بھی درس دیا ہے جیسا کہ العباب الزاخر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

فی ھذا الکتاب مما یشا کل ما	اس کتاب (العباب) میں اس قسم کے تمام
ذکرت منیف علی الفی موضع	الفاظ (اغلاط جوہری) جن کا میں نے ذکر
نبھت علیھا کلھا فی کتابی	کیا ہے وہ دو ہزار سے بھی زیادہ مواقع
التکملۃ و مجمع البحرین وقد	پر ہیں، میں نے ان پر اپنی دونوں کتابوں
صحح نسخته وحشاھا من قرأ	التکملہ اور مجمع البحرین میں تنبیہ کردی ہے
علی ھذا الکتاب بالھند	جن لوگوں نے صحاح جوہری مجھ سے ہندوستان
والسند والیمن والعراق[2]،	سندھ، یمن اور عراق میں پڑھی ہے انھوں
	نے اپنے نسخہ کی تصحیح اور اس کا تحشیہ بھی
	میرے پاس کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صغانیؒ نے یہاں صحاح جوہری کا درس ہی نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تصحیح اور تحشیہ کا بھی کام کرایا ہے،

صغانی کی سیر و سیاحت اور ریاضت و عبادت

صغانی کے بعض بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی سیر و سیاحت کا دائرہ مملکتِ اسلامیہ کے حدود تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ دار الحرب میں بھی صغانی کی آمد و رفت رہی ہے اور ان کی سیاحت محض سیر و تفریح کے لئے نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد نفس کا تزکیہ اور

[1] ملاحظہ ہو سرور الصدور مع تکملہ بدر البدور (مخطوطہ) ص ۲۲۲ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ العباب، مخطوطہ راقم السطور منقولہ از نسخہ مولانا عبد العزیز المیمنی زید مجدہم،

عبادتِ الٰہی میں انہماک اور اشتغال تھا، کیونکہ بلادِ اسلامیہ میں آپ کا جتنے عرصہ قیام رہتا، طالبانِ علوم کا اتنا ہجوم رہتا کہ عبادت و ریاضت کا موقع نہ ملتا، اس لئے آپ کبھی کبھی اس کام کے لئے دار الحرب میں چلے جاتے، اور عبادت و ریاضت میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ گویا اس عالم قدس کے سوا دنیائے فانی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے، اس حقیقت کا انکشاف اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ناگور میں علما، فقرا اور اعیانِ مملکت آپ سے مصباح الدجیٰ کا سماع کر رہے تھے کہ آپ کے ایک دوست نے آپ سے درخواست کی کہ کچھ علم تصوف کی بھی تعلیم دیجئے، آپ نے فرمایا اس وقت میں درس حدیث میں مشغول ہوں، فرصت نہیں، اگر تمہیں اس کی طلب ہے تو میرے ساتھ ایسے مقامات پر چلو جہاں مسلمانوں کی حکومت نہ ہو وہاں تمہیں بتاؤں گا تصوف کیا ہے، اس دوست کی طلب صادق تھی، اس لئے وہ گجرات کے سفر میں آپ کا رفیق سفر ہوا، وہاں آپ نے . . . . عملاً یہ بتلایا کہ تصوف عمل اور اخلاص کا اعلیٰ نمونہ اور استقامت وصفتِ احسان کا دوسرا نام ہے اس کا تعلق سراسر عمل سے ہے گفتار اور قال سے نہیں، تصوف کی حقیقت عمل ہی کی راہ سے منکشف ہوتی ہے، اگر اس میں کمال پیدا کرنا ہے تو تم اسی طرح عبادت کرو جس طرح مجھے دیکھتے ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے صلوا کما رأیتمونی اصلی (اسی طرح سے نماز پڑھو جس طرح سے تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو) یہ شخص ریاضت و عبادت میں آپ کا استغراق و انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا، اور حج چھوڑ بیٹھا، سرور الصدور میں اس کی پوری تفصیل ہے،

"وہم دریں فرمودند، کہ اورا یارے بود کہ از خدمت مولانا رضی الدین علیہ الرحمۃ علم تصوف درخواست کرد کہ تا وے را بیاموزند چیزے از آن علم، خدمت ایشاں فرمودند کہ مرا این جا مشغولی است کہ خلق ناگور دریں وقت از من علم احادیث می شنوند و مرا فرصت نیست کہ دریں میان ترا علم تصوف بیاموزم اگر می خواہی کہ ایں علم بیاموزی دریں سفر ہا کہ می روم، و دریں بلاد کفار کہ آنجا[1]

این چنیں انبوہے نباشد، بیائی تا ترا این علم بیاموزم می گویند چوں دراں دار الحرب بیا رسیدند چنانچہ جالور[1] و گجرات[2]، و دریں روز ہا دستار[3] و دراز پیچیدہ بود نیچہ باخسر ابطہ نہادہ و پیراہنے کوتاہ بپوشید و نعلین در پاے کرد و کوزہ آب برگرفت و در نماز و طاعت مشغول شد و وے رفت تا روزے ایں مرد گفت کہ آخر نہ من از خدمت شما علم تصوف می خواہم کہ بیاموزم و شما گفتہ بودید کہ چوں بدیں بلاد برسیم کہ فراغت باشد از دیگر گفت و شنود ترا ازاں علم چیزے بیاموزم خدمت گفتند بدانکہ علم تصوف بقال نیست، بحال است، چنانکہ من می کنم و مرا می بینی و نماز می گذارم و کار ہا دیگر چنانچہ از من[4] می بینی تو نیز ہمچنیں می کن کہ علم تصوف بجز و نت زگفتن کہ تصوف ایں است،

صوفیا، اور علما، کا یہی وہ عمل تھا جس نے سخت تر قوم کو بھی حلقہ بگوش اسلام بنادیا تھا، اسی طویل اقتباس کا ایک ٹکڑا اجناب خلیق احمد نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں سرور الصدور ہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کی نسبت موصوف کا خیال ہے کہ اس واقعہ کا تعلق شیخ حمید الدین ناگوری سے ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"شیخ حمید الدین ناگوری نے علم حدیث کو علم تصوف سے زیادہ اہمیت دی اور اپنا بیشتر وقت اسی میں صرف کیا، ایک دن اپنے ایک مرید سے فرمانے لگے،"

[1] جالور، جودھپور میں ایک چھوٹا سا شہر ہے، یہ وہی مقام ہے جہاں علاء الدین کے لشکر نے خمس کا مطالبہ کیا تھا، تفصیل کے لئے دیکھو ظفر الوالہ بمظفر والہ طبع لیڈن ج ۲ ص ۵۰۵، [2] گجرات پورے طور پر علاء الدین خلجی کی فتوحات کے بعد ۶۹۶ھ میں اسلامی قلمرو میں شامل ہوا ہے، اسی لئے اس کو دار الحرب سے تعبیر کیا ہے تفصیل کے لئے دیکھو مراۃ احمدی از علی محمد خاں بہادر طبع کلکتہ ۱۹۲۸ء ج ۱ ص ۳۴ [3] فی الاصل دستار و زاغ پیچیدہ [4] فی الاصل از بینی،

مرا ایں جا مشغولی ست کہ خلق ناگور دریں ۔۔۔ مجھے یہاں یہ مشغولیت ہے کہ آج کل ناگور

وقت از من علم احادیث می شنوند و مرا ۔۔۔ کے لوگ مجھ سے علم حدیث سنتے ہیں مجھے

فرصت نیست کہ دریں میان ترا علم تصوف ۔۔۔ فرصت نہیں کہ اس دوران میں تجھے علم

بیا موزم، (تاریخ مشائخ چشت ص ۱۴۹) ۔۔۔ تصوف سکھاؤں،

ہم نے جو اقتباس پیش کیا ہے اس میں کہیں اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ اس واقعہ کا تعلق شیخ حمید الدین ناگوریؒ سے ہے۔

جب ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ میں سلطان التمتش کا انتقال ہوگیا تو اس کی اولاد میں خانہ جنگی ہوئی، آخر کار اس کا منجھلا لڑکا رکن الدین حریفوں پر غالب آیا، اور فیروز شاہ لقب اختیار کرکے تخت سلطنت پر متمکن ہوا، مگر اس کا دورِ حکومت پر آشوب گذرا، یہ خود سر، سخت گیر اور عیش پرست تھا، مگر اس نے خلیفۃ المومنین کی نیابت اور اطاعت سے سرمو انحراف نہ کیا، اس کے دور کے ڈھلے ہوئے سکوں پر ناصر المومنین کے الفاظ اس امر کا بین ثبوت ہیں، ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ صفائیؒ کے اس طویل قیام نے خلیفۃ المسلمین کا احترام ہی مسلمانوں کے دلوں میں زندہ نہیں کر دیا تھا، بلکہ اُن میں یہ جرأت بھی پیدا کر دی تھی کہ اگر کسی کو سلطان وقت سے داد رسی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ بادشاہِ وقت سے یہ کہنے میں ذرا نہیں جھجکتا تھا، کہ اگر ہماری داد و فریاد نہیں سُنی گئی، یا جو ظلم و ستم ہم پر ہوا ہے اس کا بدلہ نہیں لیا گیا تو ہم بغداد جا کر خلیفہ سے داد خواہی کریں گے، تاج الدین ریزہ جو ایک ملنسار، شگفتہ مزاج اور بذلہ گو شاعر تھا، جب اس کے کسی دشمن نے اسے زدوکوب کیا تو اس نے ان مظالم کی ایک داستان نظم کی اور منظوم فریاد اپنے ممدوح سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے دربار میں پیش کی جسے اس طرح سے شروع کرتا ہے۔

بفریاد آمدم اینجا بفریاد ۔۔۔ مگر شاہ جہاں دادم دہد داد

اور آگے لکھتا ہے،

اگر داد ے نیابم ایں ستم را ۔۔۔ دوم زیں خاک خوں آشام برباد

ز آب چشم امیر المومنین را ۔۔۔ نمایم دجلۂ دیگر بہ بغداد

رکن الدین فیروز شاہ کی سخت گیری، عیش کوشی اور سرمستی نے جلد ہی اعیانِ مملکت اور اربابِ اقتدار کو اس سے برگشتہ کر دیا اور سب نے سازش کرکے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یہ اُن کی سرکوبی کے لئے نکلا مگر اس کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کی بہن رضیہ کو تخت سلطنت پر لا بٹھایا، اُس نے اسے بھی قید کرا دیا، اور بحالت قیدی ۶۳۴ھ میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا، جب زمامِ کار رضیہ سلطانہ کے ہاتھ میں آگئی، اور یہاں کی سیاسی فضا مکدر ہوگئی تو معلوم ہوتا ہے صفائی حج کی اجازت لے کر حجاز چلے گئے، اور غالباً ۶۳۴ھ میں حج کیا اور کچھ عرصہ کیلئے وہیں ٹھہر گئے،

(باقی)

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۷)

رضیہ کے برسر اقتدار آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے صغانی کو ہندوستان کا قیام پسند نہیں رہا اور آپ ۶۳۴ھ میں حج کے ارادہ سے حجاز روانہ ہوگئے، یہ بات وثوق سے تو نہیں کہی جا سکتی کہ آپ نے اسی سال حج کیا یا ۶۳۵ھ میں یہ سعادت نصیب ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صفر ۶۳۵ھ تک آپ کا قیام حجاز ہی میں رہا، کیونکہ آپ نے یہیں رہ کر تکملۃ الصحاح کو مکمل کیا تھا، آستانہ (ترکی) میں صغانی کے قلم کا لکھا ہوا تکملۃ الصحاح کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کے خاتمہ پر تحریر ہے،

فرغ من تالیفه امام بیت الله
الحرام صبیحة یوم الجمعة وقت
فتح باب بیت الله الحرام العاشر
من صفر سنة خمس وثلاثین

مولف اس تکملہ کی تالیف سے بیت اللہ شریف کے سامنے صبح کو جمعہ کے دن بیت اللہ کا دروازہ کھلنے کے وقت دس صفر ۶۳۵ھ کو فارغ ہوا،

لہ ملاحظہ ہو تہذیب الصحاح (مقدمہ از عبد الغفور عطار طبع دار المعارف مصر ۱۳۷۱ھ ص ۹۴ و صحاح اللغۃ للجوہری کا مقدمہ احمد عبد الغفور عطار) دار الکتاب العربی مصر ۱۹۵۶ء ص ۱۲۹

صحاح جوہری کا تکملہ پورا کرنے کے بعد حجاز سے ہندوستان واپس آگئے،

اسلام نے چونکہ عورت کو امام اور خلیفہ کے اختیارات کا مستحق قرار نہیں دیا ہے، اس لیے اہل علم نے رضیہ کی حکمرانی کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا، اسی لیے صغانی کو بھی یہاں کا قیام پسند نہ تھا، چنانچہ اس کے تخت شاہی پر تمکن ہونے کے بعد ہی یہاں سے رستگاری کی تدبیریں شروع کر دیں، لیکن رضیہ نے برسر اقتدار ہونے کے بعد خلافت بغداد سے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا تھا، اس لیے آپ کی خواہش کے باوجود آپ کو بغداد نہیں بلایا گیا، مگر صغانی یہاں کا قیام اپنے لیے ایک قید خانہ سے کم نہ سمجھتے تھے، (جیسا کہ آیندہ اشعار سے معلوم ہوگا) یہاں سے نکلنے کے لیے اپنے فرزندوں کو بھی لکھا، انھوں نے بھی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہو سکے، اور خلیفہ مستنصر باللہ نے ان حالات میں آپ کو بغداد بلانا غالباً مصلحت کے خلاف سمجھا اور یونہی ڈیڑھ دو برس کی مدت گذر گئی، اس کے بعد ۶۳۷ھ میں آپ کو بغداد بلایا گیا، ان حالات سے متاثر ہو کر صغانی نے ۵۹ شعروں کا ایک قصیدہ لکھا، جو ہندوستان کی سرزمین میں عربی زبان میں ادبی طرز کا واحد قصیدہ ہے، اس میں صنائع لفظیہ و معنویہ اور الفاظ عربیہ کے باوجود یہ خوبی ہے کہ اس میں آپ نے اپنے حالات قلمبند کیے ہیں، زمانہ کی سازگاری اور ناسازگاری کو بیان کیا ہے، اور شاعرانہ انداز میں آپ بیتی لکھی ہے، یہ پورا قصیدہ تجنیس[1] میں ہے اس لیے کچھ اشعار نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں

(۱) انسانی الدھر اعطانی داوطانی وحطنی ووھاد الخسف اوطانی

زمانہ نے (حیرت دل سے) میرے وطن اور میری نشست گاہوں (کی یاد) کو بھلا دیا اور مجھے قعر ذلت میں گرا کر روندا ہے،

[1] صنائع لفظیہ کے اقسام میں سے ایک قسم کا نام صنعت تجنیس ہے، اسکی بھی کئی قسمیں ہیں، جس میں ایک قسم تجنیس تام کہلاتی ہے، یہ ایسی صنعت ہے جس میں دو لفظ انواع حروف، اعداد حروف، ترتیب حروف اور حرکات و سکنات میں متفق اور معنی میں مختلف استعمال ہوتے ہیں، یہ پورا قصیدہ اسی صنعت پر مشتمل ہے،

(۲) وکنت افنیت عمری فی رفاھیۃ فعطنی ولذیذ العیش انسانی

حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و عشرت میں گذاری، پھر اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور میری پسندیدہ اور پرعیش زندگی کو بھلا دیا

(۳) وکان قدمنی قدرا واکرمنی فالآن اخرنی غدرا وانسانی

حالانکہ اس نے میری بڑی عزت افزائی کی تھی اور میرا بڑا اکرام کرتا تھا اور اب اس نے مجھ سے بیوفائی کر کے مجھے چھوڑ دیا اور بھلا دیا،

(۴) وکم غنیت بمغنی العز اشرف اجرفی المجد اذیالی وارادانی

میں بہت سے عز و شرف کے مقامات میں رہا ہوں اور مجد و بزرگی میں اپنے دامن اور آستین گھسیٹتا رہا ہوں

(۵) لا استکین لسلطان ولا ملک بعظمہ فرد انی ثم ارادانی

میں کبھی کسی سلطان اور بادشاہ کے آگے اس کے جاہ و جلال کی وجہ سے سرنگوں نہیں ہوا مگر زمانہ نے مجھے پارہ پارہ اور ہلاک کر دیا ہے

(۶) ردّنی خائبا صفر الیدین لقیّ من بعد ماکان بالترحیب حیّانی

اس نے مجھے گری پڑی چیز کی طرح نامراد اور خالی ہاتھ لوٹا دیا، حالانکہ وہ پہلے مجھے خوش آمدید اور عمر دراز باد کہہ چکا تھا،

(۷) وکان احیاء ھذا الصقع لی تبعاً فھل یدین من الاحیاء حیّان

اور اس زمین پر رہنے بسنے والے میرے فرمانبردار تھے، اب کیا دو قبیلے بھی میری اطاعت قبول کر سکتے ہیں اور فرماں بردار ہو سکتے ہیں؟

(۸) ومسنی بالیم الضر معتسفا لمّا طوی لی اعوانی واعیانی

اور اس نے ظلم پر کمر بستہ ہو کر مجھے بڑی دردناک تکلیف پہنچائی ہے، اس نے میرے سرداروں اور ممتاز ساتھیوں کو مار ڈالا ہے

(۹) وکنت اعی زمانا عزۃ وسنا   فالآن جور زمان السوء اعیانی

میں زمانہ کو عزت اور وقار کے اعتبار سے تھکا چکا تھا، اور اب زمانۂ بد کے ظلم وستم نے مجھے تھکا مارا ہے

(۱۰) وکان لو خضعت نفسی لترضیۃ   القی القیاد فاعلانی واسمانی

اور اگر میرا نفس اسکی رضاجوئی کیلئے آمادہ ہوگیا ہوتا تو قیادت میرے ہاتھ میں رہتی اور اس نے مجھے بام عروج پر پہنچایا ہوتا

(۱۱) وحین کنت حدیث السن ذا اشر   سنی عطائی واغنانی واسنانی

اور جس وقت میں نوعمر اور سربلند تھا تو اس نے مجھے انعامات سے سرفراز، مالامال اور ممتاز اور نمایاں کیا

(۱۲) ثم انہ دار انی اخیرا والحی غصنی   من بعد ما نفضت للشیب اسنانی

پھر اس نے آخر میں مجھے حقیر اور ناکارہ سمجھا اور شاخوں (گوشت پوست) کو نوچنا شروع کر دیا، جبکہ

بڑھاپے کی وجہ سے دانت ہلنے شروع ہوگئے اور خراب ہوگئے

(۱۳) وکان دوحۃ عیشی غضۃ زمنا   قصیرۃ ذات اغصان وافنان

اور میرے عیش کا برگ وبار والا درخت بہت تھوڑے زمانہ تک تر وتازہ رہا

(۱۴) وکنت مہما ارتجلت الشعر مقتضبا   یزری علی ابن ابی النہی وحسان

اور جس وقت میں فی البدیہہ شعر کہتا تھا تو اس کے مقابلہ میں ابن ابی النہی اور (حضرت)

حسان رضؓ کے شعر بے حقیقت معلوم ہوتے تھے

(۱۵) فالآن انی لارعی الناس قاطبۃ   مذ ضامنی وجمیع الضیم حسانی

اب میں تمام لوگوں سے زیادہ تھکا ماندہ ہوں، جب سے اس نے مجھ پر ظلم کیا اور ظلم کو مجھے گھونٹ گھونٹ کرکے پلایا ہے

(۱۶) وکان قصری من وافاہ قال لہ   یا بانی القصر نعم القصر والبانی

اور میرا محل ایسا تھا کہ جو اس کو دیکھتا تھا، کہتا تھا کہ محل بنانے والا اور محل دونوں خوب ہیں،

(۱۷) فہدہ الدھر ھدا لا نظام لہ   ضرب المعول غصن الطلح والبان

پس زمانہ نے جس کا کوئی اصول نہیں ہے اسکو منہدم کردیا اور ایسی ضرب لگائی جیسے کدال والا ببول اور بان کی

(۱۸) ولی ببغداد دار العز دام بہا   ظل الامام الراضی المستنصر ابنانی

اور بغداد جو عزو شرف کا گھر ہے اس میں ہمیشہ ہمیشہ ولعزیز خلیفہ مستنصر باللہ کا سایہ رہے وہاں میرے دو لڑکے ہیں

(۱۹) وہا انا الآن کرہا لا طواعیۃ   بالہند والسند ذو عدن وایطان[ا]

اور میں اسوقت خوشی سے نہیں، مجبوری سے ہندوستان اور سندھ میں اقامت گزیں اور مقیم ہوں،

(۲۰) ان کان غیری فی خفض وفی دعۃ   یخلو بدف ومزمار وعیدان

میرے علاوہ اور لوگ عیش وعشرت میں ہیں اور خلوت میں دف، بانسری اور باجوں کے مزے لے رہے ہیں،

(۲۱) فلی من الدھر فی یومی ولیلتہ   من التہدد فی غیظ وعیدان

میرے لیے زمانہ کی طرف سے شب وروز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں (ایک صبح اور ایک شام)

(۲۲) وکنت من قبل لو ہمت بد ائرۃ   صروف دھری علی حر انا الثانی

حالانکہ میں پہلے ایسا تھا کہ اگر زمانہ اپنی گردشیں کسی شریف اور آزاد مرد پر لانا چاہتا تو میں اسکا منہ پھیر دیتا تھا،

(۲۳) امر عیشی ما قاسیت فی سفری   من بعد ما کان حلاہ وحلا لی

میری زندگی کا سب سے تلخ حصہ وہ ہے جو میں نے اپنے سفر میں گذارا، جبکہ اس سے پہلے زمانہ نے اسکو

خوشگوار اور شیریں تر بنا دیا تھا

(۲۴) معطلا جسمی المرہون منتقیا   من بعد ما کان حلاہ وحلانی

اب وہ میرے نحیف وکمزور جسم کو بیکار کرچکا ہے، جب کہ پہلے اسکو سنوارا اور مجھکو مزین کرچکا تھا

(۲۵) وعاد قوتی کفا من نوی حشف   وکان من صدر دراج وحلان

اور اب میری خوراک ایک مٹھی بھر کھجور رہ گئی ہو حالانکہ پہلے تیتر اور بکرے کے سینہ کا گوشت میری خوراک تھی،

(۲۶) یا قرتی عینی الندبین ان تجدا   ید الی فک ماسور فخلانی

اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک، شریف ودانا فرزندو! اگر تم میں ایک قیدی کے چھڑانے کی طاقت ہو تو تم مجھے چھڑالو۔

[ا] یہ اور اس سے پہلے والا شعر ہمارے اس دعوئی کی کہ یہ قصیدہ یہیں لکھا گیا ہے، نہایت بین دلیل ہے۔ یہ شعر سلطانہ رضیہ کے دور قیام کی پوری پوری غمازی کر رہا ہے، اور اس دعوئی کی صریح دلیل ہو کر قصیدہ یہیں نظم ہوا ہے، اسی لیے ہم نے اسکو یہاں درج کیا ہے،

(۲۷) من بعد ما ربی طولا واکرمنی — قولا واجزل لی نولا وفتانی

اس کے بعد کہ زمانہ نے مجھے بڑی ناز و نعمت سے پالا، زبان سے بڑا اکرام کیا، بڑے بڑے انعامات سے

نوازا، جوان کیا، طاقتور بنایا، جوانمردی اور سخاوت کا جامہ پہنایا،

(۲۸) حتی اذا صرت اخشی الذئب من کبری — الاذنی بصفیق الوجہ فتان

یہاں تک کہ جب میں بڑھاپے کی وجہ سے ایسی حالت میں ہو گیا کہ بھیڑیے سے ڈرایا جائے تو اس نے

مجھے اپنے فتنہ انگیز چہرے کی پناہ میں لے لیا

(۲۹) وکنت من قبل من اودعتہ ذھبا — کانما حاطہ للحفظ برجان

اور پہلے میں جس کے پاس سونا امانت رکھا تھا تو گویا اس کی حفاظت کے لیے دو برج ہوتے تھے،

(۳۰) والآن کل من استودعتہ اھبا — الص من سارق العربان برجان[1]

اور اب ہر وہ شخص جس کے پاس میں کچا چمڑا امانت رکھتا ہوں تو وہ عربوں کے برجان نامی چور سے

بھی زیادہ چور نکلتا ہے

(۳۱) فقلت یا دھر سالمنی مسالمۃ — فاننی عمری ثم صاغانی

میں نے زمانہ سے کہہ دیا ہے کہ تو مجھ سے پوری مصالحت کرلے، ورنہ جان لے کہ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ

کی اولاد سے ہوں اور صاغانی ہوں

(۳۲) فانصاع ینقاد اذعانا وسالمنی — ومد ضبعی وناغانی وصاغانی

اب وہ سچا منقاد ہو گیا ہے، اس نے مجھ سے مصالحت کرلی ہے، میرے بازو پھیلا دیے ہیں، مجھ سے

قریب اور میری طرف ہمہ تن گوش ہو گیا ہے،

---

[1] یہ بھی ضرب المثل اسرق من برجان سے ماخوذ ہے، برجان نامی کوفہ میں ایک چور تھا جسے چوری کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی تو سزا کے موقع پر بھی چوری سے باز نہیں رہا، ملاحظہ ہو مجمع الامثال از مجمی کرمانی طبع طہران سنہ ۱۲۹۰ھ ص ۳۰۶

(۳۳) فصار شکوای شکرا والجوی فرحا — والعتب عتبی وفادانی وناجانی[1]

اسلیے اب میرا شکوہ شکر سے اور غم خوشی سے بدل گیا اور ناراضگی رضامندی میں تبدیل ہوگئی اور اس نے

مجھ سے سرگوشیاں کیں اور کہا میں تیرے قربان!

(۳۴) وذاک للصفح منی عن جنایتہ — والصفح یجدی کثیرا ان جنی جان[2][3]

یہ تبدیلی اسلیے ہوئی کہ میں نے اس کے قصور سے درگذر کیا اور گنہگار کے گناہ سے درگزر کرنا بڑا فائدہ مند ہے۔

یہاں یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ ہندوستان میں سفارت کے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے صغانی کو کبھی ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا، وہ لغت کے امام اور فن حدیث کے ناقد تھے، اور یہی ان کا اصلی مذاق تھا، لیکن اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم کی یہ خوبی تھی کہ ایک عالم کو جس قسم کی خدمت سپرد کی جاتی تھی، اس کو انجام دے سکتا تھا، صغانی نے قیام ہندوستان کے زمانہ میں ہندوستان کے خلافتِ بغداد سے تعلقات ایسے مستحکم اور استوار کر دیے تھے کہ سفارت کا تعلق ختم ہونے کے بعد بھی خلفاء کی عظمت بادشاہوں کے قلوب میں بدستور قائم رہی اور خلافت بغداد کی تباہی بھی ایک زمانہ تک اس کی یاد ان کے دل سے فراموش نہیں کراسکی اور شاہان ہند خلفاء کا نام اپنے سکوں پر برابر لکھواتے رہے اور ان کی نیابت کا دم بھرتے رہے۔[4]

صغانی کے ہندوستان میں قیام کی مجموعی مدت

صغانی کی زندگی کے واقعات چونکہ تذکروں کی کتابوں میں مرتب نہیں ہیں اور جن ارباب تذکرہ نے کہیں کہیں سنہ کا تعین کیا ہے، ان میں سے بعض خود صغانی کی تصریح کے خلاف ہیں۔ صغانی کا بھی یہی دستور ہے کہ کہیں تو معمولی معمولی واقعات پر بھی

---

[1] فی الاصل فادانی [2] فی الاصل الکثیر [3] یہ پورا قصیدہ ابن ابی مخرمہ نے تاریخ ثغر عدن میں مجد الدین فیروزآبادی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن طبع لیڈن ۱۹۳۶ء ج ۲ ص ۸۵ [4] ملاحظہ ہو

The Coinage and Metralugy of The Sultan of Dehli by H.N. Wright. Dehli. 1936

سنہ کو لکھ دیتے ہیں اور کہیں اہم مواقع پر بھی سنہ کا ذکر نہیں کرتے، چنانچہ عنبر مچھلی کی کھال کی جوتیاں بنوائیں تو اس کا سنہ لکھ دیا، لیکن مجمع البحرین کی تالیف کا کام کس سنہ میں شروع کیا اور کب ختم ہوا، اس کا پوری کتاب میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں، اسی طرح مشارق الانوار اور العباب الزاخر کی تاریخ تحریر کا بھی کچھ پتہ نہیں، ایسی صورت میں واقعات کی ترتیب اور سنین کی تعیین میں جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، تاہم جہانتک واقعات کے بیان میں سنین کا سراغ مل سکا ہے انھیں نقل کر دیا گیا ہے، لیکن صغانی کا کل قلمی سرمایہ پیش نظر نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہیں اور بھی سنین کا ذکر آیا ہو، جن واقعات میں سنین کو نقل کیا گیا ہے وہ گذر چکے ہیں، اگر ان سنین کو سامنے رکھا جائے تو جمہور مورخین کے قول پر صغانی کے اس بیان الی ان شرقت وغربت بالهند والسند نیفا و اربعین سنة کی صحت اسی وقت ممکن ہے جب ان کے بچپن کے ابتدائی دس سال لاہور ہی میں تسلیم کیے جائیں (جس کی تردید کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں) کیونکہ اس صورت میں صغانی کے ہندوستان اور سندھ میں قیام کی مجموعی مدت ۴۱ اور کسور کو شامل کرنے کے بعد ۴۳ سال پوری ہو جاتی ہے،

صغانی ۶۳۷ھ میں ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہکر بغداد چلے گئے، مورخ ذہبی تاریخ الاسلام میں رقمطراز ہیں،

قدم سنة اربع وعشرين ثم	صغانی ۶۲۴ھ میں بغداد آئے، پھر سفیر
اعيد اليها رسولاً عام ثمان	ہوکر اسی سال ہندوستان واپس چلے گئے
رجع الى بغداد سنة سبع وثلاثين[1]	اور ۶۳۷ھ تک بغداد واپس نہیں آئے۔

ذہبی کے مذکورۂ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ۶۳۴ھ میں صغانی حجاز جاتے ہوئے

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام تذکرہ حسن بن محمد الصغانی، مخطوطہ رضا لائبریری رامپور۔

اور ۶۳۵ھ میں وہاں سے واپس آتے ہوئے بغداد نہیں گئے تھے، بلکہ حجاز سے سیدھے ہندوستان آگئے تھے، اس سے مولانا عبد الحی لکھنوی کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ انھیں خلیفہ بغداد نے سلطانہ رضیہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا[1] جیسا کہ گذر چکا۔

کدار میں ورود

صغانی ہندوستان سے جاتے ہوئے یمن کے ایک شہر کدار میں بھی اترے تھے، چنانچہ مجمع البحرین میں فرماتے ہیں:

الكدراء[2] بلدة باليمن على وادى	کدراء یمن کا ایک شہر ہے جو وادی سہام
سهام واليها ينسب الاديم	کے پاس آباد ہے، کچا چمڑا اس کی طرف منسوب
قال الصغانى مؤلف هذا الكتاب	ہے، صغانی اس کتاب کا مولف کہتا ہے
وقد وردتها سنة سبع وثلاثين	میں ۶۳۷ھ میں ہندوستان سے بغداد
وستمائة منصرفى من الهند الى	(اللہ تعالیٰ اس کو اپنی حفاظت میں
مدينة السلام حماها الله تعالى[3]	رکھے) جاتے وقت یہاں اترا تھا،

کدراء سے بغداد گئے تھے،

بغداد میں آمد اور رباط مرزبانیہ کی صدارت

صغانی نے ہندوستان کے قیام کے زمانہ میں تصوف میں جو مقام حاصل کیا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آپ بغداد پہنچے تو خلیفہ مستنصر باللہ نے آپ کو رباط المرزبانیہ (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کا صدر مقرر کیا، صغانی مجمع البحرین میں رقمطراز ہیں:

المرزبانية قرية على نهر عيسى	مرزبانیہ نہر عیسیٰ کے پاس اور محول کے بالائی
فوق المحول بنى بها الامام الناصر	حصہ میں ایک بستی ہے، الناصر لدین اللہ قدس اللہ روحہ

[1] نزہۃ الخواطر طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ج ا ص ۱۳۸ [2] معجم البلدان ج ۷ ص ۲۲۳ [3] مجمع البحرین (روٹو گراف کاپی) اسلامک ریسرچ انسٹیٹوٹ کراچی، مادہ "کدر"

لدین اللہ قدس اللہ روحہ
دار اور باطا لاھل التصوف
تقبل اللہ منہ وجعلنی الامام
المستنصر باللہ انار اللہ برھانہ
شیخ ذالک الرباط واوزعنی شکر
نعمھم[1]

نے یہاں ایک مکان اور صوفیوں کے لیے
ایک سرائے بنوائی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی اس
خدمت کو قبول فرمائے، خلیفہ مستنصر باللہ
نے (اللہ تعالیٰ اس کی خلافت کو برقرار رکھے)
مجھے اس سرائے اور خانقاہ کا صدر بنایا اور
اللہ تعالیٰ مجھے ان نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرمائے

مرزبانیہ بغداد کی ایک بستی کا نام ہے جو اپنی سرسبزی اور شادابی میں مشہور تھی، خلیفہ بغداد الناصر لدین اللہ چونکہ شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی المتوفی ۶۳۲ھ کا بڑا عقیدتمند تھا، اور ان کے فضل و کمال اور زہد و ورع سے اتنا متاثر تھا کہ مسلمان بادشاہوں کے دربار میں ان کو سفیر بنا کر بھیجتا تھا، اس لیے اس نے آپ کے رہنے کے لیے ایک نہایت کشادہ اور عالیشان مکان تعمیر کرایا، جس میں حمام بنوایا اور باغ لگوایا اور ایک سرائے اور خانقاہ تعمیر کرکے فقراء اور اہل اللہ کے لیے وقف کی، یہی وہ سرائے ہے جو رباط المرزبانیہ کے نام سے مشہور تھی، ابن الفوطی المتوفی ۷۲۳ھ شیخ شہاب الدین سہروردی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

بنی لہ الخلیفۃ الناصر لدین اللہ
رباطا بالمرزبانیۃ علی نہر عیسی
وبنی الی جنبہ دارا واسعۃ
وحماما وبستانا یسکنھا باھلہ
وتفقدہ الخلیفۃ رسولا الی

خلیفہ الناصر لدین اللہ نے آپ کے لیے ایک سرائے
مرزبانیہ میں نہر عیسیٰ کے کنارے تعمیر کرائی تھی،
اور اس کے پہلو میں ایک نہایت کشادہ
مکان اور حمام بنوایا اور باغ لگوایا تھا،
یہاں آپ اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے،

۱ ملاحظہ ہو معجم البلدان مادہ مرزب

عدۃ جہات وکان الملوک الذین
یرد علیھم یبالغون فی اکرامہ
وتعظیمہ واحترامہ اعتقادا
فیہ وتبرکا[1]

خلیفہ نے آپ کو مختلف شہروں میں سفیر بنا کر
بھیجا تھا، جن بادشاہوں کے دربار میں
آپ جاتے تھے وہ حصول برکت کے لیے اور
ارادتمندی کی وجہ سے آپ کی تعظیم و تکریم کرتے تھے،

شیخ شہاب الدین سہروردی شافعی المذہب عالم اور بڑے خدا ترس بزرگ تھے، اگرچہ علماء بعض مسائل میں ان کے تفرد کی وجہ سے ان سے زیادہ خوش نہیں ہیں[2]، انھوں نے خلیفہ ناصر لدین اللہ سے وقف کے وقت غالباً یہ شرط کرائی تھی کہ اس کا صدر ہمیشہ شافعی المذہب عالم ہوگا، صغانی کو اس شرط کا علم نہ تھا، مگر آپ کئی برس تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے، ایک مدت کے بعد کسی ضرورت سے وقف نامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس وقت معلوم ہوا کہ واقف نے یہ شرط رکھی ہے کہ اس کا صدر شافعی المسلک عالم ہی ہوگا تو آپ فوراً صدارت سے دستبردار ہوگئے، مورخ ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فرتب شیخا برباط المرزبانیۃ
فلم یزل الی اخر ایام المستنصر
ثم نظر فی شرط الواقف فوجد
فیہ ان یکون شافعیا فعزل
نفسہ[3]

پس آپ کو رباط مرزبانیہ کا صدر مقرر کیا گیا
اور آپ مستنصر باللہ کے آخری زمانہ تک
اس کے صدر رہے، اتفاق سے آپ نے
وقف نامہ پڑھا تو دیکھا کہ وقف کرنے والے نے
اس میں یہ شرط رکھی ہے کہ اس کا صدر شافعی
مسلک عالم ہوگا تو آپ فوراً اس منصب سے

۱ ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ، مکتبۃ العربیہ بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۴۷، ۲ ملاحظہ ہو الطبقات الشافعیہ الکبریٰ مطبعۃ الحسینیہ مصر ج ۵ ص ۱۴۴، ۳ ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۶۳

مستنصر باللہ کا انتقال جمادی الاخری ۶۴۰ھ کو ہوا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صغانی ۶۳۹ھ تک اس خدمت پر مامور رہے، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ الحوادث الجامعہ ہی میں "تتمۃ اخبار سنۃ ۶۴۳ھ" کے ضمن میں یہ بھی موجود ہے کہ اسی سال (۶۴۳ھ میں) صغانی رباط المرزبانیہ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اور شیخ الشیوخ علی بن النیار کو جو شافعی المذہب عالم اور صوفی مشرب بزرگ تھے، صغانی کی جگہ صدر مقرر کیا گیا، چنانچہ فرماتے ہیں:

فیھا عزل رضی الدین الحسن	رضی الدین حسن بن محمد الصغانی اسی سال
بن محمد الصغانی عن مشیخۃ	۶۴۳ھ میں رباط مرزبانیہ کی صدارت سے
رباط المرزبانیۃ لکونہ حنفیا	مستعفی ہوئے، کیونکہ وہ حنفی تھے اور وقف کنندہ کی
وشرط الواقف ان یکون شافعیا	یہ شرط تھی کہ صدر شافعی مسلک کا عالم ہوگا،
واضیف الرباط الی الشیخ علی	اس کے بعد رباط مرزبانیہ کی زمام شیخ علی
بن النیار[1]	ابن النیار کے ہاتھ میں دیدی گئی۔

مذکورۂ بالا بیان میں اس امر کی تصریح ہے کہ صغانی کے بعد رباط مرزبانیہ کا صدر شیخ علی ابن النیار کو بنایا گیا تھا، اس لیے یہی قول زیادہ صحیح ہے، لیکن مورخین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ علی بن النیار کو شیخ الشیوخ ۶۴۲ھ میں بنایا گیا ہے یا ۶۴۳ھ میں، یہ اختلاف بھی دراصل اس امر پر مبنی ہے کہ وزیر نصیر الدین احمد بن الناقد کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا یا ۶۴۳ھ میں، کیونکہ اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۰۷، علی بن محمد بن الحسین نام، ابو المظفر کنیت، اور شمس الدین لقب تھا، بڑے جید عالم اور صوفی مشرب بزرگ تھے، خلیفہ مستعصم باللہ کے مربی رہ چکے تھے، آپ ہی نے مستعصم کو قرآن مجید حفظ کرایا، تجوید کی تعلیم دی اور خوشنویسی سکھائی تھی، اس لیے مستعصم باللہ کے دور خلافت میں انھیں بڑا اعزاز حاصل رہا، ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا، حالات کے لیے ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۳۰۴ اور البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۱۳ ص ۲۱۳

انتقال کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ نے قلمدان وزارت شیخ علی بن النیار کو سپرد کرنا چاہا تھا، مگر انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں نے صوفیانہ لباس پہن لیا، اسے نہیں اتار سکتا، ان کا مکالمہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فلما توفی الوزیر بن الناقد خاطبہ	جب وزیر بن الناقد نے وفات پائی تو خلیفہ
فی تقلید الوزارۃ فابی وقال	نے انکو وزیر بنانا چاہا، انھوں نے اس انکار
انی عاھدت اللہ ان لا اغیر	کر دیا اور فرمایا میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ
لبس المتصوفین ولا انزع عنی	فقیرانہ لباس نہیں بدلوں گا اور جس کو میں نے
ما تعودتہ فقیل لہ نحن نوافقہ	اختیار کر لیا ہے اس کو نہیں چھوڑوں گا، ان سے
علی ذلک بحیث تورخ الناس	کہا گیا ہم اس پر بھی آپ کی وزارت سے اتفاق
ان شخصا یختص بنا ندبناہ الی	کرتے ہیں تاکہ مورخین یہ لکھیں کہ ایک ایسے شخص
الوزارۃ فابی ان یغیر زیہ	کو جو ہم سے وابستہ تھا، ہم نے وزارت قبول
فاجبناہ الی ذلک فقال لان	کرنے کی دعوت دی مگر اس نے اپنے فقیرانہ
تورخ الناس ان شخصا متصوفا	لباس کے بدلنے سے انکار کر دیا لیکن ہم نے
حسن فیہ الظن وندب الی	اس شرط کو بھی قبول کر لیا، اس پر انھوں نے
الوزارۃ فامتنع احسن من ذلک	کہا کہ مورخین کا یہ لکھنا کہ ایک صوفی مشرب
فحینئذ فوضت الیہ مشیخۃ	انسان کو جس کے ساتھ انھیں حسن ظن تھا
الشیوخ ببغداد... خوطب بشیخ	وزارت کی دعوت دی گئی مگر اس نے انکار کیا
الشیوخ.... ثم اضیف الیہ مشیخۃ	بار وزارت اٹھانے سے بہتر ہے، اس وقت
رباط المرزبانیۃ[1]	انھیں مشائخ بغداد کا صدر بنایا گیا اور شیخ الشیوخ

---

[1] الحوادث الجامعہ ص ۲۰۵

ان کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن العلقمی کو وزارت کا عہدہ ملا جس نے تاتاریوں سے مل کر خلافت اور عروس البلاد بغداد کا خاتمہ کر دیا، ابن کثیر نے ان ہی بزرگ کی وفات پر یہ نقرہ لکھا ذبح بدار الخلافۃ کما تذبح الشاۃ (دار الخلافت بغداد میں انھیں اس طرح ذبح کر دیا گیا جس طرح بکری کو ذبح کیا جاتا ہے)

ابن الفوطی کا خیال بھی یہی ہے، وزیر نصیر الدین کا انتقال ۶۴۳ھ میں ہوا ہے، لیکن ابن الطقطقی نے الآداب السلطانیہ[1]، ذہبی نے دول الاسلام[2] اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں تصریح کی ہے کہ اس کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا تھا، ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی سال علی بن النیار کو شیخ الشیوخ بنایا گیا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صغانی اس اہم خدمت پر کم وبیش پانچ برس مامور رہے اور مستنصر باللہ کے زمانۂ خلافت میں نہیں بلکہ مستعصم باللہ کے دور خلافت میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ (باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو الآداب السلطانیہ طبع مصر ص ۲۴۴ [2] دول الاسلام طبع اول دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۱۱۲ [3] البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۳ ص ۱۶۴

بزم مملوکیہ

جس میں ہندوستان کے مملوک یعنی غلام سلاطین، امراء اور شہزادوں کی علم نوازی، اور معارف پروری کے حالات اور ان کے دربار سے متوسل علماء و فضلاء، اور ادباء و شعراء کے کمالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ (مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم، اے)

صفحات ۳۵۰ - قیمت: ۵ روپے ۵۰ نئے پیسے

منیجر

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از جناب مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۸)

مدرسہ تتشیہ میں صغانی کا تقرر

جب صغانیؒ ۶۴۲ھ میں رباط المرزبانیہ کی صدارت سے سبکدوش ہوئے تو خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ نے ان کو خمارتکینؒ[1] کے مدرسۂ تتشیہ[2] میں مدرس مقرر کر دیا اور

---

[1] افسوس ہے اس مخلص اور خیر خواہ کے تذکرے سے تاریخ اور تذکرہ کی متداول کتابیں یکسر خاموش ہیں، جو سرمایہ جستجو و تلاش کے بعد ہاتھ آیا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے، خمارتکین بن طاشتکین المتوفی ۵۰۸ھ سلطان الپ ارسلان کے فرزند تاج الدولہ ابو سعید تتش السلجوقی المتوفی ۴۸۸ھ کا غلام تھا، تاج الدولہ ابو سعید نے اس کو پہلی مرتبہ ایک بار شتر نمک کی قیمت میں خریدا تھا، یہ جوہر قابل تھا، اس نے اپنی وفاداری، فرض شناسی، غیر معمولی شجاعت اور قابلیت کی وجہ سے جلد ہی اپنے آقا کی نگاہ میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا، اس کے انتقال کے بعد محمد بن ملک شاہ المتوفی ۵۱۱ھ کے دربار میں اس کو بڑی جاہ و منزلت حاصل ہو گئی تھی، اس کے دور حکومت میں اس کا طوطی بولتا تھا، اس کے پاس مال و دولت کی بڑی فراوانی تھی، اور اس نے رفاہ عام کے کارہائے نمایاں انجام دیے، حاجیوں اور مسافروں کے لیے رے اور سمنان میں نہایت عالیشان سرائیں تعمیر کرائیں، بغداد میں مسجدیں اور سڑکیں بنوائیں، شفاخانے اور مدرسے کھولے، مگر اس وفادار اور حق شناس خادم نے ان سب کو اپنے نام سے انتساب کے بجائے اپنے آقا کے نام سے نسبت ہی کو باعث فخر سمجھا، اس کے اخلاص کی یہ برکت تھی کہ دو سو برس تک ان سے خلقِ خدا کو فیض پہنچتا رہا، یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ

(باقی حواشی صفحہ ۱۶۶ پر)

خلعت خاص سے سرفراز فرمایا، پہلی مرتبہ اس کا اصل محرک اور بانی اگرچہ ابو سعد صوفی تھا، مگر اس کا

(بقیہ حواشی ص ۱۶۵) معجم البلدان میں رقم طراز ہے :-

تتش التاآن مضمومتان والشين معجمة وهو اسم رجل ينسب اليه مواضع ببغداد وهي سوق قرب المدرسة النظامية يقال له العقار التتشي ومدرسة بالقرب لاصحاب ابي حنيفة يقال التتشية وبيمارستان بباب الازج يقال له التتشي والجميع منسوب الى خادم يقال له خمارتكين كان للملك تاج الدولة تتش بن الب ارسلان بن داؤد بن سلجوق قالوا وكان ثمن خمارتكين هذا في اول شرائه حملا ملحا وعظم قدره عند السلطان محمد بن ملك شاه ونفذ امره وكثرت امواله وبنى ما بناه مما ذكرنا في بغداد وبنى بين الري وسمنان رباطا عظيما ينتفع الحاج والسابلة وغيرهم وامضى السلطان محمد ذلك كله وجميع ما ذكرناه في بغداد موجود معمور الآن جار على احسن نظام عليه الوكلاء يعينون اموالها

تتش یہ ہر دو تا مضموم اور شین معجمہ کیساتھ ہے یہ ایک شخص کا نام ہے، اس کی طرف متعدد مقامات منسوب ہیں، مدرسہ نظامیہ کے قریب ایک بازار بھی اسی کے نام سے موسوم ہو جس کو عقار تتشی کہا جاتا ہے، احناف کا ایک مدرسہ بھی اس کے پاس ہے جس کو مدرسۂ تتشیہ کہا جاتا ہے، باب الازج کے پاس ایک شفاخانہ بھی ہے جو شفاخانہ تتشی کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور یہ سب اسی ایک خادم کی طرف منسوب ہیں جس کا نام خمارتکین ہے، یہ سلطان تاج الدولہ تتش بن الب ارسلان ابن داؤد بن سلجوق کا خادم اور غلام تھا، اور جس وقت پہلی مرتبہ اس کو خریدا تھا اسکی قیمت ایک بار شتر نمک تھی، محمد بن ملک شاہ کے یہاں اس کا بڑا مرتبہ تھا، اس کا حکم چلتا تھا اور ان کو بڑی ثروت حاصل ہو گئی تھی، اس نے بغداد میں ان چیزوں کو بنایا جس کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے، رے اور سمنان میں بھی اس نے بڑی بڑی سرائیں بنوائیں تاکہ حاجیوں اور مسافروں کو فائدہ پہنچے، اسکی بناکردہ چیزوں کو سلطان محمد نے برقرار رکھا اور وہ

(باقی حواشی ص ۱۶۷ پر)

روح رواں نہایت متعصب شافعی نظام الملک طوسی تھا، جس کے نام سے یہ مدرسہ مشہور ہے،

(بقیہ حواشی ص ۱۶۶) وبعمره فوتها في وجوهها ومات خمارتكين هذا في رابع صفر ۵۰۸ (معجم البلدان باب التاء والتاء وما يليها)

بغداد میں آج بھی موجود اور آباد ہیں اور حسن انتظام کیساتھ چل رہی ہیں اور اسکی نگرانی اور دیکھ بھال کیلئے وکیل مقرر ہیں جو انکی نگرانی اور مرمت وغیرہ پر روپیہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خمارتکین کا انتقال ۴ صفر ۵۰۸ھ

عربی زبان کا پرگو اور صاحب دیوان شاعر عیسیٰ الحاجری المتوفی ۶۳۲ھ اسی کی نسل سے تھا، مورخ ابن خلکان المتوفی ۶۸۱ھ وفیات الاعیان (طبع ایران ۱۲۸۴ھ ج ا ص ۴۳۵) میں رقمطراز ہیں :

هو عيسى بن سنجر بن بهرام بن جبريل بن خمارتكين بن طاشتكين الاربلي

اس میں اس کے باپ کا نام بھی بصراحت مذکور ہے،

۲ے ہمارا خیال ہو کہ حنفیوں کا یہ مدرسہ مدرسہ نظامیہ کے مقابلہ پر قائم کیا گیا تھا جو کم و بیش دو سو برس تک خاموشی کے ساتھ اسلام کی خدمت کر رہا ہے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ مدرسہ نظامیہ شوافع کا قائم کردہ اور شافعی مکتب خیال کے علماء کا مرکز اشاعت تھا، اس میں درس و تدریس کا منصب شافعی عالم ہی کو ملتا تھا اور اس کے دروازے حنفی علماء پر بند تھے، صرف و نحو تک پڑھانے کے لیے غیر شافعی کو جگہ نہ ملتی تھی، حالانکہ صرف و نحو کو حنفیت اور شافعیت سے کوئی علاقہ نہیں، کیونکہ بانیان مدرسہ نے وقف کے وقت یہ شرط لگا دی تھی کہ تدریس کا منصب بجز شافعی علما کے اور کسی کو نہیں دیا جا سکتا، اس لیے بعض زمانہ ساز علماء نے یہاں پر درس و تدریس کی خاطر شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا، مورخ ابن خلکان الشافعی المتوفی ۶۸۱ھ شیخ ابن الدہان ابو بکر المبارک الواسطی المتوفی ۶۱۲ھ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں :

تفقه على مذهب ابي حنيفة بعد ان كان حنبليا ثم سغر (اشتغل) منصب تدريس النحو بالمدرسة النظامية وشرط الواقف ان لا يفوض الا الى شافعي فانتقل الوجيه الى مذهب الشافعي

وہ حنبلی تھے مگر فقہ حنفی کی تحصیل کی اور حنفی مسلک اختیار کیا، پھر جب مدرسہ نظامیہ میں نحو کی تدریس پر مامور ہوئے تو واقف کی اس شرط کے مطابق کہ کوئی منصب شافعی عالم کے سوا اور کسی کو نہیں دیا جائیگا، وجیہ (ابن الدہان کا لقب ہے) نے شافعی مذہب اختیار کر لیا،

یہی وجہ تھی کہ اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد بغداد میں اختلافی مسائل کی بڑی گرم بازاری رہی، مناظرے و مباحثے ہوئے، اور احناف کی تردید میں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں، مسعود بن ابی شیبہ السندی کتاب التعلیم (مخطوطہ مجلس علمی کراچی ص ۱۳۰) میں تحریر فرماتے ہیں :

ظہر مذہب الشافعی حین ظہر	شافعی مذہب کا غلبہ بغداد میں نظام الملک
فیھم نظام الملک وکانت فتنۃ	طوسی کے اقتدار کے زمانہ میں ہوا اور
علی اصحاب ابی حنیفۃ ومالک	یہ حنفیوں اور مالکیوں کے لیے دیلمیوں کے
اشد من الدیلم وقد قتلوا منھم	فتنہ سے بھی بڑھ کر تھا، انھوں نے ان کی
خلقاً کثیراً وضعت فی ایامہ کتب	کثیر تعداد قتل کی، اسی کے زمانہ میں امام
مثالب ابی حنیفۃ ومعائبہ	ابو حنیفہؒ کی مذمت اور معائب میں کتابیں
وقد لقی جزاء ذلک حیا ومیتا	لکھی گئیں، مگر اس کو زندگی میں بھی اور مرنے
حتی تناثرت اعضاءہ بالجذام	کے بعد بھی اس کا پورا بدلہ ملا ہے، اس کے
وعذب بالضرب والحبس و	اعضا کوڑھ سے گل کر گرنے لگے، مار اٹھا
احرقت رمتہ فی سنۃ اثنتین	پڑی، قید و بند کی سزائیں اس نے بھگتیں،
وثلاثین وستمائۃ بعد مائۃ	اور اس کی موت کے ۱۴۸ برس کے بعد
وثمان واربعین سنۃ احرقتھا	کافر تاتاریوں نے ۶۳۲ھ میں جب اصفہان
الکفار التتر لما استولوا	پر قبضہ کیا، اس وقت اس کی ہڈیاں قبر سے
علی اصفھان بسبب یطول ذکرہ	نکال کر جلا دیں، اس وقت اس کی تفصیل

خلفائے بغداد کو ایک زمانہ کے بعد نظامیہ کے قیام سے پیدا شدہ منافرت کا صحیح احساس ہوا اور آخر مستنصر باللہ نے ایک جداگانہ مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، جو مدرسہ مستنصریہ کے نام

سے مشہور ہے، اس میں مذاہب اربعہ کی تعلیم کا صحیح انتظام کیا گیا تھا اور ہر مسلک کے علماء کو اس میں مدرس رکھا گیا تھا جس سے اتحاد و اتفاق کی ایک نئی روح علماء میں جلوہ گر ہوئی تھی،

ابن الفوطی نے (الحوادث الجامعہ ص ۲۹۰) شمس الدین محمد بن عبید اللہ الہاشمی الکوفی المتوفی ۶۷۵ھ کے تذکرہ میں لکھا ہے،

ولی التدریس بالمدرسۃ التتشیۃ	آپ مدرسہ تتشیہ میں تدریس کے منصب پر فائز ہوئے ہیں،

جس سے ثابت ہوتا ہے مدرسہ تتشیہ میں ۶۷۵ھ تک تعلیم کا سلسلہ جاری تھا،

صغانی جب پہلی مرتبہ اس مدرسہ میں آئے تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور تدریس سے فارغ ہو کر برجستہ چند اشعار پڑھے، مورخ ابن الفوطی البغدادی لکھتے ہیں :

رتب الصغانی مدرسا بمدرسۃ	خلیفہ مستعصم باللہ نے صغانی کو خمارتکین
خمارتکین التتشی وخلع علیہ	کے مدرسہ تتشیہ میں مدرس مقرر کیا اور
وحضر المدرسۃ وخطب خطبۃ	خلعت سے سرفراز فرمایا، آپ مدرسہ میں آئے
فصیحۃ وذکر عشرۃ دروس	تو نہایت فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور جو دس
وانشد عند فراغھا	سبق آپ کے سپرد ہوئے تھے انکی بابت کچھ فرمایا
	اور اس سے فارغ ہو کر حسب ذیل چند شعر پڑھے
فھاکم یا سادتی	منی دروسا عشرۃ
میرے بزرگو! مجھ سے	دس سبق پڑھ لو
فانتم معادن الفضل الکرام البررۃ	
آپ فضیلت کی کانیں ہیں	نیک اور شریف ہیں
ولست حبرا عالما	لکنھا محبرۃ
اور میں کوئی زبردست عالم نہیں	صرف ایک دوات ہوں

فلتعذر وا اخاکم	فمثلکم من عذر ہ[1]
تمھارا بھائی تم سے عذر قبول کرنے کے لیے کہتا ہے	تمھاری طرح بعض وہ لوگ ہیں جو عذر پیش کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں

صغانی کے اس مدرسہ سے ترک تعلق کی کوئی شہادت نہیں مل سکی جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدرسۂ مذکورہ سے موصوف کا تعلق تا حیات برابر قائم رہا ہے،

خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ کا وزیر موید الدین محمد ابن العلقمی غالی شیعہ ہونے کے باوجود آپ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا، بڑے احترام سے پیش آتا اور ہر طرح سے آپ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ اس کے اسی اخلاص و محبت کا نتیجہ تھا کہ صغانی بھی اس کا خیال رکھتے تھے، اس نے جہاں اور نادرۂ روزگار فضلاء کو اپنے فرزند عز الدین ابو الفضل محمد العلقمی کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا تھا وہاں ادب اور لغت کی تعلیم کے واسطے آپ کی خدمات حاصل کی تھیں، اس کو پڑھانے کے لیے ابن العلقمی کے محل میں جاتے تھے، الحوادث الجامعہ کے مؤلف کا بیان ہے:

کان یتردد الی دار الوزیر	آپ وزیر کے فرزند عز الدین کو ادب کی تعلیم دینے کے
بشغل ولدہ عز الدین فی الادب[2]	واسطے اس کے دولتکدہ پر آیا جایا کرتے تھے،

صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی المتوفی ۷۶۴ھ تحریر فرماتے ہیں:

قرأ القرآن علی التقی حسن ابن	عز الدین نے قرآن مجید حسن بن الباقلانی
الباقلانی الحلی النحوی واللغۃ	الحلی النحوی سے اور لغت رضی الدین الصغانی
علی رضی الدین الصغانی[3]	سے پڑھی،

اس زمانہ میں امرا بھی جید عالم ہوتے تھے اور ہر امیر کے پاس ایک کتب خانہ بھی ہوتا تھا، ابن العلقمی اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز اور بڑا صاحب ذوق وزیر تھا، وہ صرف وزیر ہی نہیں بلکہ حکومت کے

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ مطبعۃ الفرات بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۰۸ [2] ایضاً ص ۲۶۳ [3] ملاحظہ ہو الوافی بالوفیات مطبعۃ الدولہ استنبول ۱۹۳۱ء ج ۱ ص ۱۸۶

سیاہ و سفید کا مالک تھا، اس کا ذاتی کتب خانہ نوادر اور بیش قیمت کتابوں کا خزانہ اور دس ہزار مجلدات پر مشتمل تھا، ابن الطقطقی اس کے فرزند ابو القاسم علی سے ناقل ہے:

اشتملت خزانتہ علی عشرۃ	اس کا کتب خانہ دس ہزار نہایت عمدہ
الآف مجلد من نفائس الکتب[1]	کتابوں پر مشتمل تھا،

یہی کتب خانہ تھا جسے اس نے ۶۴۴ھ میں اپنے محل سے دار الوزارت میں منتقل کر دیا تھا جس سے اس کا فائدہ عام ہو گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس میں اور بھی علوم و فنون کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا، ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فتحت دار الکتب التی انشأھا	وہ کتب خانہ جو ابن العلقمی نے اپنے گھر میں
الوزیر مؤید الدین ابن العلقمی	قائم کیا تھا، اس کو کھول دیا گیا اور اس میں
فی دارہ، و نقل الیھا کتب من	مختلف علوم و فنون کی کتابیں داخل کی
انواع العلوم[2]	گئیں۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فتحت دار الکتب التی انشأھا	وہ کتب خانہ جو وزیر موید الدین محمد بن
الوزیر مؤید الدین محمد بن	احمد العلقمی نے قائم کیا تھا، اس کو دار الوزارت
احمد العلقمی بدار الوزارۃ	میں کھولا گیا جس کی عمارت نہایت
وکانت فی نہایۃ الحسن ووضع	خوبصورت ہے اور اس میں نہایت
فیھا من الکتب النفیسۃ والنافعۃ	عمدہ، نفیس اور مفید کتابیں جمع
شیٔ کثیر[3]	کی گئی تھیں،

[1] ملاحظہ ہو الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ مطبعۃ الموسوعات مصر ۱۳۱۷ھ ص ۳۰۱ [2] الحوادث الجامعہ المکتبۃ العربیہ بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۰۹ [3] البدایہ والنہایہ مطبع السعادہ مصر ج ۱۳ ص ۱۷۳

صحاح جوہری کی تصحیح اور تحشیہ صغانیؒ نے اپنے قلم سے صحاح جوہری کے ایک نسخہ کی تصحیح اور تحشیہ کرکے اسی کتب خانہ میں داخل کیا تھا، موصوف العباب الزاخر کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :

قد صححت نسخة وحشيتها بخطی
بمدينة السلام حماها الله تعالے
للخزانة الميمونة المعمورة الوزيرية
المؤيدية زاد الله صاحبها
من الارتقاء فی درج الجلال
ورقاه وذريته عين الكمال
فمن رام مصداق ما ذكرت
فليقه عينه بادارتها فيها
وليرتع فی رياض فرائدها
وفوائد حواشيها[1]

میں نے مدینۃ السلام (بغداد) میں اللہ تعالےٰ اس کو اپنی حفاظت میں رکھے، صحاح جوہری کے ایک نسخہ کی تصحیح کی اور اس پر اپنے قلم سے حواشی لکھکر وزیر مؤید الدین کے مبارک ومعمور کتب خانہ میں داخل کیا ہے، اللہ تعالےٰ صاحب کتب خانہ کے مراتب میں ترقی عطا فرمائے اور اس کو اور اس کی آل اولاد کو کمال کی چوٹی پر چڑھائے، پس جو کچھ میں نے کہا اگر کوئی اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے (کہ صحاح جوہری میں ایک ہزار غلطیاں ہیں) تو اس کو کتاب میں اپنی نگاہ دوڑانا چاہیے اور اس کے یکتا موتیوں کے باغ سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور حاشیوں کے فائدوں سے بہرہ ور ہونا چاہیے،

کتاب الذئب کا سبب تالیف خلیفۂ وقت مستعصم باللہ کی قدردانی اور وزیر ابن العلقمی کی عزت افزائی نے صغانی کو ہمعصروں کی نظروں میں محسود بنا دیا، چنانچہ بعض حاسدوں نے آپ کو طرح طرح سے تنگ کیا، مگر آپ خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے، مگر جب ان کی آتش حسد کسی طرح

[1] ملاحظہ ہو مقدمۃ العباب قلمی اس کا نسخہ مولانا عبدالعزیز میمن زید مجدہم اور راقم السطور کے پاس موجود ہے۔

ٹھنڈی نہ ہوئی، تو صغانی نے ان کے وہ خصائل جو ان میں اور بھیڑیوں میں مشترک تھے، ایک رسالہ میں جمع کر دیے، اور اس رسالہ کا نام کتاب الذئب رکھا، آغاز رسالہ میں لکھتے ہیں :

هذا كتاب غريب مبناه، فی أسامی
الذئب وكناه، حدانی علی جمعه
تذأب بعض اهل زمانی، ومن
عصبيات رواشقه رمانی
وانا اسئل الله تعالیٰ ردكيده
فی نحره، وان يعيذنی من شراره
وشره وهو مجيب دعوة الداعی
اذا دعاه، ومنيل اهل الراجی
اذا رجاه[1]

یہ کتاب جس کی اساس غیر مانوس الفاظ پر ہے بھیڑیے کے ناموں اور کنیتوں کے بیان میں ہے، میرے بعض ہمعصروں کا بھیڑیوں کی طرح مکاری اور خباثت میں میرے پیچھے لگ جانے اور میری ہڈیوں میں گھس جانے والے تیز تیر پھینکنے والی کمانوں سے مجھ پر تیر برسانے نے اس کتاب کی ترتیب پر مجھے آمادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ ان کے مکر کو ان کے سینہ میں اتار دے اور اللہ تعالےٰ مجھے انکی شرارتوں اور برائیوں سے اپنی پناہ میں رکھے، وہی پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے جب کوئی اسکو پکارتا ہے اور وہی آس لگانے والوں [illegible]

اس واقعہ سے جہاں صغانی کی وسعت قلب کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں ان کے اخلاق وکردار پر بھی روشنی پڑتی ہے،

صغانی کا مطالعہ درس وتدریس کے بعد صغانی کو جو وقت ملتا تھا وہ مطالعہ اور تصنیف وتالیف میں گذرتا تھا، مطالعہ سے شغف اخیر عمر تک باقی رہا اور لغت میں آپ کا قول حرف آخر ہونے کے باوجود

[1] ملاحظہ ہو کتاب الذئب، یہ رسالہ مقالات الحنفی اور ابن ناقیا کے ساتھ مطبعہ احمد کامل استنبول سے سنہ ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا تھا،

آپ کا مطالعہ ہمیشہ علم میں اضافہ کرتا رہا، چنانچہ لفظ مجراشہ کا علم ابن خالویہ کی طرح موصوف کو بھی ستر سال سے متجاوز عمر ہونے کے بعد ہوا تھا، جس وقت اس کا علم ہوا تو زبان قلم پر بے اختیار خدا کی حمد و ثنا جاری ہوگئی، یہ واقعہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

قال ابو عبد الله الحسين بن خالويه	ابو عبد اللہ حسین بن خالویہ نحوی کتاب لیس
النحوی فی کتاب لیس اجرأشت الابل	میں کہتا ہے اجرأشت الابل جب اونٹ
ای سمنت و امتلأت بطونها فهی	موٹا ہو جاتا ہے اور اس کی کوکیں بھر جاتی
مُجرأشةٌ بفتح الهمزة علی خلاف	ہیں تو اس کے لیے لفظ مجراشۃ خلاف قاعدہ
القياس كما قالوا الفح فهو مُلْفَح	فتح ہمزہ کے ساتھ بولتے ہیں، جس طرح اہل عرب
واحصن فهو محصن واسهب فهو	الفح فهو ملفح اور احصن فهو محصن اور اسهب
مسهب، قال ابن خالويه وجدت	فهو مسهب کہتے ہیں، ابن خالویہ کہتا ہے مجھے
هذه اللفظة يعنی فهی مجرأشة	یہ لفظ یعنی فہی مجراشۃ ستر برس کے بعد معلوم
بعد سبعين سنة قال الصغانی	ہوا تھا، اس کتاب کا مولف صغانی کہتا ہے
مولف هذا الكتاب انا وجدت	مجھے بھی اس لفظ کا علم ستر برس کے بعد ہوا
هذه اللفظة بعد سبعين سنة	اور تمام تعریفیں اللہ ہی کی ذات کے لیے ہیں
والحمد لله علی طول الاعمار وتردد	جس نے لمبی لمبی عمریں عطا کیں اور آثار اور
الاثار ومصاحبة الاخيار ومجانبة	نقول کو دست بدست پہنچایا، نیک لوگوں
الاشرار والاكثار من الانديار	کی صحبت نصیب فرمائی اور بدکاروں سے
والحج والاعتمار جعلنی الله تعالیٰ	بچایا، دیار حبیب کی کثرت سے زیارت کا شرف
من اولیائه والابرار المستغفرين	بخشا، حج اور عمرہ کی توفیق دی، مجھے اللہ تعالے

بالاسحار الذاكرين الله	اپنے نیک بندوں میں بنا دے جو آخر شب میں اس سے
بالعشی والابكار[1]	مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور صبح و شام یاد الہٰی میں مشغول رہتے ہیں

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صغانیؒ کا مطالعہ برابر جاری رہا، اس واقعہ سے ان کی باطنی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

تصنیف و تالیف کا شغلہ اسی طرح تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی مرتے دم تک نہ چھوٹا، چنانچہ العباب الزاخر کی تالیف کے وقت لفظ بکم لکھا تھا کہ انتقال ہوگیا، سید مرتضیٰ الزبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں:

لما بلغ الشيخ الاجل الفاضل	شیخ اجل، فاضل، زاہد، امین اور حرم اللہ (مکہ)
الزاهد الامين الملتجئ الی حرم	کی پناہ کے طالب رضی الدین حسن بن محمد بن
الله تعالیٰ رضی الدين الحسن	حسن صاغانی اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے
بن محمد بن الحسن الصاغانی	سایہ میں رکھے، جب اپنی تالیف کردہ کتاب
تغمده الله تعالی برحمته فی	العباب الزاخر میں اس جگہ (بکم) تک پہنچے تو
تصنيف كتابه العباب الزاخر	تو موت نے ان کو چھین لیا اور کتاب نا تمام
الی هذا المكان اخترمته المنية	رہ گئی، حکم اور فیصلہ بس اسی خدائے بزرگ
وبقی الكتاب مقطوعا والحكم لله	و برتر ہی کا جاری و ساری ہے۔[2]

کسی شاعر نے اسی واقعہ سے متاثر ہو کر حسب ذیل قطعہ کہا تھا،

ان الصغانی الذی	حاز العلوم والحکم
صغانی جس کی ذات	علوم اور حکمتوں کی جامع تھی

---

[1] ملاحظہ ہو العباب الزاخر روٹوگراف کاپی اسلامک انسٹیٹوٹ آف ریسرچ کراچی مادہ جرش [2] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ بکم

کان قصارٰی اُمرہ	ان انتھی الی بکم[1]
ان کا بھی سارا دور	لفظ بکم تک پہنچکر ختم ہوگیا تھا اور کتاب ناقص رہ گئی تھی

یہ قطعہ صنعت ایہام میں ہے کیونکہ یہاں لفظ بکم سے قریب اور بعید دونوں معنی مراد لیے جاسکتے ہیں، بعید معنی ہی یہاں مراد ہیں کہ صغانی جو علوم و فنون اور حکمت کے ماہر تھے، وہ بھی لفظ بکم لکھکر اس کی تشریح سے قاصر رہے اور کتاب ناتمام رہ گئی، دانشوران ناصری میں مذکور ہے :

" شاعر دریں شعر در صناعت ایہامی کہ بکار بردہ و بمقتضیٰ اہمال این صنعت دو معنی ارادہ کردہ یکے بعید، دیگر قریب از معنی بعید ایں را ارادہ کردہ است کہ حسن کتاب مذکور را تا مادہ بکم نوشتہ و آں را باتمام نرسانیدہ ...... یعنی ہمانا حسن صغانی کہ فنون و علوم و اصناف حکمتہا را فراہم نمودہ عاقبت امرش ایں شد کہ برگ گنگ گردیدہ زبانش بستہ شد[2] "

درس وتدریس | یہی حال درس وتدریس کا تھا، یہ شغل بھی تاحیات منقطع نہیں ہوا، شرف الدین دمیاطی کا بیان ہے :

قرأت علیہ یوم الاربعاء وتوفی	میں نے بدھ کو ان سے پڑھا اور جمعہ کی شب
لیلۃ الجمعۃ[3]	کو ان کا انتقال ہوگیا۔

پاکستان کے مایۂ ناز فرزند حسن صغانی جن کا سکہ لغت وادب فقہ و حدیث تمام اقلیموں پر یکساں رواں تھا اور جو صرف و نحو، شعر وادب، اخبار و انساب، رجال و سیرت کے امام تھے، جن کے وجود پر علم و فضل اور ورع و تقویٰ کو ناز تھا، اس پیکر علم و تقویٰ جس نے کم وبیش نصف صدی تک

---

[1] ملاحظہ ہو بغیۃ الوعاۃ طبع مصر تذکرہ حسن صغانی [2] ملاحظہ ہو دانشوران ناصری طبع ایران ج ۵

[3] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام ذہبی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور (ترجمہ حسن صغانی)

اپنی تعلیم و تربیت اور درس وتدریس سے ایک عالم کو مستفید کیا تھا، اس قدسی صفات انسان نے تہتر (۷۳)[1] سال کی عمر میں ۲۹ شعبان ۶۵۰ھ جمعہ کی شب کو بغداد میں اچانک انتقال کیا (رحمۃ اللہ علیہ) اس اجمال کی تفصیل درج ذیل ہے :

صغانی کی وفات سے پیشتر ایک وصیت | صغانی کی وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے، مشہور ہے کہ آپکے پاس ایک زائچہ تھا جس سے آپ کی وفات کا دن اور وقت سب لکھا ہوا تھا، جب وہ دن قریب آیا تو آپ نے اپنے فرزندوں کو بلاکر پچاس دینار دیے اور وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہوجائے تو میری لاش مکہ لیجاکر فضل بن عیاض المتوفی ۱۸۷ھ کے پاس دفن کرانا، ابن الفوطی کا بیان ہے :

کان قد اوصی بذلک وان یحمل	انھوں نے وصیت کی تھی کہ انکی لاش مکہ معظمہ
الی مکۃ ویدفن مجاور الفضیل	لیجاکر فضیل بن عیاض کے پاس دفن کیجائے، انکی
بن عیاض. ففعل اولادہ	اولاد نے اس وصیت کے مطابق عمل اور ان کی
ذلک وتولّیٰ تجہیزہ[2]	تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔

علامہ ذہبی لکھتے ہیں :

کان اوصی بذالک واعد خمسین	اس امر کی انھوں نے وصیت کی تھی اور جو شخص
دینار المن یحملہ الی مکۃ[3]	انکی لاش کو مکہ لیجاکر دفن کرے اس کے لیے پچاس دینار

---

[1] ہم گذشتہ اوراق میں صغانی کی ولادت پر نہایت تفصیل سے بحث کر چکے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ وفات کے وقت آپ کی عمر تہتر سال کی تھی، امام ذہبی نے بھی دول الاسلام میں تہتر (۷۳) سال کی عمر کو وثوق سے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں

فیھا توفی العلامۃ رضی الدین الحسن	اسی سال ۶۵۰ھ میں رضی الدین حسن
بن محمد الھندی الصاغانی صاحب	ابن محمد الہندی الصاغانی جو صاحب
التصانیف ببغداد ولہ ثلاث وسبعون سنۃ	التصانیف تھے، تہتر (۷۳) سال کی عمر میں بغداد
(دول الاسلام طبع حیدرآباد دکن ۱۳۶۵ھ ج ۲ ص ۱۱۸)	میں انتقال فرمایا

[2] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۶۳ [3] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام مخطوطہ رضا لائبریری رامپور (تذکرہ حسن بن محمد الصغانی)

وفات سے پہلے احباب کی دعوت صغانی کو اس مقررہ دن کا بڑی بے چینی سے انتظار تھا، جب وہ دن آیا تو اس وقت آپ نہایت تندرست تھے، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے شکرانہ میں اس دن اپنے احباب اور شاگردوں کی پر تکلف دعوت کا انتظام کیا اور ان کو اپنے مکان پر رات کے کھانے پر مدعو کیا جب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے تو تھوڑی دیر کے بعد ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کے شاگرد حافظ الحدیث شرف الدین الدمیاطی فرماتے ہیں:

کان معہ مولودٌ وقد حکم
فیہ بموتہ فی وقتہ فکان یترقب
ذالک الیوم فحضر ذالک الیوم
وھو معافا فعمل واصحابہ طعامًا
شکرا لذالک وفارقناہ وعدیت
الی الشط فلقینی شخص اخبرنی
بموتہ فقلت لہ الساعۃ فارقتہ
فقال والساعۃ وقع الحمام یخبر
بموتہ فجاۃ وذالک سنۃ
خمسین وستمأۃ[۲]

[illegible]

صغانی کے پاس ایک زائچہ تھا جس میں انکی موت کا دن اور وقت بھی مذکور تھا، آپ اس دن کا انتظار کیا کرتے تھے، جب وہ دن آیا تو آپ اچھے بھلے تھے، خدا کی اس نعمت کے شکر کے طور اپنے احباب کی دعوت کی، اور جب ہم کھانا کھا ان سے رخصت ہوئے اور میں دجلہ کے کنارے ہی تک پہنچا تھا کہ مجھے ایک شخص ملا اور اس نے انکی موت کی خبر دی، میں نے اس سے کہا ابھی تو میں ان سے ملکر آیا ہوں اس نے کہا ابھی ابھی ان کا انتقال ہوا ہے، وہ شخص انکی اچانک موت کی خبر دے رہا تھا۔

ا؎ واضح رہے کہ مولود کا ترجمہ ولد اور لڑکا صحیح نہیں، یہاں مولود کے معنی زائچہ ہیں، ڈوزی نے عربی کی جو لغت لکھی ہے اس میں بصراحت لکھا ہے کہ مولود کا لفظ زائچہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نیز ما بعد کا جملہ خود اس معنی کا ثبوت ہے، یہی معنی دانشوران نامی میں مذکور ہیں، محمد علی تبریزی نے ریحانۃ الادب فی تراجم المعروفین بالکنیۃ واللقب (چاپخانہ شرکت سہامی ۱۳۶۸ھ قمری ج ۲ ص ۴۵۳) میں بھی زائچہ ہی ترجمہ کیا ہے، دہخدا نے بھی لغت نامہ (طبع طہران ۱۳۲۵ھ) میں ترجمہ میں زائچہ کا لفظ اختیار کیا ہے۔

۲؎ ملاحظہ ہو بغیۃ الوعاۃ

جب صغانی کا انتقال ہو گیا تو انھیں اسی مکان میں جس میں ان کا قیام تھا، عارضی طور پر دفنایا گیا، یہ مکان حریم طاہری میں[ا] واقع تھا، دمیاطی کہتے ہیں:

جہانتک معلوم ہو سکا ہے ۶۳۷ھ میں صغانی کی ہندوستان سے روانگی کے بعد بغداد میں یہ موصوف کا دوسرا مکان تھا، پہلا مکان باب الازج کے پاس تھا، یہ ایک محلہ کا نام ہے، جو بغداد کے مشرقی حصہ میں واقع تھا، اسی مکان میں صغانی نے مغرب (اندلس وغیرہ) کے بعض علماء کو مشارق الانوار کی سند دی تھی جس کے آخر میں اس کا تذکرہ موجود ہے، دمیاطی

سمع جمیع ھذا الکتاب وھو مشارق
الانوار النبویۃ من صحاح الاخبار
المصطفیۃ علی مصنفہ الشیخ الامام
العالم الاجل رئیس الاصحاب الصدر
الکبیر المحترم قدوۃ الامم وعمدۃ
الائمۃ الملتجیٔ الی حرم اللہ تعالیٰ
رضی الدین ابی الفضائل الحسن بن
محمد بن الحسن الصغانی رضی اللہ عنہ
بقراءۃ الفقیہ الامام الحافظ المتقن
جمال الدین ابی بکر محمد بن احمد بن
محمد البکری الشریشی والسادۃ الفقہا
برھان الدین ابراھیم بن یحیی بن ابی
جفان المکناسی وسعد الدین

یہ پوری کتاب جس کا نام مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفیہ ہے، اس کو شیخ امام علامہ اجل، رئیس اصحاب، صدر محترم و مکرم، امت کے سردار، ائمہ کے معتمد، حرم بیت اللہ میں پناہ کے طلبگار رضی الدین ابو الفضائل حسن بن محمد بن حسن الصغانی رضی اللہ عنہ کے سامنے فقیہ، امام، حافظ متقن جمال الدین ابو بکر محمد بن احمد ابن محمد بکری الشریشی اور فقہا کے سردار برہان الدین ابراہیم ابن یحیی بن ابی جفان مکناسی، سعد الدین سعد بن احمد بن احمد بن عبد اللہ جذامی البیانی، محی الدین ابو الحسن علی بن یحیی بن

ا؎ یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ المشترک وضعاً والمفترق صقعاً (طبع گوٹن جرمنی ۱۸۴۶ء ص ۱۳۰) میں لکھتے ہیں:

الحریم الطاھری فی اعلا مدینۃ السلام بغداد بالجانب الغربی کان منازل آل طاھر بن الحسین وکان من لجاء الیہ امن فسمی الحریم

حریم طاہری مدینۃ السلام بغداد کے مغرب کیطرف بالائی حصہ میں واقع ہے، یہاں آل طاہر بن الحسین کے مکانات تھے جو یہاں آکر پناہ لیتا تھا وہ مامون ہو جاتا تھا، اسی لیے اسکو حریم کہتے ہیں

[illegible]

حضرت دفنه بدار الحريم الطاهری	صغانی کے دفن کے وقت جب انھیں انکے گھر کے اندر دفن کیا گیا، میں وہاں موجود تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) سعد بن احمد بن احمد بن عبد الله الجذامی البیانی ومحی الدین ابو الحسن علی بن یحیی بن علی التمیمی الغرناطی ورضی الدین سلیمان بن یوسف بن محمد بن ابی عیان الملیانی وشہاب الدین ابو عبد الله محمد بن محمد بن بدر السبتی المالکی وشمس الدین ابو عبد الله محمد بن میمون بن علی الکومی وعبد الله بن محمد بن ابی بکر الغسانی الاندلسی المالکی عفا الله عنه فی مجالس اخرها یوم الثلاثاء السابع والعشرون من جمادی الآخرة سنة سبع وثلاثین وستمائة وصح ذلك وثبت فی منزل الشیخ المصنف من باب الازج وکتب عبد الله بن محمد بن ابی بکر الغسانی والحمد لله وحده وصلواته علی محمد وآله وسلامه	یوسف بن محمد بن ابی عیان الملیانی، شہاب الدین ابو عبد اللہ محمد بن محمد ابن بدر السبتی مالکی، شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن میمون بن علی الکومی اور عبد اللہ بن محمد بن ابی بکر الغسانی الاندلسی المالکی عفا اللہ عنہ کی قرأت سے مختلف نشستوں میں جن میں سے آخری نشست دوشنبہ ۲۷ جمادی الآخرہ ۶۳۷ھ کو تھی، اس کتاب کا سماع ہوا، اور مصنف کے مکان پر جو باب الازج میں واقع ہے پایۂ تکمیل کو پہنچا، یہ عبارت عبد اللہ ابن محمد بن ابی بکر الغسانی نے قلمبند کی ہیں، تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں، اور درود و سلام محمدؐ اور ان کی آل و اصحابؓ ....

(باقی ص ۱۸۱ پر)

ابن الفوطی کا بیان ہے:

دفنه اصحاب الوزير	انکی تدفین کے وقت وزیر کا عملہ بھی موجود تھا

وصیت کے مطابق صغانی کی مکہ میں تدفین

چند دنوں کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق جسد خاکی کو یہاں سے مکہ لیجایا گیا، اور حرم مکہ میں جنۃ المعلاۃ کے اندر فضیل بن عیاضؒ کی قبر کے پاس سپرد خاک کیا گیا، موصوف کے مایۂ ناز شاگرد حافظ الحدیث دمیاطی جو استاد کی وفات کے بعد بغداد چھوڑ کر مکہ معظمہ آگئے تھے، لکھتے ہیں:

ثم نقل بعد خروجی من بغداد الی مکة فدفن بها[1]	میرے بغداد سے مکہ نکلنے کے بعد آپکا جسد خاکی مکہ لایا گیا اور وہاں دفن کر دیا گیا۔

ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل

اس طرح آپ کی وہ دعا قبول ہوئی جو آپنے مشارق الانوار کے مقدمہ میں ان الفاظ میں مانگی تھی:

قال الملتجی الی حرم الله الحسن بن محمد الصغانی بنهه للخطر الاعظم	حرم بیت اللہ کی پناہ کا طالب حسن بن محمد الصغانی کہتا ہے کہ اللہ پاک اسکو بڑے خطرہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۰) صح ذلك وکتب الملتجی الی حرم الله تعالی الحسن بن محمد بن الحسن الصغانی احله الله اعلی محال اولی الفضل والحجی وجعله علما فی الفضائل کالنجم فی الدجی حامدا ومصلیا	یہ جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے، نوشتہ ملتجی الی حرم اللہ الحسن ابن محمد بن الحسن الصغانی اللہ تعالیٰ اسکو فضیلتوں سے آراستہ اور دانشوروں کے اعلیٰ مقام میں جگہ دے اور فضیلتوں میں اسکو ایسا اونچا علم بنادے جیسے ثریا تاریکی میں ہوتا ہے، حامداً و مصلیاً

(ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات عربیہ کتب خانہ چسٹر بیٹی ج ۲ پلیٹ نمبر ۱۵ مرتبہ جے آر بری طبع ڈبلن ۱۹۵۶ء)

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ صغانی جمادی الآخرہ ۶۳۷ھ سے پہلے بغداد گئے تھے، اور ہندوستان سے زیادہ بغداد میں مقبول رہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام مخطوطہ رضا لائبریری رام پور

قبل ان یضعضع الموت ارکانه	سے متنبہ فرمادیں (تاکہ وہ نیک اعمال کا ذخیرہ کرلے)
وحثاه علی ان یعمر ربع الورع	اس سے پیشتر کہ موت اس کے اعضا کو ہلادے،
ویشید بنیانه واباحه باحة	اور باری تعالیٰ اس کو پرہیزگاری کی منزل
سبوحة واتاح فیها غبوقه	آباد رکھنے اور اسکو مستحکم کرنے پر آمادہ رکھیں اور
وصبوحه واماته بها حمیداً	اسکو مکہ معظمہ کے میدان میں اتاریں اور اسی میں
فاقبره ثم اذا اشأنها انشره[1]	اسکی صبح وشام کی شراب مقدور فرمادیں اور اسی
	حالت میں وہیں اسکو موت دیں کہ لوگوں کی زبانوں
	پر اسکے حق میں خیر کلمے جاری ہوں اور وہیں اسکا مزار
	بنائیں، پھر قیامت کے دن وہیں اس کا حشر فرمائیں،

یہی دعا صغانیؒ نے کتاب الذئب کے شروع میں ان الفاظ مانگی تھی:

قال الملتجیٔ الی حرم الله تعالیٰ	حرم بیت اللہ کا طلبگار حسن بن محمد بن حسن صغانی
الحسن بن محمد بن الحسن الصغانی	کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کی
اعاذه الله من افتراس اغراض	اغراض کا شکار بننے سے پناہ میں رکھے اور
عباده واعاده برحمته الی اشرف	اپنی رحمت سے اس کو سب سے بزرگ و برتر شہر مکہ
بلاده[2]	کیطرف لوٹائے اور وہیں مرنا نصیب کرے۔

---

[1] مشارق الانوار طبع آستانہ ۱۳۰۹ھ ص ۲ واضح رہے عبد اللطیف المتوفی ۸۸۵ھ نے مبارق الازہار (طبع آستانہ) میں لکھا ہے کہ فاقبرہ کے بعد اذا شاء منها انشره کہنے سے شدت اہتمام کا اظہار ہے۔ پھر لکھا ہے کہ میرے دادا اور شیخ عبد العزیز نے مجھ سے اپنے مشائخ کا یہ قول بیان کیا تھا کہ جو مکہ میں دفن ہوتا ہے اور وہ وہاں دفن ہونے کے لائق نہیں ہوتا تو فرشتے اس کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں، لہٰذا حقیقت میں یہ اس امر کی دعا ہے کہ باری تعالیٰ وہاں دفن ہونے اور وہیں سے حشر ہونے کے لائق اور مستحق کردے [2] ملاحظہ ہو کتاب الذئب طبع استنبول ص

صغانی کی وفات پر شاگردوں کے مرثیے

صغانیؒ کے انتقال پر ان کے بعض شاگردوں نے مرثیے لکھے تھے، بعض مرثیے نہایت خوب ہیں، زمخشری نے اپنے استاد ابو مضر کی وفات پر جو اشعار کہے تھے، صغانی کے ایک شاگرد نے اسی انداز پر ان کا مرثیہ لکھا ہے، ابن ابی مخرمہ نے اس واقعہ کو لکھکر اس کے چند شعر بھی نقل کیے ہیں، فرماتے ہیں:

قال الجندی واجتمعت برجل	جندی کہتے ہیں کہ میری ایک عجمی سے ملاقات
من العجم اسمه علی بن الحسن بن	ہوئی جس کا نام علی بن حسن بن محمد بن عمر بن
محمد بن عمر بن اسماعیل	اسمٰعیل شہرزوری تھا، وہ فقہاء کے
الشهرزوری کان یتزیا بزی	لباس میں رہتا تھا، مگر اس کے دماغ میں
الفقهاء وعلی ذهنه اشعار	عمدہ اشعار کا غلبہ تھا (وہ صاحب ذوق تھا)
مستحسنة فتذاکرنا محاسن	عمدہ شعروں پر ہماری گفتگو ہوئی، میں نے
الشعر فذکرت له قول جار الله	اس کو جار اللہ محمود بن عمر زمخشری کے
محمود بن عمر الزمخشری فی	وہ شعر سنائے جو اس نے اپنے استاد ابو مضر
بیتین یرثی بها شیخه ابا مضر	کی وفات پر کہے تھے، وہ کہتا ہے۔
وقائلة ماهذه الدرر التی	تساقطها عیناك سمطین سمطین

محبوباؤں نے پوچھا یہ موتیوں کی دو لڑیاں تیری آنکھیں کیوں گرا رہی ہیں۔

فقلت هی الدر اللواتی حشی بها	ابو مضر اذنی تساقطن من عینی

تو میں نے کہا یہ وہ موتی ہیں جن کو ابو مضر نے میرے کانوں میں بھرا تھا اب وہ میری آنکھوں سے گر رہے ہیں۔

فقال لی قد اخذ هذا المعنی عمّ لی	تو اس نے کہا میرے چچا نے جن کا نام احمد بن
اسمه احمد بن محمد فی شعر رثی به	محمد ہے، اسی مفہوم کو ان اشعار میں نظم کیا ہے

شیخہ ابا الفضائل الحسن بن محمد — جو انھوں نے شیخ ابو الفضائل حسن بن محمد

الصغانی فقال — الصغانی کے مرثیہ میں کہے ہیں، وہ کہتا ہے،

اقول والشمل فی ذیل النوی عثرا — یوم الوداع ودمع العین قد کثرا

میں کہتا ہوں جب جدائی کے دن آنسوؤں کی جھڑی رواں تھی اور اجتماع وداع کے دامن پر پھسل رہا تھا

ابا الفضائل قد زودتنی اسفا — اضعاف ما ذدت قدری فی الوری اثرا

(اسوقت) ابوالفضائل تم نے مجھے اس سے دونا چوگنا رنج و اندوہ کا توشہ دیا، جتنا کمالات علمیہ دیکر دنیا میں میری قدر و منزلت بڑھائی تھی۔

قد کنت تودع سمعی اللآلی منتظما — فخذ لامن جفن عینی الآن منتشرا[۱]

تم نے میرے کانوں میں ایک سلک مروارید کو امانت رکھا تھا اب ان ہی موتیوں کو اس وقت میری آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے لے لیجئے۔

وزیر محمد ابن العلقمی کے فرزند عز الدین العلقمی نے آپ کا جو مرثیہ لکھا تھا، اس کو ابن الفوطی نے نقل کیا ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے، کہتا ہے:

تخاطبنا الدنیا خطاب مناصح — واسماعنا عما تقول صوارف

دنیا ہم سے ناصح مشفق کی طرح خطاب کرتی ہے اور جو کچھ وہ کہتی ہے ہمارے کان اسکو سننے سے بھی گریز کرتے ہیں

تخوفنا الاّمن حشو قلوبنا — کانّ سوانا من عنتہ المخاوف

وہ ہم کو ڈراتی ہے اور ہمارے دل امن سے معمور ہوتے ہیں۔ گویا کہ ڈرانیوالی چیزوں نے ہمارے سوا اوروں کو مراد لیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے

وترشدنا احداثہا فنری الہدیٰ — عیانا ولکنا غرورا نخالف

حوادث زمانہ ہمیں راہ دکھاتے ہیں اور ہم ہدایت کو علانیہ دیکھتے ہیں، لیکن دھوکہ سے مخالفت کرتے ہیں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ عدن طبع لیڈن ج ۲ تذکرہ حسن بن محمد الصغانی

ونرجو من الایام عدلا لجہلنا — ویقضی بجور صرفہا المترادف

ہم نادانی کی وجہ سے زمانہ سے انصاف کی توقع رکھتے ہیں، اور اسکی پے در پے آنیوالی گردش ظلم کا فیصلہ کرتی ہیں۔

ہوت بالصغانی الذی جل قدرہ — علوا من الاقدار دہماء قاذف

وہ صغانی جس کے مقدر نے سربلندی میں اقدار (تقدیر الٰہی) سے مقابلہ کیا تھا اسکو ایک پھینکنے والی مصیبت نے گرادیا

لیبک علیہ العلم ان عاش بعدہ — وتندبہ ان تبق النہی والمعارف

علم کو اس پر رونا چاہیے اگر وہ اسکے بعد زندہ رہے۔ اور اگر فہم و دانش بھی زندہ رہیں تو ان کو بھی اس پر نوحہ کرنا چاہیے

بکاک کتاب لم تتم فصولہ — ودون امانی الرجال صوادف

تجھ پر وہ کتاب، رو رہی ہے جس کی فصلیں ناتمام رہ گئیں (العباب) اور لوگوں کی امیدوں کے سامنے بہت سے موانع ہیں کہ ان کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔

کذا مجمع البحرین فرق شملہ[۱] — وغاص الکتاب موجہ المتقاذف

اسی طرح مجمع البحرین جسکا مرتب مواد منتشر ہوگیا، اور اس کی وہ تیز رفتار موج بھی غم کی وجہ سے تہ نشین ہوگئی

لئن اصبح التصحیف بعدک فاشیا — لقد الف بسط الوجوہ الصحائف

اور اگر تیرے بعد غلطیاں اور تصحیفات پھیل گئیں، تو کتابیں بھی منہ کھولنے سے ناک بھوں چڑھائیں گی۔

فحال بنی الآداب بعدک حائل — وبال بنی الآداب بعدک کاسف

تمھارے بعد بنی الآداب (ادب عربی کے شیدائیوں) کے درمیان ایک پردہ حائل ہوگیا ہے اور تمھارے بعد عربی ادب کے شیدائیوں کے دل بھی بجھ گئے ہیں۔

---

[۱] مجمع البحرین صغانی کی دو کتابیں ہیں، ایک لغت میں ہے اور دوسری حدیث میں، لغت کی کتاب ہمارے مطالعہ سے گذر چکی ہے وہ مکمل ہے، جو حدیث میں ہے وہ سید مرتضیٰ الزبیدی کے پیش نظر رہی ہے، انھوں نے جس انداز سے اس کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکمل ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صغانی نے مجمع البحرین کے نقل کرکے ان کے کتب خانہ میں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہوگا، جو موت کی وجہ سے پورا نہ ہوسکا، اس شعر میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

قضی فقضت ام الفضائل نحبھا وما حکمہا فیما قضت منجا نف

ابو الفضائل کا انتقال ہوگیا تو ام الفضائل بھی رانڈ ہوگئی، اور اس نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ بیجا نہیں کیا،

ومات حمید احین لم یبق مشرق ولا مغرب الا لہ فیہ واصف[1]

اس کا اس حالت میں انتقال ہوا ہے کہ مشرق و مغرب ہر جا ہر سو اسکی تعریف کے لوگ گن گاتے ہیں،

ہم نے صغانیؒ کے صرف سوانح حیات پر روشنی ڈالی ہے، ان کے علمی کمالات، عادات واخلاق، تصنیفات، فضل وکمال اور شاگردوں پر کچھ نہیں لکھا ہے، کیونکہ یہ عنوانات بڑی تفصیل چاہتے تھے، ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ نہایت عجلت میں لکھا ہے، جس کی حقیقت کو راقم السطور اور شاید مدیر محترم ہی جانتے ہیں، اگر مدیر محترم کا ماہانہ تقاضہ نہ ہوتا تو کچھ عجب نہ تھا کہ یہ حصہ بھی ناتمام ہی رہ جاتا اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو ہم ان عنوانات پر لکھکر پاکستان کے اس نامور فرزند پر ایک مستقل کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کرینگے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً

---

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ترجمہ حسن بن محمد الصغانی۔

ابن الجزریؒ

(ماہنامہ معارف، نومبر—دسمبر 1957ء- جنوری 1958ء)

مقالات

ابن الجزری

از جناب مولانا محمد عبدالعلیم چشتی فاضل دیوبند

نام ونسب محمد نام، ابوالخیر کنیت، شمس الدین لقب اور ابن الجزری[1] عرف ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے:

محمد بن محمد بن محمد بن علی بن یوسف الجزری (العمری الدمشقی ثم الشیرازی)

ولادت آپ کی ولادت کا واقعہ بھی نہایت دلچسپ ہے،

آپ کے والد تاجر تھے، جن کو شادی کیے ہوئے چالیس برس گزر چکے تھے، مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی، بسلسلۂ حج مکہ معظمہ پہنچے، خانۂ کعبہ کا طواف کیا، چاہ زمزم پر گئے، آب زمزم پیا، ہاتھ اٹھا کر دعا کی، بار الٰہا! نیک اولاد عطا فرما! دل سے دعا نکلی، عرش

---

[1] محمد بن عبد الرحمٰن السخاوی المتوفی ۹۰۲ھ نے الضوء اللامع (جلد ۹ ص ۲۵۵) میں اور سید مرتضیٰ زبیدی المتوفی ۱۲۰۵ھ نے تاج العروس (مادہ زجر) میں تصریح کی ہے کہ جزری جزیرۂ (عبدالعزیز) ابن عمر کی طرف نسبت ہے جو موصل کے قریب واقع ہے،

یاقوت الحموی المشترک وضعا والمفترق صقعاً (طبع گوٹنگن جرمنی ۱۸۴۶ء ص ۱۰۲) میں رقمطراز ہیں،

"جزیرۂ ابن عمر ایک چھوٹا سا شہر ہے جو موصل کے شمال میں واقع ہے، اور اسکو دجلہ ہر سمت سے بصورت ہلال محیط ہے اور بڑی مردم خیز بستی ہے۔"

تک پہنچی، بارگاہِ الٰہی سے شرفِ قبول عطا ہوا، اور شب شنبہ ۲۵[1] رمضان المبارک ۷۵۱ھ میں دمشق کے مشہور محلہ قصاعین میں ابن الجزریؒ کی ولادت ہوئی، یہی بچہ آگے چل کر عالمِ علی اور فاضلِ لوذعی، فخرِ علمائے دین اور مسند المحدثین بنا۔

حلیہ | ابن الجزریؒ کے تذکرہ نگاروں نے آپکے خط و خال کی تفصیل نہیں لکھی ہے، لیکن اس امر کی سبنے تصریح کی ہے کہ آپ نہایت حسین اور بڑے جمیل و شکیل تھے، تقی الدین احمد المقریزی ۸۴۵ھ العقود الفریدہ فی تراجم الاعیان المفیدہ میں لکھتے ہیں،

کان شکلاً حسناً فصیحاً بلیغاً[2]	آپ نہایت جمیل و شکیل اور فصیح و بلیغ انسان تھے،

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ انباء الغمر فی ابناء العمر میں رقمطراز ہیں

انہ کان ثریاً وشکلاً حسناً[3]	آپ بڑے دولتمند اور نہایت حسین و جمیل تھے،

---

[1] مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ نے التحسن التحسین (مطبع یوسفی لکھنؤ ۱۳۲۰ھ ص ۲۵۱) میں مؤرخ مجیر الدین الحنبلی کی تاریخ "الانس الجلیل فی تاریخ القدس والخلیل" کے حوالہ سے جو عرصہ ہوا مصر سے شائع ہو چکی ہے، آپ کی تاریخ ولادت ۱۶ رمضان ۷۵۱ھ لکھی ہے جو صحیح نہیں۔

غایۃ النہایہ (مطبعۃ السعادہ قاہرہ ۱۳۵۱ھ ج ۲ ص ۲۴۷) میں ابن الجزریؒ کے ایک تلمیذ نے خود ابن الجزریؒ سے آپ کی تاریخ ولادت آپکے والد کی زبانی ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

ولد فیما حققہ نفسہ من لفظ والدہ	موصوف نے اپنے والد کے الفاظ میں
فی لیلۃ السبت الخامس والعشرین من	اپنی تاریخ ولادت شب شنبہ ۲۵ رمضان [المبارک]
شہر رمضان سنۃ احدیٰ وخمسین وسبعمائۃ	۷۵۱ھ لکھی ہے،

[2] ملاحظہ ہو درر العقود الفریدہ بحوالہ الضوء اللامع طبع قاہرہ ۱۳۵۴ھ ج ۸ ص ۲۶۰

[3] انباء الغمر بحوالہ الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۹

تعلیم و تربیت | آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں دمشق علوم و فنون کا مرکز تھا، آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت یہیں ہوئی، بچپن میں قرآن مجید حفظ کرنا شروع کیا، بارہ سال کی عمر ۷۶۴ھ میں پورا قرآن حفظ کر لیا اور ہر سال تراویح میں سناتے تھے۔

فقہ شافعیہ کی پانچ مشہور اور متداول کتابوں میں سے فقیہ ابو اسحٰق ابراہیم الشیرازی المتوفی ۴۷۶ھ کی مشہور تالیف التنبیہ کو حفظ کیا۔

قرأت کی تحصیل و تکمیل | سات مشہور قرأتوں میں علامہ ابو عمرو عثمان الدانی المتوفی ۴۴۴ھ کی مشہور کتاب التیسیر اور ابو محمد قاسم الشاطبی المتوفی ۵۹۰ھ کی حرز الامانی و وجہ التہانی (جو شاطبیہ کے نام سے زیادہ مشہور ہے) شیخ تقی الدین عبد الرحمٰن بن احمد البغدادیؒ[1] المتوفی ۷۸۱ھ وغیرہ سے پڑھیں، قرأۃ سبع کی مشق احمد بن الحسین الکفریؒ[2] المتوفی ۷۷۴ھ سے کی، شیخ القراء محمد بن احمد ابن اللبان[3] المتوفی ۷۷۶ھ سے کتابیں بھی پڑھیں اور قرأتوں کا اجراء بھی کیا، شیخ عبد الوہاب بن یوسف ابن السلار[4] المتوفی ۷۸۲ھ اور شیخ احمد بن رجب البغدادی[5] المتوفی ۷۷۴ھ سے ۷۶۶ھ و ۷۶۷ھ میں چودہ قرأتوں کی علیحدہ علیحدہ مشق کی، ۷۶۹ھ میں شیخ ابن اللبان کو تمام قرأتوں کے ساتھ پورا قرآن سنایا، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے نامور قراء سے استفادہ کیا اور سند لی ہے۔

ہر چند دمشق اس دور میں علوم و فنون کا مرکز بنا ہوا تھا، مگر آپ کا سمندِ شوق اس پر کیونکر

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ از ابن حجر عسقلانی طبع اول دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن ۱۳۴۹ھ ج ۲ ص ۳۲۳ و شذرات الذہب ابن العماد طبع قاہرہ ۱۳۵۱ھ ج ۶ ص ۲۷۱ [2] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ج ۱ ص ۱۲۵

[3] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ طبع دوم ۱۳۸۳ھ ج ۳ ص ۳۰۰ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۴۳ [4] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ج ۳ ص ۴۳۱ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۷۵ [5] ایضاً ج ۱ ص ۱۳۰ و [شذرات الذہب] ج ۶ ص ۲۳۰

فارغ ہو سکتا تھا، چنانچہ ۷۶۸ھ میں جب کاروان عمر انیسویں منزل طے کر رہا تھا، آپ تکمیل علوم کے لیے وطن سے نکلے، پہلے حج کیا اور پھر بلاد اسلامیہ قاہرہ، اسکندریہ، بعلبک وغیرہ میں ارباب کمال سے بہ تمام و کمال اس فن کو حاصل کیا،

فقہ کی تحصیل

فقہ کی تحصیل جمال الدین عبدالرحیم الاسنوی[1] المتوفی ۷۷۲ھ، عمر بن رسلان[2] المتوفی ۸۰۵ھ اور ابو البقا عبدالوہاب السبکی[3] المتوفی ۷۷۷ھ جیسے نامور فقہا سے کی،

اصول فقہ اور معانی و بیان کی تعلیم

اصول فقہ اور معانی و بیان کی تعلیم علامۃ الدہر عبداللہ بن سعد الدین الضیاء القرمی[4] المتوفی ۷۸۰ھ اور دیگر ارباب فضل و کمال سے پائی تھی،

تحصیل حدیث

شیخ ابو الثنا محمود[5] بن خلیفہ المتوفی ۷۶۷ھ، بہاء الدین عبداللہ بن ابی بکر[6] المتوفی ۷۹۴ھ، شہاب الدین احمد بن عبدالکریم[7] الحنبلی المتوفی ۷۷۴ھ، شمس الدین محمد ابن المحب[8] المقدسی المتوفی ۷۸۹ھ اور ابن کثیر الدمشقی جیسے حفاظ حدیث سے حدیث کا درس لیا، فخر الدین البخاری المتوفی ۶۹۰ھ، حافظ شرف الدین عبدالمومن الدمیاطی المتوفی ۷۰۵ھ اور شیخ شہاب الدین احمد بن رفیع الابرقوہی المتوفی ۷۰۱ھ کے نامور تلامذہ سے حدیث کا سماع کیا، حافظ الحدیث عمر بن الحسن ابن امیلۃ[9] المراغی المتوفی ۷۷۸ھ سے سنن ابو داؤد، جامع ترمذی

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۳۵۴ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۲۳ و البدر الطالع ج ۱ ص ۳۵۲ [2] حالات کے لیے ملاحظہ ہو لحظ الالحاظ بذیل طبقات الحفاظ از ابن فہد طبع دمشق ص ۲۰۶ و شذرات الذہب ج ۷ ص ۵۱ و البدر الطالع ج ۱ ص ۵۰۶ [3] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۴۲۵ و شذرات ج ۶ ص ۲۲۱ و البدر الطالع ج ۱ ص ۴۱۰ [4] حالات کے لیے ملاحظہ ہو الدرر الکامنہ ج ۲ ص ۲۶۰ و البدر الطالع ج ۱ ص ۳۰۰ [5] الدرر الکامنہ ج ۴ ص ۳۲۳ [6] ایضاً ج ۲ ص ۳۵۱ [7] ایضاً ج ۱ ص ۱۶۷ [8] ذیل طبقات الحفاظ: سیوطی طبع دمشق ص ۳۶۶ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۳۰۹ [9] النجوم الزاہرہ طبع دار الکتب المصریہ قاہرہ ج ۱۱ ص ۴۴،

اور امالی ابن شمعون (ابو الحسن محمد بن احمد) کا سماع کیا، اور شیخ صلاح الدین محمد بن احمد بن احمد الحنبلی[1] المتوفی ۷۸۰ھ جیسے نامور ائمہ فن سے طبرانی کی المعجم الکبیر اور مسند احمد پڑھیں، مسند احمد کو آپ نے سات برس میں پڑھا تھا، جس کی وجہ نسخۂ مسند کی کمیابی تھی، فرماتے ہیں،

سببہ ان نسخۃ اصل سماعہ کانت بخط الحافظ الضیاء رحمہ اللہ تعالیٰ فوجد بعضها وکان شیخنا الحافظ الکبیر شمس الدین ابو بکر بن المحب یحرضنا علی سماع المسند منہ ویقول لا تشکوا فی انہ سمعہ کاملاً علی ابن البخاری فبادروا الی سماعہ کاملاً فکنا نقرؤہ من نسخۃ وقف البلدرامیۃ لوضوحها وکان بعض المحدثین قد احتاط علیها ولا یعطی منها شیئاً الا بعد تعب کثیر فطالت المدۃ لذلک[2]

اس کا سبب یہ تھا کہ شیخ صلاح الدین کا اصل سماع والا نسخہ حافظ الحدیث ضیاء الدین ابو عبداللہ محمد بن عبدالواحد المقدسی کا لکھا ہوا تھا، اس کا کچھ حصہ ملتا تھا، ہمارے شیخ حافظ ابو بکر ابن المحب، شیخ صلاح الدین سے سماع مسند کی بڑی ترغیب دیتے اور فرماتے تھے، اس میں شک نہ کرو، شیخ نے پوری مسند فخر ابن البخاری سے سنی ہے، تم بھی پوری مسند کے سماع میں جلدی کرو، ہم چونکہ مدرسہ بلدرامیہ کے وقف شدہ نسخہ سے پڑھتے تھے، جو نہایت صاف اور بہت روشن خط تھا، بعض محدثین اس نسخہ کی بڑی حفاظت کرتے تھے، جو جز بھی ملتا تھا وہ بڑی دشواری سے ملتا، اسی لیے اتنی مدت لگ گئی،

اس نسخہ کی جلد ثانی پڑھنے کے زمانہ میں نہیں مل سکی تھی، مگر شیخ سے اس کی اجازت حاصل تھی،

---

[1] المصعد الاحمد فی ختم مسند احمد ص ۵۰ و شذرات الذہب ج ۶ ص ۲۶۷ [2] المصعد الاحمد فی ختم مسند احمد (۵۱) از ابن الجزری، یہ دار الکتب المصریہ سے مسند احمد بشرح احمد محمد شاکر کی پہلی جلد کے ساتھ شائع ہو گئی ہے،

شیخ صلاح الدین کی وفات سے قبل حافظ ضیاء الدین کے خط کی بقیہ جلدیں بھی مل گئیں جن میں شیخ نے سماع کیا تھا، تو ہمارے استاد شیخ ابن المحبؒ نے فرمایا "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ موصوف نے پوری مسند کا سماع کیا ہے"۔

اسی طرح شیخ صلاح الدین کی وفات کے بعد حافظ ضیاء الدینؒ کے قلم کا لکھا ہوا "تتمۃ" المسند ملا، ابن الجزری کا بیان ہے اس نسخہ میں شیخ موصوف کے سماع کی تصریح تھی، طلبۂ حدیث اس سے بہت خوش ہوئے، اور ہم نے اپنے شیخ ابوبکر ابن المحبؒ سے پوچھا، ہم روایت حدیث کے وقت اس کے لیے اجازت کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں، اگرچہ اس کا سماع نہیں ہو سکا ہے، مگر شیخ کا سماع پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے۔ فرمایا، اس میں سماع کی احتیاج نہیں، ایسا ہی واقعہ شیخ ابوزرعہ طاہر بن ابی محمد المقدسی کو سنن ابن ماجہ کے سلسلہ میں پیش آیا تھا، اس وقت معتبر حفاظِ حدیث نے یہی فتویٰ دیا تھا، کہ اس میں سماع کی حاجت نہیں، کیونکہ یہ شیخ کی اجازت عامہ میں داخل ہے،

اس مدت میں ابن الجزری نے شیخ صلاح الدینؒ سے حدیث اس طرح سے پڑھی تھی کہ ان کی مرویات اور مسموعات میں سے کچھ نہیں چھوڑا تھا، فرماتے ہیں،

فلم اترک من مسموعاتہ فیما	میں نے اپنے علم کے مطابق شیخ موصوف
علمت الا قرأتہ علیہ او سمعتہ	کی مسموعات اور مرویات میں سے کچھ نہیں
منہ[1]	چھوڑا جس کو آپ سے پڑھا یا سنا نہ ہو،

ان محدثین کے علاوہ اس عہد کے تمام نامور محدثین اور اکابر علماء کا علم آپ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا، طاش کبری زادہ لکھتا ہے:

سمع الحدیث من جماعۃ[2]	محدثین کی ایک بڑی جماعت سے حدیث کا سماع کیا"[4]

---

[1] المصعد الاحمد ص ۱۵ [2] الشقائق النعمانیہ برحاشیہ وفیات الاعیان لابن خلکان مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۳۹

ابن الجزریؒ کا اصل فن قرأت تھا، اس میں اگرچہ عنفوان شباب ہی میں کمال پیدا کر لیا تھا، مگر اس سے شغف اور انہماک کسی طرح کم نہ ہوتا تھا، بعض جوہر شناس اساتذہ نے آپ کا یہ شغف دیکھ کر فرمایا، بلاشبہ علم قرأت سے شغف بھی اچھا ہے، مگر یہ علم بڑی محنت چاہتا ہے، اس لیے اس سے فائدہ اٹھانے والے تھوڑے ہوتے ہیں، تمھیں اس سے نافع تر علوم سے شغف رکھنا چاہیے، اس وقت آپ نے حدیث کی طرف توجہ کی اور سندوں کے ساتھ ایک لاکھ حدیثیں یاد کر لیں، علامہ شمس الدین الدیریؒ کا بیان ہے،

ان سبب اشتغالہ بالحدیث	فن قرأت سے انہماک اور شغف کے بعد علم حدیث
بعد ان کان مکبا علی علم القراءت	سے اشتغال اور دلچسپی پیدا ہونے کا سبب یہ ہوا کہ
ان بعض اشیاخہ، قال لہ ذات	آپ کے شیوخ میں سے کسی نے ایک دن آپ سے
یوم ان علم القرأت کثیر التعب	یہ فرمایا، قرأت کا فن کثیر المشقت اور قلیل
قلیل الجدوی وانت ! ذھنک	المنفعت ہے، تم، تمھارا ذہن ماشاء اللہ
رائق وفھمک فائق ! ومن کان	اچھا ہے، تمھاری سمجھ خوب ہے، اور جو شخص ایسا ہو
ھکذا فعلیہ بعلم الحدیث فاجتھد	اسے تو علم حدیث پر محنت کرنا چاہیے، چنانچہ
فیہ حتی حفظ مائۃ الف حدیث	آپ نے اس فن میں محنت کی اور ایک لاکھ حدیثیں
باسانید ھا[2]	سندوں کے ساتھ یاد کر لیں،

افتاء اور تدریس کی اجازت

اس ذوق و شوق اور محنت نے آپ کو اپنے شیوخ کی نظروں میں

---

[1] ہمارا خیال ہے کہ اس سے مراد شیخ ابوبکر بن المحب ہیں، کیونکہ آپ ہی نے موصوف کو شیخ صلاح الدین سے مسند احمد کے سماع پر ترغیب اور تحریص دلائی تھی [2] ملاحظہ ہو فہرس الفہارس، تالیف عبدالحی الادریسی الکتانی، طبع فاس ۱۳۴۶ھ ج ۱ ص ۲۲۳

جلد ہی اس قابل بنادیا تھا کہ انھوں نے آپ کو درس و تدریس، افتا، اور تحدیث (روایت حدیث) کی اجازت دیدی تھی، چنانچہ ۷۷۴ھ میں عماد الدین ابن کثیر، ۷۷۸ھ میں ضیاء القرمی اور ۷۸۵ھ میں شیخ الاسلام البلیقنی نے تدریس اور افتا کی اجازت دی تھی، ان کے علاوہ اور ارباب فضل وکمال سے بھی آپ کو اجازت حاصل ہے، مورخ سخاوی کا بیان ہے،

اذن له غير واحد بالافتاء والتدريس والاقراء[1] — آپ کو بہت سے علماء سے فتوی دینے، پڑھانے اور قرائتیں سکھانے کی اجازت حاصل ہو،

تحصیل علم کی فطری صلاحیت واستعداد، شفیق استاذوں کی صحبت اور تربیت نے آپ کو جلد ہی مسند علم پر بٹھادیا۔

درس وتدریس — تحصیل علوم کے بعد آپنے درس و تدریس کا شغل اختیار کیا، جس کی تفصیل مورخ سخاوی نے اس طرح کی ہے۔

"چند سال آپنے دمشق کے اندر جامع بنی امیہ میں قبۂ نسرین کے نیچے بیٹھکر قرائتوں کی تعلیم دی، پھر دار العلوم عادلیہ کے شیخ القرا مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دار الحدیث اشرفیہ میں شیخ القرا رہے، پھر اپنے شیخ ابن السلار کی وفات کے بعد تربۃ ام الصالح کے شیخ القرا ہوگئے، یہاں آپنے ائمۂ فن کی موجودگی میں درس دیا، اور شیخ شہاب الدین بن حجی (جیسے نامور علماء) نے اس امر کا اعتراف کیا کہ آپ کا درس نہایت شاندار ہوتا ہے"[2]

یہاں آپ نے ایک مدرسہ دار القرآن کے نام بھی کھولا تھا،

خطابت — انہی ایام میں الملک الظاہر سیف الدین برقوق المتوفی ۸۰۱ھ نے جو ایک دیندار نیک نفس بادشاہ تھا، آپ کو جامع توبۃ کا خطیب مقرر کیا،

[1] الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۶ [2] ایضاً کتاب مذکور

۷۹۵ھ میں الجامعۃ الصلاحیۃ (بیت المقدس) میں امور تعلیمی کے ناظم مقرر ہوئے،

عہدۂ قضا — امیر شام قطلبک استاد دار اتنمش نے ۷۹۷ھ میں مملکت شام کا عہدۂ قضا آپکے سپرد کیا، لیکن اوقاف کے حسابات درست نہ ہونے کے باعث امیر اتنمش ناراض ہوگیا اور آپ پر تاوان وسختی کی گئی، سارا مال واسباب ضبط کرلیا گیا، ان کے مظالم سے تنگ آکر آپ اسکندریہ سے براہ دریا روم پہنچے اور روم کے پایۂ تخت بروصہ میں اترے،

بروصہ میں قیام، علم حدیث اور قرأت کی اشاعت — یہاں شاہ بروصہ ابویزید بن عثمان سے ملاقات ہوئی، یہ خود عالم اور اہل علم کا بڑا قدر دان تھا، آپ کا شہرہ پہلے سے سن چکا تھا، بڑی تعظیم وتکریم سے پیش آیا، از راہ قدر دانی اپنے ہی پاس ٹھہرایا، اور تازندگی بروصہ نہ چھوڑنے دیا،

خدا نے ابن الجزریؒ کو جس فیاضی کے ساتھ علم کی دولت عطا کی تھی، اسی فیاضی کے ساتھ آپنے اسے تقسیم کیا، بروصہ میں بھی آپنے حدیث اور قرأتوں کا درس دیا، خود حاکم بروصہ ابویزید بن عثمان نے آپسے دس قرأتوں کی تکمیل کی، اہل بروصہ نے بھی اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا، اور ایک جماعت نے عشرہ کی آپسے مشق کی اور سند لی،

یہاں آپ کی ذات سے حدیث اور قرأتوں کی اشاعت کا سلسلہ کم وبیش سات برس تک قائم رہا ہے، تیمور لنگ جب سلطان بایزید بن عثمان سے نبرد آزما ہوا اور اس کو شکست دے کر اس کے قلمرو پر قابض ہوگیا اور اسے حراست میں لے لیا[1]، تو بروصہ کے بعض اہل علم نے یہاں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا، اور بروصہ سے نکل جانا چاہا، ان ہی میں ابن الجزریؒ بھی تھے۔ مگر شیخ نور الدین نے آپ کو پکڑ کر تیمور کے پاس پہنچا دیا، غیاث الدین المعروف بہ خواند امیر

[1] اسی واقعہ کے چند ماہ بعد آق (شہزادہ) میں ۱۴ شعبان ۸۰۵ھ میں بعارضۂ ضیق النفس بایزید بن عثمان کا انتقال ہوگیا،

حبیب السیر میں ظفرنامہ اور مطلع سعدین کے حوالہ سے ناقل ہیں:

"در ظفرنامہ و مطلع سعدین مذکور است کہ درآں آوان کہ امیر گورگان ایلدرم بایزید را اسیر گردانید مرزا محمد سلطان و امیر شیخ نورالدین را برسا فرستادہ وجمعے از اکابر آن دیار راہ فرار نمودند و لشکر ظفر شعار از عقب شتافتہ بیشتر آن مردم را گرفتند شمس الدین محمد جزری و سید محمد بخاری و مولانا شمس الدین فناری از آنجملہ بودند، امیر شیخ نورالدین، شیخ شمس الدین محمد را ہمراہ خود بپایہ سریر اعلیٰ بردہ در کوتاہیہ بشرف ملاقات صاحبقرانی خجستہ صفات رسانید و آنحضرت شیخ را منظور نظر اعتنا ساختہ، بصوب سمرقند فرستادہ و آنجناب تا زمان وفات امیر تیمور در ماوراء النہر اوقات شریف می گذرانید"۔[1]

امیر تیمور علماء، فقراء کا عقیدتمند اور ان کی صحبت کا دلدادہ تھا، نیز ان کی زیارت کو سعادت سمجھتا تھا، جیسا کہ توزکات تیموری میں ہے:

"سادات و علماء و مشائخ و عقلاء و محدثین اخبار را برگزیدہ داشتم و تعظیم و احترام ایشان نمودم .... و با علماء صحبت داشتم و بردلہائے اصحاب قلوب رفتم و از ایشان دریوزہ ہمت نمودہ از انفاس متبرکۂ ایشان التماس فاتحہ کردم"[2]

اسی عقیدت مندی کی بنا پر امیر تیمور آپ کو اپنے ساتھ ماوراء النہر لے گیا، اور وہ بجائے صحبتوں میں وہ آپ کی بزرگی کا قائل ہوگیا، اس کی گرویدگی کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے

[1] حبیب السیر، طبع اول مطبع احمدی بمبئی ۱۲۷۳ھ ج ۳ ص ۹۰ [2] ملاحظہ ہو توزکات تیموری طبع آکسفورڈ لندن ۱۷۸۳ء ص ۱۶۴

جو طاش کبری زادہ نے الشقائق النعمانیہ میں آپکے فرزند ابوالخیر محمد الجزری کے تذکرہ میں نقل کیا ہے کہ تیمور لنگ جب سمرقند پہنچا تو اس نے ایک نہایت عظیم الشان دعوت ولیمہ منعقد کی،[1] جس میں اعیان مملکت اور عمائد سلطنت، علماء، فقراء سب کو مدعو کیا، دعوت میں صفوف کی ترتیب ہمیشہ حلقہ نما ہوتی تھی، علماء اور فضلاء کو حسب مراتب دائیں جانب اور امرا کو بائیں جانب بٹھایا جاتا تھا،

اس دعوت میں محقق سید شریف جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ بھی مدعو تھے، امیر تیمور نے انھیں ابن الجزری کے پیچھے بٹھایا، حاضرین مجلس میں سے کسی نے امیر تیمور سے کہا آپ نے سید شریف کو ابن الجزری کے پیچھے کیوں بٹھایا، وہ تو سب سے آگے جگہ پانے کے مستحق تھے، امیر تیمور نے فوراً یہ جواب دیا:

[1] طاش کبری زادہ نے نہ واقعہ کی نوعیت بیان کی ہے اور نہ کوئی تفصیل لکھی ہے، بلکہ صرف اتنا لکھنے پر اکتفا کیا ہے،

لما ذھب بہ الامیر تیمور الی ماوراء النھر	امیر تیمور جب آپ کو ماوراء النہر لے گیا تو وہاں
اتخذ الامیر تیمور ھناک ولیمۃ عظیمۃ	اس نے ایک عظیم الشان دعوت ولیمہ کی،

محمد بن خاوند شاہ ہروی کا وقائع نگار قلم واقعہ مذکور کی تفصیل اس طرح کرتا ہے،

درآں زمان محمود حسب اشارت عالی سادات و قضاۃ و علماء و ارباب درس و فتوی بمجلس ہمایوں حاضر آمدند و مرزا الغ بیگ امیرزادہ ابراہیم و سلطان مرزا امیران شاہ و از اولاد امیرزادہ عمر شیخ امیرزادہ احمد و سیدی احمد و شاہزادہ بایقرا ہر یک را بکریمۂ از کرائم خاندان سلطنت و دودمان مملکت بآئین شرع مطہر عقد بستہ دو دراں محفل جنت مثال امام ائمہ ستودہ خصال شیخ شمس الدین جزری بعد از رعایت شرائط عقد بقرأت خطبۂ نکاح اشتغال فرمودہ و کلمۂ ایجاب و قبول بقاضی قضاۃ سمرقندی مولانا صلاح الدین متعلق بود نیاز بیشمار و گوہر بسیار نثار کردند (روضۃ الصفا مطبوعہ نولکشور ۱۲۷۴ھ ج ۶ ص ۱۲۳۴)

ان ہی شاہزادوں کی شادی پر جو ولیمہ ہوا، اسی مجلس کا یہ واقعہ ہے،

ابن الجزری کا درجہ تیمور کی نظر میں

کیف لا اقدم [1] رجلا عالماً بالکتاب و السنة ودیناً و اشکل علیه منهما النبي صلی الله علیه وسلم بالذات فیحل له [1]

میں بھلا ایسے شخص کو آگے کیوں نہ کروں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا عالم ہو اور جب اسے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ میں کوئی اشکال در پیش آتا ہو تو وہ اس کا براہ راست بارگاہ رسالت سے حل کر لیتا ہو،

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر تیمور کی نظر میں موصوف کا کیا مقام تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے تاحیات آپ کو نہ چھوڑا، ۸۰۷ھ میں جب تیمور لنگ کا انتقال ہوا تو آپ خراسان چلے گئے، اور ہرات، یزد اور اصفہان ہوتے ہوئے رمضان المبارک ۸۰۸ھ میں شیراز پہنچے

شیراز کا عہدہ قضا

یہاں پیر محمد حاکم شیراز نے مملکت شیراز میں قاضی القضاۃ کے عہدہ پر آپ کا تقرر کر دیا، جسے آپ نے مجبوراً قبول کیا، اور نہایت خوش اسلوبی سے عرصۂ دراز تک اپنے فرائض منصبی کو انجام دیتے رہے، یہاں بھی آپ نے حدیث اور قرأت کی تعلیم کا ایک مدرسہ کھولا،

۱؎ الشقائق النعمانیہ ج ۱ ص ۴۴ - یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امیر تیمور محقق سید شریف جرجانیؒ کے علمی مقام سے آگاہ اور آپ کا بڑا قدردان تھا، سید شریفؒ نے تیمور کو اس دور کا مجدد قرار دیا تھا اور اس مضمون کا ایک خط بھی اس کو بھیجا تھا، جیسا کہ تزوکات تیموری میں ہے:

"امیر سید شریف کہ از فحول علمائے زمان بود دریں باب مکتوبے بمن نوشت کہ اتفاق علمائے سلف و خلف بریں رفتہ کہ در سر ہر صد سال از حضرت رسالت پناہ اللہ تعالی برائے رواج دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم مجددی انگیزد و چوں دریں سر صد ہشتم امیر صاحبقران دین متین را رواج دادہ اند در اقطار و امصار عالم دین و اسلام ذات یافتہ بتحقیق رسید کہ مروج دین امیر صاحبقران است" (ص ۱۴۸)

اس کے بعد وہ اصل مکتوب درج کیا ہے۔

جن میں بعض نے سبعہ قرأتوں کی اور بعض نے عشرہ کی تکمیل کی اور سند لی، اہل شیراز کو آپ سے بڑا فیض پہنچا، مورخ سخاوی کا بیان ہے،

نشر بها ایضاً القرأت والحدیث وانتفعوا به [1]

شیراز میں بھی آپ کی ذات سے حدیث اور قرأتوں کی بڑی اشاعت ہوئی، اہل شیراز کو آپ سے بڑا فیض پہنچا،

درس و تدریس کا یہ سلسلہ ۸۲۲ھ تک برابر قائم رہا، یہاں آپ نے امام اعظم کے لقب سے شہرت پائی، مگر کچھ دنوں کے بعد کسی وجہ سے حاکم وقت کی نگاہیں بدل گئیں

حج کی روانگی

اس لیے ۸۲۲ھ میں آپ براہ بصرہ حج کے لیے روانہ ہو گئے، سوء اتفاق سے راستہ میں ڈاکوؤں نے ایسا لوٹا کہ کچھ نہ چھوڑا، اور حج بھی فوت ہو گیا، چار و ناچار ینبع [2] میں قیام کرنا پڑا، ربیع الاول میں مدینہ منورہ پہنچکر حدیث کا درس دیا، پھر مکہ معظمہ گئے اور فریضۂ حج ادا کر کے حرم ہی میں قیام فرمایا [3]، اور اسی سال اپنی دو بیویوں کے ہمراہ بلاد عجم کی سیر و سیاحت کے لیے نکلے اور دمشق ہوتے ہوئے قاہرہ تشریف لائے، یہاں کے حاکم السلطان الاشرف نے آپ کی بڑی تعظیم و توقیر کی کم و بیش سولہ دن قیام رہا، مگر قاریوں کا اتنا ازدحام تھا کہ آپ صرف ایک آیت تلاوت فرماتے تھے، پھر سب اس کو لوٹاتے تھے، طاش کبری زادہ کا بیان ہے،

ان الشیخ شمس الدین الجزری لما قدم القاهرة وازدحمت علیه خلق لم یتسع وقته لقرأة الجمیع وکان یقرأ علیهم

شیخ شمس الدین الجزریؒ جب قاہرہ آئے تو قاریوں کا بڑا ازدحام تھا، اور آپ کے پاس سب کیلئے قرأت کا وقت نہ تھا، اس لیے آپ انھیں ایک ایک آیت پڑھ کر سناتے اور پھر

۱؎ الضوء اللامع ج ۹ ص ۲۵۷، ۲؎ مدینہ منورہ کی قدیم بندرگاہ ۳؎ مورخ ابن العماد کا بیان ہے کہ آپ حج کر

چلے گئے تھے، یہاں تجارت کی پھر ۸۲۶ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے،

الآية ثم يعيد وفها عليه — وہ سب مل کر اس کو لوٹاتے تھے۔

دفعة فلم يكف يقرأته[1] — ....

حافظ ابن حجر عسقلانی انباء الغمر میں لکھتے ہیں،

لما قدم القاهرة اشتال الناس — جب آپ قاہرہ آئے تو لوگ سماع حدیث

للسماع عليه والقراءة وكان — اور قرأتوں کی تعلیم کے واسطے آپ پر ٹوٹے

قد ثقل سمعه قليلاً ولكن بصره — پڑتے تھے، اس وقت سماعت میں کچھ

صحيح يكتب الخط الدقيق على — فرق آگیا تھا، لیکن بینائی بالکل درست تھی

عادته[2] — چنانچہ آپ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق نہایت

یہاں آپ نے مسند احمدؒ اور مسند شافعیؒ وغیرہ کا درس دیا، ابن العماد کا بیان ہے

حدث بالقاهرة بمسند احمد — قاہرہ میں آپ نے مسند احمد اور مسند شافعی وغیرہ

ومسند الشافعي وغير ذلك[3] — کو اپنی سند سے روایت کیا تھا،

یہاں سے آپ پھر یمن ہوتے ہوئے حج کو روانہ ہو گئے، یمن میں آپ کی کتاب الحصن الحصین

کا بڑا رواج تھا، اہل یمن اس کی روایت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش

---

[1] مفتاح السعادہ طبع اول دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۲۹ھ ج ۲ ص ۲۶۰۔ ابن الجزریؒ نے اپنی قرأت پر اکتفا نہیں کیا، اسکی وجہ یہ تھی کہ قاری کو اپنے استاد سے اجزاء قرأت میں کم از کم کتنا پڑھنا ضروری ہے، یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، چنانچہ صدر اول میں محض دس آیتوں کا پڑھ لینا بھی کافی سمجھا جاتا تھا، مگر بعد میں شاگرد کی صلاحیت اخذ اور استعداد کا دار رہی، مگر ابن الجزریؒ نے (ان قیود کے ساتھ) اتنا اور اضافہ کیا کہ کسی ایک امام کی قرأت کی مشق میں کم از کم ایک سو بیس آیتیں پڑھنا اور متعدد ائمہ کی قرأتوں کے اجزاء کی صورت میں دو سو چالیس آیتوں کا پڑھنا از بس ضروری ہے، حالانکہ کسی نے یہ تحدید نہیں کی ہے [2] انباء الغمر بحوالہ الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۹
[3] شذرات الذہب طبع قاہرہ ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۲۵

کرتے تھے، جب آپ کا ورود یہاں ہوا تو بہت سے لوگ جنھیں آپ سے اس کتاب کا سماع حاصل تھا، فوت ہو چکے تھے، ان کے بیٹے پوتوں نے آپ سے اس کا سماع کیا، کچھ دنوں زبید کی مسجد الاشاعرہ میں حدیث کا درس دیا، اور زبید کے علماء نے آپ سے حدیث کی اجازت لی، خود حاکم یمن الملک المنصور نے آپ کو صحیح مسلم سنائی اور روایت حدیث کی اجازت حاصل کی، اور زاد راہ اور انعام دیکر مکہ معظمہ پہنچایا[1]،

یہاں بھی مسجد الحرام میں ربیع الاول ۸۲۸ھ میں مسند احمد کا درس دیا اور اسی سال دوبارہ حج کیا، پھر اپنے فرزند ابوبکر احمد الجزری کے ساتھ مصر آئے، وہ روم چلے گئے اور آپ جمادی الاخری ۸۲۹ھ میں دمشق چلے آئے، یہاں سے شام ہوتے ہوئے بصرہ گئے اور یہاں سے شیراز آ گئے،

فضل وکمال | ابن الجزریؒ دو واسطوں سے امام شاطبیؒ کے شاگرد اور نہایت عالی اسناد کے حامل تھے[2]، آپ کا خاص اور امتیازی فن قرأت تھا، اس فن کے آپ امام تھے، مورخ سخاوی کا بیان ہے کہ حافظ ابن حجرؒ نے انباء الغمر میں آپ کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

الحافظ، الامام المقری...... — حافظ، امام قرأت .... آپ کو حدیث

انه لهج بطلب الحديث والقرا — اور قرأتوں کی تحصیل کی طرف رغبت ہوئی،

---

[1] تحفۃ الذاکرین از علامہ شوکانی ص ۵ [2] ابو القاسم یوسف بن علی الہذلی المعروف بابن جبارہ المتوفی ۴۶۵ھ کی معرکۃ الآراء کتاب الکامل فی القرأت الخمسین کی آپکے پاس نہایت اعلیٰ سند تھی، حافظ ابن حجر اپنی معجم الشیوخ میں لکھتے ہیں،

ان من احسن ما عنده الكامل في — قرأتوں کی سندوں میں آپکے پاس سب سے اعلیٰ سند

القرأت لابن جبارة — الکامل فی القرأت الخمسین لابن جبارہ کی تھی

اور پھر آپ کی پوری سند درج کی ہے (معجم الشیوخ بحوالہ الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۸)

فی القراأت ...... وانتهت الیه[1]	آپ قراأتوں کے فن میں مشہور ہوگئے، بلاد اسلامیہ میں
ریاسۃ علم القرأت فی البلاد[1]	علم القرأت کی ریاست آپ پر ختم ہوگئی۔

حافظ جلال الدین سیوطی ذیل طبقات الحفاظ میں لکھتے ہیں،

الحافظ المقرئی شیخ الاقراء فی	حافظ، قرأتوں کی سند دینے والے اور اپنے
زمانہ[2]	زمانہ میں قرأتوں کے امام تھے،

محدث محمد بن علی الشوکانی البدر الطالع میں رقمطراز ہیں،

قد تفرد بعلم القرأت فی جمیع	آپ قرأتوں کے علم میں سارے جہان سے یکتا تھے
الدنیا ونشرہ فی کثیر من البلاد	بہت سے ملکوں میں آپنے اسکی اشاعت کی اور آپ کے
وکان اعظم فنونہ واجل ما عندہ[3]	فنون میں یہ فن سب سے ممتاز اور نمایاں تھا،

اسی طرح حدیث بھی آپ کا خاص موضوع تھا، اور علوم حدیث میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، ایک لاکھ حدیثیں سندوں کے ساتھ حفظ تھیں، حفظ حدیث میں روایات کی کثرت سے زیادہ ان کی کیفیت اور نوعیت معیار کمال ہے، اس اعتبار سے بھی آپ کا پایہ نہایت بلند ہے، محدث طاوسی[4] لکھتے ہیں:

انہ تفرد بعلو الروایۃ وحفظ	وہ علوے روایت، حفظ احادیث، جرح و
الاحادیث والجرح والتعدیل	تعدیل، متقدمین اور متاخرین رواۃ کی

---

[1] انباء الغمر بحوالہ الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۹ [2] ذیل طبقات الحفاظ للذہبی طبع دمشق ۱۳۴۷ھ ص ۳۷۷
[3] البدر الطالع طبع قاہرہ ۱۳۴۸ھ ج ۲ ص ۲۵۱ [4] طاوسی سے مراد شہاب الدین ابو العباس احمد الطاوسی ہیں، جو محدث عبد اللہ بن عبد القادر المتوفی ۸۳۳ھ کے نامور فرزند اور محقق سید شریف جرجانی اور ابن الجزری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو الضوء اللامع سخاوی،

ومعرفۃ الرواۃ المتقدمین	معرفت میں یکتائے روزگار تھے، صحیحین، سنن ابی داؤد،
والمتاخرین یعنی بالنسبۃ[1]	نسائی، ابن ماجہ، مسند دارمی، مسند امام شافعی
الی تلک النواحی واورد	اور موطا امام مالک کی سندوں کو بطریق یحییٰ
اسانیدہ بالصحیحین وابی داؤد	ابن یحییٰ، ابو مصعب، القعنبی اور ابن بکیر
والنسائی وابن ماجہ وبمسانید	روایت کرتے تھے، مصنفات بغوی
الدارمی والشافعی واحمد	اور نووی کو بھی بسند بیان کرتے تھے،
وبموطا مالک عن طریق یحییٰ	جیسا کہ میں نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے
بن یحییٰ وابی مصعب والقعنبی	....
وابن بکیر وبمصنفات البغوی	....
والنووی کما سقتہا فی التاریخ	....
الکبیر[2]	....

ذیل طبقات الحفاظ میں محدث سیوطیؒ نے تصریح کی ہے:

وصفہ (ابن حجر) بالحفظ	الدرر الکامنہ میں متعدد جگہ حافظ ابن حجر نے
فی مواضع علا یاساتہ من الدرر[3]	آپکے حفظ حدیث کی تعریف کی ہے،

مورخ سخاوی اپنے استاذ حافظ ابن حجر سے ناقل ہیں،

فنہ الذی مہر فیہ القرأت	آپ کا اصل فن جس میں مہارت حاصل تھی،
ولہ عمل فی الحدیث ونظم	وہ قرأتوں کا فن تھا، حدیث میں بھی آپکا کارنامہ ہے،

---

[1] یعنی والا جلد غالباً سخاوی کا اضافہ ہے [2] الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۸ [3] ذیل طبقات الحفاظ للذہبی ص ۳۷۷

وسط [1]

نظم البتہ اوسط درجہ کی ہے

ابن الجزری کا شمار حفاظ حدیث میں ہے، محدث سیوطی ذیل طبقات الحفاظ میں لکھتے ہیں:

کان اماماً فی القراءات لا نظیر له فی القراءات فی الدنیا فی زمانه حافظاً للحدیث وغیره [2]

فن قراءت میں آپ امام تھے، اور اپنے زمانہ میں عالم میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، حدیث اور دیگر علوم کے آپ حافظ تھے،

محدث محمد بن عبد الباقی الزرقانی المتوفی ۱۱۲۲ھ فرماتے ہیں

ابوالخیر شمس الدین ابن الجزری الدمشقی الامام فی القراءات الحافظ للحدیث [3]

ابو الخیر شمس الدین ابن الجزری دمشقی فن قراءت کے امام اور حافظ الحدیث ہیں،

مورخ ابن العماد کا بیان ہے

فانه کان عالم النظیر طائر الصیت انتفع الناس بکتبه وسارت فی الآفاق مسیر الشمس [4]

آپ مشہور خلائق تھے، اور اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، لوگوں نے آپ کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے، عالم میں آپ کی تالیفات ایسی تیزی سے پھیلی ہیں جس طرح سورج تیز گامی سے اپنی منزل کی طرف پہنچتا ہے،

فن قراءت اور حدیث کے علاوہ اور بہت سے علوم اسلامیہ تاریخ، طبقات، رجال نحو اور اصول فقہ وغیرہ میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، علامہ شوکانی کا بیان ہے،

---

[1] الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۹ [2] ذیل طبقات الحفاظ للذہبی ص ۳۷۷

[3] شرح المواہب اللدنیہ، طبع اول مصر ۱۳۲۵ھ، ج ۱ ص ۱۳۹

[4] شذرات الذہب ج ۸ ص ۲۰۶

مهر فی کثیر من العلوم خصوصاً علم القراءات فانه تفرد به واخذ عنه الناس فیه وفی غیره من العلوم [1]

آپ کو بہت سے علوم میں مہارت حاصل تھی خاص طور سے علم قراءت، اس میں وہ تو یکتائے زمانہ تھے، بہت سے لوگوں نے آپ سے علم قراءت اور دوسرے علوم حاصل کیے،

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے یہ بھی لکھا ہے لیس له ید فی الفقه [2] ان کو فقہ میں دستگاہ حاصل نہ تھی، اور ابن حجر کے شاگرد سخاوی نے استاد کی اتباع میں یہاں تک لکھ دیا ہے، لم یکن محمود السیرۃ فی القضاء [3]۔ آپ قضا کے معاملہ میں کچھ زیادہ نیک کردار نہ تھے،

ہمارے خیال میں یہ دونوں باتیں قرین قیاس نہیں، کیونکہ ابن الجزری کے واقعات زندگی سے ان باتوں کی تصدیق نہیں ہوتی، اگر ان کو فقہ میں درک حاصل نہ ہو، یا اور وہ محمود السیرۃ نہ ہوتے تو ماوراء النہر میں جو زمانۂ دراز سے فقہ کا مرکز تھا، مدت مدید تک عہدۂ قضا پر کیونکر فائز رہ سکتے تھے، پھر فقہ میں آپ کی تالیفات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ آپ کو فقہ پر عبور حاصل تھا، طاش کبری زادہ کا بیان ہے،

الف فی التفسیر والحدیث والفقه [4]

فقہ، حدیث اور تفسیر میں آپ کی تالیفات ہیں،

معلوم ہوتا ہے، ان کی بڑھتی ہوئی شہرت اور قبولیت کو دیکھکر بعض معاصرین نے انکو بدنام کرنے کی کوشش کیں، یہانتک کہ مجازفت دمن گھڑت باتیں کرنا ہے کبھی آپ کو

---

[1] تحفۃ الذاکرین طبع قاہرہ [2] الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۹ [3] ایضاً کتاب مذکور

[4] مفتاح السعادۃ، طبع اول حیدر آباد دکن ج ۱ ص ۳۹۴

متہم کیا گیا، مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس اتہام کی نہایت سختی سے تردید کی ہے، چنانچہ انکا بیان ہے،

قد سمعت بعض العلماء یتهمه	میں نے بعض علماء سے سنا وہ ان کو مجازفت
المجازفة فی القول واما الحدیث	فی القول سے متہم کرتے تھے، ان کی حدیث
فیما اظن به ذلك الا انه رائی	کی نسبت تو میں اس کا گمان بھی نہیں کرسکتا،
للقصر مین شیأ اغار علیه	بات اتنی ہوگی کہ جب انھوں نے اپنے معاصرین
ونسبه للنفسه وهذا امر	کے پاس کوئی ایسی چیز دیکھی (جوان کے پاس بھی
قد اکثر المتاخرون منه	نہ تھی)، تو ان کو غیرت آئی اور اس کی نسبت
ولم ینفرد به[1]	اپنی طرف بھی کردی ہو، یہ بات متاخرین
.....	علماء میں ان سے بھی زیادہ موجود ہے،
.....	اس میں وہ منفرد نہیں ہیں،

فقہ کے سلسلہ میں غالباً حافظ ابن حجر بھی معاصرین کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، ورنہ جس شخص کے زہد و ورع کا یہ عالم ہو کہ سفر و حضر میں بھی اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا ہو جس کی للہیت اور دربار رسالت میں رسائی کا یہ حال ہو کہ اس کے اشکالات براہ راست بارگاہ نبوی سے حل ہوتے ہوں، اس کو غیر محمود السیرۃ کیونکر باور کیا جاسکتا ہے۔

(باقی)

---

[1] الضوء اللامع ج ۹ ص ۲۵۹

ابن الجزری

از جناب مولانا محمد عبد العلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۲)

شعر و سخن کا ذوق ابن الجزریؒ کو شعر و سخن کا فطری ذوق تھا، انھوں نے اس ملکہ سے بھی قرآن و حدیث کی خدمت کی، فن تجوید کے اصول اور قواعد کو اشعار میں منضبط کیا، اور قراتوں کے اختلاف کو نظم کیا تاکہ یاد کرنے میں سہولت ہو، چنانچہ اٹھارہ سال کی عمر میں دس قراتوں میں شاطبیہ کا تکملہ نظم الهدایہ فی تتمۃ العشرہ نامی لکھا جس کا وزن اور قافیہ بھی وہی ہے جو شاطبیہ کا ہے،[1]

---

[1] علامہ شاطبی کے انداز پر لکھنا نہایت مشکل کام ہے، جیسا کہ ابن الجزری کا بیان ہے

من وقف علی قصیدتیه علم مقدار	جو ان کے دونوں قصیدوں سے واقف ہوگا اس کو
ما آتاه الله تعالیٰ فی ذلک خصوصاً	اس کا اندازہ ہوگا کہ فن قرأت میں اللہ تعالیٰ نے
اللامیة التی عجز البلغاء من بعدها	انکو کتنا علم عطا کیا تھا، خاص طور سے لامیہ کو جسکے
عن معارضتها فانه لا یعرف مقدارها	مقابلہ سے بعد کے بلغا بھی عاجز آگئے، اسکی قدر
الا من نظم علی منوالها او قابل	وہی جان سکتا ہو جس نے اس انداز پر نظم لکھی ہو یا اسکے
بینها وبین ما نظم علی طریقها	اور اس نظم کے درمیان جو اس انداز پر لکھی گئی ہو
(مفتاح السعادۃ، ج ۱ ص ۳۸۸)	موازنہ کیا ہو،

(باقی ص ۳۴۳ پر)

مقدمۃ الجزریہ طالبعلموں کو آج بھی ابتداءً یاد کرایا جاتا ہے، طیبۃ النشر میں سبعہ اور عشرہ قرأتوں کے اختلافات کو ایک ہزار اشعار میں نظم کیا، جو اس زمانہ میں بھی قاری یاد کرتے اور تکمیل فن کے لیے آج بھی اس کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں، اصول حدیث میں بھی ایک ارجوزہ آپ کی یادگار ہے، آپ کی بیشتر نظمیں اسی قسم کی ہیں، ان کے علاوہ جو اشعار ہیں، وہ عشق نبوی میں ڈوبے ہوئے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ نے شاگردوں کو شمائل ترمذی ختم کرائی تو فی البدیہہ یہ دو شعر کہے تھے،

اخلائی ان شط الحبیب و ربعہ وعز تلاقیہ و ناءت منازلہ

میرے پیارے دوستو! اگر محبوب اور اسکی منزل دور ہے، اس سے ملاقات مشکل اور اسکے کوچہ تک رسائی دشوار ہے،

وفاتکم ان تبصروہ بعینکم فما فاتکم بالسمع ھذہ شمائلہ

اور اگر تم سے یہ نہ ہو سکے کہ تم انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو تو تمھارے لیے یہ تو ممکن ہے کہ تم انکے خصائل اور شمائل کا حال سنو،

دیار حبیب کے متعلق بھی یہ دو شعر سن لیجئے،

مدینۃ خیر الخلق تجلو لناظری فلا تعذ لونی ان قتلت بھا عشقا

افضل الموجودات کا مدینہ میری آنکھوں کو جلا بخشتا ہے، اگر میں اس کے عشق میں مارا جاؤں تو مجھکو برا بھلا نہ کہو

وقد قیل فی زرق العیون شآمۃ وعندی ان الیمن فی عینھا الزرقاء

اور کہا تو یہ جاتا ہے کہ چشم نیلگوں بدفال ہوتی ہے، لیکن میرے نزدیک اسکے عین الزرقا[۱] میں نیک فالی ہی نیک فالی ہے

ختم مسند پر ایک دالیہ کہا تھا جس میں بڑی آمد اور روانی ہے، فرماتے ہیں،

حدیث النبی المصطفیٰ خیر مسند وسنتہ الغراء ارفع مسند

نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بہترین مسند ہے، اور آپ کی تابناک سنت سب سے اعلیٰ مسند ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴۱) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کو نظم پر کیسی زبردست قدرت حاصل تھی، کہ عنفوان شباب ہی میں شاطبیہ کے انداز پر اس کا تکملہ لکھا۔ [۱] مدینۃ الرسول کے پانی کے ایک چشمہ کا نام ہے۔

فطوبیٰ لمن اضحی الحدیث شعارہ وبشریٰ لمن آسی بالاخیار یقتدی

خوش نصیب، جس کا شعار علم حدیث بن گیا ہو، اور قابل مبارکباد ہے وہ جو بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے لگا ہو

ویا فوز من بات النبی سمیرہ ومن نورہ فی ظلمۃ الجھل یھتدی

اور اے بامراد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسکے ہمکلام ہیں، اور وہ ان ہی کے نور سے جہالت کی تاریکی میں ہدایت یافتہ ہو

یا سعد من کان الصحابۃ حولہ یروح علیھم بالحدیث ویغتدی

اور اے خوش نصیب کہ جسکے پاس صحابۂ کرام موجود ہوں، اور وہ صبح و شام ان سے باتیں کرتا ہو،

وان کتاب المسند البحر للذی فتی حنبل للدین آیۃ مسند

اور حقیقت میں مسند احمد تسلیم و رضا کا سمندر ہے، حنبل کا نوجوان دین کے لیے اسناد کی ایک نشانی ہے،

حوی من حدیث المصطفیٰ کل جوھر وجمع فیہ کل در منضد

اس نے حدیث مصطفیٰ کا ایک جوہر اکٹھا کیا ہے، اور اس میں تہ بہ تہ ہر موتی کو جمع کیا ہے.

فما من صحیح کالبخاری جامعاً ولا مسند یلقی کمسند احمد

صحیح بخاری کی طرح کوئی جامع کتاب نہیں ہے، اور نہ مسند احمد کی طرح مسند ہے.

امام ھدی للناس افضل مقتدی شدید کبیر للخلائق مرشد

وہ لوگوں کے واسطے امام ہدایت اور افضل رہنما ہیں، خلق کے لیے بہترین مرشد اور رہبر ہیں

ھو الصابر الاواہ فی محن دھت لہ المنۃ العظمیٰ علی کل مھتدی

وہ ناگہانی مصیبتوں میں صبر کرنے والے اور نرم دل ہیں۔ ہر ہدایت یافتہ پر آپ کا بڑا احسان ہے

یا الٰھی وارحم کل من ھو حاضر ومن غائب الیناً فاعف عنہ واسعد

یا الٰہی حاضرین مجلس پر رحم فرما۔ اور جو موجود نہیں ہیں انھیں معاف کر اور نیک بخت بنا

ما کان من حاجاتنا فاقضہ لنا وحطنا وجد والنصر وسلّم وایّد

ہماری جو بھی حاجتیں ہیں ان کو پورا فرما، ہمارے گناہ معاف کر، ہم پر عنایت فرما، ہمیں سلامت رکھ اور قوت بخش،

وقد قاله العبد الفقیر محمد فتی الجزری السائل العفو فی خذ [1]

یہی دعا ہے اس عاجز فقیر محمد الجزری کی، جو کل بھی تجھ سے معافی کا طلب گار ہے۔

آپ کی نظم کے بارہ میں حافظ ابن حجر کی اس رائے "نظم وسط" کو نظم اوسط درجہ کی ہوتی ہے، کا سبب یہ ہے کہ شعر و سخن کا تعلق زیادہ تر حسن و عشق سے ہے، شاعر کے اصلی جوہر اسی میدان میں کھلتے ہیں، اور ابن الجزری نے فن کے قواعد کو اشعار میں نظم کیا ہو، وہ بھی اصول تجوید اور قرأتوں کے اختلافات کو علوم حدیث اور اصول حدیث کو بھلا ان اشعار میں رنگینی اور لطف کیونکر پیدا ہو سکتا ہے،

بڑے سے بڑا شاعر بھی کسی خاص فن کے قواعد کو اشعار میں نظم کرے تو وہ خوبیاں ہرگز پیدا نہیں کر سکتا جو حسن و عشق کی داستان میں کی جا سکتی ہیں، کسی فن کے مسائل کو نثر ہی میں لکھنا مشکل ہے، نہ کہ نظم کرنا، اس کے باوجود اگر آپ کی نظم اوسط درجہ کی ہے تو بھی بڑا کمال ہے،

فصاحت و بلاغت | مذہبی علوم کے علاوہ زبان و ادب کا مذاق بھی نہایت پاکیزہ اور بلند تھا، اور ادب میں بھی خاصی مہارت حاصل تھی، آپ کا شمار اپنے دور کے فصحا میں تھا، تقی الدین احمد المقریزی درر العقود الفریدہ میں لکھتے ہیں

کان ...... فصیحا بلیغا له — آپ نہایت جمیل و شکیل اور فصیح و بلیغ انسان تھے،

نظم ونثر وخطب — نظم و نثر اور خطبے آپ سے یادگار ہیں،

ابن حجر عسقلانی نے بھی انباء الغمر میں اس امر کا اعتراف کیا ہے،

انه کان ثریا ...... فصیحا بلیغا [2] — آپ صاحب ثروت اور بڑے فصیح و بلیغ تھے،

---

[1] المصدر الاحمد ص ۵۵ [2] انباء الغمر بحوالہ الضوء اللامع للسخاوی،

حافظہ اور ذکاوت | علم کے ذوق و شوق کے ساتھ حافظہ بھی نہایت قوی پایا تھا، جو چیز ایک دفعہ یاد کر لی وہ گویا کتاب میں محفوظ ہو گئی، حافظہ کا یہ حال تھا کہ ایک لاکھ حدیثیں سندوں کے ساتھ یاد تھیں، فہم و ذکا سے بھی وافر حصہ ملا تھا، جس کا اندازہ آپ کے شیوخ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے، جو انھوں نے فن حدیث کی ترغیب دیتے ہوئے آپ سے کہے تھے،

انت! ذهنك رائق و فهمك — تم! تمھارا ذہن بڑا رسا اور تمھاری سمجھ

فائق! — خوب ہے،

اخلاق و عادات | آپ بڑے ملنسار، شیریں گفتار اور خدا ترس تھے، جب بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، آپکے فقرہ فقرہ سے فصاحت و بلاغت ٹپکتی تھی، مزاج میں تواضع اور انکسار تھا، لوگوں کے ساتھ .... احسان اور حسن سلوک سے پیش آتے تھے، اللہ تعالیٰ نے دولت دنیا سے بھی وافر حصہ دیا تھا، اہل حجاز کے ساتھ خصوصیت سے بہت احسان کرتے تھے، حافظ ابن حجر انباء الغمر میں لکھتے ہیں،

کثیر الاحسان لاهل الحجاز [1] — اہل حجاز کے ساتھ دل کھول کر احسان کرتے تھے،

عبادت اور ریاضت | علم کے ساتھ عمل کے زیور سے بھی آراستہ، بڑے عابد اور نہایت مرتاض بزرگ تھے، زندگی کے مشاغل ثلاثہ میں تیسرا مشغلہ عبادت اور ریاضت ہی تھا، جو سفر و حضر میں بھی نہ چھوٹتا تھا،

انضباط اوقات | ابن الجزریؒ نے اپنے شبانہ روز کے مشاغل اور اوقات کار کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا،

(۱) قرأت کی تعلیم اور درس حدیث (۲) تصنیف و تالیف (۳) عبادت اور یاد الٰہی

---

[1] انباء الغمر بحوالہ الضوء اللامع ج ۹ ص ۲۵۹

تمام عمر ان امور پر بڑی پابندی سے عمل پیرا رہے، ہر مہینہ میں تین روزے رکھتے تھے، دوشنبہ، اور پنجشنبہ کا روزہ اس کے علاوہ تھا، جو کبھی قضا نہ ہوا، سفر تک میں بھی شب بیداری اور تہجد گذاری میں کبھی فرق نہ آیا، نواب صدیق حسن خاں قنوجی اتحاف النبلاء میں لکھتے ہیں،

اوقاتش معمور بود بہ شغل قرأت قرآن، یا اسماع حدیث یا عبادت در اوقات او برکت محسوس بود باوجودیکہ مردم بطلب ایں دو علم بروے ہجوم داشتند و اورا او وعبادت وظیفہ داشت آں قدر ہر روز تصنیف می کرد کہ کاتب جیّد سریع الکتابت می نوشت در سفر و حضر بیدار و قائم اللیل می ماند ہرگز روزۂ دوشنبہ و پنجشنبہ از وے فوت نمی شد و سہ روزہ از ماہ نیز می نہاد۔"[1]

قبولیت عام | اپنے فضل وکمال اور زہد وورع کی بنا پر مرجع خلائق بن گئے تھے، قرّا اور طالبان حدیث دور دور سے استفادہ کے لیے آتے تھے، جہاں جاتے تھے، شائقین کا ٹھٹھ لگ جاتا، قاہرہ میں پہنچے تو لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، یمن آئے تو یمنی حصول سند میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کرنے لگے، خلفا، وسلاطین کی گرویدگی کا یہ عالم تھا کہ جس خلیفہ کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا اس نے تاحیات آپ کو نہ چھوڑا، بایزید بن عثمان جب تک زندہ رہا، اس نے آپ کو اپنے ہی پاس رکھا، امیر تیمور نے بھی مرکر ہی مفارقت اختیار کی، پیر محمد حاکم شیراز نے زندگی بھر شیراز سے نکلنے نہ دیا،

بمقبولی کسے را دسترس نیست ۔۔۔ قبولِ خاطر اندر دستِ کس نیست

وفات | ابن الجزریؒ نے کم وبیش پچیس سال تک متواتر قرآن وحدیث کی خدمت کرنے کے بعد ۸۲ سال کی عمر میں جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے ۵ ربیع الاول ۸۳۳ھ میں (جو مرزا شاہ رخ کا عہد تھا) شیراز میں اپنی قیام گاہ محلۂ اسکافین (موچی محلہ) میں انتقال فرمایا، اور اپنے مدرسہ دار القرآن

---

[1] اتحاف النبلاء مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۳۹۲

میں سپرد خاک کیے گئے۔ سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ منزلہ ومثواہ آمین[1]

غایۃ النہایہ میں جنازہ کی کیفیت آپ کے ایک تلمیذ کی زبانی اس طرح مرقوم ہے

"جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو اتنا ہجوم تھا کہ اعیان مملکت، عوام وخواص جنازہ کو کندھا دینے، چھونے اور بوسہ دینے میں ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے جن کو جنازہ تک

---

[1] بعض کتابوں میں سال وفات سہواً غلط درج ہوگیا ہے، یہ غلطی حاجی خلیفہ سے کشف الظنون میں ہوئی ہے، انھوں نے الحصن الحصین کے ضمن میں اور ابن الجزری کی بعض دوسری کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے سال وفات ۸۳۳ھ اور ۸۳۴ھ لکھدیا ہے، نواب صدیق حسن خان نے بھی اتحاف النبلاء میں ۸۳۴ھ لکھا ہے، جس پر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے تذکرۃ الراشد وتبصرۃ الناقد (مطبع انوار محمدی لکھنؤ ص ۱۹۶) اور ابراز الغی (مطبع انوار محمدی لکھنؤ ص ۲۴) نہایت سخت تنقید کی ہے، نواب صدیق حسن خاں سے یہ غلطی محض کشف الظنون کی اتباع میں ہوئی ہے، کشف الظنون چونکہ اسلامی علوم پر کتابوں کی ایک جامع فہرست اور ان کا اجمالی تعارف ہے، اسی لیے اس میں سنین وفات کی صحت کا چنداں اہتمام نہیں ہے، جو لوگ صرف اس پر اعتماد کرکے تاریخ وفات نقل کرتے ہیں وہ عموماً غلطی کرتے ہیں، نواب صدیق حسن خاں کے پیش نظر بھی کشف الظنون رہی ہے، اس لیے ان سے بھی تاریخ وفات لکھنے میں بڑی غلطیاں ہوئی ہیں، ان ہی میں سے ایک یہ غلطی بھی ہے،

تاج العروس میں مادۂ ذجر کے تحت موصوف کا سال وفات ۸۳۵ھ درج ہے جو کتابت یا طباعت کی غلطی ہے،

مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے الانس الجلیل کے حوالہ سے طرب الاماثل بتراجم الافاضل (مطبع یوسفی لکھنؤ ۱۳۰۰ھ صفحہ ۲۶۰) میں لکھا ہے کہ آپ نے بقرعید کے دن انتقال فرمایا، مگر یہ تاریخ بھی صحیح نہیں ہے، ہم نے جو تاریخ اور سنہ وفات اوپر نقل کیا ہے وہی صحیح ہے، غایۃ النہایہ میں ابن الجزریؒ کے تلمیذ کی زبانی یہی منقول ہے، یہی طاش کبری زادہ اور مورخ سخاوی نے بھی سال وفات بیان کیا ہے، حافظ جلال الدین سیوطی، ابن عرب شاہ، محدث عبدالباقی زرقانی اور مولف حبیب السیر نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے،

پہنچنا ممکن نہ تھا، وہ ان لوگوں کو ہاتھ لگا کر برکت حاصل کرتے تھے جنھیں امام الجزریؒ کے جنازہ کے ہاتھ لگانے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، آپ کے انتقال سے اسلام کی بہت سی عظیم الشان یادگاریں مٹ گئیں۔[1]

وما کان قیس هلکه هلك واحد ولکنه بنیان قوم تهدما

اولاد و احفاد | پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں آپ نے یادگار چھوڑیں، سب سے بڑے ابو الفتح محمد الجزری تھے، منجھلے کا نام ابو بکر محمد الجزری تھا، ان سے چھوٹے ابو الخیر محمد الجزری تھے، یہ تینوں بڑے نامور، محدث قاری اور فقیہ تھے، ابن الجزری نے طبقات القراء میں ان کا تذکرہ لکھا ہے، دو فرزند ابو البقا اسماعیل اور ابو الفضل اسحاق بھی قاری اور محدث تھے، لڑکیوں میں فاطمہ، عائشہ اور سلمیٰ تھیں، یہ بھی جلیل القدر محدثہ اور فن قرأت کی ماہر تھیں، طاش کبری زادہ کا بیان ہے

جمیع هولاء من القراء المجودین یہ سب فن تجوید کی بہترین عالم، بہت اچھی

والمرتلین ومن الحفاظ المحدثین[2] قاری اور حافظ حدیث تھیں،

تصنیفات و تالیفات | (۱) تجوید و قرأت: اتحاف المهرة فی تتمة العشرة،[3]

(۲) اصول القرأت - یہ اصول قرأت میں ایک مختصر ہے۔[4]

(۳) اعانة المهرة فی الزیادة علی العشرة۔ یہ عشرہ کے بعد کی قرأتوں کے بیان میں ہے،[5]

(۴) الغاز - یہ فن قرأت میں ایک منظوم ہمزیہ ہے، جس میں قرأتوں کے اختلافات بطور چیستان بیان کیے گئے ہیں۔[6]

---

[1] غایة النهایة، مطبع السعادة، قاہرہ ۱۳۵۱ھ ج ۲ ص ۲۴۹ [2] مفتاح السعادة ج ۱ ص ۳۹۶

[3] مقدمۂ کتاب النشر از احمد محمد دہمان طبع دمشق و الضوء اللامع ج ۸ ص ۲۵۰ [4] ملاحظہ ہو کشف الظنون مطبوعہ استنبول ۱۹۴۱ء ج ۱ کالم نمبر ۱۱۴ [5] مقدمۂ کتاب النشر و الضوء اللامع [6] کشف الظنون ج ۱ کالم ۱۵۰

(۵) تحبیر التیسیر فی العشر - یہ علامہ دانیؒ کی مشہور کتاب التیسیر جو سبع قرأتوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد اور مقبول کتاب ہے، اس میں آپ نے تین اور قرأتوں کو اضافہ کر کے اسی کا نام تحبیر التیسیر رکھا ہے، یہ آپ کی ابتدائی تالیفات میں سے ہے،[1]

(۶) التقریب - یہ النشر کی تلخیص اور اس کا نہایت جامع مختصر ہے۔[2]

(۷) التمهید فی علم التجوید - یہ رسالہ اصول تجوید میں ہے، اسے ۷۶۹ھ میں تالیف کیا تھا۔[3]

(۸) الدرة المضیة فی قرأت الائمة الثلاثة المرضیة - یہ عشرہ میں شاطبیہ کا منظوم تکملہ ہے، جو ۲۴۱ اشعار پر مشتمل ہے، اس کا وزن اور قافیہ بھی وہی ہے، جو شاطبیہ کا ہے، جمادی الآخر ۸۲۳ھ میں مکمل ہوا، ابن الجزریؒ کے بعض تلامذہ اور بعض علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں، یہ مجموعہ قرأت کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہو گیا ہے۔

(۹) شرح طیبة النشر - یہ عشرہ میں ایک منظوم کتاب طیبة النشر پر حواشی اور اس کی مختصر شرح ہے۔[4]

(۱۰) شرح النشر - یہ النشر پر حواشی اور اس کی شرح کے متعلق مقامات کی توضیح اور شرح ہے۔[5]

(۱۱) طیبة النشر - نظم میں قرأت عشرہ کا بیان ہے، شعبان ۷۹۹ھ مطابق ۱۳۹۶ء میں یہ نظم لکھی تھی، جو ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہے اور قاہرہ سے پہلی مرتبہ ۱۲۸۲ھ اور پھر ۱۳۰۷ھ میں شائع ہو چکی ہے،

(۱۲) العقد الثمین - یہ الغاز کی غیر منظوم شرح ہے، اس کی ایک شرح سراج الدین ابو حفص عمر بن قاسم انصاری نے بھی کی تھی جس کا نام العقد الجوہری فی حل الغاز الجوہری رکھا تھا،[6]

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام [2] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۹۵۲ [3] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

[4] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۰۳۲ [5] ایضاً ۱۳۲۱ [6] ایضاً ۱۱۵۰

(۱۳) غایۃ المہرہ فی الزیادۃ علی العشرہ۔ یہ کتاب عشرہ اور اثنا عشر قرأتوں کے بیان میں ہے۔[1]

(۱۴) القرأت الشاذہ۔ یہ شاطبیہ کے انداز پر شاذ قرأتوں کے بیان میں ایک منظوم رسالہ ہے اور رمضان ۷۹۰ھ کی تالیف ہے۔[2]

(۱۵) المقدمۃ الجزریہ۔ یہ فن تجوید میں ایک منظوم رسالہ ہے جو ایک سو دس شعروں پر مشتمل ہے، مصر اور تبریز میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

تلاوت سے قبل قرآن پڑھنے والے پر جن باتوں کا جاننا ضروری ہے، ان ہی باتوں کو اس رسالہ میں بیان کیا ہے، آپ کے فرزند ابوبکر احمد الجزری نے اس کی شرح لکھی تھی جس کا نام الحواشی المفہمہ بشرح المقدمہ رکھا تھا، بعد میں علماء نے اس کی بکثرت شرحیں لکھیں اور مختلف زبانوں میں لکھی ہیں، ۲۲ شرحوں کا تذکرہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں کیا ہے، ملا قاری کی شرح المنح الفکریہ بہت مشہور ہے اور مصر سے شائع ہو گئی ہے، اردو زبان میں قاری محمود اور محمد ادریس نے بھی اچھی شرح لکھی ہے، جو ۱۳۵۳ھ میں برقی پریس دہلی سے شائع ہو گئی ہے۔

(۱۶) منجد المقرئین ومرشد الطالبین۔ یہ کتاب سات ابواب پر منقسم ہے، حاجی خلیفہ کا بیان ہے کہ نہایت مفید کتاب ہے، شیخ محمد زاہد کوثری لکھتے ہیں۔

اس میں موصوف نے حافظ ابوشامہ کی کتاب المرشد الوجیز فی علوم القرآن العزیز کا رد کیا ہے، اس کتاب کے باب رواۃ العشر میں ثابت کیا ہے کہ قرأت عشر کا ثبوت بھی متواتر ہے، اور یہ سلسلہ طبقہ بعد طبقہ برابر قائم ہے، اس کے راوی ہر زمانہ میں نہایت کثیر رہے ہیں، محدث شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اس کتاب کا مطالعہ کیے بغیر ابن الجزری سے اس کے غیر متواتر ہونے کا قول نقل کیا ہے، اور سبعہ قرأت کی تنقیص کی ہے اور عشر

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [2] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۳۲۳

کا تو ذکر ہی کیا ہے۔"[1]

(۱۷) النشر فی القرأت العشر۔ یہ عشرہ قرأتوں میں نہایت مشہور اور بڑی مقبول کتاب ہے، فن قرأت کی امہات الکتب میں اس کا شمار ہے، یہ کتاب صرف نو مہینہ کی قلیل مدت میں لکھی تھی، صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہے،

الجامع لجمیع طرق العشرۃ لم	یہ کتاب قرأت عشر کے تمام طریقوں کی
یسبق الی مثلہ[2]	جامع ہے، اس جیسی کتاب نہیں لکھی گئی ہے،

[1] التعلیقات علی ذیل طبقات الحفاظ للذہبی، از شیخ محمد زاہد کوثری، اس کے خطی نسخوں کے لیے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ائمہ فن قرأت نے صحت قرأت کے لیے ارکان ثلاثہ ضروری قرار دیے ہیں، ابن الجزری النشر میں رقمطراز ہیں کہ

(۱) ہر وہ قرأت جو اصول عربیت کے مطابق ہو اگرچہ کسی ایک ہی طریقہ سے ہو، (۲) مصاحف عثمانیہ میں سے کسی ایک مصحف کے ضرور مطابق ہو، خواہ وہ مطابقت احتمالی ہو۔ (۳) سند صحیح سے ثابت ہو۔

اس کو صحیح قرأت کہا جاتا ہے، اس کا رد جائز اور انکار روا نہیں ہے، یہ احرف سبعہ میں سے ہے جن کے مطابق قرآن پاک کا نزول ہوا ہے، لہذا اس کا قبول کرنا لوگوں پر واجب اور فرض ہے، خواہ یہ ائمہ سبعہ سے منقول ہو یا عشرہ سے یا ان کے علاوہ دیگر ائمہ قرأت سے مگر جب ان ارکان ثلاثہ میں سے کوئی رکن مختل ہو جاتا ہے، تو پھر اس قرأت پر ضعیف یا شاذ یا باطل کا اطلاق ہوتا ہے، خواہ وہ ائمہ سبعہ میں سے منقول ہو یا ان سے بھی بڑے بڑے ائمہ سے، یہی بات محققین سلف وخلف کے نزدیک صحیح اور معتبر ہے، چنانچہ علامہ دانی، مہدوی اور ابوشامہ نے اس امر کی تصریح کی ہے،

[2] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۹۵۲

محمد احمد دہمان کے مقدمہ اور تصحیح کے ساتھ مطبعۃ التوفیق دمشق سے دو جلدوں میں پہلی بار ۱۳۴۵ھ میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔[1]

(۱۸) نظم الہدایہ فی تتمۃ العشرہ۔ اس کا نام بھی الدرۃ ہے، اس کو اٹھارہ سال کی عمر میں نظم کیا تھا، اسی زمانہ میں اتنی مقبول ہوئی کہ آپکے بعض اساتذہ نے اس کو زبانی یاد کیا تھا۔[2]

(۱۹) کفایۃ الالمعی فی آیۃ یا ارض ابلعی۔ یہ آیت شریفہ یا ارض ابلعی کی تفسیر اور اسکے وجوہ اعجاز کے بیان میں ہے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ ابن الجزری نے آغاز کتاب میں لکھا ہے۔

"ایک مجلس میں اعجاز قرآن کی بحث آئی اور یہ ذکر ہوا کہ علامہ سکاکی نے اس آیت پاک کے وجوہ اعجاز کو خوب لکھا ہے، چنانچہ میں نے اس آیت پاک کے ان وجوہ اعجاز کو لکھا (جن کو علامہ سکاکی نے بھی بیان نہیں کیا تھا) اور اس کو لکھکر سلطان رضا کیا ابن سید علی کیا الحسینی العلوی کی خدمت میں پیش کیا۔"[2]

(۲۰) حدیث: الاجلال والتعظیم فی مقام ابراہیم: اس میں مقام ابراہیمؑ کے فضائل مذکور ہیں،[3]

الاربعین: اس میں چالیس نہایت مختصر اور جامع حدیثیں جمع کی ہیں، اس کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

اختار فیہ ما ہو اصح و افصح و اوجز[4]	اس میں ایسی حدیثوں کا انتخاب کیا ہے جو سب سے زیادہ صحیح سب سے زیادہ فصیح اور سب سے زیادہ مختصر ہیں۔

---

[1] مقدمہ کتاب النشر از محمد احمد دہمان طبع دمشق ۱۳۴۵ھ و الضوء اللامع [2] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۴۹۷ نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [3] ایضاح المکنون میں اس کا نام الاجلال و التعظیم مذکور ہے، بظاہر الاجلال ہی صحیح معلوم ہوتا ہے [4] کشف الظنون ج ۱ کالم ۵۳،

(۲۱) الاولویۃ فی الاحادیث الاولیہ: اس رسالہ میں اولیات کو بیان کیا ہے[1]

(۲۲) التوضیح فی شرح المصابیح: یہ محدث حسین بن مسعود الفراء البغوی کی مشہور کتاب مصابیح السنۃ کی تین جلدوں میں نہایت مبسوط شرح ہے جو ماوراء النہر میں اس وقت لکھی تھی جب تیمور آپ کو وہاں لے گیا تھا، صاحب کشف الظنون نے اس کا ذکر تصحیح المصابیح کے نام سے کیا ہے، لیکن مورخ سخاوی اور دیگر تذکرہ نگاروں نے وہی نام لکھا ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا، یہی زیادہ مناسب اور صحیح معلوم ہوتا ہے[2]

(۲۳) الحصن الحصین: یہ الحصن الحصین کا مختصر ہے[3]

(باقی)

---

[1] ایضاح المکنون ج ۱ کالم ۱۵، [2] کشف الظنون ج ۳ کالم ۱۹۹۹ [3] ایضاح ۱ کالم ۶۶۹

اسلام کا سیاسی نظام

اگرچہ اسلامی نظام حکومت کے مختلف پہلوؤں پر ادھر بہت سی کتابیں اور بکثرت مضامین لکھے گئے، لیکن جب یہ کتاب لکھی گئی تھی، اس وقت تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی، لیکن بعض وجوہ سے اس کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے، کتاب موضوع کے اعتبار سے بہت جامع، مکمل اور سیر حاصل ہے، اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے سیاسی نظام کا اساسی خاکہ پیش کیا گیا ہے، اور اس کے ایک ایک جز کی تفصیل کی گئی ہے، شروع میں مولانا عبد الماجد دریابادی کے قلم سے پیش لفظ بھی ہے،

(مؤلفہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) قیمت: صر

منیجر

ابن الجزری

جناب مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۳)

(۲۴) الحصن الحصین :- اس کتاب کا پورا نام الحصن الحصین من کلام سید المرسلین ہے، جس کے معنی سید المرسلین کے کلام سے انتخاب کیا ہوا مضبوط قلعہ ہیں، یہ نام بھی غالباً حدیث ہی سے ماخوذ ہے، ایک حدیث میں وارد ہے:

آمرکم ان تذکروا اللہ فان مثل ذلک کمثل رجل خرج العدو فی اثرہ سراعا حتی اذا اتی علی حصن حصین فاحرز نفسہ منہم کذلک العبد لا یحرز نفسہ من الشیطان الا بذکر اللہ تعالیٰ

(حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا) میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تم اللہ کا ذکر کرو، کیونکہ اس ذاکر کی مثال اس شخص کی سی ہے جسکے پیچھے دشمن دوڑتا ہوا نکلا اور اس نے ایک مضبوط قلعہ پر پہنچکر اپنے آپ کو بچالیا، اسی طرح بندہ اپنے کو بغیر ذکر الٰہی کے شیطان سے نہیں بچا سکتا ہے۔

محدث محمد الشوکانی تحفۃ الذاکرین میں رقمطراز ہیں،

لعل المصنف رحمہ اللہ اخذ تسمیۃ کتابہ (الحصن الحصین) الذی ھو اصل ھذا الکتاب من ھھنا

شاید مصنف نے اپنی کتاب الحصن الحصین کا نام جو عدۃ الحصن الحصین کی اصل ہے، حدیث کے اسی ٹکڑے سے لیا ہے،

یہ اذکار اور ادعیہ کی نہایت جامع کتاب ہے، ۲۲ ذی الحجہ ۷۹۱ھ میں سنیچر کے دن ظہر کے بعد اس

کی تکمیل سے فراغت ہوئی، اس وقت کسی غنیم نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا تھا، خلق خدا بڑی پریشان تھی، آپ نے اس نازک وقت میں اسی کتاب کو پناہ کا وسیلہ بنایا، جیسا کہ خاتمۂ کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

جمیع ابواب دمشق معلقۃ بل شیئا بالاحجار والخلائق یستغیثون علی الاسوار وفی جھاد عظیم من الحصار والمیاہ مقطوعۃ والایادی موضوعۃ وقد احرق ظواھر البلد ونھب اکثرہ وکل احد خائف علی نفسہ ومالہ واھلہ ووجل من ذنوبہ وسوء اعمالہ وقد تحصن بما یقدر علیہ فجعلت ھذا احصنی و توکلت علی اللہ تعالیٰ وھو حسبی ونعم الوکیل

(یہ کتاب اس فتنہ و فساد کے وقت ختم ہوئی) جب دمشق کے تمام دروازے بند اور پتھروں سے مستحکم تھے، مخلوق شہر پناہ پر بارگاہ الٰہی میں فریاد کر رہی تھی اور ظالموں کے محاصرہ کی وجہ سے بڑی مصیبت میں تھی، یہانتک کہ پانی تک بند کر دیا گیا تھا، لوگوں کے ہاتھ عجز و انکساری کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں اٹھے ہوئے تھے، شہر کے گرد و نواح میں آگ لگی ہوئی تھی اور اسکا بڑا حصہ لوٹ لیا گیا تھا، ہر شخص اپنی جان و مال اور اہل و عیال کے بارے میں خائف، اپنی بداعمالی اور گناہوں کی وجہ سے خوف زدہ تھا، ہر ایک نے اپنی استطاعت کے مطابق پناہ لے رکھی تھی، بس میں نے

معلوم ہوتا ہے جس ظالم نے محاصرہ کیا تھا، وہ آپ کا جانی دشمن تھا، چنانچہ اس نے مختلف تدبیروں سے آپ کو پکڑوا کر ملوانا چاہا، مگر آپ روپوش ہوگئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، اور اسی کتاب کے طفیل اس سے نجات پائی، جیسا کہ آغاز کتاب میں لکھتے ہیں:

لما اکملت ترتیبہ وتھذیبہ طلبنی عدو لا یمکن ان یدفعہ الا اللہ تعالیٰ

جب میں اس کتاب کی ترتیب اور اصلاح مکمل کر چکا تو مجھے ایک ایسے دشمن نے تلاش کیا جسکو اللہ تعالیٰ کے سوا دفع کرنے والا کوئی نہ تھا

لہ اس بیان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں آپ عوام میں اپنی ہر دلعزیزی کے باعث ارباب اقتدار کی نظروں میں کھٹکتے تھے، اسی لیے دشمن آپ کو پکڑنے کی فکر میں تھا۔

فهربت منه مختفيا و تحصنت بهذا[۱] الحصن فرأيت سيد المرسلين صلی اللہ علیہ وسلم وانا جالس على يساره وكانه صلی اللہ علیہ وسلم يقول ما تريد فقلت له يا رسول اللہ ادع الله لى وللمسلمين فرفع رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يديه الكريمتين وانا انظر اليهما فدعا ثم مسح بهما وجهه الكريم وكان ذلك ليلة الخميس فهرب العدو ليلة الاحد وفرج الله عنى وعن المسلمين ببركة ما فى هذا الكتاب عنه صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی دفع کرنے والا نہ تھا، میں اس سے چھپ کر بھاگ گیا اور اس (مضبوط و مستحکم) قلعہ کو اپنی حفاظت کا ذریعہ بنایا (یعنی وظیفہ کے طور پر اسے پڑھنا شروع کیا) میں نے سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ میں آپ کے بائیں جانب بیٹھا ہوں اور آپ فرما رہے ہیں تم کیا چاہتے ہو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ میرے اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا فرمائیں، میری درخواست پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لیے دست مبارک اٹھا دیے، میں آپ کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا، پھر آپ نے دعا فرمائی اور اسے روئے مبارک پر ہاتھ پھیرا، جمعرات کو میں نے یہ خواب دیکھا، اتوار کی رات میں دشمن بھاگ گیا، اور ان احادیث نبویہ کی برکت سے جو اس کتاب میں جمع کی ہیں اللہ تعالیٰ نے میری اور تمام مسلمانوں کی مصیبت دور فرمائی۔

یہ قطعہ بہت مشہور ہے:

ان نابك الامر المهو ل اذكر الله العالمينا

اگر کسی مصیبت کا سامنا ہو تو خدا کو یاد کرو،

واذا بغى باغ عليك فلا دنك الحصن الحصينا

اور جب کوئی باغی تم پر ظلم کرے تو اس مضبوط قلعہ کو جائے پناہ قرار دو،

حاجی خلیفہ کا بیان ہے کہ یہ دشمن امیر تیمور تھا جس نے آپ کو طلب کیا تھا، اور آپ بھاگ کر روپوش ہو گئے تھے، پھر حضورؐ کی دعا کے طفیل آپ کو اور اہل دمشق کو نجات ملی، چنانچہ کشف الظنون میں لکھتے ہیں:-

ولما اكمل ترتيبه طلبه عدو وهو تيمور فهرب منه مختفيا و تحصن بهذا الحصن فرأى سيد المرسلين صلے اللہ علیہ وسلم جالسا على يمينه[۱]

جب آپ اس کتاب کو مکمل اور مرتب کر چکے تو آپ کے دشمن نے آپ کو طلب کیا جو تیمور تھا، آپ اس سے بھاگ کر چھپ گئے، اور اس کتاب الحصن الحصین کو پناہ کا وسیلہ بنایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں اپنی دائیں جانب تشریف فرما دیکھا،

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی کا بھی یہی خیال ہے، چنانچہ موصوف الحصن الحصین کے خاتمہ پر قمطراز ہیں،

كان تصنيفه الحصن فى وقعة تيمور لنك وهو المراد بالعدو المذكور فى ديباجته كما يفهم من عجائب المقدور فى اخبار تيمور[۲]

آپ کی تالیف الحصن الحصین تیمور لنگ کے فتنہ کے زمانہ کی ہے اور لفظ عدو سے جو مولف کے دیباچہ کتاب میں مذکور ہے، تیمور مراد ہے جیسا کہ عجائب المقدور فی اخبار تیمور سے بھی سمجھا جاتا ہے،

ہمارے خیال میں تیمور کو عدو قرار دینا محل نظر ہے، کیونکہ ۷۹۱ھ میں تیمور کا دمشق یا اطراف دمشق کا محاصرہ تاریخ سے ثابت نہیں، اس زمانہ میں تیمور فارس کے اطراف میں تھا،[۳] ابن عربشاہ نے دمشق کی تباہی کا جو واقعہ عجائب المقدور فی اخبار تیمور میں تاریخ ابن شحنہ سے نقل کیا ہے، اور مذکورۂ بالا عبارت میں غالباً اسی کی طرف مولانا عبد الحئی کا بھی اشارہ ہے، وہ بعد کا واقعہ ہے، اس لیے حسب

---

[۱] اسی عبارت کا ترجمہ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اتحاف النبلاء[۲] پر کیا ہے۔ [۲] الحصن الحصین المحشی مطبع یوسفی لکھنؤ ۱۳۲۰ھ ص ۲۵۱۔ [۳] ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (تیمور) اور عجائب المقدور فی اخبار تیمور، از ابن عربشاہ طبع کلکتہ

شخص نے دمشق کا محاصرہ کیا تھا، دراصل وہی عدو (غنیم) کا مصداق ہو سکتا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ دمشق ۷۹۱ھ میں سخت خانہ جنگی اور طوائف الملکی کے دور سے گذر رہا تھا، شہر سے باہر الملک الظاہر برقوق اور امیر تمر بغا افضل جو منطاش کے نام سے مشہور ہے، باہم نبرد آزما تھے، منطاش نے دمشق کا محاصرہ کر لیا تھا، اور گرد و نواح میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس معرکہ میں میدان برقوق کے ہاتھ رہا تھا، اسلیے وہ عدو تیمور نہیں بلکہ منطاش تھا[1]،

یہ ادعیہ اور اذکار کی کتاب : ابن الجزریؒ نے حدیث کی چھبیس مستند اور صحیح کتابوں سے انتخاب کر کے تالیف کی ہے، اور ہر ماخذ کا بطور علامت مختصر بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا ہے،

کتاب میں صحت کا بڑا خیال رکھا ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں :-

اخرجته من الاحادیث الصحیحة — میں نے صحیح حدیثوں سے اس کتاب کو مرتب کیا ہے،

یہ انتخاب ایسا جامع ہے کہ کوئی صحیح حدیث چھوٹنے نہیں پائی ہے، جیسا کہ خود مرتب کا بیان ہے:

مع اقتصاره واختصاره لعله لا — باوجودیکہ یہ کتاب چھوٹی اور مختصر ہے، مگر
حدیثا صحیحا فی بابه الا استحضره — اپنے باب کی کوئی صحیح حدیث چھوٹنے
واتی به — نہیں پائی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کو اس کتاب میں اس جامعیت سے یکجا کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر بڑی سے بڑی کتاب میں بھی مفقود ہے،

قد جمع بحمد الله تعالى هذا المختصر — الحمد للہ یہ مختصر مجموعہ ان تمام حدیثوں کا جامع ہے
اللطیف ما لم تجمعه مجلدات من التالیف — جس سے بڑی بڑی تالیفات بھی خالی ہیں،

---

[1] ملاحظہ ہو النجوم الزاہرہ طبع دار المعارف المصریہ ج ۱۱ ص ۲۵۵ (حوادث ۷۹۱ھ) نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (برقوق) اور

The Mameluke or Slave Dynasty of Egypt by W. Muir. London 1896 P. 111

یہ کتاب کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا بولتا ہوا مرقع ہے،

ان دعاؤں میں نبوت کا نور، پیغمبر کا یقین اور عبد کامل کی نیازمندی اور اطاعت ہے، ان کا فقرہ فقرہ دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لیے کافی ہے، ان میں درد بھی ہے اور دوا بھی، انسان کی درماندگی کا اظہار بھی ہے، اور خدا کی عظمت اور جبروت کا اعتراف بھی، سادگی اور خلوص بھی ہے، قبولیت اور تاثیر بھی، دل کی تڑپ بھی ہے اور سکون قلب بھی، اختصار بھی ہے اور جامعیت بھی، اس میں ان تمام چیزوں کا ذکر ہے جن کی انسان کو مہد سے لحد تک ضرورت پیش آتی ہے، دنیا اور آخرت کی ہر ضرورت کا تذکرہ ہے، یہ پیغمبروں کی صداؤں کا مجموعہ ہے، جو بھی یہ صدا لگاتا ہے اس کی صدا خالی نہیں جاتی۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کی زبانیں ان صداؤں سے تر رہتی ہیں،

اس کتاب کی تمام دعائیں ایک مسلمان کو یاد ہونی چاہئیں، اگر سب نہ ہو سکیں تو کم از کم وہ دعائیں تو ضرور یاد ہونی چاہئیں جو کسی وقت اور سبب کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، اور کتاب کے آخر میں درج ہیں،

ہندوستان کے سرخیل جماعت اہل حدیث نواب صدیق حسن خاں قنوجی اس کی صحت اور قبولیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"این کتاب جامع اوراد و ادعیہ و اذکار در ہر باب است و ورودے ذکر کردہ کہ اخراج او را از احادیث صحیح نمودہ است"[1]

آگے رقمطراز ہیں :

"این کتاب از روز تالیف تا این دم شرقاً و غرباً در ورد اہل علم و فضل است

---

[1] اتحاف النبلاء، ص ۶۷

"وتاثیر دے برہمگنان ظاہر"

ان ادعیہ کی صحت اور صداقت آج بھی عالم آشکارا ہے، محدث شوکانی نے "تحفۃ الذاکرین" میں اس قسم کے متعدد واقعات لکھے ہیں، جس سے اس کی صداقت اور صحت میں کوئی شبہہ نہیں رہتا،

نامور محدثین کا اس کتاب کی شرحیں لکھنا بھی اس کی صحت اور قبولیت کی نہایت واضح دلیل ہے، ان شارحین میں اہل دل بھی ہیں اور زاہدانِ خشک بھی، ان شروح میں ملا علی قاری کی شرح الحرز الثمین بہت مشہور ہے، جو مکہ معظمہ سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی ہے، ہندوستان میں اس کی متعدد شرحیں فارسی زبان میں لکھی گئیں، اور اردو زبان میں سب سے پہلے نواب قطب الدین خاں دہلوی[1] نے نہایت جامع شرح لکھی ہے، جو ظفر جلیل کے نام سے مشہور ہے، یہ نام حکیم خیر اللہ مرحوم کا تجویز کردہ ہے، جو خیر کے باعث دائم و قائم ہے، اس میں شارح نے

[1] محمد قطب الدین بن محمد محی الدین احراری نام تھا، ۱۲۱۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تحصیل دہلی کے ارباب کمال سے کی، حدیث شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے پڑھی، اور دہلی ہی میں تمام عمر حدیث کا درس دیتے رہے، ۱۲۸۹ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، بہت سے رسالے اردو زبان میں رفاہ عام کے لیے لکھے، بعض اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے بھی کیے، جن میں مظاہر حق اور ظفر جلیل بہت مشہور ہیں، مزید حالات کے لیے ملاحظہ ہو: آثار الصنادید مؤلفہ سر سید احمد مطبع نولکشور ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ باب چہارم ص ۶۰، سیر المحتشم از نواب محمد غوث خاں والی جاورہ، مطبع سرکاری ریاست جاورہ ۱۸۵۵ء ص ۶۲۵، حدائق الحنفیہ تالیف فقیر محمد جہلمی مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۰۶ء ص ۴۸۸، تذکرہ علمائے ہند مؤلفہ رحمان علی طبع نولکشور ۱۹۱۴ء ص ۱۶۹، الحیات بعد الممات از فضل حسین مطبع اکبری آگرہ ۱۳۳۲ھ ص ۱۸۱ و ۴۷، ۷۴ تا ۷۶، ارواح ثلاثہ، مرتبہ ظہور الحسن یونین پریس دہلی ۱۳۷۰ھ ص ۳۶۸، بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ ص ۸۵

ہر دعا کا سلیس اور مطلب خیز ترجمہ کیا اور جا بجا مفید اور ضروری قواعد کا اضافہ کیا ہے، شرح مکمل کرنے کے بعد حرفاً حرفاً شاہ محمد اسحاق کو سنائی اور انھوں نے بہت پسند فرمائی،

ظفر جلیل کی زبان نہایت قدیم ہے، اور انداز بیان میں بھی کوئی جاذبیت نہیں، مگر اس میں بڑی سادگی اور خلوص ہے، اور یہی اس کی قبولیت کی بڑی دلیل ہے،

یہ کتاب سب سے پہلے ۵ رجمادی الاخری ۱۲۵۸ھ میں مولوی محمد حسین کے زیر اہتمام بڑی تقطیع پر مطبع دہلی اخبار سے شائع ہوئی ہے، میرے والد محمد عبد الرحیم خاطر قدس سرہ العزیز کے کتب خانہ میں یہی نسخہ تھا، جو الحمد للہ احقر کے پاس ہے، اس نسخہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں فوائد کو حواشی کتاب میں درج کیا ہے، اور خاتمۃ الکتاب پر باب الرقاق کا اضافہ کیا جو مشکوٰۃ سے منقول ہے اور کم و بیش سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ نسخے سال ڈیڑھ سال میں بک گئے، اور شائقین کی طلب باقی رہی تو مصطفیٰ خاں المتوفی ۱۲۶۹ھ نے اپنے مطبع مصطفائی لکھنؤ سے ۱۲۶۰ھ میں نہایت آب و تاب سے شائع کیا، مگر اس سے باب الرقاق خارج کر دیا، یہ نسخے بھی دو تین برس میں فروخت ہو گئے، تو عبد الرحمن بن محمد صالح نے ۱۲۶۴ھ میں اس نسخہ کی نقل اپنے مطبع رحمانی بمبئی سے شائع کی، پھر ۱۲۸۸ھ میں مطبع بدر الدجیٰ اور ۱۳۱۰ھ میں مطبع افتخار دہلی سے شائع ہوئی،

ظفر جلیل کی زبان پرانی تھی، مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے اس کی زبان بدل کر اس کو از سر نو زندگی بخشی اور اس کا نام ظفر جلیل رکھا، اور تاریخی نام خیر متین تجویز کیا اور یہی نام کتاب پر چھپا اور مشہور ہوا،

حصن حصین کا ایک ترجمہ ظہیر الیقین، شاہ ظہیر احمد ظہیری سہسوانی کے نام سے لاہور سے شائع ہوا ہے، یہ ترجمہ بامحاورہ، رواں اور چست ہے، مگر ترجمہ ہی ترجمہ ہے، تشریحی فوائد سے یکسر خالی ہے، اس کے علاوہ اردو میں حصن حصین کا انتخاب بھی کہف المتین کے نام سے شائع ہو چکا ہے، عدۃ الحصن الحصین یہ بھی الحصن الحصین کا مختصر ہے، نواب صدیق حسن خاں قنوجی کے ایما سے مولوی عبد المجید دہلوی کے

زیر اہتمام ۱۳۰۶ھ میں پہلی بار مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے

یہ الحصن الحصین کی بڑی اچھی تلخیص ہے، ابن الجزریؒ نے یہ احباب کے اصرار سے لکھی تھی، آغاز کتاب میں لکھتے ہیں:

حدانی علی اختصارہ فی ھذہ	مجھے ان اوراق میں حصن حصین کی تلخیص
الاوراق من اصلہ المذکور	پر ایک ایسے شخص کے برسہا برس کے
بعد ان کنت سئلت عن ذالک	اصرار نے آمادہ کیا، جس نے میری
مراراً فی سنین وشھور ممن	بے چینی کو دور کیا، اور میری غربت
آنس غربتی وکشف کربتی	کو موانست بخشی، حق تعالیٰ نے مجھ پر
فاوجب الحق علی مکافاتہ	اس کا بدلہ ضروری قرار دیا، میں بدلہ
ولم اقدر علیھا الا بالدعا	میں بجز دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتا،
فاسأل اللہ تعالیٰ نصرہ	لہذا بارگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوں
ومعافاتہ	کہ خدایا اس کی مدد اور نصرت فرما،
ملیک علی الدنیا بطلعۃ وجھہ	وہ اپنے رخ روشن سے دنیا کا بادشاہ ہے،
جمال واجلال وعز مؤبد	اس میں جلال بھی ہے، جمال بھی، اور عزت
فتی ما سمعنا قبلہ کان مثلہ	اور شوکت بھی، وہ ایسا جوان ہے کہ
ولا بعدہ واللہ یبقیہ مؤجلا	جس کے جیسا جوان نہ اس سے پہلے سنا
	اور نہ دیکھا اور نہ آگے دیکھ سکتے اور
	سن سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس نور کو
	دائم اور قائم رکھے،

یہ کتاب دس بابوں پر مشتمل ہے، متوسط تقطیع کے ۴۴ صفحات پر محیط ہے

ابن الجزریؒ کا یہ مختصر بھی بہت مقبول ہوا، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے،

"۸۲۷ھ میں ہرات میں سید اصیل الدین عبد اللہ بن عبد الرحمن الحسینی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا اور بعض اہم امور کا اضافہ بھی کیا جو پانچ فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے"[1]

متاخرین علما میں محدث محمد بن علی شوکانی نے اس کی نہایت جامع اور مفید شرح لکھی ہے، جس کا نام تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین ہے، یہ شرح محدثانہ رنگ میں منفرد اور بہت سے فوائد کی جامع ہے، محمد بن محمد زبارہ کی تعلیقات کے ساتھ مصر سے دو مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔

(۲۵) مفتاح الحصن الحصین: یہ الحصن الحصین کی نہایت مفید اور مختصر شرح ہے، جس میں ابن الجزریؒ نے مشکل الفاظ کی تشریح اور مغلقات کی توضیح کی ہے، یہ الحصن الحصین کی تالیف کے چالیس سال بعد شیراز میں تالیف کی اور رمضان ۸۳۱ھ میں اس کی تکمیل سے فراغت پائی، وہ وعدہ جو الحصن الحصین کے دیباچہ میں کیا تھا اب پورا کیا،[2]

(۲۶) عقد اللآلی فی الاحادیث المسلسلۃ العوالی: اس میں دینی مسلسلات کو بیان کیا ہے، ش ۸۰۵ھ میں شیراز میں تالیف کی تھی،[3]

(۲۷) غایۃ المنی فی زیارۃ منی: اس میں منی کے فضائل مذکور ہیں،[4]

(۲۸) فضل حرا: یہ غار حرا کے فضائل میں ہے،[5]

---

[1] کشف الظنون، جلد ۱ کالم ۶۷۰ [2] ایضاً جلد ۱ کالم ۶۶۹ [3] انسائیکلو پیڈیا آف اسلام [4] الضوء اللامع [5] ایضاً

(۲۹) اصول حدیث۔ البدایہ فی علوم الروایہ: یہ کتاب علوم حدیث اور اصول حدیث میں ہے۔[1]

(۳۰-۳۱) تذکرۃ العلماء: یہ کتاب بھی اصول حدیث میں ہے، اور التوضیح فی شرح المصابیح کا مقدمہ ہے، جب آپ کا تیمور کے ساتھ کش میں قیام ہوا تھا، اس وقت آپنے مصابیح کی شرح توضیح کے نام سے لکھی، اس میں جب مصطلحات فن کا ذکر آیا، اور رومیوں کو اس کے سمجھنے میں کچھ دقت ہوئی تو انھوں نے مصطلحات فن پر جداگانہ کتاب لکھنے کی درخواست کی، اس سے پیشتر آپ الھدایہ الی معالم الروایہ لکھ چکے تھے، مگر وہ منظوم تھی، اور اس میں ایجاز تھا، رومیوں کی درخواست پر آپ نے مصطلحات حدیث پر ایک جداگانہ رسالہ لکھا، اور اس میں حدیث کے مصطلحات اور اصول حدیث کو نہایت تفصیل سے ذکر کیا، جو طریقہ ابن الاثیر الجزری نے جامع الاصول کے مقدمہ میں اختیار کیا، وہی طریقہ آپنے بھی اس میں اختیار کیا ہے، یہ ۸۰۶ھ کی تالیف ہے، چونکہ یہ التوضیح کا مقدمہ ہے، اسلیے المقدمہ فی علم الحدیث کے نام سے بھی مشہور ہے، آپ کے فرزند ابو بکر احمد الجزریؒ نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔[2]

(۳۲) الھدایہ الی علوم الدرایہ[3]۔ یہ اصول حدیث میں ایک منظوم رسالہ ہے جو (۴۱۰) شعروں پر مشتمل ہے، شیخ تقی الدین حسین بن علی بن عبد الرحمٰن الحصنی نے ۹۵۹ھ میں العنایہ کے نام سے اس کی ایک مبسوط شرح بھی لکھی ہے۔

---

[1] المصعد الاحمد فی ختم مسند احمد ص ۳۵ [2] کشف الظنون ج ۱ کالم ۳۸۹، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [3] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اس کا نام الھدایہ علم معالم الروایہ لکھا ہے، مگر صاحب کشف الظنون نے اس کا نام الھدایہ الی علوم الدرایہ ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو کشف الظنون ج ۲ کالم ۲۰۲۸

فقہ: (۳۳) الابانہ فی العمرۃ من الجعرانہ[1] } ان دونوں رسالوں میں جعرانہ اور تنعیم سے عمرہ کے احرام باندھنے پر فقہی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔
التکریم فی العمرۃ من التنعیم }

اصول فقہ: (۳۴) شرح التحصیل - یہ امام فخر الدین رازی کی کتاب المحصول کی تلخیص التحصیل ملخصہٗ محمود بن ابی بکر الارموی المتوفی ۶۸۲ھ کی تین جلدوں میں نہایت مبسوط شرح ہے[2]

(۳۵) شرح منہاج الوصول الی علم الاصول - یہ علامہ بیضاوی کی کتاب منہاج الوصول کی شرح ہے، جو آپنے زندگی کے آخری ایام میں تالیف کی تھی، چنانچہ آغاز کتاب میں اپنے بڑھاپے اور بے بسی کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[3]

سیرت: (۳۶) التعریف بالمولد الشریف - یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور بیان ولادت میں ہے اور ایک مقدمہ اور دو بابوں پر مشتمل ہے۔[4]

(۳۷) ذات الشفا فی سیرۃ المصطفٰی ومن بعدہٗ من الخلفاء - یہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مصنف کے زمانہ تک خلفاء کے حالات میں ایک منظوم کتاب ہے، جو آپ نے سلطان بایزید عثمان کی فرمائش پر ۲۵ ذی الحجہ ۷۹۸ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۳۹۶ء میں تالیف کی تھی۔[5]

(۳۸) عرف التعریف - یہ التعریف بالمولد الشریف کا خلاصہ ہے، جس میں صرف سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے، حاجی خلیفہ کا بیان ہے،

---

[1] ایضاح المکنون فی الذیل علی کشف الظنون مؤلفہ اسمٰعیل پاشا طبع استنبول ۱۹۴۵ء ج ۱ کالم ۳ میں اسکا نام الابانہ فی العمرہ من الجوانہ درج ہے، ظاہر ہے کہ یہ طباعت کی غلطی ہے، صحیح لفظ من الجعرانہ ہے [2] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۶۱۵ [3] ایضاً کالم ۱۸۷۹ [4] ایضاً جلد ۱ کالم ۴۲۱، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسی کتاب کو غالباً المولد الکبیر کے نام سے درج کیا ہے (al-Mawlid al Kbir) [5] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۱۳۲

یہ انتہائی اختصار کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احوال اور وقائع پر حاوی ہے، ایک مقالہ اور دو مقصدوں پر مشتمل ہے، ملاحسین واعظ کاشفی نے نہایت وضاحت کے ساتھ اس کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا ہے[۱]"

(۳۸) اسنی المطالب فی مناقب علی بن ابی طالب۔ یہ حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب کے بیان میں ہے، اور مصر سے شائع ہو گئی ہے۔

(۳۹) تاریخ و رجال: تاریخ ابن الجزری۔ یہ شمس الاسلام ذہبی کا مختصر ہے، ۷۹۸ھ میں اس کی تالیف سے فراغت پائی تھی، حاجی خلیفہ نے تصریح کی ہے۔

"ہو غیر الطبقات۔ یہ کتاب طبقات القراء کے علاوہ ہے[۲]"

(۴۰) غایۃ النہایہ فی القراء۔ اس کا پورا نام غایۃ النہایہ فی اسماء رجال القرأت اولی الروایۃ والدرایۃ ہے، اس کی ترتیب حروف معجم پر ہے، اور طبقات الصغریٰ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، یہ دراصل نہایۃ الدرایات کا مختصر ہے، جو موصوف نے ۷۹۵ھ میں کیا تھا، مستشرق برجستراز (Bergstraesser) نے مطبعۃ السعادۃ قاہرہ سے ۱۳۵۱ھ/۱۹۳۲ء میں اس کو دو ضخیم جلدوں میں شائع کیا[۳]، غایۃ النہایہ کا اختصار مولف کے تلمیذ عبد الرزاق بن حمزۃ الحنفی الطرابلسی نے بھی کیا تھا، جس کا نام نہایۃ الغایۃ فی بعض اسماء رجال القرأت اولی الروایۃ والدرایہ رکھا تھا، اس کو ۸۵۰ھ کے اوائل میں شروع کیا، اور ۱۲ رجب سنہ مذکور کو مکمل کیا، اس کا ایک مخطوطہ دار الکتب المصریہ میں موجود ہے[۴]۔

(۴۱) نہایۃ الدرایات فی اسماء رجال القرأت۔ یہ کتاب طبقات الکبریٰ کے نام سے بھی

---

[۱] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۱۳۲ [۲] ایضاً کالم ۲۹۵، ۲۷۷ [۳] فہرس الکتب العربیہ لدار الکتب المصریہ طبع قاہرہ ۱۹۴۲ء ج ۵ ملحق ثانی علم التاریخ ص ۲۷۱

مشہور ہے، اس علامہ دانی اور شمس الدین ذہبی کی کتابوں کو جو اسی موضوع پر تھیں یکجا ہی نہیں کیا[۱] بلکہ اپنی بیش بہا معلومات کا جابجا اضافہ کیا ہے، اور بہت سے لوگوں کا مستقل تذکرہ بھی لکھا ہے، مورخ سخاوی کا بیان ہے:

اخذ ابن الجزری کتاب للذہبی وضم الیہ زیادات کثیرۃ فی التراجم وتراجم مستقلۃ وکتبت علیہ ذیلاً حافلاً[۲]	ابن الجزری نے ذہبی کی کتاب کو اصل قرار دیکر اس کے تراجم رجال میں بیش بہا معلومات کا اضافہ کیا اور بہت سے لوگوں کا مستقل اور جداگانہ تذکرہ بھی لکھا ہے، اور میں نے اس پر ایک نہایت جامع ذیل لکھا ہے۔

طاش کبری زادہ کا بیان ہے۔

لا اجمع ولا انفع من طبقات الشیخ الجزری[۳]	طبقات القراء میں ابن الجزری کی طبقات القراء سے زیادہ نافع اور جامع کوئی کتاب نہیں ہے،

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

ھو اجمع الکتب فی ھذا النوع[۴]	اس موضوع پر یہ کتاب سب کتابوں سے زیادہ جامع ہے

(۴۲) المسند الاحمد فیما یتعلق بمسند احمد۔ اس میں مسند احمد کی اہمیت اور دخول مسند فی مسند سے بحث کی ہے[۵]،

(۴۳) المصعد الاحمد فی ختم مسند۔ ربیع الاول ۸۲۵ھ میں مسجد الحرام کے اندر جب مسند احمد ختم کرائی تھی، اس وقت یہ رسالہ سپرد قلم کیا تھا، یہ متوسط تقطیع کے ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، احمد محمد شاکر نے مسند احمد کی پہلی جلد کیساتھ دار المعارف المصریہ سے چھپوا کر شائع کر دیا ہے، اس میں اپنی سند کو بیان کیا ہے، اور جن شیوخ کا نام آیا ہے ان کے حالات اور تحصیل سند کی کیفیت وغیرہ

---

[۱] الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ مولفہ سخاوی مطبعۃ الترقی دمشق ۱۳۴۹ھ ص ۱۰۲ [۲] مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۲۳۳ [۳] کشف الظنون ج ۲ کالم ۱۱۰۵ [۴] المصعد الاحمد ص ۱۳ و ایضاح المکنون ج ۲ کالم ۴۸۱

امام احمدؒ کا مختصر اور جامع تذکرہ ہے۔

(۴۴) المقصد الاحمد فی رجال مسند احمد - یہ کتاب رواۃ مسند کی جرح و تعدیل اور اس کے رجال کے حالات میں ہے، ابن الجزریؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر یہ نہایت مبسوط کتاب تھی، اس کا کچھ حصہ کسی فتنہ میں ضائع ہو گیا تھا جس کو دوبارہ مختصر لکھکر کتاب کے ساتھ شامل کر دیا، اس میں ان رواۃ کا اضافہ ہے جو آپ کے شیخ ابوبکر ابن المحب سے چھوٹ گئے تھے[1]۔

(۴۵) ھدایۃ المھرۃ فی ذکر الائمۃ العشرۃ المشتھرۃ - یہ ائمہ قرأت عشرہ کے حالات میں ہے[2]۔

معانی و بیان (۴۶) حاشیۃ الایضاح - یہ علامہ جلال الدین محمد بن عبدالرحمن القزوینی المتوفی ۷۳۹ھ کی تالیف الایضاح فی المعانی والبیان پر آپ کا حاشیہ ہے[3]،

نحو (۴۶) الجواھرۃ العلیہ فی علم العربیہ - یہ علم نحو میں ہے[4]،

پند و موعظت (۴۷) الزھر الفائح فی ذکر من تنزہ من الذنوب والقبائح - یہ کتاب متوسط تقطیع کے ۲۴ صفحات پر مشتمل ہے اور مصر سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے،

(۴۸) مختار النصیحہ بالادلۃ الصحیحہ - اس میں احادیث کی روشنی میں اخلاقی امور پر بحث کی گئی ہے[5]،

(۴۹) الاصابہ فی لوازم الخطابہ - یہ کتاب فن خطابت پر ہے[6]،

---

[1] المصعد الاحمد ص ۴ [2] کشف الظنون ج ۲ کالم ۲۰۴۲ [3] ایضاً ج ۱ کالم ۲۱۱

[4] الضوء اللامع اور البدر الطالع

[5] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام [6] ایضاً

علامہ محمد طاہر پٹنیؒ

اور

ان کی کتاب مجمع بحار الانوار

(ایک علمی و تحقیقی جائزہ)

(مجلہ فکر و نظر، 2005ء)

Fikr-o-Nasar (Islamabad) 42,43:4,1 (2005)

فکرونظر............ اسلام آباد   جلد: ۴۲، ۴۳   شمارہ: ۴، ۱

علامہ محمد طاہر پٹنی اور اُن کی کتاب مجمع بحارالانوار

(ایک علمی و تحقیقی جائزہ)

ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی ☆

بر صغیر پاک و ہند میں عربی و دینی ثقافت

(حدیث و علوم حدیث کے حوالے سے ایک مطالعہ)

برِ صغیر پاک وہند کو دوسری صدی ہجری سے عربی، دینی و علمی ثقافت کو عام کرنے اور پروان چڑھانے کی سعادت حاصل ہے۔ چنانچہ نامور محدّثِ بصرہ **ربیع بن الصّبیح السعدی ثم السّندی المتوفی ۱۶۰ھ** کا شمار ان سابقین اولین میں کیا جاتا ہے، جنھوں نے سب سے پہلے حدیث میں کتاب تالیف کی۔[۱]

پاک سرزمین سندھ میں عربی ثقافت کو ایسا قبول حاصل ہوا کہ سندھی زبان کے ساتھ عربی زبان بھی یہاں کے بازاروں میں بولی جاتی تھی۔

نامور سیاح ابو عبداللہ احمد المقدسی المعروف بالبشّاری (۳۳۶ھ ۳۸۰ھ=۹۴۶ء۔۹۹۰ء) "**احسن التقاسیم فی معرفة الأقالیم**" میں "**المنصورہ**" کے متعلق رقم طراز ہے:

"**کلّهم تجّار کلامهم سندی و عربی**"[۲]

یہاں سب تاجر ہیں اور ان کی گفتگو سندھی اور عربی میں ہوتی ہے۔

عربی زبان کی مشہور کتاب "**تاج اللّغة و صحاح العربیة**" جو ابو نصر الجوہری الفاریابی المتوفی ۳۹۳ھ کی تالیف ہے۔ اس کا تکملہ جب برِصغیر پاک و ہند کے امام لُغت، حسن بن محمد صغانی لاہوری (۵۷۷ھ۔۶۵۰ھ) نے لکھا تو اس سے سندھ اور ہند ہی نہیں، سارا عالم فیضیاب ہوا، موصوف کی اس کتاب اور ان کی دوسری لغت کی کتابوں "**العباب الزاخر**" وغیرہ سے آج بھی عالمِ اسلام میں فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔

☆ نگران شعبہ تخصص فی علم الحدیث النّبوی، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی

علامہ صغانی کی "مشارق الأنوار النبويه من صحاح الأخبار المصطفويه"[۳] جو صحیحین کی قولی حدیثوں کا اختصار ہے۔ الفاظ اور عوامل پر مرتب ہے۔ اس کا ہند و بیرونِ ہند میں بہت چرچا رہا، یہاں یہ حدیث کے نصاب میں شامل تھی، حضرت نظام الدین بدایونی (۶۳۱۔۷۲۵ھ/۱۲۳۳۔۱۳۲۴ء)[۴] اور دوسرے اولیاء اللہ نے اسے پڑھا ہے۔[۵]

"مشكوٰة المصابيح" سے پہلے اسلامی دنیا میں اسی کتاب کا چلن تھا، یہی محدثینِ دوراں کی منتہاءِ نظر سمجھی جاتی تھی۔ جس کو "مشارق الأنوار" زبانی یاد ہوتی تھی، اس کو محدث سمجھا جاتا تھا۔

علامہ تاج الدین السبکی (۷۲۷۔۷۷۱ھ) نے اس نظریہ پر سخت تنقید کی اور کہا کہ کثرت سے حدیثیں یاد کرنے سے کوئی محدث نہیں بن جاتا۔ محدث کے لئے ضروری ہے کہ اسانید و مسانید اور رجالِ حدیث و عللِ حدیث پر اس کی نظر ہو۔ وفیات کا علم رکھتا ہو۔ وہ عالی و نازل سند سے واقف ہو۔ اس نے صحاح ستہ، مسندِ احمد، سنن البیہقی ومعجم الطبرانی کا سماع کیا ہو۔[۶]

"مشارق الأنوار" کے بعد افسوس کہ برِصغیر پاک و ہند میں اس موضوع پر مزید کام نہ ہوسکا، جس کا یہ اثر ہوا کہ مؤرخِ اسلام شمس الدین الذھبی المتوفی ۷۴۸ھ کو رسالہ "ذوات الآثار في الامصار" میں یہ لکھنا پڑا: "والأقاليم التي لا حديث بها يُروىٰ ولا عُرفت بذٰلک الصين أغلق الباب والهند والسند"[۷]۔

(وہ ممالک جہاں حدیث کی روایت نہیں کی جاتی اور لوگوں میں حدیث کی معرفت نہیں، چین اور ہند و سندھ نے اس کے دروازے اپنے اوپر بند کیے ہوئے ہیں)۔

ابھی ایک صدی ہی گزری تھی کہ دسویں صدی ہجری میں یہاں حدیث اور اس کی لغت پر وہ کام ہوا کہ بیرونِ برصغیر پاک وہند میں یہاں کے محدثین کا نام روشن ہوگیا، چنانچہ شیخ علاؤالدین علی المتقی الہندی المتوفی ۹۷۵ھ نے جب علامہ جلال الدین سیوطیؒ المتوفی ۹۱۱ھ کی حدیث میں مختصر و مطوّل دائرۃ المعارف "جامع الصغير و زياداته" اور "جمع الجوامع في الحديث" کو جو حدیث کی پچاس سے زیادہ کتابوں کا مجموعہ ہے،[۸] اور مسانید پر مرتب تھا۔ فقہی ابواب پر ترتیب دیا اور اس کا نام رکھا "كنز العمال في سنن الاقوال و الافعال"[۹]

اہلِ علم نے اسے دیکھا تو مکہ مکرمہ کے نامور محدث و فقیہ شیخ ابو الحسن البکری المتوفی ۹۵۲ھ نے فرمایا تھا: "ان للسّيوطيؒ منة على العالمين وللمتقيؒ منة عليه"[۱۰]

(سیوطیؒ کا عالم اسلام کے باشندوں پر احسان ہے تو علامہ سیوطیؒ پر شیخ علی متقیؒ کا احسان ہے)

شیخ علی متقیؒ کے بعد برصغیر ہند میں پہلی مرتبہ ان کے مرید علامہ محمد بن طاہر پٹنی گجراتیؒ المتوفی ۹۸۶ھ کی حدیث کی جامع عربی لغت "**مجمع بحار الأنوار**" اور دوسری تالیفات نے عالمِ اسلامی میں قرآن و سنت کی روشنی پہنچائی۔ چنانچہ حاجی خلیفہ کا (۱۰۱۷ھ۔ ۱۰۶۷ھ) "**کشف الظنون**" میں ان کی تالیفات کا تعارف کرانا اس حقیقت کا شاہدِ عدل ہے۔[۱۱]

علّامہ محمد طاہر پٹنیؒ......مختصر سوانحی خاکہ

محمد نام،[۱۲] **ملک المحدثین**،[۱۳] مجدالدین،[۱۴] اور **جمال الدین**،[۱۵] لقب ہیں نسباً صدیقی ہیں، وطن پٹن نہر والہ کاٹھیا واڑ گجرات ہے۔ سلسلۂ نسب محمد بن طاہر بن علی الصدیقی ہے۔

ولادت: ولادت ۹۱۳ھ، وفات ۹۸۶ھ ہے۔

تعلیم و تکمیلِ علوم:

ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی، بلوغ سے پہلے قرآن پاک یاد کیا، پھر پندرہ برس علماء گجرات میں استاذ الزمان ملّامہتہ شیخ ناگوریؒ، مولانا یداللہ السّوہیؒ، مولانا برھان السمھودیؒ سے علوم کی تحصیل و تکمیل کی، متعدد فنون میں کمال حاصل کیا۔[۱۶]

محدثین و فقہاء حجاز سے روایتِ حدیث کی اجازت اور شیخ علی متقیؒ سے بیعت:

جب تیس برس کے ہوئے تو علامہ پٹنیؒ نے حج و زیارت کی سعادت حاصل کی۔ حرمین شریفین کے نامور علماء و اربابِ کمال شیخ ابو الحسن محمد بن عبد الرحمٰن البکری (۸۹۹۔۹۵۲ھ) ابو العباس احمد بن محمد بن علی المعروف بابنِ حجر الہیثمی المکیؒ (۹۲۴ھ۔۹۷۲ھ) محدث شیخ ابو الحسن علی بن محمد المعروف بابن عراق (۹۰۷۔۹۶۳ھ) شیخ جار اللہ بن محمد المکی الشافعی (۸۹۱۔۹۵۴ھ) سے حدیث پڑھی، اور شیخ علی متقی (۸۸۵۔۹۷۵ھ) سے روایت حدیث کی اجازت لی اور انہی کے دستِ حق پر بیعت کی، ایک مدت تک ان کی صحبت میں رہ کر اکتسابِ فیض کیا۔[۱۷]

اپنی کتاب "**مجمع بحار الأنوار**"کو ان کے نام معنون کیا۔ چنانچہ مقدمۂ کتاب میں رقم طراز ہیں:

"میرے مرشد، شفیق و مہربان، مفاخر و معالی کے جامع، قطبِ دوراں، غوثِ زماں، رحمان کی

برگزیدہ ہستی، قیام پذیر حرمین شریفین، مجاورِ بیت اللہ، خلقِ خدا کے مربی، متقیوں کے رہنما، ان سے میری مراد، شیخ علی متقی ہیں، جن کا فیض ہر قریب و بعید پر جاری و ساری ہے، اس کتاب سے ان کو وسیلہ بناتا ہوں۔[(۱۸)]

موصوف نے شیخ علی متقیؒ سے تین باتیں ورثے میں پائی تھیں:

﴿۱﴾ دین میں استقامت۔

موصوف کی شہادت اس کا مظہر ہے۔

﴿۲﴾ حدیث کی خدمت۔

اسی کا اثر تھا کہ موصوف تدریسی و تصنیفی اور تربیتی شعبوں میں تاحیات سرگرمِ عمل رہے۔

﴿۳﴾ اصلاحی و فلاحی کام میں سرگرمی ۔

شیخ علی متقیؒ مہدویوں کے مخالف تھے، ان کی قوم کے بہت سے قریبی رشتہ دار مہدوی ہوگئے تھے، اس لئے یہ ان کی اصلاح کے لیے تا حیات کوشاں رہے۔

معاصرین میں علامہ پٹنیؒ کا مقام:

مؤرخ عبدالقادر العیدروسی (۹۷۸-۱۰۳۸ھ) کا بیان ہے:

"وہ ہمعصروں سے برتر رہے، یہاں تک کہ علماء گجرات میں کوئی ایک عالمِ فنِ حدیث میں ایسا نہیں تھا، جو موصوف کے مرتبہ و مقام کو پہنچا ہو، ہمارے مشائخ کا یہی کہنا ہے۔"[(۱۹)]

ہر فن میں بہت سے علماء پیدا کیے،[(۲۰)] علومِ حدیث کے شعبہ میں بنیادی کام سر انجام دیے، موضوعاتِ حدیث پر کام کیا، ضعفاء پر کتاب لکھی، صحاح ستہ کے غیر متداول الفاظ کے معانی و شرح کے لیے **"مجمع البحار"** لکھی، راویانِ حدیث کو صحیح اعراب کے ساتھ پڑھنے کے لئے **"المغنی"** ترتیب دی، راویانِ صحاح ستہ کے نام، کنیت، القاب اور مختصر حالات سے آگاہی کی خاطر **"تلخیص خواتم جامع الاصول"** مرتب کی۔

(یہ تمام کتابیں شائع ہو گئی ہیں) درسی کتابوں **"مشکوٰۃ المصابیح"**، **"صحیح مسلم"**، **"صحیح بخاری"** پر حواشی و تعلیقات لکھیں، نحو میں **"شافیہ ابنِ حاجب"** کی شرح لکھی، چہل حدیث بھی مرتب کی تھی۔ **"عدۃ المتعبدین الی منہاج السائلین"** اور **"حاشیہ مقاصد الاصول"** بھی موصوف

کی یادگار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی سیرت پر بھی عربی میں مختصر کتاب لکھی تھی، یہ سب غیر مطبوعہ کتابیں ہیں، ان کا ذکر قاضی عبد الوہاب التوفی (۱۰۰۸ھ) نے ''کتاب المناقب'' میں کیا ہے۔

طلبہ کی مالی مدد اور ان کی علمی تربیت:

موصوف کا گھرانہ تاجر تھا، باپ نے بہت دولت چھوڑی تھی، مولانا نے وہ دولت غریب، نادار طلباء کی تعلیم پر خرچ کی، انہوں نے بچوں کے استاذ سے کہہ رکھا تھا کہ جو سمجھدار لڑکا نادار ہو، اس کو میرے پاس بھیج دو، وہ پڑھے، میں اس کی اور اس کے گھر والوں کی کفالت کروں گا، وہ مالدار لڑکوں کو پڑھنے کی ترغیب دیتے ، نگرانی کرتے، خود پڑھاتے، اور دورانِ سبق ان کے لیے سیاہی تیار کرتے رہتے اور انھیں مفت دیتے تھے۔(۲۱)

طالبِ علمی کے زمانے میں طلباء اور بعض لوگوں کی طرف سے بہت تکلیفیں اور مشکلیں جھیلی تھیں، اس وقت سے موصوف نے یہ نذر مانی تھی کہ مجھے علم سے نوازا گیا تو میں اللہ کی رضا کی خاطر عمر بھر طلباء کی خدمت کرتا رہوں گا۔(۲۲) طلباء کی خدمت، تدریسی و تصنیفی خدمات اور قوم کی اصلاح اس نذر کا ثمرہ ہے۔(۲۳)

موصوف فرقہ مہدویہ کی تردید و سرکوبی کے لیے برابر کمر بستہ رہے، ۹۷۹ھ میں قسم کھائی کہ جب تک ان کی اصلاح نہیں کروں گا، سر پر عمامہ نہ باندھوں گا۔

۹۸۰ھ میں اکبر بادشاہ نے گجرات فتح کیا اور یہاں کے علماء کو بلایا، یہ ننگے سر حاضر ہوئے، اس نے وجہ پوچھی، آپ نے وجہ بتائی تو اکبر نے کہا یہ کام ہم کریں گے اور اس نے ان کے سر پر عمامہ باندھا، اکبر نے اپنے رضاعی بھائی، خان اعظم عزیز مرزا کو گجرات کا گورنر مقرر کیا، اس سے مہدویوں کا زور ٹوٹا۔ ۹۸۱ھ میں جب عبد الرحیم خان خاناں کو یہاں کا گورنر مقرر کیا، وہ شیعہ تھا، تو مہدویوں کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں۔ شیخ نے پھر عمامہ اتارا، آگرہ میں اکبر کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے نکلے، مہدویوں کو خبر ہوئی، انہوں نے پیچھا کیا، ۶ شوال ۹۸۶ھ میں ''اجین'' کے قریب انہوں نے رات کو جب آپ تہجد پڑھ رہے تھے، شہید کردیا اور بھاگ نکلے۔ انہیں شیخ بھکاریؒ کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا، اکبر کو جب خبر ملی تو اس نے حکم دیا کہ ان کے جسد خاکی کو آبائی قبرستان میں منتقل کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آج بھی ان کا مقبرہ زیارت گاہِ خلائق ہے۔(۲۴)

''مجمع البحار'' کا زمانۂ تالیف:

"**مجمع بحار الأنوار**" سرزمینِ ہند و پاک میں حدیث و قرآن کی پہلی لغت ہے، یہ تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ''مجمع البحار'' کی ترتیب و تدوین کا کام کس سن میں شروع ہوا، لیکن اس کتاب کے ثلث اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پہلی جلد جو مادہ ''رحا'' تک ہے، شیخ علی متقیؒ المتوفی ۹۷۵ھ کی حیات میں پوری ہوگئی تھی۔

دوسری جلد ۱۱ رمضان ۹۷۶ھ کو مادہ ''عین'' تک پوری ہوئی تھی، اس وقت شیخ علی متقیؒ کا انتقال ہوگیا تھا۔

تیسری جلد ثلث اخیر ۱۲ ربیع الاول کی رات کوختم ہوئی۔ کاروانِ عمر ۶۵ویں منزل طے کررہا تھا۔ اس میں بھی سن نہیں دیا گیا۔ بظاہر ۹۷۷ھ ہے، "**مجمع البحار**"کو نو لکشور نے پہلی بار لکھنؤ سے ۱۲۸۳ھ میں اور دوسری بار ۱۳۱۴ھ میں شائع کیا۔

پھر مطبع مجلسِ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن میں مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق سے ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء میں اسے شائع کیا گیا۔ وہی نسخہ **کلیة الایمان** مدینۂ منورہ نے ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء میں پانچ ضخیم جلدوں میں شائع کیا۔

موصوف نے حدیث کے طلبہ و اساتذہ کے فائدہ کے لیے خاتمۂ کتاب میں نوفصلوں کا اضافہ کیا ہے۔ جو مصطلحاتِ حدیث، جرح و تعدیل، بے اصل مشہور احادیث، کتابتِ حدیث کے آداب، رسول اللہ ﷺ کی سیرت، صحابہؓ کے فضائل وغیرہ میں ہیں۔

تکملہ میں ان غریب الفاظ کو بیان کیا گیا ہے جو **مجمع البحار** میں چھوٹ گئے تھے۔ یا الفاظ کی مزید تشریح مل گئی تو اضافہ کردیا گیا ہے۔

کتاب کے اخیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرۂ نسب پیش کیا گیا ہے۔

علامہ پٹنیؒ نے "**مجمع البحار**"کی تالیف میں ائمۂ فن کی جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی نشاندہی مقدمۂ کتاب میں کی ہے اور ان میں علامہ ابن الاثیر الجزریؒ المتوفی ۶۰۶ھ کی "**النّهاية فى غريب الحديث والاثر**" سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ائمۂ فن کی کتابوں کی نہایت مفید تلخیص آگئی ہے، اس سے یہ سمجھنا کہ **النّهاية** کی اشاعت کے بعد علامہ پٹنیؒ کی **مجمع البحار** کی افادیت و اہمیت جاتی رہی ہے، درست نہیں، اس کی اہمیت وافادیت آج بھی مسلّم

و برقرار ہے۔

اس میں حدیثوں کے نت نئے فقروں اور جملوں کی کثرت النّھایہ سے زیادہ پائی جاتی ہے، بہت سے جملے فقرے اور الفاظ ایسے ملتے ہیں جو ابن الاثیر سے چھوٹ گئے ہیں۔

علامہ پٹنیؒ نے ان کی تشریح اور معانی ومطالب کی وضاحت شارحینِ حدیث کی کتابوں سے نقل کی ہے، اس میں الفاظ اور جملوں کا احاطہ و استیعاب اور ان کی تشریح ابن الاثیر کی النھایہ سے زیادہ ہے، اس لیے اس کی افادیت واہمیت برقرار ہے، اس امر کا اندازہ ''برأ'' کے مادہ سے کیا جاسکتا ہے، علامہ ابن الاثیر الجزریؒ نے مذکورہ بالا مادہ میں جن الفاظ،فقروں اور جملوں کا ذکر کیا، وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) الباریٔ۔ بغیر نمونہ و مثال پیدا کرنے والا۔

(۲) حدیث میں آیا ہے:''أصبح بحمداللّٰه بارئاً'' بحمداللہ وہ صحت وعافیت سے ہیں۔

(۳) ''اراک بارئاً'' میں آپ کو صحتمند دیکھتا ہوں۔

(۴) ''لایمسّھا حتٰی یبریٔ رحمھا'' لونڈی سے اس وقت تک صحبت نہ کرے، جب تک اس کا رحم حیض سے پاک صاف نہ ہوجائے، (یا وہ امید سے تو نہیں)۔

(۵) ''وکذٰلک الاستبراء الذی یذکر مع الاستنجاء فی الطھارة'' اور اس طرح استنجاء میں طہارت کے وقت شرم گاہ کو نجاست کے اثر سے پاک صاف کرنا ہے (اور مرض اور قرض سے چھٹکارا پانا ہے)۔

(۶) ''فانّه اروىٰ وابرأ'' تین سانس میں پانی پینا آدمی کو خوب سیراب کرتا ہے۔

(۷) ''انّ یوسف منّی بریٔ و انا منه براءٌ۔''[۲۵]

حضرت یوسف علیہ السلام سے میرا کیا جوڑ، وہ پیغمبر تھے، میں ادنیٰ مسلمان ہوں، یہ حضرت ابوہریرہؓ نے اس وقت کہا تھا جب حضرت عمرؓ نے انہیں کسی خدمت پر مامور کرنا چاہا تھا۔

''مجمع البحار'' میں مذکورہ بالا مادہ ''برء'' میں اس کے علاوہ جو اضافہ پایا جاتا ہے، وہ ہدیۂ قارئین ہے:

(۱) ''من استبرأ لدینه'' جوشخص اپنا دین اور آبرو بچانے کے لیے گناہ سے الگ رہے۔

(۲) ''حتٰی اذا رأی انّه قد استبرء ہ''

تاآنکہ وہ یہ سمجھے کہ پانی جسم پر سب جگہ پہنچ گیا، وہ پاک صاف ہوگیا۔

(۳) ”ابرأ الی اللّٰہ ان یکون لی منکم خلیل“

میں چاہتاہوں اللہ کرے تم میں سے کوئی میرا دوست نہ ہو۔

(۴) ”فتبرئکم یهود فی أیمان“

یہود پچاس قسمیں کھاکر تم کو قسموں سے بچائیں گے۔ (پھر تم کوقسم کھانے کی حاجت نہیں رہی)۔

(۵) ”استبرأ الخبر“ خبر کی خوب چھان بین کی۔

(۶) ”اذا دخلت فی الدم من الحیض الثالثة فقد برأت منه“ مطلقہ کو جب تیسرا حیض آجائے، تو وہ خاوند سے الگ ہوگئی۔(طلاق کی عدت ختم ہوگئی)۔

(۷) ”شرار کم الباعون البراء العنت“[۲۶]

تمہارے برے لوگ وہ ہیں جو پاک دامنوں سے گناہ کرانا چاہتے ہیں۔

”مجمع البحار“ میں کم وبیش ہر ایک مادہ میں النّهایه کے علاوہ کچھ نہ کچھ بیش بہا اضافہ پایا جاتا ہے۔ علامہ پٹنیؒ نے ”مجمع البحار“ میں بعض ایسے الفاظ کا بھی اضافہ کیا ہے، جن کا سراغ ہمیں النہایہ میں ان کے مادوں میں نہیں ملتا۔ جیسے ”استبرأ“ کا لفظ ہے۔ اس سے ”مجمع البحار“ کی جامعیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، حالانکہ ابن الاثیر نے ”عِرضٌ“ کے مادہ میں حدیث ”من اتقیٰ الشّبهات استبرأ لدینه وعرضه“ جو شبہات ومشتبہات سے بچا، اس نے اپنا دین وآبرو بچائی۔ اس کے تحت اس کے معنی ”احتاط لنفسه“ کیے ہیں۔[۲۸] لیکن مادہ ”برأ“ میں اس کا ذکر ان سے رہ گیا ہے۔ اس طرح بعض الفاظ جیسے ”قرن“بمعنی زمانہ کی تشریح النّہایہ میں اتنی مختصر ملتی ہے جس سے ایک محقق کی تشنگی دور نہیں ہوتی، جیسے حدیث ”خیرالقرون ثم الّذین یلونهم“، یعنی ”الصحابةؓ ثم التابعینؒ“،[۲۹] تبع تابعین کا لفظ نہیں لکھا ہے، حالانکہ ائمۂ فن کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہاں دورِ صحابہؓ، عہدِ تابعین، اور زمانہ تبع تابعین سب داخل ہیں۔[۳۰] گو عہد کی تعیین زمانوں کے ساتھ کسی نے نہیں کی ہے۔

علامہ پٹنیؒ نے علامہ طیبیؒ المتوفی ۷۴۳ھ کی شرح المشکٰوۃ سے ان تینوں زمانوں کی تعیین کی ہے۔

چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

[قرن] ط: فیه: "قرنه أصحابه والذین یلونهم أبناؤهم والثالث ابناء أبنائهم، وقیل: کلّ طبقة مقترنین فی وقت، والصحیح أن قرنه أصحابه والثانی التابعون والثالث تابعوهم، وقد ظهر انّ مدة مابین البعثة الیٰ آخر من مات من الصحابة مائة و عشرون سنة بالتقریب، وان اعتبرت وفاته کان مائة، واماّقرن التابعین فان اعتبر من سنة مائة کان نحو سبعین، واماّ من بعدهم فان اعتبر من سنة مائة کان نحو خمسین، فظهرانّ مدة القرن یختلف باعتبار اعمار اهل کلّ زمان، واتفق انّ آخر اتباع التابعین من عاش الیٰ عشرین و مائتین." (۳۱)

''قرن'' سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کا دور مراد ہے اور (دوسرے قرن سے) صحابہؓ کے بعد ان کے بیٹوں کا زمانہ مراد ہے اور (تیسرے قرن سے) ان کے بیٹوں کی اولاد کا زمانہ مراد ہے اور یہ بھی قول ہے کہ ایک وقت میں ہر ایک طبقہ دوسرے سے ملا ہوتا ہے۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ قرن سے مراد آپ کے صحابہ ہیں اور دوسرے درجہ میں تابعین ہیں اور تیسرا درجہ تبع تابعین کا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ مدت جو بعثت نبویؐ سے لے کر آخری صحابی تک ہے، وہ تقریباً ایک سو بیس سال ہے اور اگر آپؐ کی وفات کا اعتبار کیا جائے تو یہ مدت سو سال بن جاتی ہے، اور تابعین کے زمانے کو اگر سو سال کے بعد شمار کیا جائے تو تقریباً ستر سال ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد والوں کے زمانے کو اگر سو سال کے بعد شمار کیا جائے تو یہ پچاس سال بن جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ زمانے کی مدت میں بعد کے لوگوں کے اعتبار سے اختلاف ہوتا رہتا ہے اور تبع تابعین کا زمانہ بالاتفاق دو سو بیس سال تک ہے۔

علامہ طاہر پٹنیؒ کے اضافوں کا اندازہ قارئین کو ہر مادہ میں "النهاية" کے علاوہ دوسرے ماخذوں کی علامات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

صاحبِ ''مجمع البحار'' کے تسامحات:

علامہ ابن الاثیر الجزریؒ اور علامہ محمد طاہر پٹنیؒ کے تسامحات اور لغزشوں کا ذکر علامہ وحید الزمان نے مقدمۂ کتاب میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''صاحب **مجمع** سے بہت اور صاحب **نهایه** سے کم تسامحات ہوئے ہیں، جس لغت کو اس کے صحیح باب میں بیان کرنا تھا، وہاں بیان نہ کرکے دوسرے باب میں بیان کر دیا ہے''۔

شاید قارئین کی آسانی کے خیال سے انہوں نے ایسا کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو اجرعظیم دے۔ انہوں نے فراہمی لغات میں بڑی محنت اٹھائی ہے۔ میں نے اس کتاب میں باتباع ہر دو صاحبان مذکورین کے ہر لغت کو اس باب میں بیان کردیا ہے۔ جس میں انہوں نے بیان کیا ہے، مگر اکثر مقامات میں اس کے ساتھ ہی یہ اشارہ کردیا ہے کہ یہ لغت فلاں باب میں بیان کرنا تھا۔[(۳۲)]

علامہ محمد طاہر پٹنیؒ نے لفظ ''ابرِدَة'' کو باب ہمزہ مع الباء میں لکھا ہے، حالانکہ یہ اپنے مادہ ''بَرْدٌ'' یعنی **باب الباء مع الراء** میں بیان کرنا چاہیے تھا۔ یا مثلاً ''اُبلُمة'' کو مادہ ''بلمٌ'' کے تحت ذکر کرنا چاہیے تھا۔ یا ''أجنادٌ'' کو ''جُنْدٌ'' میں آنا چاہیے تھا، مگر ان سب کو باب الالف میں بیان کیا گیا۔[(۳۳)]

یہ وہ تسامح اور فروگذاشت ہیں، جن کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے۔ مولانا وحید الزمان کا یہ خیال کہ اس قسم کے تسامح اور فروگذاشت صاحب **مجمع البحار** سے زیادہ اور ابن الاثیر سے کمتر ہوئی ہیں، ایسا نہیں ہے۔ بلاشبہ علامہ پٹنیؒ نے بہت سے الفاظ کو ان کے اصل مقام کے علاوہ دوسری جگہ بھی بیان کیا ہے اور مقدمہ میں اس کی وجہ بیان نہیں کی، مگر اس امر کی تصریح کی ہے کہ ہم نے اس کتاب میں صاحب النہایہ ابن الاثیر الجزری کی پیروی کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ صاحب النہایہ کی تقلید کا نتیجہ ہے۔[(۳۴)]

رہی یہ بات کہ علامہ ابن الاثیرؒ نے ایسا کیوں کیا؟ ابن الاثیر نے جہاں ایسا کیا ہے وہاں اس کی وجہ بھی بیان کی ہے اور لفظ کے غیر مقام پر بیان کرنے سے جو شبہ قاری کو پیدا ہوسکتا تھا، اس کا ازالہ کیا ہے۔ چنانچہ ''اِبردة '' کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''اِبْردة'' میں ہمزہ اور راء دونوں پر زیر ہے۔ یہ ایک مشہور بیماری ہے جو برودت اور رطوبت کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہے، اور ہمبستری سے باز رکھتی ہے، اس میں ہمزہ زائد ہے، اسے **باب الألف مع الراء** میں داخل کرنے سے یہ سمجھنا کہ اس کا ہمزہ اصلی ہے، درست نہیں۔ ہم نے اس کو ظاہر لفظ کے اعتبار سے یہاں بیان کردیا ہے۔[(۳۵)]

یہی بات لفظ ''اُبُلُمَة'' کی تشریح میں کہی ہے، ابن الاثیر نے محض طالب کی سہولت کی غرض سے ایسا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس لفظ کو دوبارہ اس کے مادہ میں بھی ذکر کیا ہے، ایک جگہ نقل کرنے پر اکتفاء نہیں کیا، ایسے الفاظ کو ان کے مادے میں ذکر نہ کرنا یا مادہ میں اس لفظ کی طرف اشارہ نہ کرنا تو بجاطور پر تسامح قرار دیا جاسکتا تھا، لیکن ابن الاثیر نے مقدمۂ کتاب میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے اور علامہ پٹنیؒ نے اس امر میں ابن الاثیر کی پیروی کی ہے۔

وحید الزمان جہاں ائمۂ لغت کی لغزش پر تنبیہ کرتے ہیں، وہاں حقیقت میں مولانا کی اپنی غلطی ہوتی ہے۔ چنانچہ لفظ ''اُطُوُم'' پر لکھتے ہیں:

''کچھوا یا وہ مچھلی جس کی کھال سخت اور موٹی ہو اور ''صاحب النہایہ'' نے جو ''اطُومُ' کے معنی زرافہ لکھے ہیں، اور صاحب مجمع نے ان کی تقلید کی ہے، یہ وہم ہے۔ زرافہ تو ایک جنگلی جانور ہے جو افریقہ میں بکثرت ہوتا ہے''۔

ابن الاثیر نے ''اطوم'' کے معنی زرافہ بیان کیے ہیں، یہ معنی تمام ائمۂ لغت سے منقول ہیں، کسی نے اس معنی کو غلط قرار نہیں دیا، پھر اس کی صحت میں کیا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ ابن منظور الافریقی المتوفی ۷۱۱ھ نے ''لسان العرب'' میں اور سید مرتضٰی زبیدی بلگرامی المتوفی ۱۲۰۵ھ نے ''تاج العروس'' میں ''اطوم'' کے معنی زرافہ نقل کیے ہیں۔[۳۶]

اب اس کی صحت میں کیا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

''مجمع البحار'' برصغیر ہند کے شارحین و محدثین کی نظر میں:

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (۹۵۹ھ۔۱۰۵۲ھ) ''اخبار الاخیار'' میں لکھتے ہیں:

''ازاں جملہ کتابے است کہ متکفل شرح صحاح ستہ مسمیٰ بمجمع البحار''۔[۳۷]

منجملہ ان کے ایک کتاب جو صحاح ستہ کی شرح کو جامع ہو، وہ **مجمع البحار** سے موسوم ہے۔

نواب صدیق حسن خان المتوفیٰ ۱۳۰۷ھ ''ابجد العلوم'' میں رقمطراز ہیں:

''موصوف کی کتاب ''**مجمع البحار**'' اس زمانے میں ہندوستان میں طبع کی گئی ہے۔ اس کی شہرت نصف النہار میں سورج کی طرح ہے۔ اس میں حدیث کے ہر غریب لفظ کو ذکر کیا گیا ہے، جو معانی اس کے بیان کیے گئے ہیں، انہیں بتایا ہے۔ گویا یہ کتاب صحاح ستہ کی شرح کی حیثیت رکھتی

ہے۔ اگر حدیث کی بنیادی چھ کتابیں کسی کے پاس موجود نہ ہوں تو یہ معانی کے حل کے لیے اور اس کے اساسی معانی کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ اس کتاب کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے۔ جس زمانے میں یہ تالیف کی گئی۔ اس وقت سے یہ اہل علم میں متداول رہی ہے۔(۳۸)

حکیم سید عبدالحی لکھنوی المتوفی ۱۳۴۱ھ "نزھة الخواطر" میں تحریر فرماتے ہیں:

''اُن کی جلیل القدر اور مفید تصانیف ہیں۔ جن میں سے مشہور اور عمدہ کتاب "مجمع بحارالانوار" ہے''۔ اس میں ہر مشکل حدیث کے الفاظ کو اس طرح سے جمع کیا ہے کہ جو کچھ اس کے متعلق لکھا گیا ہے وہ سب اس میں آگیا ہے، جس کی وجہ سے وہ صحاح ستہ کی شرح بن گئی ہے، اور یہ ایک ایسی کتاب ہے، جس کے عالم وجود میں آنے کے بعد سے علماء کا اس کی قبولیت پر اتفاق ہے اور مؤلف کا یہ کارنامہ اہل علم پر بہت بڑا احسان ہے۔(۳۹)

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ ''یادایام تاریخ گجرات'' میں لکھتے ہیں:

علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنیؒ ایسے بلند پایہ محدث تھے، جن کے فضل و کمال کی شہرت دنیا بھر میں ہے اور ان کی تصنیفات سے علماء حجاز ویمن اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں جیسے ہندوستان کے علماء۔(۴۰)

ہندوستان کے نامور محدث وصحاح ستہ کے تعلیق نگار مولانا احمد علی محدث سہارنپوری المتوفی ۱۲۹۷ھ نے اس سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا، ان کے یہاں مشکوٰۃ المصابیح، صحیح البخاری، سنن الترمذی، سنن ابن ماجہ اور مؤطا مالک کی تعلیقات میں جابجا اس کے حوالے اس امر کے شاہد عدل ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۲ھ) کے پاس بھی اس کا خطی نسخہ ۱۰۱۹ھ موجود تھا، موصوف نے اس سے "اشعة اللمعات" اور "لمعات التنقیح" میں فائدہ اٹھایا۔ مولانا وحید الزمان (۱۲۶۷۔۱۳۳۸ھ) نے "وحید اللغات" میں "مجمع البحار" سے اس قدر استفادہ کیا ہے کہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مولانا وحید الزمان نے وحید اللغات میں "مجمع البحار" کا اردو میں ترجمہ کردیا ہے۔

مرکز اسلام حرمین شریفین کے محدثین وفقہاء کی نظر میں علامہ پٹنیؒ کی تالیفات:

علامہ شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ نے "تذکرة الموضوعات" اور قانون الموضوعات و الضعفاء ۹۵۸ھ میں تالیف کیں۔ تکمیل کے بعد جب یہ حجاز و مصر کے محدثین و حفاظ اور فقہاء کے مطالعہ میں

آئیں، تو انہیں حسن قبول حاصل ہوا، موصوف رتن ہندی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں :

''میں نے لمبی عمر پانے والوں کا ذکر ''**تذکرۃ الموضوعات**'' میں تفصیل سے کیا ہے، تم اس کا مطالعہ کرو تمہیں وہ کتاب فائدہ دے گی، وہ نفیس کتاب ہے، علماء حرمین میں بہت مقبول ہے''۔

مجھے بعض معتبر اہل علم نے میرے شیخ ابن حجر کی (۹۰۹۔۹۷۴ھ) کے متعلق بتایا، وہ فرماتے تھے۔ ''ان شاء اللہ اس کتاب سے فائدہ اٹھایا جائے گا'' اور جلال الدین سیوطیؒ (المتوفی ۹۱۱ھ) کے نامور شاگرد شیخ محمد بن عبدالرحمٰن العلقمی الشافعی ۸۹۷۔۹۶۹ھ، فرماتے تھے:

''**ھو فی ھذا الباب احسن المختصرات**'' یہ موضوعات کے باب میں مختصرات میں سب سے عمدہ کتاب ہے اور میرے شیخ علی بن حسام الدین متقیؒ (۸۸۵۔۹۷۵ھ) (اللہ تعالیٰ انہی کی جماعت میں میرا حشر فرمائے) نے مجھے لکھا تھا: ''**قد وقع الکتاب مفیداً کثیراً جزاکم اللّٰہ خیرا**''، یہ کتاب بہت مفید ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین بدلہ دے۔

میں نے اس کتاب کی مدح سرائی میں جو کچھ پیش کیا ہے، وہ اس لیے کہ باہمت اہل علم اس ذخیرۂ معلومات سے جو اس میں منقول ہے، فائدہ اٹھائیں۔(۴۱)

حواشی و حوالہ جات

(۱) حسن بن عبدالرحمٰن الرامہرمزی/ المحدث الفاصل بین الراوی والواعی۔ تحقیق محمد عجاج الخطیب (ص۱۱۶) دارالفکر، بیروت (ب۔ت)

(۲) محمد بن احمد المقدسی المعروف بالبشاری/ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم (ص۳۶۱)۔ دار احیاء التراث العربی۔ بیروت، ۱۴۰۸ھ

(۳) حسن بن محمد الصغانی الاہوری/ مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ (ص۳) آستانہ۔ مطبعہ سعادت۔ ۱۳۲۹ھ

(۴) عبدالحیٔ الحسنی/ نزھۃ الخواطر وبھجۃ المسامع والنواظر (۲ / ۱۲۳) مطبعہ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، الدکن، ۱۳۵۰ھ

(۵) ایضاً۔ عبدالحق دہلوی/ اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (ص۱۷) مطبع مجتبائی دھلی۔ ۱۳۳۲ھ

(۶) عبدالوہاب السبکی/ معید النعم ومبید النقم، تحقیق محمد علی النجار وغیرہ (ص۸۱۔۸۲) دارالکتاب العربی، القاھرہ، ۱۳۶۷ھ۔ عبدالرحمٰن السیوطیؒ/ تدریب الراوی فی شرح تقریب النواوی تحقیق عبدالوہاب۔ عبداللطیف (ص۸۔۹) المکتبۃ العلمیۃ المدینہ المنورۃ۔ ۱۳۷۹ھ۔ مصطفیٰ ابن عبداللہ الشھیر بحاجی خلیفۃ /کشف الظنون عن اسماء الکتب والفنون (ج۱ ص۶۴۱) استانبول، مطبعۃ المعارف ۱۳۶۰ھ۔

(۷) محمد بن عبدالرحمٰن السخاوی /الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ (ص۱۴۳) القدسی، دمشق، ۱۳۴۹ھ۔

(۸) الدھلوی/ المقدمۃ فی اصول الحدیث (ص۷) مشکوٰۃ المصابیح نور محمد۔ کراچی ۱۳۶۸ھ۔

(۹) حاجی خلیفہ (ج ا ص۱۴۱)

(۱۰) الحسنی (ج ۴ ص۲۴۴)

(۱۱) حاجی خلیفہ ج ا ص۵۹۷۔۵۹۸، ج ۲ ص۱۵۱۸۔ ص۱۵۹۹

(۱۲) صدیق حسن قنوجیؒ نے اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقهاء والمحدثین (ص۳۹۷) مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ میں۔ الحسنی ج ۴، ص۲۹۸، دارالثقافه الاسلامیه فی الهند (ص۱۵۷) میں، المجمع العلمی العربی دمشق ۱۳۸۶ھ میں موصوف کا نام محمد ذکر کیا ہے۔ ابو ظفر ندوی نے تذکرہ شیخ عبدالوہاب اقضی القضاۃ المتوفی ۱۲۸۶ھ۔ ندوۃ المصنفین دہلی۔ ۱۹۵۴ء پر جو مقدمہ لکھا ہے اس لیے ص۱۱ میں محمد بن طاہر کو صحیح بتایا ہے۔ لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار ص۲۸۲ میں اور عبدالقادر العیدروسی نے النور السافر (ص۳۶۱) المکتبه العربیة بغداد ۱۹۳۴ء میں مؤرخ ابن العماد الحنبلی نے شذرات الذهب فی اخبار من ذهب ج۸ ص۴۱۰ داراحیاء التراث العربی۔ بیروت (ب،ت) میں، مولانا محمد عبدالحیٔ لکھنوی نے التعلیقات السنیہ (ص۱۶۴) مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۲۴ھ میں اور صدیق حسن قنوجیؒ نے ابجدالعلوم (ج ۳، ص۲۲۲) دارالکتب العلمیة، بیروت (ب،ت) میں محمد طاہر نقل کیا ہے۔

(۱۳) العید روسی ص۳۶۱، ابن العماد (ج۸، ص۴۱۰) محمد عبدالجلیل السامرودی (ص۲۹۱) تذکرۃ الموضوعات۔ المکتبۃ العلمیہ بمبئی ۱۳۴۳ھ

(۱۴) ابو ظفر ندوی (ص۱۰)

(۱۵) ایضاً۔محمد بن طاہر الفتنی / مجمع بحارالانوار فی غرائب التنزیل ولطائف الاخبار (ج۳، ص۵۵۵) نولکشور لکھنو، ۱۲۸۳ھ۔

(۱۶) عبدالحیٔ حسنی، ''یادایام تاریخ گجرات'' ص۵۵ (شبلی بک ڈپو لکھنو) میں لکھتے ہیں: ملّا مہتہ، شیخ ناگوری، مولانا یداللہ، مولانا برہان الدین، یہ چاروں گجرات کے علماء کرام تھے، ملّا مہتہ کا لقب اُستاذ الزمان تھا۔ افسوس ہے کہ ان چاروں عالموں کے کچھ حالات معلوم نہیں، اگر اس مضمون کے پڑھنے والوں میں کسی کو ان کے حالات پر اطلاع ہوتو ازراہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔

(۱۷) العید روسی (ص۳۶۱) ابن العماد (ج۸، ص۴۱۰) الحسنی (ج۴، ص۲۹۸) القنوجیؒ (ج۳، ص۲۲۲) اتحاف (ص۳۹۷)

(۱۸) ایضاً العید روسی (ص۳۶۲)

(۱۹) پٹنی (ج۱، ص۲)

(۲۰) العید روسی (ص۳۶۲) ابن العماد (ج۸، ص۴۱۰) الحسنی (ج۴، ص۲۹۹) قنوجیؒ (ص۳۹۸)

(۲۱) ایضاً

(۲۲) ایضاً

(۲۳) ایضاً

(۲۴) لکھنوی (ص۱٦۵)۔ قنوجی (ص۳۹۰۔۳۹۱) ج۳، ص۱۲۲۔ الحسنی ج۴، ص۲۹۹۔۳۰۰۔ابو ظفر ندوی (ص۱۷۔۴۷)

(۲۵) مبارک بن محمد الجزری المعروف بابن الاثیر/ النہایہ فی غریب الحدیث والأثر۔ ج۱، ص۱۱۱۔۱۱۲۔ مادہ "بوأ"، دارالفکر، بیروت۔

(۲٦) محمد بن طاہر الفتنی/ مجمع بحار الانوار (ج۱، ص۸۳۔۱۸۴) مادہ "برأ" نول کشور، لکھنو، ۱۲۸۳ھ۔

(۲۷) ابن الاثیر۔ ج۳، ص۲۰۹

(۲۸) ایضاً ج۴، ص۵۱

(۲۹) محمد بن احمد بن طلحہ الازہری المتوفی ۳۷۰ھ/ تہذیب اللغہ۔(ج۹ ،ص۸۷) القاہرہ الدارالمصریہ (ب،ت)

(۳۱) الفتنی۔ ج۳، ص۱۳۸ (قرن)

(۳۲) وحیدالزمان/ لغات الحدیث (ص۵) نور محمد اصح المطابع کراچی۔ ب ت

(۳۳) محمد عبدالحلیم چشتی/ حیات وحید الزمان (ص۱۵۴) نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ کراچی۔ ۱۹۵۷ء

(۳۴) ایضاً ص۱۵۵

(۳۵) ایضاً

(۳٦) ایضاً ۱۵٦

(۳۷) عبدالحق دہلوی/ اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (ص۲۸۰)، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۳۳۲ھ۔

(۳۸) القنوجی۔ ج۳، ص۲۲۳ (۴) اتحاف النبلاء ص۱۳۳

(۳۹) الحسنی، ج۴، ص۳۰۱

(۴۰) یادایام تاریخ گجرات ص۵٦

(۴۱) الفتنی۔ج، ۳، ص۵۱۴

تذکرہ شاہ ولی اللہؒ

از

الروض الممطور

(مجلہ الرحیم، جولائی 1966ء)

تذکرہ شاہ ولی اللہ از الروض الممطور

مرتبہ، مولانا عبدالحلیم چشتی

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی مرحوم نے علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی کتاب شرح الصدور فی احوال الموتی والقبور کی اردو میں شرح لکھی ہے، جوطے الفراسخ فی منازل البرازخ کے نام سے تین جلدوں میں مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۳۰۷ھ میں شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی ہے۔ یہ کتاب عالم برزخ اور احوال آخرت کے موضوع پر اردو زبان میں سب سے زیادہ مبسوط، جامع اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب میں جن بزرگوں کے نام دوران شرح آئے ہیں، مولانا ذوالفقار احمد نقوی نے ان کا مختصر تذکرہ الروض الممطور فی رجال شرح الصدور کے نام سے اردو میں کیا ہے جوطے الفراسخ کے ساتھ شائع ہوگیا ہے۔ اس میں منجملہ اور ناموں کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام بھی آیا ہے۔ اس لئے موصوف نے اس میں شاہ صاحبؒ کا بھی تذکرہ نقل کیا ہے۔

مولانا ذوالفقار احمد نقوی کی عربی تحریر جیسی رواں اور شگفتہ ہوتی ہے اردو تحریر ایسی نہیں۔ اس میں عربی کے بعض بوجھل الفاظ بھی آجاتے ہیں۔ پھر انداز نگارش بھی ان کا یکسر پرانا ہے۔ تاہم ان کا یہ تذکرہ اردو میں اس حیثیت سے بہت ممتاز ہے کہ اس میں انہوں نے ان اصول

کی نشاندہی بھی کی ہے جو شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے شاہ ولی اللہ کی تربیت میں ملحوظ رکھے ہیں اور جن پر تازندگی کاربند رہنے کی ان کو تاکید کی تھی اور وہ اس پر شاہ صاحبؒ تمام عمر کاربند رہے ہیں اس سے شاہ صاحبؒ کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ سیرت کی تعمیر میں اصول تربیت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی نقوی نے ان اصول کو انفاس العارفین سے نقل کر کے ان کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہ کے تذکرہ نگاروں نے ان اصول سے یا تو بحث ہی نہیں کی ہے یا پورا اعتناء نہیں کیا ہے۔ اس لئے مولانا ذوالفقار احمد نقوی کا تذکرہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

ہم نے شاہ صاحب کا تذکرہ الروض الممطور سے بجنسہ نقل کر دیا ہے اور اس میں ذیلی سرخیوں کے علاوہ کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ہے۔

(چشتی)

نام و نسب ولی اللہ قطب الدین احمد بن عبدالرحیم بن وجیہہ الدین الشہید بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قواذن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی برہان بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین المفتی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابوالفتح ملک بن عمر الحاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جرجیس بن احمد بن محمد شہریار بن عثمان بن ہامان بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہکذا ذکرہ فی الامداد فی مآثر الاجداد۔

پس نسب آپ کا طرف خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تیس واسطے سے پہنچتا ہے۔ خود آپ نے اپنا حال برکت اشتمال جزء لطیف نامی رسالے میں لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ،

ولادت ولادت آپ کی روز چہار شنبہ شوال مقارن طلوع شمس سنہ چودہ میں بارہویں قرن ہجری کے واقع ہوئی یعنی ۱۱۱۴ھ میں بعض دوستوں نے عظیم الدین تاریخ پائی اور حضرت والدین وایک جماعت صلحاء نے مبشرات بسیار حق میں اس فقیر کے قبل ولادت و بعد ولادت کے دیکھے چنانچہ بعض اخوان اعزہ و خلان اجلہ نے تفصیل ان وقائع کی مع اور واقعات کے ایک رسالہ میں ضبط کی اور اس کا نام القول الجلی رکھا ہے۔

تعلیم کا آغاز جب پانچویں برس آئی تو مکتب میں بیٹھا ساتویں برس پدر بزرگوار نے نماز پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کو فرمایا اور ختنہ بھی اسی برس میں واقع ہوئی۔ اور دل میں ایسا آرہا ہے کہ اسی سال کے آخر میں قرآن عظیم ختم کیا۔ اور کتب فارسیہ و مختصرات پڑھنی شروع کر دیئے دسویں برس میں شرح ملا پڑھتا تھا مطالعہ کی راہ فی الجملہ کھل گئی۔

شادی چودہویں برس بیاہ کی صورت ہوئی۔

بیعت پندرہویں برس والد سے بیعت کی اور اشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ میں مشغول ہوا۔ اور اسی سال کچھ بیضاوی پڑھی والد نے بہت سا کھانا تیار کیا اور خاص و عام کی دعوت کی اور فاتحہ اجازت درس پڑھی فنون متعارفہ سے حسب رسم اس دیار کے

تکمیل علوم پندرہویں برس فراغ حاصل ہوا۔

مختلف علوم و فنون کی جن کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھا ان کے نام علم حدیث شریف سے ساری مشکوٰۃ پڑھی گئی۔ اور صحیح بخاری سے کتاب الطہارت تک اور شمائل النبیؐ تمام اور کچھ بیضاوی و مدارک اور چند بار مدارست قرآن کریم میں ساتھ تدبر معانی اور شان نزول تفاسیر کی طرف رجوع کر کے خدمت میں والد کے حاضر ہوا۔ یہ معنی فتح عظیم کا سبب ہوا۔

اور فقہ سے شرح وقایہ و ہدایہ تمامہا مگر کچھ ذرا سا دونوں سے

اور اصول سے حسامی اور کچھ توضیح و تلویح سے

اور منطق سے شرح شمسیہ اور کچھ شرح مطالع

اور کلام سے پورا شرح عقائد مع بعض خیالی کے اور شرح مواقف

سلوک سے کچھ عوارف اور ایک پارہ رسائل نقشبندیہ وغیرہ سے

اور حقائق سے شرح رباعیات مولوی جامی رحمہ اللہ اور مقدمہ شرح لمعات

اور مقدمہ نقد النصوص

اور خواص اسمار و آیات سے مجموعہ خاص والد کا اور مائۃ فوائد

اور طب سے موجز القانون

اور حکمت سے شرح ہدایۃ الحکمۃ

اور نحو سے کافیہ و شرح ملاّ

اور معانی سے مطول و مختصر

اور ہیئت و حساب سے بعض رسائل مختصرہ

اور اس درمیان میں بلند باتیں ہر فن کی دل پر گزرتی تھیں۔

شاہ عبدالرحیم کا انتقال اور بیعت اور شادی کی اجازت سترہویں برس والد بیمار ہوکر انتقال فرما گئے اور بیعت و ارشاد کی اجازت دیدی اور مکرر یدہ کیدی کا کلمہ فرمایا۔ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد نے نہایت رضامندی میں فقیر سے انتقال فرمایا۔ اور ان کی توجہ طرف فقیر کے اوس توجہ کے مانند نہیں ہے جو آبار کو ابنا کے ساتھ ہوتی ہے۔

بارہ برس کتب درسیہ کی تعلیم دینا۔ اون کی وفات کے بعد بارہ سال کم و بیش کتب دینیہ و عقلیہ کے درس کے ساتھ مواظبت کی۔

فقہاء محدثین کی روش کا حاصل ہوجانا۔ بعد ملاحظۂ کتب مذاہب اربعہ اور ان کے اصول اور اون حدیثوں کے جو اون کا متمسک ہیں بمدد و فور غیبی روش فقہائے محدثین قرارداد خاطر ہوئے۔

سفر حجاز۔ بعد اس کے ۱۱۴۳ھ میں مشرف بحج ہوا۔ اور ایک سال مجاورت حرمین و روایت حدیث شیخ ابوطاہر مدنی وغیرہ مشائخ سے موفق ہوا۔ اور ہمراہ متوطنان حرمین۔ علماء وغیرہم کی رنگین صحبتوں کا اتفاق ہوا۔

شیخ ابوطاہرؒ سے خرقہ جامعہ کا ملنا۔

اور خرقۂ جامعۂ ابوطاہر کا پہنا کہ جس کو جمیع خرقہ ہائے صوفیہ کا حاوی کہہ سکتے ہیں۔

اس سال کے آخر میں حج ادا کر کے اوائل ۱۱۴۵ھ میں متوجہ وطن کا ہوا۔ روز جمعہ چودہویں رجب کو صحیح و سالم وطن میں پہنچا۔

نعمت عظمیٰ۔ نعمت عظمیٰ اس صفت پر وہ ہے کہ اس کو ناتجیت کا خلعت دیا اور دورہ ر بازپیس کا فتح اوس کے ہاتھ پر کیا اور ارشاد فرمایا کہ

اسرار و مصالح احکام کی تدوین مرضی فقہ میں کیا ہے اوس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی سرے سے بنیاد کی اور اسرار حدیث و مصالح و مصالح احکام و ترغیبات اور اس سب کو جو حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لائے ہیں۔

اور یہ وہ فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے اس فقیر کی بات سے مضبوط تر بات اس کو کسی نے ادا نہیں کیا ہے باوجود جلالت اس فن کے، اگر کسی کو اس حرف میں شبہ ہو تو اس سے کہہ کہ قواعد کبریٰ کو دیکھ کہ شیخ عزالدین نے اوس جگہ کیا کچھ جہد کیا ہے۔ اس فن کے عشر عشیر کو نہیں پہنچے۔

طریقہ سلوک کا الہام کیا جانا۔ اور طریقہ سلوک کا الہام فرمایا جو کہ اس زمانے میں مرضی حق ہے اور اس دورے میں فائز ہوتا ہے۔ اس کو ہمعات، الطاف القدس میں ضبط کیا ہے۔ اور قدمائے اہل سنت کے عقائد کا دلائل و حجتوں سے اثبات کیا اور اس کو معقولیوں کے خس و خاشاک سے پاک کیا اور ایسے طور پر مقرر کیا کہ بحث کا محل نہ رہا۔

علم کمالات اربعہ اور علم کمالات اربعہ یعنی ابداع و خلق و تدبیر و تدلی کا باوجود اس عرض و طول کے اور علم استعدادات نفوس انسانیہ کا بہ جمیعہا اور کمال و مآل ہر شخص کا افاضہ فرمایا۔ اور یہ دو علم جلیل ہیں اس فقیر سے پہلے کوئی اس کے گرد نہیں پھرا ہے۔

حکمت عملی کا افادہ۔ اور حکمت عملی کہ جس میں اس دورے کی صلاح ہے بوسعت تمام افادہ کی اور توفیق اس کے مضبوط کرنے کے ساتھ کتاب و سنت و آثار صحابہ کی دی۔

اور علم دین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے اور جو محرف و مدخول

ہے اور جو سنت ہے اور جو کچھ ہر فرقے نے بدعت نکالی ہے اس سب کی تمیز پر افادہ کیا۔

ولو ان لی فی کل منبت شعرۃ

لسانا لما استوفیت واجب حمدہ ؎ انتھی کلامہ

تصنیفات۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں اور سب کے سب نافع اور مفید اور بعض ان میں سے اپنے باب میں عدیم النظیر غیر مسبوق تھا۔

۱۔ حجۃ اللہ البالغہ

۲۔ ازالۃ الخفاء، یہ دونوں ۱۲۸۵ھ میں بصرف ہمت منشی محمد جمال الدین خاں مرحوم مدار المہام بھوپال طبع ہو چکی ہیں۔

۳۔ مصفی شرح فارسی موطا (۴) مسوی شرح عربی موطا

۵۔ فیوض الحرمین (۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین

۷۔ فوز الکبیر فی اصول التفسیر (۸) قول الجمیل

۹۔ ہمعات (۱۰) الطاف القدس (۱۱) تاویل الاحادیث (۱۲) مقالہ وضیہ فی النصیحۃ والوصیۃ۔ (۱۳) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (۱۴) انصاف فی بیان سبب الاختلاف (۱۵) سرور المحزون (۱۶) لمحات (۱۷) سطعات (۱۸) المقدمۃ السنیہ فی انتصار الفرقۃ السنیہ (۱۹) فتح الرحمٰن ترجمہ فارسی قرآن۔

(۲۰) انفاس العارفین (۲۱) خیر کثیر (۲۲) شفاء القلوب (۲۳) فتح الخبیر

۲۴۔ قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین (۲۵) البدور البازغہ (۲۶) الزھراوین۔

ان کے سوا ایک کتاب تفہیمات ہے اوس میں دو سو رسالوں سے زیادہ بلکہ کئی سو ہیں۔[1] الی غیر ذلک بلکہ تفہیمات میں فرمایا ہے۔

ومن نعم اللہ علی ولا فخر ان جعلنی اللہ ناطق ھذہ الدورۃ و

---

[1] ان کا یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ کتاب التفہیمات دو جلدوں میں مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کر دی ہے۔ اس میں تفہیمات سب آگئی ہیں۔

حکیمها وقائده هذه الطبقة و زعیمها نطق علی لسانی ونفث فی نفسی فان نطقت باذکار القوم واشغالهم نطقت بجوامعها واتیت علی مذاهبهم جمیعها وان تکلمت علی نسب القوم فیما بینهم وبین ربهم ذویت لی مناکبها وبسطت فی جوانبها وانیت ذروة سنامها وقبضت علی مجامع خطامها۔ وان خطبت باسرار اللطائف الانسانیة تغوصت قاموسها وتلمست ناعوسها وقبضت علی جلا بیبها واخذت بتلابیبها وان تمیطت ظهر علم النفوس وما لغها فانا ابو عذرتها آتیهم بعجائب لا تحصی وغرائب لا تکتنه ولا اکتناهها یرجی، وان بحثت عن علم الشرائع والنبوات فانا لیث عرینها وحافظ جر ینها ووارث خزائنها وباعث مغابنها ؎

وکم للہ من لطف خفی
یدق خفاه عن فہم الزکی

شرف الدین صاحب کتاب وسیلۃ الی اللہ کا بیان شیخ اکمل شرف الدین محمد نے اپنی کتاب مسمیٰ بوسیلۃ الی اللہ میں کہا ہے۔

ومن کان له لطف قریحة وطالع مصنفاته الشریفة وتحقق بقوانینها وقواعدها لم یبق له ریبة فی تصدیق هذا المطلب الاعنیٰ والمقصد الاقصیٰ قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر خصوصاً کتاب حجة اللہ البالغه واللمحات والطاف القدس و اللمعات والمکتوب المرسل الی المدینة والمسوی وغیر ذلك انتهیٰ

تفہیمات میں فرمایا ہے۔[1]

لما تمت بی دورة الحکمة البسنی اللہ خلعة المجددیة فعلمت علم الجمع بین المختلفات انتهیٰ

---

[1] تفہیمات ج ۱ ص ۱۲۵ سنہ ۱۳۵۵ھ

انصاف کی بات۔ انصاف یہ ہے کہ اگر ان کا وجود صدر اوّل اور زمانۂ ماضی میں ہوتا تو امام الائمہ وتاج المجتہدین میں شمار کئے جاتے ثنائے علمائے عصر ومشائخ دہر کی اون پر اس قدر ہے کہ یہ مختصر اس کے نقل کی طاقت نہیں رکھتا۔

اولاد۔ ایک جمع بے شمار نے ان کے حاشیۂ بساط علوم ظاہر و باطن میں تبحر حاصل کیا اور اعلائے مدارج کمالات صوری و معنوی کو فائز ہوگئے خصوصاً ان کی اولاد امجاد کہ ان میں سے ہر ایک بے نظیر وقت وفرید دہر و وحید عصر علم وعمل وعقل وفہم وقوت تقریر و فصاحت تحریر و تقوی و دیانت وامانت و مراتب ولایت میں تھا۔ اور اسی طرح ان کی اولاد کی اولاد ہے

این خانہ تمام آفتاب ست
این سلسلہ از طلائے ناب ست

شاہ صاحب کی پیشنگوئی اور اس کا مصداق۔ قول جلی میں ان کے کلام فیض نظام سے ذکر کیا ہے کہ فرمایا کہ یہ لڑکے کہ لطف الٰہی نے ہم کو عطا کئے ہیں سب سعداء ہیں ایک نوع کی ملکیت ان میں ظہور کریگی لیکن تدبیر غیب تقاضا کرتی ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں کہ مکہ و مدینہ میں سالہا احیائے علوم دین کریں اور اسی جگہ وطن اختیار کریں ماں کی طرف سے اون کا نسب ہماری طرف متمکن ہو کیونکہ آدمی زادہ ماں کے وطن کی طرف میلان طبعی رکھتا ہے انتقال ایک جماعت کا جو اپنی والدہ کے وطن میں متمکن ہوں کسی اور سرزمین کی طرف بالطبع مستحیل ہے مگر بقسر قاسر انتہی بلفظہ

محرر سطور کہتا ہے کہ مصداق اس آگاہی کا وجود ہر دو نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ کا ہے۔

مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ کی دہلی سے ہجرت کر کے مکۂ مکرمہ میں اقامت فرمائی اور سالہا باحیائے روایت حدیث شریف با اہل عرب و عجم مشغول رہے. واللہ اعلم

ولیکن اس وقت میں یہ خاندان علم و کمال کا بتمامہا منقرض ہوگیا اور کوئی ایک اون میں سے باقی نہ رہا۔ یفعل اللہ مایشاء و یحکم مایرید

نمونہ کلام عربی و فارسی - میل طبیعت کبھی طرف نظم عربی و فارسی کے بھی فرماتے تھے منجملہ اون کے منظومات کے ایک قصیدہ طویل الذیل ہے۔ نعت نبوی میں اول اس کا یہ ہے۔

کان نجوماً ادمضت فی الغیاھب
عیون الافاعی او رؤس العقارب

الی آخر القصیدۃ اور اشعار فارسی سے یہ اشعار ہیں۔

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی ست — واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست
جائے کہ بود جلوۂ حق عالم وقت — تابع شدن حکم خرد بو لہبی ست

کہ یاد دارد این حرف از فقیر خاکسار من
کہ ظلم عالم قدس ست انکار قبول او
ندارد باطنش از خویش آئینہ صفت رنگے
طلسم حیرت آمد ست تمکین و فضول او
شعاع آفتاب از راہ این روزن ہمی ریزد
بجز این نکتہ نتواں بست مضمونِ وصول او

نخستین بادہ کاندر جام کردند — مزاجش عکس آن گلفام کردند
شراب وحدت از خمخانۂ غیب — مرا صبح ازل در کام کردند
چو غلطیدم ز مستیہا بہر سو — حریفاں مستی از من دام کردند

دلے دارم ز خود حبابش میتواں گفتن — درد کیفیتِ جوش شرابش میتواں گفتن
سویدائے دل ما یابی اندر پیچ و تاب او — نفوس عالم ام الکتابش میتواں گفتن

تا بکے محنت مہجوری و دوری بکشم
نازنین وطنم سوئے وطن باز روم
تا بکے با خس و خاشاک بود صحبت من
صدرہ بزم چمنم سوئے چمن باز روم
تا بکے ہمدمے سنگ شود شیوۂ من
گوہرم از عدنم سوئے عدن باز روم

وفات۔ سنہ ۱۱۳۱ھ میں وفات پائی تاریخ وفات یہ مصرع ہے۔

او بود امام اعظم دیں

رضی اللہ عنہ وارضاہ آمین کذا فی الاتحاف

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے کتاب انفاس العارفین خاص ذکر والد ماجد حضرت شاہ عبدالرحیم رضی اللہ عنہ اور عم بزرگوار شاہ ابوالرضا محمد رضی اللہ عنہ میں تالیف فرمائی ہے۔ اس میں ان کے احوال و مقامات وکرامات وملفوظات ذکر کئے ہیں۔ چونکہ اس کے حصہ اول کے آخر میں چند کلمات سود مند لکھے ہیں ان کا لکھنا یہاں مناسب معلوم ہوا فرماتے ہیں کہ

اس فقیر نے بعض یاروں سے سنا تھا کہ نام ان کا عالم ملکوت میں ابوالفیض ہے میں نے تنہائی میں اس کا استفسار کیا۔ تبسم فرمایا اور کہا اسی طرح ہے۔ اور تیسرا نام ابوالفیاض ہے۔

شاہ عبدالرحیم رح کی نصیحتیں۔ ایک دن متصل نماز ظہر کے طرف متوجہ ہوئے۔ اور فی البدیہہ یہ دو بیتیں فرمائیں۔

گر تو راہِ حق بخواہی اے پسر — خاطرکس را مرنجاں الحذر
در طریقت رکن اعظم رحمت ست — ایں چنیں فرمود آں خیر البشر

اس وقت فرمایا کہ دوات و قلم حاضر کرو اور اس کو لکھو۔ حضرت حق سبحانہ نے

ناگاہ دل میں القا فرمایا ہے تاکہ تجھ کو اس کی وصیت کروں اس وقت اشارہ فرمایا کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے شکر اوس کا لازم ہے۔ انفاس نفیسۂ ایشاں سے یہ دو بیت ہیں۔

اے کہ نعمت ہائے تو از عد فزوں
شکر نعمت ہائے تو از حد بروں
عجز از شکرِ تو باشد شکر ما
گر بود فضلِ تو مارا رہنموں

اس فقیر کو مجلس صحبت میں حکمت عملی اور آداب معاملہ بہت سکھاتے تھے منجملہ ان کے جو کچھ حافظہ میں رہا ہے یہ ہے کہ فرماتے تھے کہ

مجلس میں برائی مت کر کہ اہل پورپ میں ایسے ہیں۔ اور اہل پنجاب ایسے ہیں اور افغان ایسے ہیں اور مغل ایسے ہیں شاید درمیان ان کے کوئی آدمی اوس قوم کا اہل حمیت اس قوم سے ہو تو اس کو برا لگے اور صحبت منغص ہو جائے،

فرماتے تھے کہ کوئی بات مخالف جمہور کے عام مجلس میں ہرگز زبان پر مت لا۔ گو وہ بات نفس الامر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس پر انکار کریں اور صحبت منغص ہو جائے فرماتے تھے اگر تجھ کو کسی سے کوئی حاجت ہو تو اس کے واسطے ایک تمہید شائستہ کر اور اس حاجت کی طلب میں تدریج کر ایسا نہ چاہیئے کہ بات کو پتھر کی طرح ڈالدے فرماتے تھے مجلس عام میں ہرگز کسی پر رد صریح مت کر۔

فرماتے تھے کہ آدمی کا لباس و زیّ ایسا ہونا چاہیئے کہ اس کی صنعت و کمال پر مشعر ہو مثلاً جو آدمی دانشمند ہے اسے چاہیئے کہ دانشمندوں کا لباس پہنے۔ اور انہیں کے آئین کے ساتھ زندگانی کرے۔ اور جو فقیر ہے اس کو چاہیئے کہ فقیروں کا لباس پہنے اور انہیں کے آئین سے زندگانی کرے۔

فرماتے تھے کہ بزرگوں کے مخاطبہ میں سخن مغلق و موجز و آہستہ روا نہیں ہے

فرماتے تھے کہ اگر تجھ سے شجاعت یا سخاوت یا فتوت ظہور میں آئے تو چاہیئے

کہ ابنائے روزگار اس کو تجھ سے دیکھیں۔

عیادت کے مقصود اعظم اس سے رضامندی مریض کی ہے نہ محض اطلاع اوس کی کیفیت مزاج پر اور اسی طرح تعزیت اور ایسے سفارش اور مثل ان کے پس جو شخص یہ سب کام بجالائے اور صاحب معاملہ کو محنت پر مطلع نہ کیا تو اپنی محنت کو ضائع کردیا اور اسی طرح ہر وہ چیز جس سے مقصود اقامت مصلحت موافقت و تالیف میان جمہور مردم کے ہو۔

محل تو دیع یاراں ہیں اور ان کی وصیت ہیں یہ بیت بہت پڑھتے تھے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

فرماتے تھے جن لوگوں کا مرتبہ تیرے مرتبے سے فروتر ہے اگر وہ ابتدا بالسلام کریں تو اس کو ایک نعمت نعم الہی سے جان اور شکر اس کا بجالا اور اون کے روبرو منبسط ہو اور اون کے حال کا تفقد کر بہت ہوتا ہے کہ ادنیٰ التفات جو تیرے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتا ہے وہ اون کی آنکھ میں عظیم دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ پورا اعتنا کرتے ہیں اور اگر اس کو نہیں پاتے ہیں تو غمگین ہوتے ہیں۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ می تواں خرید

خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند

فرماتے تھے احمقوں کی خصلت سے ہے کہ ساتھ کسی لباس و عادت کے نشانمند ہوتے ہیں یا تکیہ کلام مقرر کرتے ہیں یا کوئی کھانا مقرر کر لیتے ہیں کہ اس سے متنفر ہوتے ہیں اور لوگ اوس کے بدب سے مسخرا پن کرتے ہیں۔

فرماتے تھے بعض آشنا محبت ذاتی رکھتے ہیں کہ اگر محبت بتدریج اون کے دل میں جگہ پکڑتی ہے۔ بعد اس کے کسی حالت میں اون کے دل میں سے باہر نہیں جاتی ہے نہ سرّائیں نہ ضرّائیں اس یار کو غنیمت شمار کرنا چاہیئے اور فرزند سے بہتر رکھنا چاہیئے۔

اور بعض آشناؤں کی آشنائی کا سبب ظہور کسی فضیلت کا ہے تجھ سے یا ارتباط کسی حاجت کا ساتھ تیرے۔

قدر ہر آدمی کی پہچاننا چاہیئے اور سب کو ایک منزلت ورتبے میں نہ رکھنا چاہیئے اور کسی آدمی پر زیادہ اس سے جو اس کا مرتبہ ہے اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔

فرماتے تھے کہ عاقلوں حکیموں کا یہ کام ہے کہ فقط استیفاء لذت مقصود نہ ہو بلکہ یوں چاہیئے کہ وہ ضمن میں کسی دفع حاجت یا کسی فضیلت کے اقامت یا کسی سنت کی ادائی میں واقع ہو۔

فرماتے تھے بات کہنے، رستہ چلنے، بیٹھنے اوٹھنے میں اقویا کی رسم و عادت پر کام کر اگرچہ تو ضعیف ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی عیب یا جبن یا بخل ناگاہ تجھ سے صادر ہو جائے تو اوس کے کتمان واخفا میں کوشش کرنا چاہیئے اور اوس سے شرمگیں ہونا چاہیئے اور خود کو بتکلف صفتِ مقابل ظاہر کرنا چاہیئے تاکہ نفس اوس آداب کے ساتھ خوگر ہو جائے۔

جب بات چیت سفر کے حال میں ہوتی تو چوروں اوچکوں سے بچاؤ کرنے میں غلو کرتے اور اس باب میں اپنے وقائع جو کہ سفر اکبرآباد میں دیکھے تھے بیان فرماتے۔

شاہ ولی اللہؒ

اور

شاہ رفیع الدین دہلویؒ

(مجلہ الرحیم، مئی 1966ء)

شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدین دہلوی

محمد عبدالحلیم چشتی

عبدالرحیم ضیاؔ نے جن کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ المتوفی سنہ ۱۲۳۹ھ سے بدو واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، شاہ صاحب اور ان کے متعلقین اور منتسبین کے حالات میں ایک کتاب بنہایت جانفشانی سے مرتب کی ہے، جس کا تاریخی نام مقالات طریقت (۱۲۵۱ھ) المعروف بہ فضائل عزیزیہ ہے۔ اس کتاب میں بعض بنہایت مفید اور نادر معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں جو اور کتابوں میں نہیں ملتیں۔ مثلاً شاہ عبدالعزیزؒ کا سراپا اسی کتاب میں نظر سے گزرا اور کسی کتاب میں نہیں ملا۔ نوے برس پہلے سنہ ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں کرقان محمد محی الدین نے اپنے مطبع متین کرتان حیدرآباد میں طبع کرائی تھی۔ پھر شائع نہیں ہوئی، اب یہ کمیاب ہی نہیں نایاب بھی ہے۔

شاہ صاحب اور ان کے متعلقین اور منتسبین پر لکھنے والوں نے اس کتاب سے اعتنا کیا ہے۔ چنانچہ منشی محمد جعفر تھانیسری نے تواریخ عجیبہ موسوم بسوانح احمدی میں سید شہیدؒ کے حالات میں اس کتاب سے فائدہ اٹھایا ہے اور بالغ نظر تذکرہ نگاروں میں سے مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی لکھنوی نے مقالات طریقت سے پورا پورا استفادہ کیا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمہما اللہ کے تذکرہ میں اس کتاب سے بڑی قیمتی معلومات نقل کی ہیں۔ اور حوالہ بھی دیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سیرت سید احمد شہید میں اس کتاب سے اعتنا نہیں کیا اور نہ مولانا غلام رسول مہر نے سید شہیدؒ میں اس کتاب سے کچھ فائدہ اٹھایا ہے۔ حالانکہ ان کے پیشرو منشی محمد جعفر

تھانیسری نے تواریخ عجیبہ میں جا بجا اس کا حوالہ دیا ہے۔

محمد عبدالرحیم ضیاؔ نے اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں جو جانفشانی کی ہے اور جس طرح اس کو مرتب کیا ہے اس کا اندازہ دیباچۂ کتاب سے کیا جاتا ہے وہ لکھتے ہیں:-

"اما بعد خاکپائے بندگان خدا، عبدالرحیم ضیا، عفی اللہ ذنوبہ وستر عیوبہ ساکن بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد، لازالت مصونۃ عن الفساد والفتن، گزارش کرتا ہے کہ اگرچہ حالات حضرت رفیع المنزلت، اعلم العلماء، افضل الفضلاء اکمل الکملا، اعرف العرفا، شرف الافاضل فخر الاماثل، خاقان اقالیم تحقیق قہرمان ممالک تدقیق، امام المفسرین ہمام المحدثین معتمد فضلائے جلیلہ، مستند عرفائے نبیلہ، قدوۃ المتکلمین اسوۃ المحققین، سند العلماء والاولیاء سید النقباء والنجباء، قدوۃ مقبلان درگاہِ لاہوتی، دیدۂ واصلان بارگاہ جبروتی، مکمل مدارج درجات عالی، مقتدائے اداتی واعالی، مجدد روزگار، مظہر پروردگار، والاجناب قطب الاقطاب، محی السنہ، قامع البدعہ، مروج احکام وجیہہ، دافع منکرات سیئہ مفیض الثقلین مقبول رب الکونین، المولوی المعنوی الفائق بین الآفاق بالفضل والتمیز، مولانا و مرشدنا حضرت حافظ شاہ عبدالعزیز، دہلوی قدس سرہ وروح روحہ، وافاض الینا برکاتہ وفتوحہ کے بعض تذکروں میں بزرگوں کے مختصر مختصر مذکور اور مغتنم وعداں جناب حاجی نواب مبارک علی خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ مرید خاص حضرت معزز نے جو ایک رسالہ مسمی بہ کمالات عزیزی ۱۲۸۹ھ میں لکھا ہے۔ اس میں بھی مجملاً مسطور ہیں مگر آج تک اس نابغۂ روزگار کو کوئی کتاب تفصیل وار نظر نہ آئی اور اکثر مستفیضان حضرت نے عدم کی بستی بسائی اور کمالات اس ذات بابرکات کے دہی پروردگار بحد و بے شمار ہیں بے اختیار جی چاہا اور یہ شوق دل میں آیا کہ حتی المقدور کوشش بسیار و صحت بے شمار سے آپ کے حالات و کمالات جمع کر کے ایک کتاب بالتفصیل جس قدر ممکن ہو مرتب کیجئے اور اس کا صلہ خدائے تعالیٰ کے فضل سے آپ کے روح پر فتوح سے لیجئے۔ اس لئے اکثر روایات اہل ہند ثقات سے کہ بعض ان میں صحبت یافتہ حضرت کے ہیں۔ جمع کر کے جو الحاب کہ اس طریق سے حاصل نہ ہوئے ان کو بذریعۂ تحریر جناب فضیلت مآب مقبول خدا و رسول حادی فروع

واصول، محی مراسم سنن حضرت رسالت پناہی، مورد تجلیات الٰہی، مولانا حافظ حاجی محمد عبدالقیوم صاحب دہلوی، سلمہ اللہ العزیز القوی داماد و شاگرد مولانا محمد اسحاق علیہ الرحمہ سے بعد دریافت و تحقیق کے اس کتاب میں لکھا اور اس کو چھ مقالے اور ایک خاتمے پر تمام کیا۔

مقالہ اول در مجمل حالات از ولادت تا وفات

مقالہ دوم در امور متعلق ظاہر و باطن

مقالہ سوم در تعبیر رویا

مقالہ چہارم در اجوبۂ اسولہ

مقالہ پنجم در سلاسل طریقت

مقالہ ششم در حالات خلفا

خاتمہ در ذکر حضرت سید شاہ محی الدین قادری ویلوری مدنی قدس سرہ

اور حسب ایمائے مشفقی فدا علی صاحب فارغ تخلص کے ضیائے طینت (۱۲۹۰ھ) ابتداء کی تاریخ مقالات طریقت (۱۲۹۱ھ) انتہا کا سال اختتام رکھا جو سہو و خطا اس کتاب میں واقع ہوا ہو اس کو خدائے تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے معاف کر کے قبول فرمائے اور جن حضرات نے میری اعانت کی ہے ان کے مقاصد دارین برلائے۔"

مقالات طریقت میں موصوف نے شاہ عبدالعزیز کے تذکرہ سے پہلے شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدین وغیرہ کا بھی کچھ حال لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے متعلق بعض معلومات خوب ہیں اور شاہ رفیع الدین کے سلسلہ میں بعض باتیں قابل توجہ ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہے کہ ان بزرگوں کے نقل احوال میں ہم نے مؤلف کی ترتیب کو برقرار رکھا ہے۔ البتہ عنوانات کا اضافہ جا بجا کر دیا ہے اور یہ ایک ناگزیر امر تھا

(چشتی)

عبدالرحیم ضیاء نے شاہ ولی اللہؒ کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا ہے۔

زاہدِ صومعۂ تدقیق، قطب دائرۂ تحقیق، سحابِ ممطرِ لآلی نکاتِ شریفہ، بحرِ زخار درر دقائق لطیفہ، رافع اعلام علم و

حکمت، بانی مبانی شرع و ملت، مرشد انام، مرجع خواص و عوام
آیۃ من آیات اللہ، مولانا قطب الدین، المعروف بہ حافظ
حاجی شاہ ولی اللہ محدث قدس اللہ سرہ

ولادت

"ولادت آپ کی ۱۱۱۵ھ میں ہے کیونکہ نام تاریخی عظیم الدین ہے۔"[۱]

تعلیم و تربیت

"بعد پہنچنے سن تمییز کے آپ نے تمام علوم اپنے پدر بزرگوار سے اور مولانا حاجی محمد افضل سیالکوٹی[۲] سے حاصل کیا ہے۔"[۳]

آداب درس و تدریس

"معمول تھا کہ آپ سبق پڑھاتے وقت رو بقبلہ دو زانو مودب بیٹھتے تھے۔

عادات و اطوار

"اور ہر روز عادت تھی کہ صبح کو غسل کرتے۔ نیا یا دھویا ہوا لباس پہنتے تھے نظافت صفائی اور ستھرائی، کو بہت دوست رکھتے تھے۔ مزاج میں ضبط اس طور تھا کہ آپ کو مدت تک خارش کی شکایت تھی تو شب کو سوتے وقت جسم کھجلاتے تھے اور کوئی وقت کسی نے آپ کو کھجلاتے ہوئے نہ دیکھا۔"

بیعت طریقت

"اپنے والد ماجد سے آپ نے بیعت طریقت کی تمام فیوض باطن اور اشغال مشہورہ اور جمیع آداب طریقت ان سے سیکھا پدر والا قدر نے اپنی اخیر عمر میں ان کو اجازت تلقین و بیعت و صحبت و توجہ سرفراز فرمائی اور اور فرمایا یدہ کیدی (ان کے ہاتھ پر بیعت میرے ہاتھ پر بیعت کی طرح ہے۔ ان کی رحلت کی وقت آپ کی عمر سولہ برس چھ مہینے کی تھی یک

مزار پدر پر مراقبہ

"آپ مزار پر انوار پدر بزرگوار پر اکثر اوقات مراقب رہتے تھے۔ راہ حقیقت خدائے تعالیٰ کے فضل سے کشادہ ہوتی تھی۔ یہ تمام انفاس العارفین اور قول الجلی فی ذکر آثار الولی میں مفصل مذکور ہے۔"

سفر حجاز اور شیوخ حرم سے اجازت روایت وتلقین

"من بعد جب حج اور زیارت مدینہ طیبہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشرف ہوئے تو تجدید اجازت علوم ظاہر و باطن عمدۃ العلماء العرفا، حضرت شیخ ابوطاہر مدنی قدس سرہ سے کی۔ اس اثنا میں جو حقائق و علوم کہ آپ کے دل پر کھلے ہیں وہ حد بیان سے باہر ہیں چنانچہ خود استاد شیخ ابوطاہر قدس سرہ فرماتے تھے کہ

یہ شخص مجھ سے لفظ کی سند کرتا ہے اور میں اس سے معنی کی سند کرتا ہوں۔

ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

علوم میں تبحر اور ترویج علوم و تدوین معارف

"علوم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول و عقائد و آداب و علم حقایق و الہیات وغیرہ میں وحید العصر تھے۔ قدرت خدا کی معمور ہے اگرچہ ہمعصروں سے بھی آپ کے کوئی اس پایہ کا ہوا ہوگا مگر ترویج علوم ادیان اور تدوین اسرار و معارف الٰہی اور تاویل مقطعات و ترجمہ قرآن و تسہیل مطالب اور تطبیق منقول با معقول اور تبیین مسائل بعبارات مختصرہ اور اشارات لطیفہ میں فرید الدہر تھے دعویٰ بے دلیل باطل ہوتا ہے اس دعوے پر یہ آپ کی مصنفات دال اور مظہر کمال ہیں۔

تصانیف

(۱) انفاس العارفین (۲) انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (۳) قول الجمیل (۴) خیر کثیر الملقب بخزائن الحکمتہ (۵) تفہیمات الٰہیہ فی علم الحقائق (۶) لمحات (۷) ہمعات - (۸) الطاف القدس (۹) فتح الودود فی معرفتہ الجنود (۱۰) بدور بازغہ (۱۱) تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء والمرسلین (۱۲) کشف الغین فی شرح الرباعیتین (۱۳) فیوض الحرمین (۱۴) قرۃ العینین فی اثبات فضیلت الشیخین (۱۵) حجتہ اللہ البالغہ فی اسرار الحدیث وحکم الشریعہ (۱۶) سطعات (۱۷) لمعات (۱۸) واردات (۱۹) مکتوبات (۲۰) در الثمین فی مبشرات النبی الامین (۲۱) فتح الرحمٰن فی علوم القرآن (۲۲) الفوز الکبیر فی قوانین التفسیر (۲۳) المسوی شرح الموطا (۲۴) ہمعات الاصول (۲۵) الانوار المحمدیہ (۲۶)

فتح السلام (۲۷)، المقدمۃ السنیہ (۲۸)، مصفیٰ ترجمہ مسوی (۲۹)، سلسلات (۳۰)، مبشرات (۳۱)، الارشاد الی علوم الاسناد (۳۲)، التنبیہ علی ما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ (۳۳)، تفسیر سورہ بقر وآل عمران (۳۴)، رسالہ مکتوب مدنی (۳۵)، رسالہ در ذکر روافض (۳۶)، در گوہر مراد (۳۷)، حسن العقیدہ (۳۸)، ازالۃ الخفا عن خلافۃ الخلفاء (۳۹)، عقد الجید فی بیان التقلید (۴۰)، سرور المحزون (۴۱)، رسالۃ النوادر فی احادیث سید الاوائل والاواخر (۴۲)، شرح حزب البحر (۴۳)، انصاف فی بیان سبب الاختلاف (۴۴)، کشف الانوار (۴۵)، وصیت نامہ وغیرہ۔

موصوف کے متعلق شاہ عبدالعزیز کا بیان

مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ آپ کے مناقب میں لکھتے ہیں۔

آیۃ من آیات اللہ ومعجزۃ نبیہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

علوم ومعارف میں سند مسلسل اور فیض بلا واسطہ آنحضرتؐ

ظاہر میں اگرچہ آپ کو اتصال صحیح ساتھ تمام خانوادوں کے حاصل ہے مگر باطن میں بیعت اور اجازت خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے سرفراز ہے چنانچہ انتباہ میں فرماتے ہیں۔

وچوں ایں فقیر بزیارت مدینہ رسید مدتے بر قبر مبارک متوجہ شد مراتب جذب وسلوک ہمہ از ابتداء تا انتہا در نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم طے کرد آنگاہ ایں فقیر را بہ زکی وحکیم ملقب ساختند وطریقہ عنایت فرمودند وآنچہ در علم مشکلات داشتم بر سیدم جواب باصواب ظاہر نمودند اکثر آں چیزہا در رسالہ فیوض الحرمین مرقوم نیست اینجا نوشتہ شد ایں فقیر در جناب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرض کرد بود بوجہے از کلام روحانی کہ آنحضرتؐ چہ می فرمایند در فرقہ شیعہ کہ حجت اہل بیعت دعویٰ می کنند و با اصحاب آں حضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم عداوت دارند۔

افادہ فرمودند کہ مذہب ایں جماعت باطل است وبطلان مذہب ایشاں از تامل در تعریف امام کہ ایشاں مقرر کردہ اند ظاہر خواہد شد۔

بعد از افاقہ ازاں حالت در معنی امام تامل کردہ شد معلوم گشت کہ ایشاں می گویند
کہ امام معصوم مفترض الطاعۃ می باشد و وحی باطنی کہ عبارت از القائے حکم الٰہی
بردل است بطریق اجتہاد یا الہام یا امن از خطا دراں مسئلہ او را اثبات می کنند
وی گویند او را خدائے تعالیٰ نصب کردہ است برائے مردماں "تا ایشاں را احکام
الٰہی رسانند و بحقیقت معنی نبوت ہمیں خصال رجوع می کنند زیرا کہ بعثۃ اللہ
لتبلیغ الاحکام حاصلش ہمیں نصب وافتراض طاعت است۔

پس بحقیقت ایشاں قائل بختم نبوت نیستند و ائمہ را رضی اللہ عنہم معنی نبوت اثبات
می کنند اگرچہ نام نبوت نگویند و ہل عقیدۃ اقبح من ذلک انتہیٰ۔

حکیم امت

اس واسطے آپ حکیم محمدیہ لکھے جاتے ہیں؟

اولاد کی تربیت

حضرت شاہ صاحب مُعَمَّمْ کا تصرف روحانی بھی بہت قوی تھا۔ چنانچہ مولوی عبدالقیوم
صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ثقات سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ
کو توجہ اپنی اولاد کی تعلیم تکمیل کی طرف بدرجہ اتم تھی، ابھی اس کام سے فراغ حاصل نہ ہوا
تھا کہ اجل موعودہ پہنچی تو چالیس سال تک عالم برزخ میں اس عالم کی طرف متوجہ اور تربیت
و تعلیم ابنائے کرام میں مصروف رہے چنانچہ مرزا جانجاناں صاحب مظہر علیہ الرحمۃ کہ
کمل وقت اور حین رحلت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ حاضر تھے اس عالم کی طرف ان
کی توجہ پر تاسف فرماتے تھے۔

جناب مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمۃ یہ کیفیت مرزا صاحب سے دریافت
کر کے فرمایا کہ یہ توجہ ہماری تکمیل کے واسطے ہے۔

وفات۔ وفات آپ کی ۱۱۷۶ھ ہجری میں واقع ہے، نظم

تھی عجب ذاتِ مکرم شہ ولی اللہ کی ذات
فیض بخش نسل آدم شہ ولی اللہ کی ذات

رونقِ دینِ محمد واقف سر الٰہ
حامی شرع معظم شہ ولی اللہ کی ذات

کیا عجب گر منکشف اسرار عالم آپ سے ہوں
راز سے حق کے تھی محرم شہ ولی اللہ کی ذات

بس ہے یہ فضل و شرف اس شاہ والا کا کہ تھی
ذات آنسرور سے ہمدم شہ ولی اللہ کی ذات

گر خدا چاہے تو ہونگے اولیا میں اے ضیاؔ
کیونکہ رہبر رکھتے ہیں ہم شہ ولی اللہ کی ذات

شاہ صاحب کا عقد اوّل و فرزند اکبر

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا۔ ان سے مولوی محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے تھے اور آپ بڑے ولی کامل تھے آپ پر جذب بہت غالب تھا۔

عقد ثانی اور ابناء اربعہ

بعد انتقال والدہ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب موصوف نے دختر نیک اختر سید ثناء اللہ صاحب ساکن قصبہ سونپت مسماۃ بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی ان سے چار فرزند پیدا ہوئے۔

اوّلیں مولانا شاہ عبد العزیز

دوّمیں مولوی رفیع الدین

سوّمی شاہ عبد القادر

چہارمی مولوی عبد الغنی

اور ایک دختر مسماۃ بی بی امۃ العزیز

دختر مذکورہ کو مولوی محمد فائق بن مولوی محمد عاشق بن شاہ عبد اللہ بن شیخ محمد پھلتی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے شادی کر دی، ان کا سلسلہ اب تک باقی ہے۔

شاہ رفیع الدینؒ دہلوی

عبدالرحیم ضیاؔ نے شاہ رفیع الدین دہلوی کا تذکرہ ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا ہے۔

جناب مولی الکرام، مخدوم الانام، عامل باعمل، فاضل اجل، اسوۂ افاضل عرب و عجم زبدۂ ارباب ہمم، مسند اکابر روزگار، فخر کملائے شہر و دیار، محی الشرع والسنہ ماحی ہوی و بدعہ، موسس اساس دین مبین، ہادینا و مولانا حضرت شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ العزیز۔

کنیت

"کنیت آپ کی ملاء اعلیٰ میں ابوالعجائب والغرائب ہے"

تحصیل و تکمیل

"شاہ ولی اللہ صاحب کی رحلت کے وقت آپ میبذی پڑھتے تھے تمام علوم منقول و معقول اپنے برادر بزرگوار حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت فیض درجت میں تحصیل کئے"

رام پور میں ورود اور حافظہ کا امتحان

جناب مولوی حاجی حافظ احمد علی صاحب مولانا عبدالقیوم صاحب سے سلمہا اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں کہ

جب حضرت شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ کا ہنود کے قصے کے سبب سے رامپور میں تشریف فرمائی کا اتفاق ہوا تو وہاں کے لوگ دنے، بطور امتحان سوالات شروع کئے۔ آپ فرماتے تھے کہ جاؤ کل جواب دونگا۔ وہ سوالات رکھ جائیں تو آپ دوسرے دن اسی پر جوابات لکھ کر دے دیتے خدائے تعالیٰ کے فضل و کرم سے کسی جواب میں آپ کو تامل واقع نہ ہوا۔

وہاں کے علماء اور طلبا کو رشک پیدا ہوا وہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح سے آپ کو بند کیجئے تو ایک طالب علم نے شعرائے جاہلیت کے قصیدوں میں سے نوسو نوے شعر کا ایک قصیدہ تھا۔ اس قصیدے کے کسی شعر کا پہلا مصرع اور کسی شعر کا دوسرا مصرع لکھکر خدمت عالی میں لایا اور عرض کیا کہ اس کا جواب دیجئے۔ حسب عادت فرمایا کہ رکھ

وہ کل لیجانا آپ نے اس قصیدہ کے اول و ثانی تمام مصرعہ لکھ دیئے دوسرے دن وہ طالب آیا اس کو حوالہ کیا۔ وہ دیکھکر متحیر ہوا اور کہنے لگا کہ یہ تو آپ کی عجیب و غریب کرامت ہے۔ آپ نے فرمایا کرامت نہیں یہ قصیدہ مجھکو یاد ہے اور اس قسم کے قصیدے طویل شعرائے جاہلیت کے نو سو یاد ہیں۔

سبب یاد کرنے کا یہ ہوا کہ جب میں برادر بزرگوار مولانا شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں تفسیر جلالین شروع کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ لطف تفسیر کا جب ہے کہ کچھ کلام ان شعرا اور بلغا کا جن کے معارضے میں یہ کلام نازل ہوا ہے یاد ہو تو جب میں نے قصائد اور خطبے شعرائے جاہلیت مثل امرءالقیس وغیرہ کے یاد کئے تھے

کیا حافظہ اور کیا علم و فضل ہوا اسی پر قیاس کیا چاہیئے۔

بیعت طریقت

آپ کو بیعت طریقت و اجازت جناب مولوی شاہ محمد عاشق صاحب پھلتی قدس سرہ سے تھی

شاہ محمد عاشق صاحب خلیفہ طریقت اور خواجہ تاش اور ماموں کے فرزند حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ کے ہیں بڑے ولی کامل صاحب کشف و کرامات تھے سبیل الرشاد سلوک میں اور قول الجلی فی آثار ذکر الولی، حالات میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے آپ کی تصنیفات سے ہیں۔

اور شاہ رفیع الدین صاحب کو باوجود اس پایہ علوم ظاہری کے کمالات درویشی میں ایسا غلو تھا کہ دوسرے کو کم ہوگا۔ کسی مجذوب سے بھی آپ کو فیض حاصل تھا اسی واسطے قوت باطن بہت قوی رکھتے تھے۔

سخاوت و شجاعت - سخاوت و شجاعت میں بھی یکتائے عصر و فرید الدہر تھے۔

اولاد - آپ کے چھ فرزند تھے۔

۱- مولوی محمد عیسیٰ (۲) مولوی مصطفیٰ (۳) مولوی مخصوص اللہ (۴) مولوی محمد حسین۔ (۵) مولوی موسیٰ (۶) مولوی محمد حسن۔

اولاد شاہ ولی اللہ صاحب کی آپ ہی سے باقی ہے۔ چنانچہ مولوی محمد حسن صاحب تمنا

کے فرزند مولوی احمد حسن اور چند صاحبزادیاں بقید حیات ہیں۔

منجملہ اولاد شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ جناب معلی القاب مولانا و ہادینا حقائق پناہ مولوی مخصوص اللہ صاحب قدس سرہ بڑے صاحب کمال علوم ظاہر و باطن میں بے مثال تھے۔

وفات

مولانا رفیع الدین صاحب بنجم ماہ شوال ۱۲۳۳ھ کو شہر دہلی میں حضیض دار فانی سے اوج علیین کی طرف مرتقی ہوئے۔ نظم و نثر عربی میں بھی یکتائے روزگار تھے۔

تصنیفات

اور مصنفات بھی بہت ہیں ایک رسالہ معراج میں اور ایک تحقیق الوان میں سوا ان کے اور بھی مشہور ہیں مگر ترجمہ تحت لفظی قرآن شریف کا بعض کہتے ہیں کہ آپ نے شروع کیا تھا مگر ناتمام رہا دوسروں نے تمام کر کے آپ کے نام سے شہرت دی واللہ اعلم

حواشی

لہ صحیح تاریخ ولادت ۱۴ شوال ۱۱۴۷ھ ہے اور تاریخی نام عظیم الدین ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسور کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے کیونکہ ابجد کے حساب سے سال ولادت ۱۱۵۰ھ ہو برآمد ہوتا ہے جیسا کہ مؤلف موصوف نے ذکر کیا ہے۔

ﷺ حاجی محمد افضل سیالکوٹی المتوفی ۱۱۴۶ھ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ" از راقم السطور، شائع کردہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی ۱۹۶۴ء ص ۲۹۵

سلہ تفصیل کے لئے دیکھو "الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف" مطبع احمدی دہلی ص ۲۷ اور القول الجمیل مع شرح شفاء العلیل، مطبع مجیدی کانپور ۱۳۱۹ھ ص ۱۶۳

ﷺ شاہ عبدالرحیم دہلوی کا انتقال ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ میں ہوا تھا ہم نے جو تاریخ ولادت نقل کی ہے اس کے حساب سے شاہ صاحب کی عمر اس وقت سترہ برس چھ مہینے کی تھی۔

ﷺ شیخ ابو طاہر کردی المتوفی ۱۱۴۵ھ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو۔ فوائد جامعہ بر

عجالہ نافعہ ۹ ص ۲۹۷ تا ۳۰۵

۶ حجۃ اللہ البالغہ کا پورا نام پہلی مرتبہ اسی کتاب میں نظر سے گزرا

۷ اس کا صحیح نام فتح الرحمٰن بترجمۃ القرآن ہے

۸ اس کتاب کا صحیح نام الفوز الکبیر فی اصول التفسیر ہے۔

۹ مصفی موطا، کی فارسی زبان میں نہایت مبسوط شرح ہے مسویٰ کا ترجمہ نہیں ہے، چنانچہ

۱۰ یہ بڑے کام کی بات ہے۔

۱۱ بوڈھانہ ایک قصبہ ہے ضلع میرٹھ سے اٹھارہ کوس پر مولوی عبدالحیؒ صاحب علیہ الرحمہ کا وطن ہے منہ

۱۲ سونی پت ایک قصبہ ہے دہلی سے بیس کوس پر مغرب کی جانب۔

المسوی من احادیث الموطا

(عربی)

حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۴۳ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں جگہ بہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کی الموطا، کی فارسی شرح المصفیٰ پر جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا۔ اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ قیمت بیس روپے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدرآباد

سراج الہند

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

از: جناب مولانا عبدالحلیم چشتی

عبدالعزیز اصلی نام ہے اور تاریخی نام غلام حلیم ہے، سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک منتہی ہے۔

موصوف دہلی میں جمعہ کے دن ۲۵/رمضان المبارک ۱۱۵۹ھ-۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے، حافظہ اور ذہانت خداداد تھی، قرآن مجید کے ساتھ فارسی بھی پڑھ لی اور گیارہ برس کی عمر میں عربی تعلیم کا انتظام ہوا اور پندرہ سال کی عمر میں جملہ علوم رسمیہ سے فراغت حاصل کرلی، شاہ صاحبؒ نے علوم عقلیہ کی تحصیل والد بزرگوار کے بعض شاگردوں سے کی اور حدیث وفقہ شاہ ولی اللہؒ نے خود پڑھائی تھی، ابھی سترہ برس کے تھے کہ شاہ ولی اللہؒ کا انتقال ہوگیا تو شاہ ولی اللہؒ کے تلمیذ خاص محمد عاشق پھلتیؒ سے تکمیل کی، موصوف چوں کہ شاہ صاحبؒ کے سب سے بڑے فرزند تھے اور علم وفضل میں بھی سب سے ممتاز تھے، لہٰذا مسندِ درس وخلافت ان ہی کے سپرد ہوئی، اور موصوف درس وتدریس، ہدایت و ارشاد اور تصنیف وتالیف میں ہمہ تن مصروف ہوگئے، شاہ صاحبؒ کو تمام علوم متداولہ اور فنون عقلیہ ونقلیہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی، حافظہ بھی بلا کا قوی تھا، تقریر معنی خیز وسحر انگیز، مرتب ودل نشین ہوتی تھی، جس نے آپ کی ذات کو مرجع عوام وخواص بنادیا تھا، علوئے اسناد کی وجہ سے دور دور سے لوگ سفر کرکے حلقۂ درس میں شرکت کرتے اور سند فراغ حاصل کرتے تھے، درس وتدریس، افتاء وتصنیف، فصلِ خصومات، پند وموعظت اور شاگردوں کی تربیت میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے، موصوف

کی ذات سے ہندوستان میں علوم اسلامیہ خصوصاً حدیث وتفسیر کا بڑا چرچا ہوا، مسلمانوں کی اصلاح ہوئی اور فتنوں کا سدّ باب ہوا، ان ہی کی مساعی جمیلہ، نالہُ نیم شبی اور توجہ نے شاگردوں اور مریدوں میں وہ روح پھونکی جس نے مسلمانوں میں بڑا انقلاب پیدا کیا اور مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور ثقافتی حالت کو اس درجہ بہتر بنایا کہ ایک مرتبہ تو قرون اولیٰ کی یاد تازہ ہوگئی، شاہ صاحبؒ کو حدیث، فقہ، تفسیر، کلام ہی میں کمال حاصل نہ تھا بلکہ منطق وفلسفہ اور شعر وادب میں بھی مہارت حاصل تھی، حدیثیں کثرت سے یاد تھیں، مولانا محمد اشرف علی تھانویؒ نے شیخ محمد تھانویؒ شاگرد شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے نقل کیا ہے:

(انہوں نے) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی نسبت فرمایا ''ان کو چھ ہزار حدیث کے متن یاد تھے''۔ (الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ، ادارۂ اشرفیہ پاکستان کراچی ۲۷۰/۱)

شیخ محسن بن یحییٰ ترہتی ''الیانع الجنی'' میں رقم طراز ہیں:

قد بلغ من الكمال والشهرة بحيث	وہ کمال اور شہرت کے ایسے مقام کو پہنچے کہ تم
ترى الناس في مدن أقطار الهند	دیکھتے ہو لوگ بلادِ ہند میں اپنا ان سے
يفتخرون باعتزائهم إليه بل	انتساب کرنا فخر سمجھتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو
بانسلاكهم في سمط من ينتمي إلى	ایسے رشتے میں منسلک کرنے میں جو اُن کے
أصحابه ومن سجاياه الفاضلة	شاگردوں پر منتہی ہوتا ہے قابل فخر خیال
الجميلة التي لايدانيه فيها عامة أهل	کرتے ہیں، ان کے خصائل حمیدہ اور اخلاق
زمانه قوة عارضته لم يناضل أحداً	فاضلہ ایسے ہیں کہ جن میں ان کے عام
إلا أصاب غرضه وأصمى رميته	معاصرین ان سے مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے،
وأحرز خصله، ومن ذلك براعته	جس نے بھی ان سے مقابلہ کیا وہ ان کے
في تحسين العبارة وتحبيرها والتأنق	نشانہ پر گرا اور اس نے ان ہی کے نشانہ پر تیر
فيها وتحريرها حتى عده أقرانه	چھوڑا اور ان کے طور طریق کو اختیار کیا، اور

مـقدما من بين حلبة رهانه وسلموا لـه قـصبات السبق في ميدانه ومنها فـراستــه التـي أقـدره الله بهـا على تأويل الرؤيا فكان لايعبر شيئا منها إلا جـاء ت كـما أخبر به كأنما قد رآهـا و هـذا لايكون إلا لأصحاب الـنـفـوس الـزاكيـات المطهرة من أدنــــاس الشهـــوات الـــردية وأرجــاسهـــا، وكم لـه من خصـال محمودة وفضائل مشهودة.

ان کے منجملہ محاسن کے عبارت آرائی اورانشاء پردازی میں فائق ہونا اوراس میں سحرآفرینی ہے، ان کی تحریریں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ان کے معاصرین نے ان کواپنا پیش رومانا اور سب نے اس امر کوتسلیم کیا کہ وہ میدانِ مسابقت میں گوئے سبقت لے جانے والے ہیں اور نشان پر قبضہ کرنے والے ہیں اور منجملہ اس کے ان کی فراست ہے جس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کوخوابوں کی تعبیر پر قدرت عطافرمائی، جیسی تعبیر دیتے ویسی ہی ہوتی، اور گویا ایسی خبر دی جیسے کہ خود انہوں نے اس کو دیکھا ہے، یہ باتیں ایسے نفوس قدسیہ سے ظہور میں آتی ہیں جو خواہشات نفسانی کی آلودگیوں سے پاک صاف ہوتے ہیں، ان کے خصائل حمیدہ بہت ہیں اور ان کے فضائل مشاہدہ میں آچکے ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی ''إتحـاف الـنبلاء الـمتـقيـن بـإحيـاء مـآثر الفقهـاء المحدثين'' مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۲۹۶ میں رقم طراز ہیں:

شاہ عبدالعزیز بن الشیخ الاجل ولی اللہ محدث الدہلوی بن شیخ عبدالرحیم العمری رضی اللہ عنہم استاذ الاساتذہ وامام الجہابذہ بقیۃ السلف حجۃ

شاہ عبدالعزیز بن شیخ اجل ولی اللہ محدث دہلوی بن شیخ عبدالرحیم عمری رحمہم اللہ استاذ الاساتذہ، امام نقاد، بقیۃ السلف حجۃ خلف اور دیارِ ہند کے خاتم

الخلف خاتم المفسرین والمحدثین بالدیار
الہندیۃ در وقتِ خود مرجعِ علماء ومشائخ بودند
دستگاہ ایشاں در جمیعِ علومِ متداولہ وغیر متداولہ
از فنون عقلیہ ونقلیہ فوق الوصف ست، در
کثرت حفظ وعلم، تعبیر رؤیا وسلیقۂ وعظ وانشاء
وتحقیقات نفائس علوم ومذاکرہ ومباحثہ باخصوم
ممتاز اقران بودند ومعتقد فیہ موافق مخالف
تمام عمر در تدریس وافتاء وفصل خصومات ووعظ
وتربیت مریداں وتکمیل شاگرداں گزرانیدند
وجاہ وعزت صوری واحترام تعظیم ظاہری
باکمالات باطنی فراہم داشتند، سید احمد
بریلویؒ امیر المجاہدین را بیعت طریقت
بایشاں بود، ریاست علم وعمل بلادِ ہند بسوئے
ایشاں وبرادرانِ ایشاں منتہی گشتہ از علمائے دیارِ
ہندوستان بلکہ بلادِ دیگر کم کسے باشد کہ نسبتِ تلمذ
یا استفادۂ باطن بایں خاندان درست نکردہ باشد
شاگردی ایشاں فخر کبار علما است وکتب مؤلفہ
ایشاں معتمد فضلا، والد فقیر نیز از ایشاں روایت
دارند، اخذ علوم از والدِ ماجدِ خود وخلفائے ایشاں
کردہ ان وخلقے بسیار از جناب ایشاں استفادہ
نمودہ چوں اسانید علوم تحصیلیہ ایشاں از فقہ

مفسرین ومحدثین تھے اور اپنے وقت میں علماء اور
مشائخ کے مرجع تھے، تمام علوم متداولہ اور غیر
متداولہ میں خواہ فنونِ عقلیہ ہوں یا نقلیہ، ان کو
جو دستگاہ حاصل تھی وہ بیان سے باہر ہے، کثرتِ
حفظ وعلم، خوابوں کی تعبیر، سلیقۂ وعظ، انشاء
پردازی، تحقیقات نفائس علوم، مذاکرہ اور مخالفوں
کے ساتھ مباحثہ کرنے میں وہ اپنے معاصرین
سے ممتاز تھے، اور موافق ومخالف سب کو ان سے
اعتقاد تھا، تمام عمر درس وتدریس، افتاء، فصلِ
خصومات وعظ وتربیتِ مریدین اور تکمیل تلامذہ
میں گزار دی، باطنی کمالات کے ساتھ صوری جاہ
وعزت اور ظاہری تعظیم واحترام بھی میسر تھا، امیر
مجاہدین سید احمد (شہید) بریلویؒ کو ان ہی سے
بیعتِ طریقت حاصل تھی، بلادِ ہند میں علم وعمل کی
سیادت ان پر اور ان کے بھائیوں پر ختم تھی، دیارِ
ہند کے علماء ہی میں نہیں بلکہ بیرونِ ہند میں بھی کم
ہی کوئی ایسا عالم ہوگا جو تلمذ یا استفادہ باطن کی
نسبت اس خاندان سے نہ رکھتا ہوگا، ان کی
شاگردی بڑے بڑے علماء کے لیے باعث فخر
ہے اور ان کی لکھی ہوئی کتابیں فضلاء کی معتمد علیہ
ہیں، فقیر کے والد کو بھی ان سے روایت کی

وحدیث وتفسیر وغیر آں در تصانیف ایشاں مرقوم است ودر مردم مشہور، خاندان ایشاں خاندان علوم حدیث وفقۂ حنفی ست خدمت ایں علم شریف چنانکہ ازیں اہل بیت بوجود آمدہ در کشور از خانماں دیگر معلوم ومعہود نیست تخم عمل بالحدیث درحقیقت پدر ایشاں دریں سرزمین کاشتہ اند وایشاں آنرا برگ وبار بخشیدہ۔

اجازت حاصل ہے، موصوف نے علوم کی تحصیل اپنے والد اور ان کے خلفاء سے کی اور بڑی خلقت نے ان سے استفادہ کیا، ان کے علومِ تحصیلیہ فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کی سندیں ان کی تصانیف میں مذکور ہیں اور لوگوں میں مشہور ہیں، ان کا خاندان علومِ حدیث اور فقۂ حنفی کا خاندان ہے اس علم شریف کی خدمت جیسی کہ اس خاندان سے اس اقلیم میں بن آئی دوسرے کسی خاندان کی بابت معلوم اور مشہور نہیں ، در حقیقت اس سرزمین میں عمل بالحدیث کی تخم ریزی ان کے والد ماجدؒ نے کی اور انہوں نے اُس کو برگ وبار بخشے اور پروان چڑھایا۔

مولانا سید عبدالحی لکھنوی نے نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۸ میں موصوف کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

”الشيخ الإمام العالم الكبير العلامة المحدث عبدالعزيز بن ولي الله بن عبدالرحيم العمري الدهلوي سيد علماء نا في زمانه وابن سيد هم، لقبه بعضهم ”سراج الهند“ وبعضهم ”حجة الله“.

اور پھر لکھا ہے:

وكان رحمه الله أحد أفراد الدنيا بفضله وآدابه وعلمه وذكائه وفهمه وسرعة حفظه اشتغل بالدرس

مرحوم اپنے علم وفضل، آداب، ذکاوت، ذہانت، فہم وفراست اور سرعتِ حافظہ میں عالم کے اندر یگانۂ روزگار علماء میں سے

والإفادة وله خمس عشرة سنة فدرس وأفاد حتى صار في الهند العلم المفرد وتخرج عليه الفضلاء وقصدته الطلبة من أغلب الأرجاء وتهافتوا عليه تهافت الظمآن على الماء ....

ولعلك تتعجب أنه كان مع هذه الأمراض المؤلمة والأسقام المفجعة لطيف الطبع حسن المحاضرة جميل المذاكرة فصيح المنطق مليح الكلام ذا تواضع وبشاشة وتودد لايمكن الإحاطة بوصفه ومجالسه هي نزهة الأذهان والعقول بمالديه من الأخبار التي تنشف الأسماع والأشعار المهذبة للطباع والحكايات عن البلاد البعيدة وأهلها وعجائبها بحيث يظن السامع أنه قد عرفها بالمشاهدة ولم يكن الأمر كذلك فإنه لم يعرف غير كلكته ولكنه كان باهر الذكاء قوي التصور كثير البحث عن الحقائق فاستفاد ذلك

تھے، پندرہ برس کی عمر سے درس وتدریس میں مصروف ہوئے، درس دیا اور فیض پہنچایا یہاں تک کہ ہندوستان میں یکتا عالم ہوگئے اور فضلاء نے ان سے اکتساب کمال کیا، بیشتر مقامات سے طلبہ محض ان سے پڑھنے کے لیے آتے اوران پر ایسے ٹوٹ پڑتے جیسے پیاسا پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور شاید تم کو تعجب ہوگا کہ موصوف ان تکلیف دہ بیماریوں اور اندوہناک امراض کے باوجود خوش طبع، حاضر جواب، شیریں گفتار، بڑے فصیح، خوش کلام، متواضع، ہشاش بشاش اور باوقار تھے، ان کے اوصاف کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، ان کی مجلسیں عقول اور اذہان کی سیر وتفریح کا سامان تھیں، ان کی حکایتیں کانوں کو، ان کے شائستہ اشعار طبائع کو بھاتے تھے اور دور دراز کے قصے اور وہاں کے باشندوں کی داستانیں بھی خوب ہوتی تھیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سننے والے کو یہ گمان ہوتا تھا کہ موصوف نے ان باتوں کو دیکھ کر

بوفود أهل الأقطار البعيدة إلى حضرة دهلي.

جانا ہے حالاں کہ بات یہ تھی کہ انہوں نے کلکتہ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا، غیر معمولی ذکی، قوی تصور تھے، اور حقائق سے خوب بحث کرتے تھے انہوں نے ان باتوں کو ان لوگوں سے سنا تھا جو دور دراز سے دار السلطنت دہلی میں آئے تھے۔

مولوی عبدالقادر کا بیان ہے:

''مولانا شاہ عبدالعزیز علم تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت اور تاریخ میں شہرۂ آفاق تھے، اور ہیئت، ہندسہ، مجسطی، مناظر، اصطرلاب، جرثقیل، طبعیات، منطق، مناظرہ، اتفاق واختلاف، ملل ونحل، قیافہ، تاویل، تطبیق مختلف اور تفریق مشتبہ میں یکتائے زمانہ تھے، فن ادب اور ہر قسم کے اشعار کے سمجھنے میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، منقول میں کلام اللہ اور حدیث سے دلیل پیش کرتے تھے اور معقول میں جو ثبوت مناسب سمجھتے، خواہ مخواہ یونانیوں میں سے افلاطون، ارسطو اور متکلمین میں سے فخر رازی وغیرہ کے اقوال کی تائید میں مبتلا نہیں ہوتے تھے اور اپنی تحقیقات کو فن معقول میں صاف صاف بیان کر دیتے تھے''۔

(علم وعمل (وقائع عبدالقادر خانی) ج ا ص ۲۴۶ شائع کردہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۶۰ء)۔

سر سید احمد خاں نے آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:

''أعلم العلماء، أفضل الفضلاء، أكمل الكملاء، أعرف العرفاء، شرف الأماثل، فخر الأماجد والأماثل، رشک سلف، داغ خلف، أفضل المحدثين، أشرف علماء ربانيين، مولانا وبالفضل أولانا شاه عبدالعزيز دهلوي قدس سره العزيز کی ذات فیض سمات ان حضرت بابرکت کی فنون کسبی ووہبی اور

مجموعۂ فیض ظاہری و باطنی تھی، اگر چہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ہندسہ و ہیئت کو خادم علوم دینی کا کر کر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبویؐ و تفسیر کلامِ الٰہی اور اعلائے اعلام شریعت مقدمہ حضرت رسالت پناہی میں مصروف فرماتے تھے، چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد عمدۂ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں تحصیل علوم عقلی و نقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے تھے، حافظہ آپ کا نسخۂ لوح تقدیر تھا، باوجود اس کے کہ سنین عمر شریف قریب اسی (۸۰) کے پہنچ گئے تھے اور کثرتِ امراض جسمانی سے طاقت بدن مبارک میں کچھ باقی نہ رہی تھی، خصوصاً قلتِ غذا سے، لیکن برکات باطنی اور حدت قوائے روحانی سے حسب تفصیل مسائل دینی اور تبیین دقائق یقینی پر مستعد ہوتے تو ایک دریائے زخار موجزن ہوتا تھا اور فرط افادات سے حضار کو حالت استغراق بہم پہنچتی تھی۔

ہفتہ میں دو بار مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی اور شائقین صادق العقیدت و صافی نہاد خواص وعوام سے مور و ملخ سے زیادہ جمع ہوتے تھے اور طریقۂ رشد و ہدایت کا استفاضہ کرتے (بروز یکشنبہ ۹ رشوال) ۱۲۳۹ھ میں اس جہانِ فانی سے سفر آخرت کو اختیار کیا، ایک قطعہ لکھتا ہوں ؎

حجۃ اللہ ناطق و گویا شاہ عبدالعزیز فخر زمن
روز شنبہ و ہفتم شوال درمیان بہشت ساخت وطن
مہر نصف النہار در عرفاں مثل بدر منیر در ہمہ فن
از سر لطف و حلم تاریخش رضی اللہ عنہ گفت حسن

حکیم مومن خاں مومنؔ نے تاریخ وفات خوب کہی ہے:

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
(ق ی ض ن ط ر ل م (۱۲۳۹ھ))

علوم حدیث میں شاہ عبدالعزیزؒ کی دو کتابیں بستان المحدثین اور عجالۂ نافعہ مقبول اور

مشہور کتابیں ہیں، اول الذکر جو حدیث کی مشہور کتابوں اور ان کے مؤلفین کے حالات و تعارف پر مشتمل ہے، اس کا اردو میں شگفتہ ترجمہ استاد مرحوم مولانا عبدالسمیع صاحب شیفتہ مدرس دارالعلوم دیوبند نے کیا تھا جو پہلے مطبع قاسمی دیوبند سے شائع ہوا تھا اور اب اس ترجمہ کو نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب کراچی نے شائع کر دیا ہے، دوسرا رسالہ عجالۂ نافعہ ہے، یہ ان کا ثبت اور حدیث سے متعلق علوم کا آئینہ دار ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی چند مشہور تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ **تفسیر القرآن الکریم** موسوم بہ فتح العزیز، شاہ صاحبؒ نے اس کو مرض کی شدت اور ضعف میں املا کرایا تھا، یہ کتاب کئی جلدوں میں تھی، جس کا اکثر حصہ ۵۷ھ کے ہنگامہ کی نذر ہو گیا، صرف دو جلدیں اول و آخر کی رہ گئی ہیں۔

۲۔ **الفتاوی فی المسائل المشکلۃ**۔ یہ بہت ضخیم تھی مگر اس کی تلخیص دو جلدوں میں دستیاب ہے۔

۳۔ **تحفۂ اثناعشریہ**۔ شیعہ مذہب کی تردید میں بے نظیر کتاب ہے۔

۴۔ **بستان المحدثین**۔ اس میں کتب حدیث اور محدثین کی مفصل فہرست اور تذکرہ ہے مگر نامکمل ہے۔

۵۔ **عجالۂ نافعہ**۔ یہ اصول حدیث میں فارسی رسالہ ہے، نیز طلبۂ حدیث کے حفظ کے لیے بھی ایک رسالہ ہے۔

۶۔ **میزان البلاغت**۔ یہ فن بلاغت میں ایک بہترین متن ہے۔

۷۔ **میزان الکلام**۔ یہ علم کلام میں ایک بہترین متن ہے۔

۸۔ **السرّ الجلیل فی مسئلۃ التفضیل**۔ یہ بھی ایک رسالہ ہے جس میں خلفائے راشدینؓ کے فرق مراتب پر بحث کی گئی ہے۔

۹۔ **سرُّ الشہادتین**۔ حضرات حسنینؓ کی شہادت سے متعلق ایک رسالہ ہے۔

۱۰۔ ایک رسالہ انساب کے موضوع پر ہے۔

۱۱۔ ایک رسالہ تعبیر رؤیا سے متعلق ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد رسائل ہیں۔

منطق اور حکمت میں یہ کتابیں ہیں:

۱۲۔ رسالہ ''میر زاہد''، ''میر زاہد ملا جلال''، ''میر زاہد شرح مواقف''، ''حاشیہ ملا کوسج'' پر عزیزیہ کے نام سے اور صدر شیرازی کی ''شرح ہدایت الحکمت'' ان سب پر حضرت شاہ صاحبؒ کے حاشیے ہیں۔

۱۳۔ ایک کتاب ''ارجوزۂ اصمعی'' کی شرح کے نام سے ہے۔

۞۞۞۞

مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنویؒ

(ماہنامہ معارف، دسمبر 1956ء)

مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی

از جناب مولانا محمد عبدالحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

ہندوستان میں آخری دور کے علماے حدیث میں منجملہ اکابر محدثین کے مرزا حسن علی صغیر لکھنوی الہاشمی کا نام بہت ممتاز ہے، موصوف سرآمد حلقۂ محدثین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، اور محلہ یحییٰ گنج میں رہتے تھے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس دور میں ایک دوسرے بزرگ نے بھی شہرت پائی، جو نہ صرف آپکے ہم نام تھے بلکہ آپکے ہم وطن بھی تھے، اور محلہ محمود نگر میں رہتے تھے چونکہ عمر میں آپ سے بڑے تھے، اس لیے شناخت و امتیاز کی غرض سے لوگوں میں "حسن علی کبیر" کے نام سے مشہور تھے،

نام ونسب مرزا حسن علی صغیر کا اصل نام محمد، لقب جمال الدین اور حسن علی عرف تھا، والد کا نام عبد العلی تھا، چنانچہ موصوف نے اپنے فارسی رسالہ "تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والصداق" میں اپنا نام یوں لکھا ہے:

"امابعد می گوید بندۂ مسکیں جمال الدین محمد عرف حسن علی الہاشمی۔"[1]

---

[1] تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والصداق" مطبع محمدی ۱۲۶۳ھ ص ۲، یہی نام موصوف کے شاگرد خادم علی نے اپنی تالیف "تاریخ جد ولیہ" (مطبع نولکشور کانپور) ص ۴۰، پر لکھا ہے، مگر آپکے بیک واسطہ شاگرد عبد الشکور عرف رحمان علی "تذکرہ علمائے ہند" (مطبع نولکشور لکھنؤ) ص ۴۰، پر لکھتے ہیں،

"مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی ساکن محلہ یحییٰ گنج من محلات لکھنؤ" ملقب بمیرک جمال الدین المعروف بمرزا" مرزا سے شہرت کی کوئی وجہ معلوم نہ ہو سکی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نسلاً مغل تھے، مگر آپکے محولۂ بالا بیان سے اس امر کی تردید ہوتی ہے،

چونکہ آپ کا رشتہ سادات بنی ہاشم سے تھا، اس لیے اپنی نسبت "الہاشمی" لکھتے تھے، بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی آپ کو ہاشمی ہی لکھا ہے، مولانا محمد بن یحییٰ پورنوی "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں:

ومنہم جمال الدین المعروف	اور شاہ عبد العزیزؒ کے شاگردوں میں جمال الدین
بحسن علی الہاشمی اللکھنوی[1]	عرف حسن علی الہاشمی الکھنوی ہیں،

"تذکرۂ علمائے ہند" میں ہے:

"از سادات علوی است خود را ہاشمی می نوشت"[2]

تعلیم اور اساتذہ آپ نے درسی کتابیں ملا حیدر علی[3] سندیلوی المتوفی ۱۲۲۵ھ سے پڑھی تھیں، جو مشہور معقولی ملا حمد اللہ[4] سندیلی کے فرزند تھے۔

درسی کتابوں سے فراغت پاکر دہلی پہنچے، یہاں بعض فنون کی تکمیل شاہ رفیع الدین دہلویؒ سے کی، شاہ عبد القادرؒ سے بھی استفادہ کیا، اور حدیث محدث وقت حضرت شاہ عبد العزیز قدس سرہ العزیز سے پڑھی، آپ شاہ صاحبؒ کے نہایت ممتاز اور نامور شاگردوں میں سے تھے، چنانچہ صاحب "الیانع الجنی" نے شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی کے بعد آپ ہی کا تذکرہ کیا ہے،[5] آپ نے دوران تعلیم ہی میں "سنن ابی داؤد" کے نسخہ کو نقل کیا، اور اسکی تصحیح کی،[6]

---

[1] الیانع الجنی فی اسانید الشیخ عبد الغنی" طبع جید پریس دہلی ۱۳۴۹ھ ص ۷۷، نواب صدیق حسن قنوجی "ابجد العلوم" (طبع صدیقی بھوپال ۱۲۹۶ھ) جلد ۳ ص ۹۱۰ پر رقم طراز ہیں "الشیخ جمال الدین المعروف بحسن علی الہاشمی الکھنوی"۔ [2] تذکرہ علمائے ہند، ص ۵۴ نیز تراجم الفضلاء، از فضل امام خیرآبادی، طبع کراچی ۱۹۵۶ء [3] تذکرۂ علمائے ہند ص ۵۲ و تراجم الفضلاء، ص ۸ [4] الیانع الجنی ص ۷۷ [5] یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مولانا حسن علی صغیر نے اس نسخہ کی تصحیح اپنے استاد حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے ذاتی نسخہ سے کی تھی، یہ نسخہ اپنی صحت میں بے نظیر نسخہ تھا، اور درس کے وقت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے رہتا تھا (باقی ص ۴۲۹ پر)

اور روایت حدیث کی سند لیکر لکھنؤ پہنچے، یہاں محلہ یحییٰ گنج میں حدیث کا درس دینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ حدیث سے اتنا شغف ہوگیا کہ بعض کا خیال ہے کہ آپ نے شافعی مذہب اختیار کر لیا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۸) اس نسخہ کے متعلق مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے مشہور محدث میاں نذیر حسین دہلویؒ سے بہت تفصیلی بیان نقل کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

شیخنا المحدث العلامۃ السید	ہمارے شیخ محدث علامہ سید نذیر حسین دہلوی
نذیر حسین الدہلوی انہ یقول	فرماتے تھے کہ محدث الہند علامہ شاہ عبد العزیز
ان الشیخ العلامۃ محدث الہند	ابن ولی اللہؒ نے سنن ابی داؤد کے ایک نسخہ
عبد العزیز بن ولی اللہ قد صحح نسخۃ	کی تصحیح کی تھی، اور چند نہایت صحیح نسخوں کو
من سنن ابی داؤد وعارضہا وقابلہا	سامنے رکھکر اس کا مقابلہ کیا، اور پھر ساری
علی عدۃ من النسخ الصحیحۃ وقد	کتاب پر اول سے آخر تک حاشیہ لکھا اور مشکل
حشاہا من اول الکتاب الی آخرہ	مقامات میں سے کوئی مقام ایسا نہ تھا جسکی
فلم یترک موضعا واحدا من المواضع	وضاحت اور تشریح نہ کی ہو، یہ شاہ صاحب
الصحیح من غیر ایضاح ومن غیر کشف	کا علما، پر بہت بڑا احسان تھا، وہ مبارک
وکانت ہذہ منۃ عظیمۃ منہ	اور صحیح نسخہ ہمارے شیخ سید نذیر حسین کو ...
رحمۃ اللہ تعالیٰ علی العلماء وقد	...... ملا تھا، اور یہ نسخہ ایک زمانہ
وصلت تلک النسخۃ الصحیحۃ	تک آپکے پاس رہا کہ غدر کا حادثہ پیش آیا
المبارکۃ الی شیخنا السید نذیر حسین	اور اس حادثہ میں یہ نسخہ بھی ضائع ہوگیا،
وقد بقیت عندہ الی ان جاءت	جب بھی آپ اس نسخہ کے ضائع ہونے کا ذکر
ایام فتنۃ الہند فضاع الکتاب	کرتے تو آپ کو بے انتہا قلق اور بڑا صدمہ ہوتا

(باقی حاشیہ ص ۴۳۰)

جیسا کہ "تذکرۂ علمائے ہند" میں ہے:

بعضے می گویند کہ مذہب شافعی می داشت[1]"

مولانا محمد بن یحییٰ پورنوی "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں:

قد اشتهر بين الناس انه كان	لوگوں میں ایسا مشہور ہو گیا کہ آپ نے امام شافعیؒ
يتعبد على المذهب الشافعي رض	کا مسلک اختیار کر لیا تھا اور بعض کا خیال کچھ
وقيل غير ذالك والله اعلم[2]	اور ہے حقیقت حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے

لیکن موصوف کی تصانیف میں فقہ حنفی کی کتابوں کی طرف مراجعت کا حکم موجود ہے جو اسی امر کی تائید کرتا ہے، کہ آپ آخر دم تک حنفی رہے، چنانچہ سرآمد حلقہ اہل حدیث نواب صدیق حسن خاں قنوجی جنھوں نے موصوف کے فتاویٰ کا مطالعہ کیا تھا، آپ کی نسبت "ابجد العلوم" میں لکھتے ہیں:

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲۹) فی تلك الفتنة	اور بہت مغموم ہوتے، اور فرماتے اگر کسی کے پاس
ورأيته رحمه الله تعالى لما يذكر	یہ کتاب مل جائے تو میں اپنی تہی دستی، بے مائگی
قصة ضياع الكتاب يحزن كثيراً و	اور تنگ دستی کے باوجود اس کو بہت
يتاسف تاسفا عظيما ويبقي مغموما	بھاری رقم دیکر خرید لوں،
ويقول لو وجدت ذلك الكتاب	
عند احد اشتريته منه باغلي	
ثمن مع عجزي وقصوري وقلة بضاعتي	

("عون المعبود شرح سنن ابی داؤد" مطبع انصاری دہلی ۱۳۲۳ھ ج ۴ ص ۵۵۳)

(حواشی صفحہ ہذا) [1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۰۴ [2] الیانع الجنی ص ،،

رأيت له فتاوى بالفارسية	میں نے موصوف کے فتاویٰ کے فارسی مجموعہ کو
على طريقة الفقهاء ولم نجد له	دیکھا ہے اس میں فقہائے سلف کے طریقہ کا التزام
عزما يمتاز به عن غيره[1] . . .	ہے، آپ کی طرف سے کوئی جدت نہیں کہ جسکی وجہ سے
. . . .	آپ اوروں سے ممتاز ہو سکیں،

اخیر عمر میں قدرے آزاد خیال ہو گئے تھے، اور حنفی مذہب کے اس سختی سے پابند نہیں رہے تھے جس سختی سے کہ اوائل عمر میں اس پر کاربند تھے،

درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ

مولانا نے جملہ علوم کی تکمیل ارباب فن سے کی تھی اور ہر فن کو بہت محنت اور شوق سے پڑھا تھا، پھر خانوادۂ ولی اللّٰہی سے جو سوز انھیں ورثہ میں ملا تھا، اس کی بدولت ہندوستان میں جہاں ابھی تک معقولات کی حکمرانی تھی، علوم نقلیہ کی اشاعت و ترویج پر کمر باندھی اور اسی جذبہ سے متاثر ہو کر درس و تدریس کا شغل اختیار کیا، تھوڑے ہی عرصہ میں شہرت نے آکر قدم چومے اور محلہ یحییٰ گنج حدیث کی اشاعت کا مرکز بن گیا، اور بڑے بڑے فضلاے روزگار نے اسی آستانہ پر آکر کسب کمال کیا۔

لکھنؤ میں اس سے قبل جن علوم کی شہرت تھی وہ تمامتر معقولات کا فن تھا، منقول برائے نام تھی، مگر جب یحییٰ گنج میں درس حدیث کا آغاز ہوا تو لکھنؤ کے ہر گلی کوچہ میں حدیث رسول کا چرچا ہونے لگا، بالآخر فرنگی محل کے علماء نے بھی اس فن کی باقاعدہ تکمیل موصوف سے کی، اور فرنگی محل بھی اس فن کی اشاعت کا مرکز بن گیا، چنانچہ مولانا محمد عنایت اللہؒ رسالہ "تدوین حدیث" میں لکھتے ہیں:

"چونکہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تلامذہ اطراف ہند میں پھیل گئے تھے، اس لیے علم حدیث

[1] ابجد العلوم ج ۳ ص ۹۱۷

فرنگی محل میں ان تلامذہ کے ذریعہ پہنچا، اور مولانا حسین احمد ملیح آبادی اور مرزا حسن علی محدث سے مولانا عبد الحیؒ کے والد ماجد مولانا عبد الحلیم اور عبد الباری صاحب کے جد امجد حضرت شاہ عبد الرزاق رحمہم اللہ نے علم حدیث حاصل کیا، اور اس کے بعد علم حدیث کا چرچا فرنگی محل سے ہونے لگا۔"[1]

مولانا حسن علی صغیر نامور مدرس اور بلند پایہ محدث ہی نہ تھے، بلکہ ایک نہایت شیوہ بیان مقرر اور سحر طراز خطیب بھی تھے، چنانچہ جو بھی آپ کا وعظ سنتا گرویدہ ہو جاتا تھا،

اخلاق و عادات | مرزا حسن علی صغیر نہایت با اخلاق، متواضع، نیک طینت اور درویش سیرت انسان تھے، چنانچہ جب سید احمد شہیدؒ لکھنؤ وارد ہوئے اور لوگوں کو جہاد کی دعوت دی، تو آپ نے موصوف کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنے مکان پر آپ کی دو مرتبہ دعوت کی اور چند چیزیں تحفہ کے طور پر پیش کیں، جیسا کہ مولانا ابو الحسن علی ندوی "سیرت سید احمد شہید" میں لکھتے ہیں:

"مرزا حسن علی صاحبؒ نے سید احمد صاحبؒ کی دو مرتبہ دعوت کی، آخری دعوت میں آپ نے بھری محفل میں سید صاحبؒ کو دو تھان مشروع کے اور ایک تھان چکن کا، اور ایک چھوٹا پاندان سفید الائچیوں سے بھرا ہوا، اس میں ایک عطر کی شیشی رکھی ہوئی، سید صاحب کو ہدیہ کیا، آپ نے رفقاء میں سے ایک شخص سے کہا کہ یہ سامان لے لو، یہ مرزا صاحب کا تبرک ہے، یہ الائچیاں ہم کھائیں گے۔"[2]

مولانا کا تبحر علمی | مولانا حسن علی فن حدیث اور علوم حدیث کے بڑے ماہر اور نکتہ سنج فقیہ تھے، مولانا محمد بن یحییٰ پورنوی "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں،

[1] رسالہ "دین حدیث" مطبوعہ اشاعت العلوم فرنگی محل ص ۲۔ [2] سیرت سید احمد شہیدؒ، ج ۱ ص ۱۳۱ طبع دوم

جمال الدین المعروف بحسن علی الہاشمی اللکھنوی کان متبحراً فی الحدیث ومتقناً بعلومہ[1]	مولانا جمال الدین جو حسن علی لکھنوی الہاشمی سے مشہور ہیں، فن حدیث اور علوم حدیث میں بڑے ماہر اور بحر زخار تھے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی "ابجد العلوم" میں فرماتے ہیں:

الشیخ جمال الدین المعروف بحسن علی الہاشمی اللکھنوی کان لہ خبرۃ فی الحدیث یعتنی لعلومہ[2]	مولانا جمال الدین جو حسن علی ہاشمی لکھنوی سے مشہور ہیں، انھیں فن حدیث میں بڑی بصیرت تھی اور علوم حدیث سے بڑا اشتغال تھا۔

سید عبد اللہ سیرام پوریؒ[3] جو سید احمد شہیدؒ کے اجلۂ خلفاء میں سے تھے اور سید صاحب کے ساتھ حج میں گئے تھے، اسی زمانہ میں موصوف نے سید احمد علی شاہ سے جو سید احمد شہیدؒ کے بھانجے تھے شاہ عبد القادرؒ کے مترجمہ قرآن کی نقل لی تھی، جب آپ حج سے ہندوستان واپس آئے اور اسکا ذکر جن اصحاب ثلاثہ سے کیا، اور جنھوں نے اس اہم کام کی طباعت اور اشاعت پر آپ کو آمادہ کیا، ان میں مرزا حسن علی صغیر لکھنوی بھی تھے، چنانچہ موصوف اپنے طبع کردہ قرآن مجید (مطبع احمدی ۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ء) کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"اس قلیل البضاعت نے بعد مراجعت اس سفر (حج) کے مولانا عبد الحیؒ صاحب اور مولانا محمد اسحاق صاحب دہلوی اور مولوی حسن علی (صغیر) صاحب لکھنوی کے ایما اور استصلاح سے کر ہمت اپنی مستحکم باندھی اور مصمم ارادہ کیا کہ جس طرح ہو اسکو چھپوانا چاہیے!"

باندہ کا سفر | مولانا حسن علی صغیر نے ۱۲۲۶ھ میں باندہ کا سفر کیا، اور یہیں خادم علی سندیلی نے

[1] الیانع الجنی ص ۷۷، [2] ابجد العلوم ج ۳ ص ۹۱۷ [3] جماعت مجاہدین، از غلام رسول مہر، کتاب منزل لاہور، ص ۲۸۷

آپ سے کسب فیض کیا، چنانچہ مولانا رحمان علی لکھتے ہیں

"منشی خادم علی سندیلی مولف تاریخ جدولیہ بسال دوازدہ وصد وبست و شش ہجری بمقام باندا مستفیض خدمت او شدہ[1]"

سفر حرمین شریفین ۱۲۴۲ھ میں فریضۂ حج ادا کیا، اور کچھ عرصہ قیام فرماکر واپس لکھنؤ آئے، اس کا ذکر موصوف نے اپنے فارسی رسالہ "تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والصداق" کے آخر میں کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں،

"یازدہم شہر شعبان ۱۲۴۳ھ روز چہارشنبہ بعد مراجعت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً و مجداً"

باندہ کو روانگی ۱۲۴۶ھ میں دوبارہ باندہ کا سفر کیا، مگر زیادہ قیام نہیں رہا، ان ہی ایام میں منشی خادم علی سندیلی نے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا جس کا جواب موصوف نے عربی میں دیا تھا، منشی خادم علی سندیلی نے اپنی کتاب "تاریخ جدولیہ" میں اس کو نقل کیا ہے، ہدیۂ ناظرین ہے، اس سے موصوف کے عربی انداز نگارش اور افتاد طبع پر روشنی پڑتی ہے،

احمد اللہ الذی زین عرائس الطروس بشرائف المبانی، جمل جیاد الصحف بلطائف المعانی. واصلی واسلم علی سیدنا محمد المخصوص بفصاحۃ[2] العرب العرباء والمؤید ببلاغۃ[3] مصاقع الخطباء، وعلی آلہ واصحابہ المحلین فی میدان براعتہ، المصلین فی مضمار بلاغتہ وبعد فسلام للہ ازکی من المسالک الاذفر، واطیب من ریا العبہر[4]، والطف من نسیم السحر، واضوء

---

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۶۴ [2] فی الاصل "بفصاحتہ" [3] فی الاصل "ببلاغتہ" [4] فی الاصل "من ریا عبہر"

من ضوء القمر، اطال اللہ بقاءک، ورزقنی فی العاجل حین لقاءک، اجدک اصنافاً من الحب للماجد[1]، لها مثلاً من سائر الناس یعرف، فمنهن من[2] لا یعرض الدهر ذکرکم،

علی الروح الا کادت الروح تتلف[3]، ومنهن حب الفؤاد ولحمه، ولا امتری فیہ ولا اتکلف،

واللہ لقد رفعت لہذا الحب فی القلب قباب، لها من حبال الوصل صمآء الودّ اوتاد واسباب، القوم اخوان الصدق بینهم، سبب من المودۃ لم یعد بہ نسب، سلوا عن مودۃ الرجال قلوبکم فتلک شهود، لم تکن تقبل الرشاد[4]. ثم انی کنت اردت ان اوصلک الی مقاصد الکمال وابلغک الی معارج الجلال، ولکنک استبددت علینا. فلا علیک ان تبتغی[5] بذلک[6] الی حیازۃ صلاح الدنیا وفلاح الآخرۃ علیک بالعلم والعمل والتقی وکن من ابناء الآخرۃ ولا تکن من ابناء الدنیا، هذا ولعمری ان الدنیا اذا اقبلت اقبلت واذا ادبرت ادبرت، فلا یغرنک حوش زهرۃ الدنیا وزخارف الهوی، وتشبث[7] باذیال معالم الدین، یبلغک اللہ الی مراسم الیقین، والباقی فی الآتی علی اعانۃ الرب المتعالی وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین. ۱۲۴۶ھ فقط مقام باندا۔

مولانا کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، تشنگان علوم دور دور سے آتے اور آپ کے چشمۂ فیض سے

---

[1] فی الاصل "الماجد" [2] فی الاصل "عن" [3] فی الاصل "بتلف" [4] فی الاصل "الرشا" [5] فی الاصل "ینبغی" [6] فی الاصل "مابذالک" [7] فی الاصل "تشبث"

سیراب ہوکر واپس جاتے۔ اس درس کی بدولت مولانا کی شہرت میں چار چاند لگ گئے، اور مولانا کو حدیث اور علوم حدیث سے اتنا شغف ہوگیا کہ انھیں کسی مستقل تصنیف وتالیف کے لیے وقت نہ ملا، تاہم حالات کے تقاضے سے مجبور ہوکر جو کچھ لکھا، وہی آپ کی یادگار ہے، جس کے دیکھنے سے مولانا کے تبحر علمی کا پتہ چلتا ہے۔

تصانیف | موصوف کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) "تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والصداق"۔ یہ رسالہ آپ نے حج سے واپسی پر لکھا، رسالہ فارسی زبان میں ہے، اور ۱۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس رسالہ میں ضرورت نکاح پر شرعی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی گئی ہے، مطبع محمدی میں ۱۲۶۶ھ میں چھپا تھا، لیکن اب کمیاب ہے، الحمد للہ والد مرحوم منشی عبد الرحیم خاطر جے پوری المتوفی ۱۴۰۲ھ کی متروکہ کتابوں میں سے احقر کے پاس ہے، اس کا ابتدائی حصہ تبرکاً درج ذیل ہے:

الحمد للہ الذی احل النکاح وحرم السفاح وخلق الانسان من نطفۃ امشاج، ثم جعلہ سمیعاً بصیرا، وخلقکم من نفس واحدۃ وجعل منہا زوجہا وبث منہما رجالاً کثیرا ونساءً وقدرہ تقدیرا، والصلوٰۃ علی من ارسل الی الخلق کافۃ وبعث ہادیا الی الناس بشیرا ونذیرا وعلی آلہ واصحابہ الذین طہروا عن رجس الشرک والطغیان تطہیرا:۔ اما بعد می گوید بندۂ مسکین جمال الدین محمد عرف حسن علی الہاشمی عفی عنہ کہ بعضے دوستان راسخ الاعتقاد ومخلصان واثق الوداد درخواست فرمودند کہ طریقۂ نکاح خواندن وکیفیت مہر وانچہ مناسب درآں باشد وتعلق بداں دارد آں را در چند ورق تحریر نماید، لہذا این رسالۂ موجزہ بپاس خاطر دوستان صادق وبحسب طلب محبان موافق در سلک تحریر کشیدیم تا حکم خدا ورسول

را کہ در بیان سنت سنیۂ نکاح باشد تحقیق نمودہ بوقت حاجت مطالب رسالۂ مسطورہ را دستور العمل خود نماید ودر اتباع طریقۂ احسنہ اہتمام تمام واحتیاط بسیار در عقد مذکور بمودنت وقت این رسالہ بعمل آرند وہر قدر کہ ضرورت بداں افتد دریں وثیقہ تحریر می شود وایں رسالہ را بر یک مقدمہ ودو مقصد ویک خاتمہ ترتیب دادم وبہ "تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والصداق" موسوم ساختم، وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب: "مقدمہ" در تنبیہ غافلین مذکور است کہ شخصے پسر خود را بحضور شریف حضرت امیر المومنین فاروق اعظمؓ آورد، وہ بوقت عرض رسانید کہ ایں فرزندم حق پدری کہ بر ذمہ او ست ادا نمی کند لہذا تنبیہ وسیاست او ضرور است امیر المومنین عمرؓ پسرش را تنبیہ کردہ فرمود کہ خدائے تعالیٰ حق والدین بر اولاد فرض گردانیدہ است تو چرا حق پدر نمی گزاری وی عرض ساخت کہ یا امیر المومنین آرے حق والدین بر اولاد ثابت است اما حق اولاد ہم بر ذمۂ والدین چیزے ہست فرمود آرے، وے عرض کرد کہ کدام حق است امیر المومنین فرمود چہار حق است، یکے آنکہ مادر او کہ حرہ باشد با وے عقد نکاح نماید، دوم آنکہ بعد ولادت نام فرزند کہ مستحسن باشد بدارد، سوم آنکہ تعلیم علم بوے نماید، چہارم آنکہ چوں بحد بلوغ برسد بزنے از اعیان قوم تزویج کند، پسر عرض کرد کہ یا امیر المومنین پدرم یکے ازیں حقوق مذکورہ ادا نساختہ است بازچگونہ حقوق خود را از بندہ استیفا میکند زیرا کہ مادرم را بیک صد درہم خریدہ ونام من جُعل نہادہ وتا حال آیتے از کتاب اللہ بمن یاد نداہانیدہ، وہنوز بزنے عقد نکاح نفرمودہ، امیر المومنین بشاہدۂ ایں حال پدرش را زجر فرمود وگفت کہ تو عجب بے انصافی کہ حقوق خود از وی می خواہی وچیزے از حقوق او بر ذمہ تست آن را یکسر فراموش ساختہ اولاً حقوق او ادا نما بعد ازاں حقوق خود از وی بخواہ، خلاصۂ کلام آنست کہ تزویج فرزند وتعلیم وغیرہ

از حقوق او بر ذمہ والد است چنانکہ در حدیث آمدہ است کہ چوں فرزند بسن ہفت
سالگی برسد پدر تاکید نماز بوے کند وچوں بسن دہ سالگی برسد بر ترک صلوٰۃ ضرب شلاق
وارد کند وچوں بہ ۹ سالگی برسد بر بستر علیحدہ خواب کناند یعنی بستر خواب او را جدا سازد
وچوں بہ ہفدہ سالگی برسد عقد نکاح او کردہ دہد واگر دختر باشد تعجیل در نکاح او تاکید
کند خصوصاً بوقت بہم رسیدن کفو چنانکہ در حدیث ترمذی آمدہ است کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
با امیر المومنین علیؓ فرمود کہ یا علی سہ چیز را تاخیر مکن چوں وقت آں رسد نماز چوں وقتش
در رسد وجنازہ چوں حاضر گردد ونکاح دختر بوقت بہم رسیدن کفو، قال اللہ تعالیٰ
وانکحوا الایامی منکم والصالحین من عبادکم وامائکم ان یکونوا فقراء یغنیہم
اللہ من فضلہ، ترجمہ، نکاح کردہ دہید زنان بے مرد ومرداں بے زنان را کہ از شما باشند
وغلاماں وکنیزاں شایستہ کار را اگر باشند فقیراں توانگری بخشد ایشاں را خدائے تعالیٰ،

(۲) "برہان الخلافۃ" یہ موصوف کے فارسی فتاویٰ کا مجموعہ ہے، اور ابتک طبع نہیں
ہوا، اس پر نواب صدیق حسن خاں کے والد سید اولاد حسن خان قنوجی کے تعقبات بھی ہیں،
چنانچہ موصوف "ابجد العلوم" میں لکھتے ہیں،

رأیت لہ فتاوی بالفارسیۃ	میں نے موصوف کے فارسی فتاویٰ کے مجموعہ کو دیکھا
علی طریقۃ الفقہاء ولہ تجلد لہ	ہے، اس میں فقہائے سلف کے طریقہ کا التزام ہے اور
عنہا یمتاز بہ عن غیرہ وکان	آپ کی طرف سے کوئی جدت نہیں کہ جسکی وجہ سے آپ دوں
من احباب سیدی الوالد[1]	سے ممتاز ہو سکیں، آپ میرے والد بزرگوار کے

[1] بلاشبہ نواب صدیق حسن خاں نے یہاں اپنے والد سید اولاد حسن خاں قنوجی کو مرزا حسن علی صغیر کے احباب میں شمار کیا ہے لیکن
"اتحاف النبلاء" میں موصوف نے اعتراف کیا ہے کہ مرزا حسن علیؒ سے آپکے والد کو تلمذ تھا، چنانچہ فرماتے ہیں (باقی ص ۴۳۹ پر)

الماجد رحمۃ اللہ وقد تعقبہ	احباب میں سے تھے، انکے بعض فتووں پر والد مرحوم
الوالد فی بعض مسائلہ (ص)	کے تعقبات بھی ہیں،

(۳) "حاشیۃ سنن ابی داؤد" یہ عربی میں ہے، اس کا موصوف کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ
آپ کے بیک واسطہ شاگرد مولانا عبد الحی فرنگی محلی المتوفی ۱۳۰۴ھ کے کتب خانہ میں موجود
تھا، چنانچہ مولانا اپنے مشہور رسالہ "اقامۃ الحجۃ علی ان الاکثار فی التعبد لیس ببدعۃ"
میں لکھتے ہیں:

"قال مولانا حسن علی المحدث الہاشمی اللکھنوی فی ہوامش
نسخۃ سنن ابی داؤد والتی کتبہا بیدہ وحشاہا وصححہا حین قراءتہا"[2]

موصوف نے اس کے تحشیہ سے ۱۲۲۴ھ میں فراغت پائی تھی،

(۴) "حاشیۃ جامع الترمذی" موصوف نے جامع ترمذی کے نسخہ کو بھی نقل کیا تھا،
اور اس کی تصحیح بھی کی تھی، کہیں کہیں اس پر حاشیہ بھی لکھا تھا، موصوف کا یہ نسخہ مولانا شمس الحق
عظیم آبادی کے پاس تھا، چنانچہ مولانا عبد الرحمن مبارکپوری المتوفی ۱۳۵۳ھ نے "مقدمۃ

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸) وبلدۂ قنوج از وجود علماء خالی گشت در طلب علم وغیرہ سہ رحلت کردند اول بسوے بلدۂ لکھنؤ
وآنجا کتب فنون واخذ علوم از عربیت وفقہ ومعقول وغیرآں از خدمت مولوی نور بن مولوی محمد انوار و مرزا
حسن علی ہاشمی محدث تلمیذ شاہ عبد العزیز دہلوی نمودند۔ (اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین۔ نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۱۵۰)

[1] "ابجد العلوم" ج۔ ۳ ص ۷، ۹ ۔ [2] "اقامۃ الحجۃ" ص ۲۶، یہ رسالہ "مجموعہ تحفۃ الطلبۃ" کے ساتھ مطبع
یوسفی لکھنو سے ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا تھا، جب مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے سنن ابی داؤد کا حاشیہ لکھنا شروع
کیا تو آپ نے یہ نسخہ مولانا عبد الحی فرنگی محلی سے مستعار لیا اور سنن ابی داؤد کی تصحیح اور تحشیہ میں اس سے بڑا استفادہ کیا، چنانچہ
موصوف نے لکھا ہے: (باقی ص ۴۴۰ پر)

تحفۃ الاحوذی" میں "جامع ترمذی" کے مطبوعہ نسخوں کے بعض اغلاط کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے،

وقع فی النسخۃ الاحمدیۃ وغیرھا	جامع ترمذی کے مطبع احمدی والے نسخہ اور
من النسخ المطبوعۃ فی الھند فی باب	ہندوستان کے اور مطبوعہ نسخوں میں بھی "باب
مایقول اذا خرج من الخلاء	مایقول اذا خرج من الخلاء" میں جو سند حدیث
حدثنا محمد بن حمید بن اسمٰعیل	حدثنا محمد بن حمید بن اسمٰعیل نا مالک بن اسمٰعیل
نا مالک بن اسمٰعیل عن اسرائیل	عن اسرائیل ...... چھپی ہے وہ غلط ہے،
...... قلت ثم وقفت بعد	چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد مجھے اس امر پر آگاہی ہوئی
ذلک علی ما افادہ العلامۃ	کہ علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے اس مقام
شمس الحق العظیم ابادی فی	پر اس امر کی وضاحت کی ہے اور کہا ہے کہ
ھذا المقام حیث قال قولہ	ترمذی کا جو قول حدثنا محمد بن حمید بن اسمٰعیل
حدثنا محمد بن حمید بن اسمٰعیل	عن مالک بن اسمٰعیل عن اسرائیل ......

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۹) الخامسۃ بخط الشیخ الکامل	اور پانچواں نسخہ شیخ کامل مرزا حسن علی
میرزا حسن علی المحدث اللکھنوی من تلامذۃ	محدث لکھنوی جو شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے
الشیخ عبد العزیز الدھلوی وعلیھا	شاگردوں میں سے تھے، کے ہاتھ کا لکھا ہوا
خطوط العلماء المکتوبۃ سنۃ ۱۲۲۴ھ	نسخہ تھا، اور اس نسخہ پر علماء کی تحریریں بھی ہیں،
وصل من الفاضل الالمعی	یہ نسخہ ۱۲۲۴ھ کا مخطوطہ ہے، فاضل لکھنوی
المولوی عبد الحئی اللکھنوی	مولانا عبد الحئی فرنگی محلی سے ہمیں ملا ہے۔
(عون المعبود شرح سنن ابی داؤد۔ ج ۴ ص ۵۵۳	
مطبع انصاری دہلی ۱۳۲۳ھ)	

نا مالک بن اسماعیل عن اسرائیل	مطبع احمدی والے نسخہ میں ہی ایسے ہی ہیں
ھکذا فی النسخ المطبوعۃ فی المطبع	قلمی نسخہ میں بھی ہے جس پر فاضل حسن علی
الاحمدی وھکذا فی نسخۃ قلمیۃ	لکھنوی کے حواشی تھے، آپ شیخ اجل
علیھا خطوط للفاضل حسن علی	حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے
اللکھنوی من تلامذۃ الشیخ الاجل	شاگردوں میں سے ہیں،
عبد العزیز المحدث الدھلوی[1]	

(۵) رسالہ قوس وقزح - یہ رسالہ متوسط تقطیع کے ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے، اور مطبع مصطفائی دہلی میں چھپا ہے، اس رسالہ میں شرح ہدایۃ الحکمۃ میبذی کی بحث قوس وقزح کی تشریح و تفصیل ہے،

تلامذہ: آپ کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، سیکڑوں طالبان حدیث نے آپ سے فن حدیث میں استفادہ کیا اور حدیث کی سند لی، ان میں سے چند مشاہیر کے نام درج ذیل ہیں:

مولانا رحمٰن کے استاد معین الدین شہیدی کڑوی[2]، مولانا محمد علی صدر پوری[3]، مولانا حافظ علیم اللہ نگرامی[4]، محدث حسین احمد ملیح آبادی[5]، منشی خادم علی سندیلوی مولف "تاریخ جد ولیہ"[6]، شاہ عبد الرزاق فرنگی محلی[7]، مولانا مسیح الدین کاکوروی[8]، محدث شاہ ظہور محمد لکھنوی[9]،

---

[1] مقدمہ "تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی" طبع اولیٰ جید برقی پریس دہلی ۱۳۶۰ھ ص ۳۳۸، واضح رہے صحیح سند یوں ہو، "حدثنا محمد بن اسماعیل نا مالک بن اسمٰعیل عن اسرائیل الخ" درمیان سند میں "حمید" کا نام غلط ہے، امام ترمذی کے شیوخ میں "محمد بن حمید" نام کا کوئی استاد نہیں ہے، [2] تذکرہ علمائے ہند، ص ۲۲۹ [3] ایضاً ص ۲۰۳ [4] ایضاً ص ۱۴۸ [5] ایضاً ص ۵۰ [6] ایضاً ص ۱۱۸ [7] مرآۃ الاعلام فی مآثر الکرام [8] تذکرہ مشاہیر کاکوری از محمد علی حیدر، اصح المطابع لکھنؤ ۱۹۲۷ء ص ۳۹۹ تا ۳۰۰، [9] موصوف نے صحیحین اور بلوغ المرام وغیرہ کی سند مرزا صاحب سے لی تھی، آپ کے تذکرہ کیلئے ملاحظہ ہو "تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار" مصنفہ صدیق حسن خاں قنوجی ص ۲۰۱، نیز تاریخ جد ولیہ ص ۱۱۴

مفتی سعد اللہ مراد آبادی[۱]، نواب صدیق حسن خاں کے والد سید اولاد حسن خاں قنوجی[۲]، مولانا عبد الحی فرنگی محلی کے والد مولانا عبد الحلیم لکھنوی[۳]، مولانا خرم علی بلہوری[۴]،

وفات | آخر عمر میں استسقاء کی شکایت ہو گئی تھی، آخر کار یہی مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ "تذکرہ علمائے ہند" میں ہے:

"در اواخر سلطنت نصیر الدین حیدر شاہ اودھ بمقام لکھنو بمرض استسقاء رحلت نمود وہم در آنجا مدفون شد سقی اللہ ثراہ"

موصوف نے نصیر الدین حیدر شاہ کے چچا محمد علی شاہ کے زمانہ میں ۲۶ صفر ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی اور لکھنؤ میں دفن ہوئے۔[۵]

۱؎ "فتاویٰ سعدیہ" مجتبائی دہلی، "ابجد العلوم" از نواب صدیق حسن خاں ج ۳ ص ۹۳۵، حدائق الحنفیہ از فقیر محمد جہلمی طبع نولکشور از ص ۴۸۸ تا ۴۹۵، "حیات جاوید" طبع انجمن ترقی اردو ہند ۱۹۳۹ء از خواجہ الطاف حسین حالی ج ۲ ص ۲۵۳-۲۵۴، تذکرہ کاملان رامپور از محمد علی شوق طبع ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء از ص ۱۵۱ تا ۱۵۴۔ ۲؎ اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین مولفہ نواب صدیق حسن خاں طبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ از ص ۲۳۵ تا ۲۳۸، ابجد العلوم ج ۳ ص ۹۳۵۔ ۳؎ احوال علمائے فرنگی محل از الطاف الرحمن مطبوعہ مجتبائی لکھنو ص ۴۳، تذکرہ علمائے ہند از ص ۱۰۳ تا ۱۰۴، حدائق الحنفیہ ص ۴۸۴، تذکرۃ الانساب از مفتی سید عبد الفتاح المعروف بہ اشرف علی گلشن آبادی، افضل المطابع دہلی ۱۳۲۶ھ از ص ۴۹ تا ۱۰۵، روضۃ النعیم فی خوارق مولانا عبد الحلیم از محمد عبد المجید فرنگی محلی مطبع مینائی لکھنو ۱۳۰۳ھ، مولانا عبد الحی فرنگی محلی نے موصوف کی وفات پر ایک مستقل رسالہ لکھا تھا جس کا نام "حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم" ہے، یہ رسالہ نفیس کے ساتھ مطبع نظامی سے چھپ گیا ہے، بعد میں نولکشور سے علیحدہ بھی چھپا ہے۔ ۴؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۵۶ ۵؎ مولانا کے سال وفات میں اختلاف ہے، امام خاں نوشہروی "تراجم علمائے حدیث ہند" ج ۱ ص ۵۲۰ پر لکھتے ہیں: "نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ۱۲۳۶ھ میں وفات پائی" یہی سال وفات موصوف نے اپنے مقالہ "ہندستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات" (مطبوعہ جید برقی پریس دہلی) میں لکھا ہے، جو بداہۃً غلط ہے کیونکہ نصیر الدین حیدر شاہ کا زمانہ ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء سے ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء تک ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، نیز ۱۲۴۲ھ میں فریضہ حج ادا کیا اور ۱۲۴۳ھ میں تحفۃ المشتاق فی بیان النکاح والصداق نامی رسالہ لکھا، ۱۲۴۶ھ میں باندہ کا سفر کیا، اسلئے موصوف کا صحیح سال وفات ۱۲۵۵ھ جیسا کہ نزہۃ الخواطر (قلمی) ج ۷ میں ہے۔

مرزا حسن علی صغیرؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے دو مکتوب

(مجلہ الرحیم — اکتوبر، نومبر 1965ء)

میرزا حسن علی صغیر اور شاہ عبدالعزیزؒ کے دو مکتوب

محمد عبدالحلیم چشتی

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے تلامذہ میں میرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی المتوفی ۱۲۵۵ھ کو جو شہرت وقبولیت حاصل ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ موصوف نے بارہ برس تک شاہ صاحبؒ سے علوم وفنون کی تحصیل وتکمیل کی تھی۔ محدث لکھنویؒ کے تلمیذ مولوی ابوالخیر محمد معین الدین کردی کاظمی مشہدی المتوفی سنہ ۱۳۰۲ھ رسالہ "تبیان فی احکام شرب الدخان" میں فرماتے ہیں :-

"استاد حضرت مولانا میرزا حسن علی محدث لکھنوی قدس سرہ واستاد اوشان خاتم المحدثین والمفسرین، استاد البریہ صاحب تحفہ اثنا عشریہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ۔ میرزا صاحب مرحوم ومغفور در دہلی رفتہ دوازدہ سال در آنجا استقامت کردہ اخذ علوم عقلیہ ونقلیہ از شاہ صاحب مرحوم ومغفور کردند، ہم چنین شنیدم از زبان استاد مرحومؒ"[1]

تحصیل علوم کی مدت

محدث لکھنویؒ نے کس زمانہ میں علوم وفنون کی تحصیل کی تھی، اس امر کی تصریح کہیں نظر سے نہیں گزری مگر بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علوم کا زمانہ تحفہ اثنا عشریہ کی تکمیل سنہ ۱۲۰۴ھ سے قبل کا ہے۔ کیونکہ تحفہ اثنا عشریہ کی شہرت جب لکھنو پہنچی تو بڑا ہنگامہ ہوا اور مخالفین نے یہ کہنا شروع کیا کہ تحفہ اثنا عشریہ شاہ صاحبؒ کا کوئی کارنامہ نہیں۔ یہ تمام تر نصر اللہ کابلی کی تصنیف صواقع محرقہ سے ماخوذ ہے۔ اس موقع پر میرزا حسن علی صغیرؒ نے شاہ صاحب سے اس سلسلہ میں جو استفسار کیا، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحفہ اثنا عشریہ کی تکمیل سے پیشتر ہی موصوف کو سند فراغ مل چکی تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو (حاشیہ) رسالہ تبیان، طبع نولکشور کانپور سنہ ۱۹۱۲ء ص ۹

اودھ اور اس کے اطراف میں علوم ولی اللہی کا چشمۂ فیض میرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی کی ذاتِ ستودہ صفات سے جاری وساری تھا موصوف کے ان مکاتیب سے جو فتاوی عزیزیہ جلد اوّل میں پائے جاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ انھیں خانوادہ ولی اللہی کے علوم سے خاص اعتنا تھا۔ محدث لکھنوی نے شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف کا نہایت غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ دوران مطالعہ جب انھیں کوئی اشکال پیش آتا تو شاہ عبدالعزیزؒ کو لکھ بھیجتے۔ شاہ صاحبؒ اپنے جوابی مکتوب میں جیسا کہ ان کے مکاتیب سے عیاں ہے، اس کو حل کر دیتے تھے۔

میرزا حسن علی صغیرؒ کو شاہ ولی اللہؒ کے علوم اور ان کی کتابوں سے جو شغف تھا، اس کا اندازہ اس امر سے بھی ہوتا ہے کہ موصوف نے اُن کی بعض تصانیف کی نہایت محنت سے تصحیح کی تھی مگر پھر بھی ان کے خاطر خواہ تصحیح نہیں ہوسکی تھی، حامد حسین کنتوری کا بیان ہے۔

"ازالۃ الخفاء .... نسخہ مصححہ مولوی حسن علی محدث کہ تلمیذ رشید فاضل عزیز بودند ودر آخر آں ایں عبارت .... مسطور است

فتوسل علی ثلاثۃ نسخۃ ولکن بسبب سقمها لم یتم التصحیح فان ساعدنی وجدان النسخۃ الصحیحۃ إنشاء اللہ تعالیٰ، قد وقع الفراغ من التصحیح والمقابلۃ تاسع الشہر رجب ۱۲۳۹ھ سنہ هجریہ یوم الجمعۃ فی بلدۃ بنارس، انتهت الفاظہا[1]"

مرزا حسن علی صغیر کو خانوادہ ولی اللہی سے خاص مناسبت اور نہایت گہرا علمی اور قلبی تعلق حاصل تھا۔ علوم حدیث میں انھیں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرما گئے تھے۔

"حدیث میں میرا نمونہ مرزا حسن علی صغیر ہیں[2]۔"

انہی کی مساعی جمیلہ سے لکھنو اور اس کے اطراف میں شاہ ولی اللہ کے سلسلہ کو بڑا فروغ حاصل

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب الاستقصاء الافحام والاستیفاء الانتقام فی رد منتہی الکلام از حامد حسین کنتوری المتوفی ۱۳۰۶ھ مجمع البحرین لدھیانہ ۱۳۰۶ھ ج ۱، ص ۸۹۔

[2] ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید از ابوالحسن علی ندوی طبع چہارم لاہور۔

ہوا، موصوف نے تحصیل علوم کے بعد درس و تدریس کا شغل اختیار کیا اور سفر و حضر میں جہاں بھی ان کا قیام رہا، وعظ و تذکیر اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہا اور خلق خدا کو فائدہ پہنچا، مولوی عبدالقادر خانی کا بیان ہے :

"میرزا حسن علی لکھنوی نے جو سفر حج بھی کر چکے ہیں اور کلکتہ میں مخلوق کو وعظ و تذکیر سے نفع پہنچایا ہے کچھ عرصے باندہ میں بھی بزم ارشاد آراستہ کی ہے، جو کچھ بھی ہیں سلسلہ عزیزیہ میں بس وہی ہیں، ان کا دل و دماغ ملفوظات عزیزیہ و رفیعیہ کی بیاض سمجھنا چاہیئے، اس زمانہ میں ایسے بزرگوار کا وجود غنیمت ہے[1]۔"

میرزا صاحب کا ذاتی کتب خانہ

میرزا حسن علی صغیرؒ کے انتقال کے بعد جب ان کا علمی کتب خانہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا تو منجملہ اور نوادر کے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف میں سے ازالۃ الخفا اور کتاب النوادر کا نسخہ مولوی حامد حسین کنتوری کو انہی کے کتب خانہ سے ہاتھ لگا تھا، جس کا والہانہ انداز میں ذکر کرتے ہوئے استقصاء الافحام میں رقم طراز ہیں :

" بعد تحریر این مقام از نوادر اتفاقات لابل بعنایت و لطف خالق بریات، رسالہ نوادر من حدیث سید الاوائل و الاواخر کہ آنہم تصنیف شاہ ولی اللہ است از کتب حسن علی محدث کہ تلمیذ صاحب تحفہ بودہ است بدست این قاصر افتاد[2]۔"

میرزا حسن علی صغیر محدث لکھنویؒ کا ذاتی کتب خانہ اس لحاظ سے کہ وہ نوادر کتب پر مشتمل تھا، خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی بعض ایسی تالیفات جن کا اب کہیں سراغ نہیں ملتا جیسے مفتاح کنوز الخفیہ حاشیہ تحفہ اثنا عشریہ وغیرہ اسی کتب خانہ میں محفوظ تھیں[3]۔

---

[1] علم و عمل (وقائع عبدالقادر خانی) مرتبہ محمد ایوب قادری، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۶۰ء ج۔۱ ص ۲۵۳۔

[2] ملاحظہ ہو استقصاء الافحام ص ۱۱۹

[3] ایضاً (حاشیہ) استقصاء الافحام ص ۱۱۶

محدّث لکھنوی کے تین مکتوب جو چند علمی سوالات اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے تین مکتوب جو میرزا صاحب کے سوالات کے تفصیلی جوابات پر مشتمل ہیں، اپنی افادیت کی وجہ سے آج بھی فتاویٰ عزیزیہ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ابتدائی دو مکتوب شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی تعلیمات سے متعلق ہدیہ ناظرین ہیں، ان مکاتیب اربعہ پر تاریخ درج نہیں ہے۔ تاہم شاہ صاحب کے مکتوب ثانی سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہجوم امراض کے ایام میں لکھا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ میرزا حسن علی صغیر محدّث لکھنوی کا سلسلہ مکاتبت شاہ صاحب کے آخری ایام حیات تک جاری رہا ہے[1]

پہلا خط ایک علمی اور کلامی استفسار پر مشتمل ہے جو موصوف نے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے رسالہ ہمعات کی اس مشکل عبارت کے متعلق کیا ہے، جس سے بظاہر شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کا قائل بالبداء ہونا ثابت ہوتا ہے اور قول بالبداء (اس کی تشریح آگے آرہی ہے) اہل سنّت کے نزدیک باطل ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے اس اشکال کو شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور تصنیفات کی روشنی میں حل کیا ہے اور اس طرح حل کیا اور سمجھایا ہے کہ پھر شبہ باقی نہیں رہتا۔ اس لحاظ سے شاہ عبدالعزیز کا یہ خط نہایت بیش بہا علمی معلومات کا حامل ہے اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے دلچسپی اور شغف رکھنے والوں کے لئے ایک نہایت کارآمد سرمایہ ہے۔

رسالہ ہمعات دو مرتبہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ پہلی مرتبہ مولانا عبیداللہ سندھی کی تصحیح کے ساتھ بیت الحکمۃ لاہور سے شائع ہوا تھا مگر اس میں رسالہ ہمعات کی یہ اہم علمی عبارت ہی سرے سے ندارد ہے اور اس اعتبار سے اس نسخہ کو کامل کہنا مشکل ہے۔ دوسری مرتبہ رسالہ ہمعات کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد سندھ نے شائع کیا ہے یہ نسخہ ہمارے فاضل دوست مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی نے ایڈٹ کیا ہے۔ موصوف کے پیش نظر مولانا نورالحق کا تصحیح کردہ ایک قلمی نسخہ بھی رہا ہے اور اس سے موصوف نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے اس نسخہ میں رسالہ ہمعات کی وہ عبارت جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز سے سوال کیا گیا تھا ص ۱۱۲ پر موجود ہے مگر تعجب ہے کہ اس کو پھر بھی متن کتاب

---

[1] موصوف کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو راقم السطور کا مقالہ میرزا حسن علی صغیر محدّث لکھنوی معارف دسمبر ۱۹۵۶ء

میں جگہ نہیں دی گئی ہے، اس کا اضافہ حاشیہ (فٹ نوٹ) میں کیا گیا ہے۔

رسالہ ہمعات کی اس اہم عبارت کے متعلق میرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی کا یہ علمی استفسار اور شاہ عبدالعزیزؒ کا یہ علمی جواب ان بزرگوں کی نظر میں نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ رسالہ ہمعات میں جگہ نہیں پاسکا ہے۔ اب اس مکتوب کو علمی حیثیت سے جو اہمیت حاصل ہے، وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اسی علمی افادیت کی وجہ سے اس مکتوب کو "الرحیم" کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مکتوب شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی جامعیت اور بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ امید ہے نہایت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

مکتوب میرزا حسن صغیرؒ

از میرزا حسن علی صاحب بخدمت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز)

در مذہب اہل حق قول بالبداء[1] باطل است چنانچہ تفصیل تمام دلائل عقلیہ و براہین نقلیہ در کتب احادیث و تفاسیر و کلام مصرح است، و آنچہ در کلام حضرت فخر المحدثین امام المتصوفین جناب شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ ثبوت بداء در کتاب ہمعات مذکور شدہ بکدام معنی باید فہمید و بکدام محل صحیح حمل باید نمود تا مخالف کتاب و سنت نباشد

از میرزا حسن علی صاحب، بخدمت مولانا شاہ عبدالعزیز (قدس سرہ العزیز)

اہل حق کے نزدیک قول بالبداء باطل ہے چنانچہ اس امر کے بطلان پر حدیث، تفسیر اور کلام کی کتابوں میں عقلی اور نقلی دلیلیں نہایت صراحت اور تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ کتاب ہمعات میں حضرت فخر المحدثین امام المتصوفین جناب شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ العزیز کے کلام سے جو بداء کا ثبوت ملتا ہے اس کے کیا معنی سمجھنا چاہئے اور کس محل پر اس کو حمل کرنا چاہیئے تاکہ کتاب

---

[1] بداء کے معنی ظہور الرآی بعد ان لم یکن کے ہیں۔ باری تعالیٰ کا ارادہ ازلی اور قدیم ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی نئی شے ظہور پذیر ہو اور پہلے سے اس کے متعلق اس کا ارادہ اور فیصلہ نہ ہو چکا ہو۔ گویا ایک چیز کا حال اب معلوم ہوتا اور پہلے سے معلوم نہ ہونا اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے۔ اسی طرح سابق میں جس شے کے متعلق جو فیصلہ ہو چکا ہے اس کو بدل دینا بھی موہم بداء ہے۔ اسی امر کی توضیح شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے جوابی مکتوب میں کی ہے۔

عبارت ہمعات انیست !

و ارادہ قضائے حوادث از ان تجلی فوارہ
صفت جوشش می زند و مبدأ[1] اولی حوادث
ہمان ارادہ است و آں ارادہ رانیستر اسباب
دیگر اند بعضے مستتر مثل قوائے کواکب و
افلاک و طبیعۃ[2] کلیہ کہ مدبر شخص اکبر است
و بعضے ظاہر مثل ادعیہ ملاء اعلیٰ وحوادثے کہ
انا[3] سفل مرتفع می شود وریں موطن محو و اثبات
و مبداء نسخ واقع میشود وہمیں تجلی است
کہ مرئی بنی آدم خواہد شد در معاد الی اخر
ما قال،

وامام بغوی در تفسیر معالم التنزیل در
بحث آیۂ یمحو اللہ ما یشاء ویثبت وعندہ
ام الکتاب نقل فرمودہ مراد از محو و اثبات
کہ موہم بداء است چہ خواہد شد و نہ ہ عبارتہ!
عن عمر و ابن مسعودؓ انہما
قالا یمحو[4] السعادۃ والشقاوۃ ایضاً
ویمحو الرزق والاجل ویثبت
ما یشاء عن عمر رضی اللہ انہ کان

وسنت کا خلاف نہ ہو، ہمعات کی عبارت یہ ہے

" ارادہ قضائے حوادث اس تجلی سے فوارہ کی
طرح جوش مارتا ہے اور حوادث کے لئے مبداء
اولیٰ وہی ارادہ ہے اور اس ارادہ کے بھی دوسرے
اسباب ہیں بعض پوشیدہ ہیں جیسے قوائے کواکب
وافلاک اور طبیعۃ کلیہ جو مدبر شخص اکبر
ہے اور بعض ظاہر ہیں مثلاً ادعیۂ ملاء اعلیٰ
اور وہ حوادث جو اسفل سے اٹھتے ہیں یہ محو و
اثبات کا محل اور نسخ کا مبداء واقع ہوتے ہیں
یہی تجلی ہے جو بنی آدم آخرت میں دیکھیں گے۔

امام بغوی المتوفی ۵۱۶ھ نے تفسیر معالم
التنزیل میں آیت شریفہ یمحو اللہ ما یشاء و
یثبت وعندہ ام الکتاب (۱۳/۱۲) اللہ جس حکم
کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی
رکھتا ہے اور اصل کتاب اسی کے پاس ہے، کی
بحث میں جو روایت نقل ہے اس سے کیا مراد ہے
یہاں بھی محو و اثبات سے بداء کا گمان ہوتا ہے
اور معالم التنزیل کی اصل عبارت یہ ہے۔
حضرت عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے

---

[1] فی الاصل مبدأ ادنیٰ۔
[2] فی الاصل طبقہ کلیہ۔
[3] فی الاصل اذا سفل۔
[4] فی الاصل فیمحو۔

یطوف بالبیت وھو یبکی ویقول :
اللھم ان کنت کتبتنی فی
اھل السعادۃ فاثبتنی فیھا وان کنت
کتبت علی الشقاوۃ فامحنی واثبتنی
فی اھل السعادۃ والمغفرۃ ، فانک
تمحو ما تشاء وتثبت وعندک
ام الکتاب

ومثلہ عن ابن مسعود[1] و
فی بعض الاثار ان الرجل یکون
قد بقی لہ من عمرہ ثلثون سنۃ
فیقطع رحمہ فیرد الی ثلثۃ ایام
والرجل یکون[2] قد بقی من عمرہ
ثلثۃ ایام فیصل رحمہ فتمد[3] الی
ثلثین سنۃ انتھی[4]۔

پس مراد از محو و اثبات کہ موہم ہم بداء
است چہ در احادیث اول و زیادت بنا،
بر صلۂ رحمی و کوتاہی بنا بر قطع رحم در حدیث
آخر چیست و اگر بر قضائے معلق و مبرم
حمل کنند خالی از تکلف نیست ،

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نیک بختی کو مٹا دیتا ہے اور
بدبختی کو بھی، چنانچہ وہ محو کر دیتا ہے روزی اور
موت کے وقت کو اور جس حکم کو چاہتا ہے باقی رکھتا
ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ
خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے اور رو رہے تھے
اور کہتے تھے اللہ! اگر تو نے مجھے اہل سعادت
میں لکھا ہے تو مجھے انہی لوگوں میں برقرار رکھ اور
اگر تو نے میرے نصیب میں بدبختی لکھی ہے تو اس
کو مٹا دے اور مجھ کو اہل سعادت اور اہل مغفرت
میں قائم فرما دے۔ کیونکہ آپ جس حکم کو چاہتے ہیں
مٹا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں باقی رکھتے
ہیں اور آپ ہی کے پاس ہے اصل کتاب۔

اور ایسا ہی بعض آثار میں حضرت ابن مسعود
رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے
کہ کسی شخص کی تیس (۳۰) برس عمر باقی رہتی ہے اور وہ
رشتہ ناتہ توڑ بیٹھتا ہے تو اس کی باقی عمر گھٹ کر
صرف تین دن کر دی جاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا
ہے کہ کسی شخص کی عمر صرف تین دن باقی رہ جاتی
ہے اور وہ صلہ رحمی کرتا ہے تو اس کی عمر بڑھا کر
تیس برس کر دی جاتی ہے۔

اب محو و اثبات سے بظاہر جو بداء کا گمان ہوتا

---

[1] فی الاصل عن ابن مسعود فی بعض الآثار [2] فی الاصل والرجل وقد یکون بقی من عمرہ
[3] فی الاصل فیرد الی ثلثین [4] معالم التنزیل برحاشیۂ لباب التاویل، طبع دوم قاہرہ ج۔۴ ص۲۱ ۔

ہے اس سے مراد کیا ہے کیونکہ پہلی اور دوسری حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ عمر میں زیادتی صلۂ رحمی سے اور کمی قطع رحمی سے ہوسکتی ہے۔ اگر اس امر کو قضائے معلق اور قضائے مبرم پر حمل کریں تو یہ تکلف سے خالی نہیں۔

مکتوب شاہ عبد العزیز رح

بداء در کتاب ہمعات بمعنی تجدّد ارادہ واقع است کہ مشابہ بداء است و در بخاری در حدیث اعمیٰ و اقرع وابرص کہ بداء اللہ عزو جل ان یبتلیھم[1] واقع شدہ نیز بہمیں معنی است و بدأ بمعنی تجدّد ارادہ مخالف مذہب حق نیست زیراکہ اہلِ سنّت قاطبۃ ارادہ را از صفات قدیمہ ازلیہ حضرت باری می دانند و تعلقات آنرا حادث می انگارند وحضرت الیشان در کتاب ہمعات، و در کُتب دیگر ارادہ در مرتبہ ذات صفت قدیمہ ازلیہ می دانند و در مرتبہ تجلّی اعظم ارادہ را حادث اثبات می فرمایند پس قدم ارادہ در مرتبہ ذات است و حدوث آں در مرتبہ متاخسر از مرتبہ ذات، کہ مرتبہ تجلّی

بداء کتاب ہمعات میں بمعنی تجدّدِ ارادہ آیا ہے جو مشابہ بداء ہے اور بخاری کی حدیث میں اندھے، گنجے اور کوڑھی کے قصے جو بداء اللہ عزوجل ان یبتلیھم (کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کو آزمائے) کے الفاظ آئے ہیں تو اس میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور بداء تجدّدِ ارادہ کے معنی میں مذہب حق کے خلاف نہیں ہے کیونکہ تمام اہلِ سنّت ارادہ الہٰی کو باری تعالیٰ کی صفات قدیمہ ازلیہ سے سمجھتے ہیں اور اس ارادہ کے تعلقات کو حادث مانتے ہیں حضرت شاہ ولی اللہ کتاب ہمعات اور دیگر تالیفات میں مرتبہ ذات میں ارادہ کو صفت قدیمہ ازلیہ جانتے ہیں اور مرتبہ تجلّی اعظم میں ارادہ کو حادث تسلیم کرتے ہیں تو ارادہ مرتبہ ذات میں قدیم ہے اور مرتبہ ذات

---

[1] صحیح بخاری مطبع مصطفائی دہلی ۱۳۰۵ھ ج۔ ۱ ص ۴۹۲۔

اعظم است وہرگاہ حدوث وقدم در دو مرتبہ
واقع شد تخالف برخاست آرے مرتبہ تجلی اعظم
راکہ مدبر شخص اکبر است[1] علماء ظاہر نمی دانند
واثبات نمی کنند پس نزد آنہا حدوث ارادہ
را در ہیچ مرتبہ گنجائش نماند بلکہ تعلق ہماں
ارادہ قدیم را حادث انگاشتند وھذا
قریب من النزاع اللفظی،

ودر آیہ کریمہ نیز اشارت باختلاف
مراتب معلوم می شود زیراکہ فرمودند یمحو
اللہ ما یشاء ویثبت باز فرمودند
وعندہ ام الکتاب صریح دلالت دارد
برآنکہ محو واثبات درجاتے ام الکتاب درمرتبہ
دیگر است ودر ہر دو اثر حضرت عمر وابن مسعود
رضی اللہ عنہما نیز دفع تخالف باختلاف
مرتبتین توان نمود علمائے ظاہر لقضائے
معلق ومبرم دفع تخالف می نمایند ولاباس
بذلک لانہم لایثبتون مرتبۃ
سوی الذات المقدسۃ،

اما الصوفیۃ اثبتوا التجلیات
ومرتبۃ التجلیات متاخرۃ عن مرتبۃ
الذات امکن لہم القول بحدوث

سے جو مرتبہ متاخر ہے وہ مرتبہ تجلی اعظم سے عبارت
ہے۔ اس مرتبہ متاخر میں جو ارادہ ہوا وہ ارادہ
حادث ہے اور جب ارادہ کا قدیم اور حادث ہونا
باعتبار دو جہتوں کے اعتبار سے ہوا تو تخالف کا
شبہ بھی باقی نہ رہا۔ ہاں مرتبہ تجلی اعظم کو جو مدبر
شخص اکبر سے عبارت ہے اس مرتبہ کو علماء ظاہر
نہیں جانتے اور یہ مرتبہ ان کے نزدیک ثابت نہیں
ہے اس بنا پر علمائے ظاہر کے نزدیک کسی مرتبہ میں
حدوث ارادہ کی گنجائش نہ رہی بلکہ یہ علماء اسی
ارادہ قدیمہ کے تعلق کو حادث جانتے ہیں اور یہ
تقریباً نزاع لفظی ہے۔

اور آیت کریمہ میں بھی اختلاف مراتب کی
جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے
فرمایا ہے یمحو اللہ ما یشاء ویثبت اور
پھر فرمایا ہے وعندہ ام الکتاب۔ اس سے
بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ محو واثبات جس مرتبہ میں
ہوتا ہے ام الکتاب کا مرتبہ اس کے علاوہ ہے اور
حضرت عمر اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے
دونوں اثر میں جس محو واثبات کا ذکر ہے، اس کو
اختلاف مراتب پر حمل کرنے سے تخالف کا شبہ جاتا
رہتا ہے علمائے ظاہر اس تخالف کو قضائے معلق و

---

[1] وفی الاصل شخص اکبر است دعلماء ظاہر۔

الارادۃ فی تلک المرتبۃ من غیر لزوم محذور،

و در کتاب ہمعات و دیگر تصانیف ایشاں اثبات حدوث ارادہ قدیمہ دریں مرتبہ مفصل مذکور است چنانچہ بعد از تامل واضح خواہد شد۔

مرتبہ پر محمول کر کے تضاد کو رفع کرتے ہیں اور اس میں کوئی قباحت نہیں کیونکہ وہ علمائے ظاہر ذات مقدس کے سوا کوئی مرتبہ ثابت نہیں کرتے۔

لیکن صوفیہ نے چونکہ تجلیات کا مرتبہ ثابت کیا ہے اور مرتبہ تجلیات، مرتبہ ذات سے متاخر ہے تو صوفیہ کو یہ کہنا ممکن ہو گیا کہ مرتبہ تجلّی میں جو ارادہ ہوتا ہے وہ ارادہ حادث ہے اور اس میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ہمعات اور اُن کی دیگر تالیفات میں مرتبہ تجلّی میں ارادہ قدیمہ کا حادث ہونا تفصیل سے مذکور ہے چنانچہ غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جائے گا۔

دوسرا مکتوب بھی ایک خاص کلامی مسئلہ عصمت سے متعلق ہے۔ اس مکتوب کا تعلق بھی شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور تصنیف تفہیمات کی ایک تفہیم سے ہے، جس میں صفات اربعہ عصمت، حکمت، وجاہت اور قطبیت باطنہ سے بحث کی گئی ہے۔ تفہیمات دو مرتبہ طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے۔ پہلی بار مطبع مجتبائی میں باہتمام سید عبدالغنی ولی اللہی (خلف الصدق مولوی سید محمد نواسہ و سجادہ نشین و متولی درگاہ شیخ کلیم اللہ شاہجہان آبادی) تفہیمات کی جلد اوّل شائع ہوئی تھی پھر ۱۳۵۵ھ میں مجلس علمی ڈابھیل (سورت) نے نہایت آب و تاب کے ساتھ دونوں جلدوں کو شائع کیا مگر شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے اس علمی مکتوب سے تعرض نہیں کیا گیا، حالانکہ زیر بحث موضوع پر اس مکتوب کی افادیت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اہمیت کے پیش نظر یہ علمی تحفہ ماہنامہ "الرحیم" کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس مکتوب سے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

مکتوب میرزا حسن علی صغیرؒ

نزد اہل حق یعنی اہلِ سنّت وجماعت
صحیح وثابت شدہ بہ براہین نقلیہ وعقلیہ
کہ ماسوائے انبیاء ورسل وملائکہ علیہم السلام
عصمت در احدے ثابت نیست حتی کہ اگر
کسے را معصوم گویند درست نیست ولہذا
متکلمین وفقہاء رحمہم اللہ اطلاق عصمت برغیر
انبیاء وملائکہ روا ندارند پس آنچہ جناب
فخر المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس
سرہ در تفہیمات آلہیہ وغیرہ صفات اربعہ کہ عصمت
وحکمت ووجاہت وقطبیت باطنہ است برائے
حضرات ائمہ اثنا عشر علیہم السلام ثابت کردہ
اند وآں ہدایت مآب نیز ایں مراتب را در
رسالہ کہ دربیان اعتقادات بحضرت ایشاں
تالیف فرمودہ اند ارقام نمودہ اند آنرا بکدام
محل صحیح حمل باید نمود ودلیلے از کتاب وسنّت
واجماع امّت بران کدام است وجواب تخالف
ایں قول کہ بہ نسبت مذہب اہل سنّت نمایاں
شدہ چہ خواہد شد ومع ذٰلک منافی تفضیل
خلفائے ثلثہ رضی اللہ عنہم خصوصاً حضرات
شیخین خواہد بود وحال آنکہ ایں مسئلہ تفضیل
مجمع علیہ اہلِ سنّت است عند من یعتمد بہ، و

اہل حق یعنی اہل سنت وجماعت کے نزدیک
عقلی اور نقلی دلائل سے یہ امر درست اور ثابت ہے
کہ انبیاء ورسل اور ملائکہ علیہم السلام کے سوا کسی
دوسرے کا معصوم ہونا ثابت نہیں۔ یہاں تک کہ ان
کے سوا کسی اور کو معصوم کہیں تو یہ درست نہیں اور
اسی وجہ سے متکلمین اور فقہاء رحمہم اللہ انبیاء اور
فرشتوں کے سوا کسی اور پر عصمت کا اطلاق روا
نہیں رکھتے، پس جناب فخر المحدثین حضرت شاہ
ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے تفہیمات وغیرہ
میں صفات اربعہ، عصمت، حکمت، وجاہت اور
قطبیت باطنہ حضرات ائمہ اثنا عشر (دوازدہ امام)
کے لئے ثابت کی ہیں اور جناب موصوف نے جو
رسالہ ان حضرات سے اعتقاد رکھنے کے بارہ میں
مرتب فرمایا ہے یہی لکھا ہے تو جناب موصوف کے
اس قول کو کس محل پر حمل کرنا چاہیئے۔ اور کتاب و
سنّت اور اجماع امت سے کون سی دلیل اس
قول کے ثبوت پر ہے۔ اس قول اور اہلِ سنّت کے
قول مذکور میں جو تخالف ہے وہ ظاہر ہے اس
تخالف کا جواب کیا ہے اور اس کے باوجود یہ قول
خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی تفضیل خصوصاً حضرات
شیخین کی تفضیل کے مخالف ومنافی ہوگا، حالانکہ

علاوہ آں خود جناب افادت مآب ہدایت
انتساب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بہزار
ضبط و ربط و طمطراق تمام این مسئلہ را یعنی
تفضیل خلفائے ثلاثہ سیما شیخین را رضی اللہ
عنہم بدلائل نقلیہ و عقلیہ و کشفیہ و وجدانیہ
بتقریر دانی و مثال شافی و ترتیب کافی تحریر
فرمودہ اند پس جواب تخالف و تعارض این
مسئلہ ممہدہ ثابتہ متفق علیہا با آں مسئلہ غریبہ
غیر ثابتہ عند اہل حق یعنی اہلِ سنّت و جماعت چہ
خواہد شد بینوا توجروا۔

محققین کے نزدیک مسئلہ تفضیل پر اہلِ سنّت کا
اجماع ہے۔ اس کے علاوہ خود حضرت شاہ
ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے خلفائے ثلاثہ کی تفضیل
کو پُر زور دلائل کے ساتھ نہایت مربوط و مرتب
بیان کیا ہے خاص طور سے شیخین رضی اللہ عنہم
کی تفضیل کو نقلی، عقلی، کشفی اور وجدانی
دلائل سے تقریر وانی، مثال شافی اور ترتیب کافی
کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ پس اس مسئلہ ممہدہ
متحققہ متفق علیہا کو اس مسئلہ غریبہ سے جو اہلِ
حق یعنی اہلِ سنّت و جماعت کے نزدیک ثابت و
متحقق نہیں جو تخالف و تعارض ہے اس کا کیا
جواب ہوگا، بیان فرمائیں اور ماجور ہوں۔

مکتوب شاہ عبدالعزیز رح

عصمت و حکمت و وجاہت نزد صوفیہ
معانی اصطلاحیہ دارند خصوصاً در کُتب مصنفہ
حضرت والا ماجد قدس سرہ مفصل مذکور
اند این وقت بسبب شدت بیماریہا امکان
نیست کہ بتمہید مقدمات نوشتہ آید اگر کُتب
مصنفہ ایشاں موجود باشند مطالعہ باید نمود واضح
خواہد شد و شرح اعتصام از تصانیف شاہ
محمد عاشق پہلتی قدس اللہ سرہ اگر بہم رسد
شافی و کافی خواہد بود۔

عصمت، حکمت اور وجاہت کے صوفیہ کے
یہاں کچھ اصطلاحی معانی ہیں وہ حضرت والد ماجد
قدس سرہ کی تالیفات میں مفصل مذکور ہیں۔ اس
وقت امراض کی شدت کی وجہ سے یارا نہیں کہ وہ
معانی تفصیل سے لکھے جائیں۔ اگر حضرت موصوف
کی تصانیف موجود ہوں تو مطالعہ کرنا چاہیں۔ یہ
امر واضح ہو جائے گا اور شرح اعتصام جو شاہ
محمد عاشق پھلتی کی تصنیف ہے اگر مل جائے تو
کافی و شافی ہوگی۔

بالجملہ موافق علماء ظاہر این وقت جواب
نوشتہ می شود عصمت دو معنی دارد۔

اوّل امتناع صدور ذنب مع القدرۃ
علیہ و این معنی باجماع اہلِ سنّت مخصوص بحضرات
انبیاء و ملائکہ علویہ است۔

دوم عدم صدور ذنب مع جوازہ
ان غیر لزوم محذور و این معنی را نزد صوفیہ
محفوظ خوانند و ہمین معنی در کلام صوفیہ سوال
عصمت برائے خود آمدہ چنانچہ در اوّل دعائے
حزب البحر واقع شدہ نسالك العصمة
فی الحركات و السكنات و الارادات
و الخطرات الی اخرہ این معنی مخصوص
بانبیاء نیست و آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
برائے اہلِ بیت خود خواستہ اند بقولہ اللهم
اذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا[1]
ہمین معنی است۔

و در حق حضرت عمر رضی اللہ عنہ وارد
شدہ ان الشیطان یفرمن عمر و
نیز وارد شدہ ان الحق ینطق علی لسان
عمر و قلبہ[2]۔

مختصر یہ ہے کہ فی الحال علمائے ظاہر کے موافق
جواب لکھا جاتا ہے عصمت کے دو معنی ہیں۔

ایک معنی ہیں گناہ پر قدرت ہونے کے
باوجود گناہ کے ارتکاب سے باز رہنا اور اہلِ سنّت
کا اس پر اجماع ہے کہ یہ معنی انبیاء۔ اور ملائکہ علویہ
کے ساتھ خاص ہیں۔

دوسرے عصمت کے معنی کسی شخص سے جواز
صدور گناہ کے باوجود گناہ کا نہ ہونا اور صدور
گناہ سے شرع کے کسی اصول میں نقصان کا لازم
نہ آنا ہیں۔ صوفیہ اس حقیقت کو لفظ محفوظ سے تعبیر
کرتے ہیں۔ صوفیہ نے بعض دعاؤں میں اپنے لئے
جو عصمت کا سوال کیا ہے تو اس عصمت سے صوفیہ
کے نزدیک یہی معنی مراد ہیں۔ چنانچہ دعائے حزب البحر
کے شروع میں ہے نسالك العصمة فی الحركات
و السكنات و الارادات و الخطرات الی اخرہ
ہم تجھ سے حرکات، سکنات، ارادے اور خطرات
میں عصمت کی درخواست کرتے ہیں۔ عصمت کے
یہ معنی انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص نہیں
ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہلِ بیت
کے لئے بھی اس امر کی دعا کی ہے آپ کے الفاظ ہیں

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں اللهم اهل بيتي فاذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا (عن ام سلمہ) جامع ترمذی، مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۳۹۵ھ ج۔ ۲ ص ۲۱۹ و مجمع الزوائد از نور الدین ہیثمی ج۔ ۹ ص ۱۶۷۔

[2] یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے۔ ان الشیطان لیفرق منك یا عمر (عن بریدہ) فیض القدیر شرح الجامع الصغیر طبع قاہرہ ۱۳۵۶ھ ج۔ ۲ ص ۳۵۹۔

و در حق صہیب رومی واقع شدہ
نعم العبد صہیب لولم یخف اللہ لم یعصہٗ فلا
اشکال۔

وحکمت بمعنی علم نافع است اگر مکتسب
باشد در اصطلاح صوفیہ آنرا حکمت نگویند
بلکہ علم و فضیلت نامند و اگر آن علم بطریق
وہب بر دل شخصے واقع شود آنرا حکمت نامند
وآتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب، وکلا
آتینا حکما وعلما وخواہ آن علم متعلق بعقائد
باشد یا باعمال یا باخلاق و این معنی ہم
مخصوص بہ انبیاء نیست و لقد آتینا لقمان
الحکمۃ ان اشکر للہ بعد ازاں آید و
اذقال لقمان لابنہ تا آخر رکوع بیان
بعضے از حکمت ایشاں است آرے ازیں
باب ہرچہ بوحی آید آن مخصوص با نبیاء است
وہب عام است نبی و غیر نبی دراں شریک

اللھم اذھب عنھم الرجس وطھرھم
تطھیرا، اے اللہ ان سے آلودگی کو دور رکھ
اور ان کو خوب نکھار دے۔ یہاں بھی یہ دوسرے
معنی مراد ہیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں
حدیث میں وارد ہے کہ شیطان حضرت عمر رضی اللہ
عنہ سے بھاگتا ہے اور انہی کے بارے میں آیا ہے کہ
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبان وقلب پر حق جاری
ہوتا ہے۔

اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے
حق میں آیا ہے، حضرت صہیب بہت اچھے بندے
ہیں اگر ان کو خدا کا خوف نہ ہوتا تو یہ محفوظ نہ رہتے،
تو اب کوئی اشکال باقی نہ رہا۔

اور حکمت بمعنی علم نافع ہے۔ اگر یہ علم کسبی
ہو تو صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو حکمت نہیں
کہتے بلکہ علم و فضیلت کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں
اور اگر وہ علم بطور فیضان الٰہی کسی شخص کے دل پر

---

۱ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور ابوعبید قاسم بن سلام نے اس کو کتاب غریب الحدیث میں نقل کیا
اور سند ذکر نہیں کی ہے چنانچہ علامہ سیوطیؒ کا بیان ہے۔
متاخرین محدثین نے تصریح کی ہے کہ انھیں اس روایت کی سند نہیں مل سکی ہے۔ میں نے اس کو جامع کبیر میں محض
شہرت کی بنا پر نقل کیا ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اس کو حضرت ابوعبید نے ذکر کیا ہے اور ابوعبید صدر اول سے
قریب ہے۔ اس نے تبع تابعین کا زمانہ پایا ہے اور ظاہر یہی ہے ان کو اس کی سند کا علم ہوگا۔ میں نے اس کتاب میں ایسی
کوئی حدیث نقل نہیں کی ہے جس کی سند کا مجھے علم نہ ہو سکا ہو بس ایک یہی حدیث ایسی ہے جس کی سند مجھے نہیں مل سکی
ہے (کنز العمال طبع دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد دکن ۱۳۱۲ھ ج ۷ صـ ۴۸ نیز ج ۶
صـ ۱۵۲، ۱۵۶)

اند و لہذا در حدیث شریف وارد شدہ انا دار الحکمۃ و علی بابہا[1] و در روایت مشہور انا مدینۃ العلم و علی بابہا واقع شدہ مراد از علم دریں جا ہمیں معنی است،

دو جاہت بمعنی آنست کہ بعضے بندگان خود را حق تعالیٰ بوجہے معاملہ نماید از دفع طعن معاندان و تہمت ہائے عیوب و حفظ در اصابت بادشاہان و امرا در حق محبوبان و ردید ایشان می نماید و ایں معنی در حق دو کس از انبیائے اولی العزم منصوص قرآنی است۔

وارد ہوا اس کو حکمت کہتے ہیں۔ آیت شریفہ ہے وآتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب ۲۳/۱۱ اور ہم نے انھیں حکمت اور فیصلہ کرنے والی تقریر عطا کی تھی۔

وکلاً آتینا حکما وعلما ۱۷/۱۱ اور حکمت و علم تو ہم نے ہر ایک کو دیا تھا۔ خواہ وہ علم عقائد سے متعلق ہو یا اعمال و اخلاق سے۔ یہ معنی بھی انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں ہیں چنانچہ ارشاد باری ہے ولقد آتینا لقمان الحکمۃ ان اشکر للہ ۲۱/۱۱ اور بیشک ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی (اور یہ حکم دیا) کہ اللہ کا شکر کرتے رہو۔ اس آیت کے بعد ہے واذ قال لقمان لابنہ تا آخر رکوع اس میں

---

[1] حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت میں یہ روایت اور جو اس کے بعد مذکور ہے دونوں روایتوں میں کلام ہے چنانچہ روایت انا دار الحکمۃ و علی بابہا کے متعلق علامہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں۔

امام ترمذیؒ کا بیان ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور جامع ترمذی کے ایک نسخہ میں اس کے متعلق منکر کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ بعض نے اس حدیث کو شریک سے روایت کیا ہے اور اس میں صنابحی کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ حدیث شریک کے سوا کسی اور ثقہ راوی سے منقول نہیں ہے۔ اور اس باب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت مروی ہے۔ علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

ہماری نظر میں اس حدیث کی سند ٹھیک ہے اور جن دیگر محدثین کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے وہ اس میں دو علتیں بتاتے ہیں، ایک یہ ہے کہ اس حدیث کا مخرج و منتہیٰ علی از آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور یہ اسی مذکورہ بالا سند سے معروف و مشہور ہے اور دوسری سند میں سلمہ بن کہیل جو راوی ہے وہ محدثین کے نزدیک نقل حدیث میں حجت نہیں ہے۔ اگرچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت میں اور بھی موافقت کرتے ہیں۔

انا مدینۃ العلم و علی بابہا .... اس روایت کو ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات میں (باقی اگلے صفحہ پر)

اوّل در حق حضرت موسیٰ علی نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر گاہ ایشاں را بنی اسرائیل تہمت ادراہ وبرص کردند قال اللہ تعالیٰ یا ایہا الذین امنوا لاتکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبراہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیھا، حق تعالیٰ راضی نشد بہ تہمت ایشاں اگرچہ آں تہمت ہیچ محذور شرعی نداشت،

حضرت لقمان کی بعض حکمت کی باتوں کا تذکرہ ہے البتہ اس طرح کا علم جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے۔ علم وہبی عام ہے اس میں نبی اور غیر نبی دونوں شریک ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے" انا دار الحکمۃ وعلیؓ بابھا" میں دار الحکمت ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں اور یہ بھی روایت مشہور ہے" انا مدینۃ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) درج کیا ہے اور تصریح کی ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے۔ حافظ صلاح الدین علائی نے کہا ہے کہ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس کو موضوع قرار دیا ہے اور دیگر علماء کا بھی یہی خیال ہے لیکن انھوں نے وضع کے دعوی کے سوا کوئی علت قادحہ بیان نہیں کی۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں تصریح کی ہے کہ مستدرک حاکم میں یہ حدیث بہت سی سندوں سے منقول ہے۔ اس بنا پر یہ حدیث بے اصل نہیں اور اس کو موضوع کہنا مناسب نہیں۔ اسی لئے حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے متعلق جو فتویٰ دیا ہے اس میں کہا ہے کہ حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، ابن جوزی نے حاکم کے اس قول کی مخالفت کی اور انھوں نے اس کو موضوعات میں شمار کیا مگر ان کا یہ قول درست نہیں اور صحیح اور حق بات حاکم اور ابن جوزی دونوں کے قول کے خلاف ہے اور وہ یہ ہے کہ حدیث نہ صحیح ہے اور نہ باطل و موضوع قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ حدیث حسن کی قسم سے تعلق رکھتی ہے یہ حسن کے مرتبہ سے نہ فروتر ہے اور نہ برتر ہے۔ یہ بحث طول کی متقاضی ہے لیکن اس بحث میں قابل اعتماد بات یہی ہے۔

میں (سیوطی) کہتا ہوں کہ میں بھی ایک زمانہ تک اس حدیث کی بحث میں یہی جواب دیتا رہا تا آنکہ علامہ ابن جریر طبری کی حدیث علی کی تصحیح پر جو انھوں نے تہذیب الآثار میں مستدرک حاکم کی حدیث ابن عباس کے ساتھ کی ہے آگاہی ہوئی تو میں نے استخارہ کیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ یہ حدیث مرتبہ حسن سے بڑھ کر صحت کے مرتبہ کو پہنچ گئی ہے (کنز العمال ج۔ ۲ ص ـــ)

دوم در حق حضرت عیسیٰ کہ یہودیاں در حق ایشاں تہمت زنازادگی بر زبان آوردند و بسخن آمدن ایشاں در عین طفولیت آں تہمت را زائل فرمود قال اللہ فی سورۃ آل عمران وجیھا فی الدنیا والآخرۃ ومن المقربین ویکلم الناس فی المھد وکہلا الی اخرہ،

و ایں معنی در حق اکثر اولیا بہ ثبوت پیوستہ اوّل در حق ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کو ان اللہ یکرہ فوق السموات السبع ان یخطاء ابوبکر فی الارض[1]،

دوم در حق علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہ دُعا کردند، اللھم ادر الحق حیث دار[2] و نگفتند ادرہ حیث دار الحق،

ومعنی قطبیت باطنہ آنست کہ حق تعالیٰ بعضے بندگان خود را مخصوص سازد کہ مہبط فیض الٰہی اولاً بالذات ایشاں باشند وازہ ایشاں بدیگراں منتقل شود گو بظاہر کسے تلمذو

العلم وعلی بابھا میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ اس علم سے مراد یہی علم وہبی ہے۔

اور وجاہت کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے حق میں کوئی ایسا معاملہ کرے کہ اس سے مخالفین کے اعتراضات ختم ہوجائیں اور عیوب کی جو تہمت انھوں نے لگائی ہے وہ زائل ہوجائے اور بادشاہوں کی ایذا رسانی سے وہ بندہ محفوظ رہے اور اسی غرض سے امرا اپنے مقربین اور متوسلین بارگاہ کے حق میں کوئی امر کرتے ہیں اور اسی معنی کے اعتبار سے وجاہت انبیائے اولی العزم میں سے دو کے حق میں نص قرآنی وارد ہے ایک حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے حق میں جب کہ بنی اسرائیل نے ان پر یہ تہمت لگائی کہ ان کو ادرہ اور برص کا مرض لاحق ہے تو دفع تہمت کی غرض سے حق تعالیٰ نے فرمایا: یا ایھا الذین آمنوا لاتکونوا کالذین آذوا موسیٰ فبراہ اللہ مما قالوا وکان عند اللہ وجیھا[22] اے ایمان والو! ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنھوں نے

---

[1] یہ حدیث بایں الفاظ منقول ہے۔

ان اللہ تعالیٰ یکرہ فوق سمائہ ان یخطاء ابوبکر الصدّیق فی الارض (کنز العمال ج۔۶ ص۱۳۸)

[2] یہ روایت ان الفاظ سے مروی ہے۔

اللھم ادر الحق معہ حیث دار (جامع ترمذی، فخر المطابع دہلی ۱۳۶۹ھ ص۶۱۶)

اکتساب از ایشاں نکردہ باشد آنکہ شعاعِ آفتاب از راہ روزنے در خانہ بیفتد پس اولاً آں روزن روشن شدہ و بواسطہ آں تمام اشیائے خانہ روشن شود و ایں را قطب ارشاد نیز نامند بخلاف قطب مدار،

بالجملہ اثبات ایں صفات اربعہ عند التحقیق نہ مخالف مذہب اہلِ سنت است گو بظاہر بنیاں از اطلاق ایں الفاظ تحاشی نمایند و نہ مخالف تفضیل شیخین کہ مجمع علیہ جمیع اہلِ حق است زیرا کہ مدار آں تفضیل بر اکثریت ثواب است عند المتکلمین و جائز است کہ خدائے تعالیٰ بعضے بندگان خود را مخصوص بزیادت ثواب گرداند ہر چند فضائل دیگر و صفات کمال در غیر آنہا بیشتر باشد، و مصنف کتاب ہمعات قدس سرہ، مدار تفضیل شیخین بر تشبہ انبیاء داشتہ است در سیاست امت و رفع شبہات و ترویج دین و نگاہداشتن مردم از بدعت و اجرائے جہاد و امر بالمعروف و نہی عن المنکر و ظاہر است کہ زیادتی شیخین دریں امور اوضح من الشمس و ابین من الامس است و لہذا قال اکثر المتکلمین التفضیل عندنا بالتوفیق لا بالفضائل فقط۔

موسیٰ کو ایذا پہنچائی تھی سو اللہ نے انھیں بری ثابت کر دیا اور اللہ کے نزدیک وہ بڑے معزز تھے اگرچہ اس تہمت سے کوئی شرعی قباحت لازم نہ آتی تھی لیکن حق تعالیٰ کو منظور نہ ہوا کہ ایسی تہمت بھی ان پر لگائی جائے اس لئے اس تہمت کو دفع فرمایا۔

دُوسری تہمت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں لگائی گئی چنانچہ یہودیوں نے ان پر زنا زادگی کی تہمت لگائی تو عین طفولیت کے عالم میں ان کی زبان سے حق بات کہلا کر یہ تہمت بھی دفع کر دی چنانچہ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وجیہا فی الدنیا و الآخرۃ ومن المقربین ویکلم الناس فی المھد و کہلاً ومن الصلحین ۳/۱۳ (وہ) دُنیا و آخرت میں معزز اور مقربوں میں سے ہیں، وہ لوگوں سے گفتگو کریں گے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے۔

اور یہ معنی وجاہت اکثر اولیاء اللہ کے حق میں ثابت ہے

ایک تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں وارد ہے ان اللہ یکرہ فوق السموات السبع ان یخطاء ابوبکر فی الارض، اللہ تعالیٰ کو ہفت آسماں پر یہ بات پسند نہیں کہ زمین پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شان میں خطاء کی نسبت کی جائے۔

دوسرے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں آنحضرت کی دُعا کے الفاظ ہیں اللھم ادر الحق حیث دار، اے اللہ تو حق کو پہنچا جہاں وہ جائیں اور آپ نے یہ نہ فرمایا ادرہ حیث دار الحق۔ جہاں حق ہو وہاں ان کو پہنچا،

اور قطبیت باطنہ کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو اس واسطے خاص کرے کہ ان پر سب سے پہلے فیضان الٰہی ہوگا اور پھر ان خاص بندوں کے ذریعہ وہ فیضِ الٰہی دوسرے بندوں کو ملے گا اور اگرچہ ظاہر میں کسی کو ان سے نسبت تلمذ حاصل نہ ہو اور نہ اس نے ان سے اکتساب فیض کیا ہو جیسا کہ آفتاب کی شعاع روزن خانہ سے گھر کے اندر پڑتی ہیں تو پہلے وہ روشن دان روشن ہوتا ہے اور اس کے واسطہ سے گھر کی تمام چیزیں روشن ہوتی ہیں اور اس کو قطب ارشاد بھی کہتے ہیں اور قطب مدار اس کے علاوہ ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفات اربعہ ثابت کرنا اہل سنت کے مذہب کے مخالف نہیں ہے اگرچہ وہ لوگ جن کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے ان الفاظ کے اطلاق سے گریز کرتے ہیں۔ اور یہ بات تفضیل شیخین کے بھی مخالف نہیں ہے جس پر اہلِ حق کا اجماع ہے کیونکہ اس تفضیل کا دار و مدار متکلمین کے نزدیک ثواب

زیادتی پر ہے اور یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض
بندوں کو زیادہ ثواب کے ساتھ مخصوص فرمائے گرچہ
دُوسری فضیلتیں اور صفاتِ کمال اوروں میں ان سے
زیادہ ہوں۔

اور مصنف کتاب ہمعات شاہ ولی اللہ قدس
سرہ نے تفضیل شیخین کا دار و مدار تشبہ انبیاء علیہم
السلام پر رکھا ہے اور یہ تشبہ سیاستِ امت، رفع
شبہات، ترویج دین لوگوں کو بدعت سے بچانے
جہاد قائم کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
کی انجام دہی میں ہے اور ان امور میں شیخین کی
فضیلت اور لوگوں پر اظہر من الشمس اور ابین
من الامس ہے چنانچہ اکثر متکلمین کا قول ہے
التفضیل عندنا بالتوفیق لا بالفضائل کہ فضیلت
ہمارے نزدیک اعمال خیر کی توفیق کی وجہ سے ہے
فضائل کے اعتبار سے نہیں ہے۔

تذکرہ شاہ محمد اسحاقؒ

از

مقالات طریقت

(مجلہ الرحیم، اپریل 1968ء)

تذکرہ شاہ محمد اسحاق از مقالات طریقت

مرتبہ محمد عبدالحلیم چشتی، ایم۔ اے۔

الرحیم کے ماہ محرم الحرام ۱۳۸۶ھ کے شمارہ میں احقر نے مقالات طریقت مولفہ عبدالرحیم ضیاؔ نے شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدینؒ کے حالات ہدیۂ ناظرین کئے تھے۔ اور اسی شمارہ میں اس کتاب کا تفصیلی تعارف بھی کرایا تھا۔ اب اسی کتاب سے شاہ محمد اسحاق دہلوی کے حالات ہدیۂ ناظرین ہیں افادیت کے پیش نظر ہم نے ذیلی سرخیاں کا اضافہ کر دیا ہے۔

نام و نسب

زبدۂ محدثین و شیخ آفاق مولانا محمد اسحٰق علیہ الرحمہ، قامع بنیان شرک و طغیان، حاوی موجبات علم و ایقان سالک مسالک ہدایت و ارشاد مجلی آئینہ صافی اعتقاد، رموز فہم سرائر تفسیر قرآنی، دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی، جامع کمالات صوری و معنوی، نکتہ سنج کلام الٰہی و حدیث نبوی مرتقی مدارج درجات عالی، ہیئولائے ادانی و اعالی، ملک سیرت فرشتہ صورت جامع اسرار معرفت و حقیقت مواظب اوامر شریعت و طریقت، فخر علمائے دین، مسند محدثین موصوف بصفت تقید و اطلاق مولانا و بالفضل اولانا ابوسلیمان مولانا مولوی شاہ محمد اسحاق ابن شیخ محمد افضل ابن شیخ احمد ابن شاہ اسماعیل ابن شیخ منصور ابن احمد ابن محمود، بموجب نسب نامہ حضرت پیر و مرشد مندرجہ مقالہ اوّل رحمہ اللہ علیہم اجمعین۔

آپ نواسے اور خلیفہ راستین و مسند نشیں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے ہیں۔

نظم

قطب آفاق حضرت اسحاق ہادی خلق و مظہر خلاق

مجمع خلق احمدی ذاتش | پیش ازیں نیست مدحت اخلاق
بود . . . . ادعریاں | انسپئے قطع راس شرک و نفاق
درخموشی ہزار لطف کلام | درتکلم کرشمۂ اشراق
درکمالات ظاہر و باطن | اے ضیار بود وفات پاکش طاق

ولادت۔ ولادت آپ کی ہشتم ذی الحجہ ۱۱۹۷ھ گیارہ سو ستانوے ہجری میں ہے۔

علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل

جناب مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کا خیہ مولانا عبدالحیٔ علیہ الرحمہ سے پڑھتے تھے کہ ان کو اپنے وطن کے سفر کا اتفاق ہوا۔ تو حضرت میاں صاحب اعنی مولانا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نے مولانا عبدالقادر صاحب اپنے برادر خورد کو آپ کے سبق کے واسطے فرمایا اس روز سے آپ ان کی خدمت میں ہر روز اخیر عمر تک حاضر رہے اور تمام صحاح ستہ اور کتب فقہ اور تمام علوم معقول و منقول آپ سے حاصل کیا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کی عادت تھی کہ ہر روز بلا ناغہ بعد صبح قریب طلوع آفتاب ایک رکوع قرآن شریف کا کوئی ایک تفسیر کے ساتھ مثلاً ایک روز جلالین اور ایک روز بیضادی اور ایک روز رحمانی اور ایک روز زاہدی اور دوسری تفسیریں اس مقام سے سنتے تھے۔ اس کا قاری سوائے مولانا اسحاق صاحب کے دوسرا نہ ہوتا تھا۔ یہ طریقہ حضرت کے روز وفات تک جاری رہا۔

اور بعد نماز ظہر کے جس وقت حضرت صحن مدرسہ میں چہل قدمی فرماتے مقامات حریری[1] کا سبق ہوتا تھا۔ دوسرے بزرگ وار جیسے مولانا عبدالحیٔ اور مولوی رشید الدین[2] خاں صاحب رحمہ اللہ علیہما اور ان کے سوا بڑے بڑے علماء وفضلا سامع رہتے تھے۔ انتہیٰ،

---

[1] یہ کتاب عربی فن انشار میں نہایت عمدہ ہے۔

[2] مولوی رشید الدین خاں صاحب بڑے فاضل یکتا اور صاحب تصانیف تھے۔ خصوصاً تردید مذہب اہل تشیع میں آپ کی بہت تحریریں ہیں اور اس خاندان والاشان کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

حاصل کلام آپ نے بیس برس کامل فن حدیث شریف اور یہ علم منیف حضرت کے حضور طلبہ جدید الفکر کو پڑھایا۔

اتباع سنت

کوئی کام آپ سے خلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرزد نہ ہوتا تھا۔ رات دن حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پیروی پر دل تھا فنافی الرسول کا مرتبہ حاصل تھا، چونکہ حق جل و علا نے صورت اور سیرت دونوں عطا کی تھیں۔ آپ کی صورت سے آثار صحابیت ظاہر ہوتے تھے اور یقین ہوتا تھا کہ حضرت سید الثقلین صلواۃ اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی صحبت کا فیض جنہوں نے پایا ہوگا اون کی یہی صورت وسیرت ہوگی۔

زہے امت خاتم المرسلیں

خلافت وجانشینی

بعد وفات حضرت شاہ صاحب موصوف کے آپ کا فرق مبارک دستار خلافت سے مزین ہوا اور تمام معتقدین صافی اعتقاد نے آپ کی طرف رجوع کیا۔ آپ کے کمالات ظاہر و باطن حد بیان سے خارج ہیں۔

حضرت شاہ صاحب مغفور فرمایا کرتے تھے کہ اگر معصومیت کا اطلاق سوائے پیغمبروں کے دوسرے پر جائز ہوتا تو اس وقت میں اسحاق پر ہوتا۔

مولانا مولوی سید ہاشم صاحب کہتے ہیں یہ بھی بات مشہور ہے جو حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میری تقریر اسماعیل نے لی اور تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے

حج وزیارت

کیا کمال اور کیا عنایت رب ذوالجلال ہے ناز اور فخر کرنا چاہیئے ایسی خدا جوئی پر کہ سب کچھ چھوڑ کر سفر حجاز اختیار کیا اور وہاں مع قبائل وعشائر حاضر ہو کر فرض حج ادا کیا۔ اور زیارت شریف سے مشرف ہو کر پھر وطن کو تشریف لاکر مواعظ ونصائح سے خلق کو راہ ہدایت دکھلاتے رہے۔

مولوی بہاؤ الدین صاحب وغیرہ کہتے ہیں کہ آپ بادشاہ کے مکان کو بھی سال میں ایک بار ماہ محرم کی نویں تاریخ رونق افزا ہوتے تھے۔ شہادت کا وعظ یعنی چند مضامین

سرالشہادتین کے بیان کرکے ٹھہر ڈیڑھ پہر دن چڑھے وہاں سے واپس آتے تھے ایک روز پیشتر بہادر شاہ یا کوئی وزیر یا شاہزادہ دعوت کے واسطے حاضر ہوتا تھا اور بروز معینہ سواریاں آتیں مع حضار و خدام تشریف فرما ہوتے۔ مجلس عام رہتی جو چاہتا چلا جاتا۔

مایۃ مسائل اور مسائل اربعین کا سن تالیف

اور ۱۲۴۵ھ میں حسب گزارش شاہزادگان دہلی یعنی مرزا غلام حیدر وغیرہ مایۃ مسائل اور ۱۱۵۵ھ میں بموجب التماس محمد خان زمان خان زمیندار موضع بھیکن پور مسائل اربعین تحریر کی سبحان اللہ کیا کہوں یہ دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ جاہل دیکھے تو عالم ہو جائے۔ اور عالم دیکھے تو کمال بڑھ جائے۔ اگر عمل کی توفیق ہو تو خاصان خدا سے ہو جائے۔

بیت اللہ کی طرف ہجرت

بعد ایک مدت کے از بسکہ شعائر اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعت میں قوت آتی جاتی تھی نیت ہجرت کو مصمم کرکے تمام قبائل کو ہمراہ لیکر راہی مکہ معظمہ ہوئے اور باوصفیکہ تمام سکنائے شہر اور سلطان وقت بسماجت تمام مانع آئے چونکہ شوق ما ہو الحق غالب تھا۔ آپ ممتنع نہ ہوئے اور مکہ معظمہ کو جاکر توطن اختیار کیا اور بسبب کثرت کرم کے آپ کا کیسہ ہمیشہ خالی رہتا تھا خصوصاً ان لوگوں کی مراعات کے سبب جو ہندوستان سے ادائے حج کو وارد مکہ معظمہ ہوتے تھے وہاں کے لوگوں نے حضرت کے وجود مطہر کو از جملہ مغتنمات سمجھا اور آپ کا وہاں ہونا موجب برکت جانا بار ثانی دہلی سے جدا ہو کر اس دیار مقدس میں چھ برس کامل تشریف رکھی۔

وفات

آخر کو اسی جا پچیسویں ماہ رجب شب شنبہ قریب طلوع صبح صادق ۱۲۶۲ھ میں اس عالم سے انتقال کیا۔ صاحب خزینۃ الاصفیا نے یہ قطعہ آپ کی تاریخ وفات میں لکھا ہے۔

قطعہ

شیخ اسحاق رہبر آفاق ۔۔۔ آنکہ ذاتش بدو جہاں لحاق است
دل بسال وصال او سر در ۔۔۔ گفت اسحاق شیخ آفاق است
۱۲۶۲ھ

؎ یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ سرالشہادتین ملا باقر مجلسی کی ایک کتاب کا حصہ ہے۔ (مدیر)

حضرت خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے روضۂ بلند پایہ کے سایہ میں آسودہ ہیں۔

مکہ معظمہ میں درس وتدریس

مکہ معظمہ میں بھی کچھ تدریس کا سلسلہ جاری رہا چنانچہ میر حسن علی عرف شاہ جی صاحب کہتے ہیں۔

آپ اپنے مکان میں دن کو سبق پڑھایا کرتے تھے۔ اور بعد مغرب کوئی طالب آوے تو تربیت درویشی میں مصروف رہتے اور آپ کے اشراق باطن کا حال تھا کہ سبق میں اکثر اشخاص مختلف المزاج کچھ اپنے دلوں میں سوالات سوچ کر آتے تو سب لوگ اپنے اپنے سوال وجواب کی تقریر حضرت کی زبان مبارک سے تفسیر وحدیث کے سبق پڑھانے میں سن لیتے۔

عادات واطوار

مولوی سید ہاشم صاحب کہتے ہیں، دہلی میں جب آپ راستے سے چلتے تھے تو نہایت فروتنی سے چلتے تھے اور نظر نیچی رہتی تھی ادھر سے ادھر نہ دیکھتے تھے۔ گویا نظر بر قدم کے مصداق تھے مگر ہیبت حق یہ ہوتی تھی کہ جو کوئی کس وناکس آپ کو دیکھتا تھا تو بغیر دست بوسی کے آگے نہ بڑھتا تھا اور دکاندار سب اپنی اپنی دکانوں سے نیچے آتے اور مصافحہ سے مشرف ہو کر جاتے تھے۔ انتہیٰ

تلامذہ

مکہ معظمہ میں بھی آپ کے شاگرد موجود ہیں چنانچہ مولوی محمد صاحب وغیرہ اور مدینہ منورہ میں جناب مولانا مولوی عبدالغنی صاحب دہلوی مدنی سلمہا اللہ تعالیٰ

اور ہندوستان میں تو بکثرت ہر یک بلاد وامصار میں مرید وشاگرد بھرے ہوئے ہیں ان میں سے یہ چند شخص مستثنیٰ اور مشہور ہیں۔

لوذعی۔ یلمعی جناب مولوی احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سلمہ اللہ تعالےٰ۔

منتخب فضلائے زماں جناب مولوی حافظ قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی سلمہ اللہ تعالیٰ

فاضل یگانہ مولوی حافظ شیخ محمد صاحب ساکن تھانہ[1] سلمہ اللہ تعالیٰ۔

گوہر بحار علوم صوری و معنوی جناب مولوی عالم علی صاحب ساکن نگینہ مشہور بہ مرادآبادی حال نزیل رام پور سلمہ اللہ تعالیٰ آپ خلیفۂ طریقت بھی ہیں۔ سلسلہ علوم ظاہر و باطن کا آپ سے جاری ہے۔

نواب معلی القاب مولوی حاجی مہاجر متبع سنن سید الاوائل والاواخر بحر مواج علوم و عرفان نواب محمد قطب الدین خاں دہلوی رحمتہ اللہ علیہ والغفران۔

آپ شاگرد رشید اور خلیفۂ طریقت اور سجادہ نشین حضرت کے تھے اور انتقال آپ کا مدینہ منورہ میں ماہ رجب ۱۲۸۹ھ میں ہوا ہے۔

---

[1] تھانہ ایک قصبہ ہے ضلع مظفرنگر میں اس کو تھانہ بھون بھی کہتے ہیں ۱۲

تذکرۂ خانوادۂ ولی اللٰہی

از

یادگارِ دلی

(مجلہ الرحیم، مارچ 1968ء)

تذکرۂ خانوادۂ ولی اللٰہی از یادگارِ دلّی

محمّد عبدالحلیم چشتی، ایم اے

سید احمد ولی اللّٰہیؒ خانوادۂ ولی اللٰہی کے وہ فرد فرید ہیں، جن کی مساعی جمیلہ سے دہلی میں مطبع احمدی قائم ہوا، جس سے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ کے عربی اور فارسی کے مختصر و نادر رسالے اور ان کے اردو ترجمے شائع ہوئے۔

سید احمدؒ نے مدرسہ عزیزیہ کو جو ۱۸۵۶ء سے ویران ہو گیا تھا پھر سے آباد کیا تھا۔ موصوف ہی نے شاہ ولی اللہ اور ان کے نیک نام فرزندوں کے مزارات کا احاطہ جو غدر کے بعد مسمار ہو چکا تھا دوبارہ کھچوایا تھا۔ بلاشبہ ان کی یہ خدمات تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور مستقل مقالہ کی محتاج ہیں، ہم انشاء اللہ کسی اگلی فرصت میں اس پر روشنی ڈالیں گے۔

سید احمد ولی اللٰہی نے دِلّی کی مختصر و جامع تاریخ بھی اردو زبان میں لکھی ہے، جو دہلی سے یادگار دِلی کے نام سے شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی ہے۔ اس کتاب میں مشاہیر اہل دِلّی کے مزارات کے سلسلہ میں دلی کی جن نامور شخصیتوں کا تذکرہ

کیا ہے، ان میں خانوادہ ولی اللہی کا تذکرہ بھی آگیا ہے اور شاہ عبدالرحیم سے شاہ عبدالغنی تک سب ہی بزرگوں کا ذکر اس میں کیا گیا ہے۔ ان کا تذکرہ اگرچہ مختصر ہے تاہم خانوادہ دلی کے ایک اہل علم کی باقیات صالحات سے ہونے کی بناء پر بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسی وجہ سے اس کو مذکورۂ بالا کتاب سے نقل کر کے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے، جو الرحیم کے قارئین کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اس پر ذیلی سرخیاں ہم نے قائم کی ہیں۔

مہندیان یہ ایک عمارت ہے جو کسی زمانہ میں عجیب و غریب ہوگی، نیچے مکانات جیسے در بنے تھے اور چار کونوں پر چار برجیاں تھیں ایک بُرجی بیچ میں قائم تھی۔

مہندیان کی وجہ تسمیہ کہتے ہیں کہ ایک نواب صاحب کو حضرت غوث الاعظمؒ کی جناب میں نہایت عقیدت تھی اور ہندوستان میں رسم ہے کہ ہر برس حضرت غوث الاعظمؒ کی مہندیاں بھرا کرتی ہیں یعنی کھپچیوں کی ایک بُرجی اونچی سی بنا کر کاغذ سے منڈھ کر اس کو روشن کرتے ہیں۔ ان نواب صاحب کے یہاں بھی مہندی کی روشنی ہوا کرتی تھی، جب وہ نواب ہوئے تو انہوں نے یہ عمارت مہندی کی صورت کی بنادی اور ہر برس اس میں روشنی کرنے لگے اور یہ مقام مہندیان مشہور ہوا اب بالکل کھنڈر پڑا ہے۔ دیکھنے سے ہرگز نہیں معلوم ہو سکتا کہ کیا عمارت تھی اور کس وضع پر بنی تھی۔

اس جگہ پر میدان میں دو آستانے نہایت متبرک ہیں،

اول مولانا شیخ عبدالعزیز شکر بار علیہ الرحمہ کا مزار ہے۔

دوسرا مکرم محترم آستانہ جس کے انوار تمام ہندوستان کو محیط ہو رہے ہیں، حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کی درگاہ ہے، پختہ احاطہ بنا ہے، احاطہ کے اندر مسجد ہے، مسجد کے جنوب میں چبوترہ پر چوبی کٹہرہ لگا ہے۔ کٹہرے کے اندر ان حضرات کے مزار ہیں:

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمہ
حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ
حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ
حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ
حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب علیہ الرحمہ
حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب علیہ الرحمہ والد ماجد حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید صاحب علیہ الرحمہ۔

ان کے علاوہ دیگر اہل وعیال کی قبریں ہیں صفحہ ۱۰۰ پر نقشہ سے پوری کیفیت معلوم ہوگی۔

شاہ ولی اللہ کے جدّاعلیٰ شمسُ الدین کی حجاز سے آمد اور رہتک میں قیام، شیخ وجیہُ الدین کی دِلّی میں سکونت

یہ سب حضرات فاروقی نسب ہیں، حضرت امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں سب سے پہلے حضرت مفتی شمس الدین صاحب فاروقی عرب سے تشریف لائے اور رہتک میں مقیم ہوئے۔ جس وقت شاہجہان بادشاہ کا زمانہ ہوا تو مفتی صاحب کی اولاد میں مولانا شیخ وجیہ الدین علیہ الرحمہ موجود تھے۔ آپ دلّی میں تشریف لائے اور اسی جگہ اقامت کی جس جگہ اب ان حضرات کے مزارات ہیں۔ اس وقت یہ مقام چھتہ خوش نہ در کے نام سے مشہور تھا اور پرانی دلّی کی آبادی اسی جگہ تھی۔ چنانچہ جابجا مکانوں اور مسجدوں کے کھنڈر دکھائی دیتے ہیں۔

مدرسہ رحیمیہ کا قیام

مولانا وجیہ الدین علیہ الرحمہ کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادہ مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب علیہ الرحمہ نے درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا اور مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ تمام دن قرآن وحدیث کا درس دیتے رات کو طالبانِ خدا کی توجّہ دہی اور سلوک طے کرانے میں مشغول رہتے، ظاہری و باطنی دونوں علموں کی تعلیم دیتے۔ دُور دُور کے لوگ حلقۂ درس میں آتے عرب وعجم کے

طلبہ فیض اٹھاتے۔

نسبت کا اثر نسبت اس قدر قوی تھی کہ ہزاروں آدمیوں پر یکساں اثر پڑتا۔

اخلاص کی کیفیت اخلاص اور قرب کی یہ کیفیت تھی کہ سرور کائنات علیہ التحیات کی مجلس میں شامل ہوتے۔ جلوت و خلوت میں رہتے۔

ولادت آپ ۱۰۵۴ھ ہجری شاہجہان بادشاہ کے وقت میں پیدا ہوئے۔

علوم وفنون کی تحصیل شرح عقائد نسفی، خیالی وغیرہ اپنے بڑے بھائی مولانا شیخ ابوالرضا محمد سے پڑھی۔ باقی معقول، منقول کی تمام کتابیں مولانا میر زاہد ہروی ابن قاضی اسلم سے پڑھیں۔

تصوف کی تحصیل وتکمیل علم تصوف مولانا خواجہ خورد ابن حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ سے حاصل کیا علم سے فارغ ہوئے تو "اللہ اللہ" کا شوق ہوا، بہت سے مشائخ سے فیض صحبت حاصل کیا۔

تین بزرگوں سے خرقہ خلافت پہنا،

اول حضرت خواجہ خورد علیہ الرحمہ سے جو حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ کے فرزند اور خلیفہ تھے،

دوسرے حضرت قاری حافظ سید عبداللہ صاحب علیہ الرحمہ سے جو شیخ آدم بنوری کی صحبت میں رہے تھے،

تیسرے حضرت خلیفہ ابوالقاسم اکبرآبادی علیہ الرحمہ سے جو ملا ولی محمد صاحب خلیفہ حضرت امیر ابوالعلی صاحب اکبرآبادی کی صحبت میں رہے۔

وفات ومدفن بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں ۱۲ صفر روز چہارشنبہ ۱۱۳۱ھ ستر برس کی عمر میں آپ کا وصال ہوا اور اسی جگہ اپنے ذکر وشغل کے حجرے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند ارجمند

مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ خلیفہ اور جانشین ہوئے والد بزرگوار کے قدم بقدم رہے۔

ولادت و تعلیم و تربیت

۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے، درسی کتابیں اپنے والد مرحوم سے سبقاً سبقاً پڑھیں، پھر قرآن شریف کا ترجمہ اخذ کیا۔ ۱۶ برس کی عمر تھی کہ شاہ عبدالرحیم صاحب نے انتقال کیا، آپ سجادہ نشین ہوئے اور طالبان ہدایت کو سیدھے رستہ لگانا شروع کیا۔ تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ جوق جوق لوگ آنے شروع ہوئے۔ سینکڑوں طالب علم مستفیض ہونے لگے۔ عجیب عجیب کتابیں تصنیف کیں۔ طبیعت میں اجتہادی قوت ازل سے ودیعت رکھی گئی تھی۔ نئے نئے نکات نکالے، زمانہ میں شہرت حاصل کی۔ مسلم الثبوت استاذ مانے گئے۔ مانے ہوئے بزرگ مشہور ہوئے۔ حتی کہ موافق و مخالف سب آپ کے اقوال سے سند پکڑنے لگے۔

مشائخ حرمین سے روایت حدیث کی اجازت

۱۱۴۳ھ ہجری میں خانہ کعبہ کی زیارت کو تشریف لے گئے، بڑے بڑے نامی علماء و مشائخ سے صحبتیں رہیں۔ حضرت شیخ ابو طاہر مدنی قدس سرہ اور دیگر مشہور مشائخ عرب سے صحاح ستہ اور دیگر حدیث کی کتابوں کی سندیں اور روایت کی اجازت حاصل کی۔

بہت سے بزرگوں سے خرقۂ خلافت پہنا اور ۱۴ رجب ۱۱۴۵ھ میں دلی واپس تشریف لائے اور اپنے قدیمی مکان میں اقامت کی۔ مدرسہ رحیمیہ کو رونق دی۔

حدیث و تفسیر کا درس دینا شروع کیا گویا شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے بعد اس زمانہ میں آپ نے حدیث شریف کو فروغ بخشا، اطراف ہندوستان میں آپ کی حدیث دانی کی شہرت ہوئی، طالب علموں کے پرے کے پرے آنے شروع ہوئے پرانی دلی دارالحدیث بن گئی۔

روشن اختر محمد شاہ بادشاہ کا زمانہ تھا اس نے چاہا کہ مولانا کے دم سے شاہجہان آباد

کو عزت ہو تو کیا کہنا ہے۔ لہذا مولانا کو یہاں بلایا اور ایک عالیشان مکان رہنے کے لئے عنایت فرمایا جس کا تفصیلی ذکر مدرسہ کے متعلق گزر چکا ہے۔ آپ مع اہل و عیال شہر میں آرہے اور قدیم جگہ غیر آباد پڑی رہی۔

وفات ۱۱۷۶ھ ہجری میں تریسٹھ ۶۳ برس کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی۔ اپنے والد ماجد کے قریب مدفون ہوئے۔ اس مصرعہ سے سالِ وفات معلوم ہوتا ہے؎ ع

او بود امام اعظم دین

آپ کے بعد آپ کے چار فرزند باقی رہے۔ سب میں بڑے "مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ" تھے۔ علم، عمل، فہم، فراست، حافظہ، تحریر، تقریر، تقوٰی، طہارت، امانت، دیانت میں یکتا شمار کئے جاتے تھے۔

ولادت ۱۱۵۹ھ ہجری میں پیدا ہوئے، تمام کتابیں اپنے والد مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ اور مولانا شاہ محمد عاشق علیہ الرحمہ اور مولانا خواجہ امین اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے پڑھیں اور حدیث کی سند اور روایت کی اجازت اپنے والد مرحوم سے حاصل کی۔ بہت سے رسائل تصنیف کئے، تفسیر عزیزی لکھنی شروع کی مگر افسوس ناتمام رہی دن کو پڑھاتے، رات کو توجہ دہی میں مصروف رہتے، ظاہری باطنی دونوں فیض جاری تھے اور اب بھی برابر وہی بات چلی آتی ہے۔

خلفاء اور تلامذہ مولانا سید احمد صاحب بریلوی شہید علیہ الرحمہ، مولانا سلامت اللہ صاحب کانپوری علیہ الرحمہ جیسے مقتدا آپ کے خلیفہ تھے۔ مولانا سید محبوب علی صاحب دہلوی، مولانا رشید الدین خان صاحب دہلوی، مولانا حسن علی صاحب لکھنوٴ وغیرہ جیسے مستند علماء آپ کے شاگرد تھے۔

وفات ۷ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ ہجری میں صبح کے وقت آپ کا وصال ہوا اور اپنے والد مرحوم کے پاس مدفون ہوئے۔ موٴمن خان دہلوی نے آپ کی تاریخ لکھی ہے ؎

انتخاب نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیز
بیعدیل و بینظیر و بیمثال و بیمثل

جانب ملک عدم تشریف فرما یوں ہوئے
آگیا تھا گیا کہیں مُردوں کے ایمان میں خلل

ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا
کیا کیا یہ ظلم تو نے بے کسوں پر اے اجل

جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا
لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسی گردوں محل

کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل

مجلس درد آفرین تعزیہ میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آکر برمحل

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فخر و دین فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے دوسرے بیٹے شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ سے چھوٹے مولانا شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمہ یکتائے زمانہ تھے، ہر علم میں یگانہ تھے۔

تکمیل علوم حدیث، تفسیر کی سند اپنے والد بزرگوار اور ان کے خلیفہ اعظم شاہ محمد عاشق علیہ الرحمہ سے حاصل کی تھی، فنون ادبیہ میں مرجع خلائق تھے، علوم عقلیہ میں مجتہدانہ طبیعت رکھتے تھے۔

درس و تدریس جس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز ضعیف ہوگئے تو تدریس کا سلسلہ آپ ہی سے قائم رہا رات دن پڑھاتے، بڑے بڑے جید علماء استفادہ کی غرض سے آتے اور بامراد جاتے۔

تصنیفات اکثر رسائل آپ کی تصنیف سے موجود ہیں، کچھ طبع ہو گئے ہیں، کچھ قلمی رکھی ہوئی ہیں۔ ترجمۂ اردو قرآن شریف آپ کا یادگار ہے۔ آخر عمر تک درس تدریس کے شیدائی رہے۔

وفات ۱۲۳۳ھ میں ستر برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے والد کے پائینتی مدفون ہوئے۔

تیسرے بیٹے "مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ" عالم، فاضل، متوکل، مستغنی المزاج تھے۔ دنیا سے نفرت کرتے۔ مجامع محافل سے کنارہ کرتے۔ تحصیل علوم سے فراغت

پاکر اکبری مسجد کے ایک حجرہ میں تمام عمر بسر کردی۔ رات دن ذکراللہ میں مشغول رہتے اہل دنیا کی طرف مطلق التفات نہ کرتے، اس لئے تصنیف و تالیف وغیرہ کی طرف بھی چنداں توجہ نہ ہوئی۔

ترجمہ وتفسیر | ترجمہ قرآن شریف اور موضح القرآن[1]۔ یہ دو نایاب چیزیں آپ کی یادگار ہیں، جن پر سے بلامبالغہ ہزار کتابیں نثار ہیں۔

ظاہر میں سیدھا سادھا تحت اللفظ ترجمہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں جواہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں، بڑی بڑی صنعتیں قائم کی ہیں اس کا لطف وہی علماء جانتے ہیں جن کو علم تفسیر اور عربی اردو محاورات میں مہارت ہے۔ عام لوگ کیا سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کو شاہ عبدالعدل صاحب علیہ الرحمہ سے شرف بیعت حاصل تھا اور ان کو خواجہ محمد ناصر اور خواجہ محمد زبیر رحمۃ اللہ علیہما سے اور خواجہ ناصر علیہ الرحمہ کو شاہ سعداللہ صاحب المعروف بہ شاہ گلن قدس سرہ سے۔

نیز شاہ عبدالقادر صاحب کو خواجہ میر درد علیہ الرحمہ سے فیض صحبت حاصل تھا۔ بہت سے لوگ آپ سے مرید تھے، متعدد خلیفہ ہوئے۔

ولادت و وفات | آپ ۱۱۶۷ھ ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۰ھ ہجری ۶۳ سال کی عمر میں وفات پائی اور اپنے جدامجد شاہ عبدالرحیم صاحب کے پائین مدفون ہوئے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے چوتھے صاحبزادہ 'مولانا شاہ عبدالغنی صاحب علیہ الرحمہ' اتباع شریعت میں بے نظیر تھے باوجود اہل وعیال کے اہل دنیا سے نفرت تھی۔ وضع، لباس، خلق تمام باتیں اپنے والد بزرگوار سے ملتی جلتی تھیں۔

تحصیل وتکمیل علوم | حدیث تفسیر کی تحصیل اپنے دونوں بڑے بھائی مولانا شاہ

---

[1] موضح قرآن اس کا تاریخی نام ہے۔ چشتی

رفیع الدین صاحب اور حضرت مولانا شاہ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ سے حاصل کی۔

وفات ۱۲۲۷ھ ہجری، ۵ برس کی عمر میں وفات پائی اور مولانا شاہ عبد القادر صاحب علیہ الرحمہ کے متصل مدفون ہوئے۔

اس کٹہرے کے اندر حسب ذیل بزرگ اور مدفون ہیں :

مولانا مخصوص اللہ صاحب

مولانا محمد موسیٰ صاحب

مولانا محمد عمر صاحب خلف مولانا اسمٰعیل صاحب شہید۔

والدہ ماجدہ شاہ عبد العزیز صاحب

والدہ ماجدہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب

مولانا شاہ عبد القادر و مولانا شاہ رفیع الدین و مولانا شاہ عبد الغنی صاحب کی صاحبزادیاں۔

احقر کی والدہ یعنی مولوی محمد موسیٰ صاحب کی صاحبزادی، مولوی مخصوص اللہ صاحب کی زوجہ، کٹہرہ کے باہر احاطہ کے اندر و دیگر اہل وعیال حضرت و اخوند برہان صاحب علیہ الرحمہ شاگرد حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب، صاحبزادے مولانا شیخ محمد صاحب محدث تھانوی علیہ الرحمہ، و مولوی عنایت الرحمٰن خان صاحب رئیس دلی و منشی امو جان صاحب و دیگر معتقدین و متوسلین خاندان و قاضی محمد زبیر صاحب چشتی نظامی علیہ الرحمہ، مولوی حافظ سید محمد صاحب مرحوم امام جامع مسجد اور کٹہرے کے غربی جانب احاطہ سے باہر مومن خان دہلوی علیہ الرحمہ کی قبر ہے جو دلی کے مشہور زبان داں، سخن فہم، فصیح بلیغ شاعر گزرے ہیں۔

یہ جگہ جہاں ان حضرات کے مزارات ہیں غدر کے بعد سے بالکل خراب ہوگئی تھی، احاطہ تک مسمار ہوگیا تھا تمام دن چرواہے مویشی چراتے تھے اور جانور قبروں پر بول و براز کرتے تھے، جس سے تمام مسجد کا صحن اور مقابر نجس رہتے تھے، اس کے علاوہ میونسپل کمیٹی نے اس موقعہ کو نزول میں داخل کرلیا تھا اور یہ زمین

ٹھیکہ پر دی جاتی تھی اور چاند ماری کے حدود میں آجانے سے اس زمانہ میں رستہ تک چلنا محال ہوتا ہے۔

ہرچند طبیعت کو پریشانی ہوتی تھی مگر بیکسی کے ہاتھوں گرفتار تھا۔ کس سے کہتا اور کون سنتا، مگر خدا کا شکر ہے کہ تھوڑا سا ٹکڑا قبرستان کا نزول سے نکل گیا، اور ۱۳۱۲ھ ہجری میں اس قدر کا احقر نے احاطہ بنوادیا۔ اور بزرگوں کے مزارات جو غرقی میں آگئے تھے، ایک چبوترہ پران کا نشان قائم کرکے چوبی کٹہرہ لگادیا اور دو آدمی خدمتگار مقرر کردیئے تاکہ پوری حفاظت ہوجائے اور بول و براز یا اور دیگر امور جن سے مقابر کی توہین ہوتی ہو نہ ہونے پائیں۔ مگر ابھی تمام قبرستان کی زمین اور قبور نزول میں آئی ہوئی ہیں خدا کرے بہت جلد کوئی سامان ہوجائے جس سے یہ مکرم قبرستان نزول سے نکل جائے اور اہل اسلام کے برگزیدہ لوگوں کی اور ان حضرات کے اہل وعیال کی قبریں پیشاب پاخانہ وغیرہ کی نجاست سے محفوظ ہوجائیں۔

مزارات کی حفاظت اور مطبع کے اجراء سے اپنا مطلب صرف یہ ہے کہ بزرگوں کے نشانات قائم رہیں اور ان حضرات کا فیض جاری وساری رہے۔

مولانا خرم علی بلہوریؒ

اور

انکی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ

(ماہنامہ معارف، مئی–جولائی 1956ء)

مقالات

مولانا خرم علی بلہوری اور اُن کی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ

از

مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی، فاضل دیوبند

ہندوستان کے آخری دور کے جن علماء نے مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لیے انتھک کوششیں کیں، حدیث کا چرچا کیا، اور نکھری ہوئی توحید کی دعوت دی، ان میں مولانا خرم علی بلہوری کا نام بہت ممتاز ہے۔

نام اور تخلص خرم علی نام اور خرم تخلص تھا، مضافات کانپور کے قصبۂ بلہور کے نیاعق نامی محلہ میں پیدا ہوئے، جہاں شرفاء کے چند گھرانے آباد تھے، اور اسی قصبہ کے نسبت سے بلہوری مشہور ہوئے،

تعلیم و تربیت اپنے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی، اور اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے، لکھنؤ اس زمانہ میں علوم و فنون کا مرکز تھا، یہاں ابتدائی کتابیں اساتذۂ وقت سے پڑھیں اور علوم عقلیہ اور نقلیہ کی تحصیل مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی سے کی اور آپ ہی کے حلقۂ درس سے حدیث کی سند لی، چنانچہ موصوف کا بیان ہے

"میں نے اپنے استاذ مرزا حسن علی (صغیر) محدث سے سنا وہ اپنے اساتذہ سے نقل کرتے

تھے کہ ممنوع وہ سیاہ خضاب ہے جو وسمہ کے سوا اور چیزوں سے ہو۔[1]"

اسی طرح موصوف نے مولانا نور لکھنوی سے بھی حدیث کا سماع کیا تھا، چنانچہ "تحفۃ الاخیار ترجمۂ مشارق الانوار" کا جو نسخہ مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۳۰۰ھ میں شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں مولانا خرم علی کا نہایت مختصر سا تذکرہ بھی مذکور ہے، اس میں ہے:

"آپ نے مولوی نور صاحب اور مرزا حسن علی صاحب محدث سے علم حدیث حاصل کیا تھا۔"

مولانا نور لکھنوی اپنے وقت کے شیخ الحدیث اور اتقیاے روزگار میں سے تھے، "ارشاد رحمانی" میں موصوف کے متعلق مولانا فضل رحمان گنج مراد آبادی کا یہ بیان منقول ہے:

"ایک مرتبہ مولوی نور صاحب اور مولانا انوار صاحب لکھنوی اور شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ کا ذکر آیا، کسی کی نسبت ارشاد ہوا کہ صلحاے وقت سے تھے کسی کی نسبت فرمایا ذاکر و شاغل تھے۔[2]"

پھر دہلی جاکر جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے[3] شاہ عبدالعزیز دہلوی کے حلقۂ درس حدیث میں شریک ہوکر حدیث کی سند لی، پھر وطن آئے، لیکن زیادہ عرصہ قیام نہیں رہا، اور جلد ہی اپنے ننہیال قصبۂ آسیون (جو اناؤ کے مضافات میں ہے) میں منتقل ہو گئے، اور محلہ قاضیانہ میں حکیم اسحاق کی حویلی کے صدر دروازہ کی بالائی منزل میں رہنے لگے، اور یہیں درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ کا شغل اختیار کیا،

عادات و اخلاق | آپ نہایت پرہیزگار، متواضع، با اخلاق اور درویش سیرت بزرگ تھے، چھوٹی

---

[1] "غایۃ الاوطار ترجمہ درمختار" طبع نولکشور ۱۹۲۵ء ج ۴ ص ۴۶۸ [2] "ارشاد رحمانی و فضل یزدانی" از محمد علی مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۱ھ ص ۳۰، افسوس! اس سے زیادہ موصوف کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ [3] ملاحظہ ہو موصوف کا مضمون "ہندوستان میں علم حدیث" معارف جلد ۲۲ شمارہ نمبر ۵

چھوٹی باتوں میں بھی شریعت کا بڑا خیال رکھتے اور نہایت سختی سے اس پر عمل کرتے تھے، چھوٹوں پر شفقت فرماتے اور اساتذہ اور بزرگوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔

مولانا کا مسلک | اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ موصوف ابتدا میں روش عام کے مطابق پکے حنفی تھے لیکن بعد میں تقلید سے آزاد ہو گئے یا نہیں، اس میں اختلاف ہے، امام خان ابو یحییٰ صاحب نوشہروی کا خیال ہے کہ اخیر عمر میں حدیث کی طرف میلان ہوا اور تقلید سے آزاد ہو گئے، اور اسی پر خاتمہ ہوا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ابتداءً روش عام کے مطابق غالی مقلد اور بقول صاحب تذکرۂ علماے ہند منع قرأت، فاتحہ خلف الامام پر رسالہ لکھا، مگر جب قسمت نے پلٹا کھایا اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی مصاحبت نصیب ہوئی تو اتباع سنت در غیر تقلید کا رنگ شوخ ہوتا گیا، اور اسی پر خاتمہ ہوا۔[1]"

لیکن مولانا خرم علیؒ کی کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ آخر دم تک فقہ حنفی پر عامل اور تقلید کے قائل رہے، چنانچہ اپنی آخری اور مشہور تالیف "غایۃ الاوطار ترجمۂ درمختار" میں مسائل شتی کے عنوان کے تحت خضاب کی بحث میں لکھتے ہیں:

"اور ہم حنفیوں کا مذہب یہ ہے کہ حنا اور وسمہ کا رنگ خوب ہے۔[2]"

حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت اور خلافت | مولانا خرم علی سنت کے متبع، طریقت کے شیدا اور توحید کے بڑے دلدادہ تھے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سید احمد شہیدؒ لکھنؤ وارد ہوئے تو آپ نے سید صاحبؒ کے دست حق پر بیعت کی، اور بڑی جلدی مدارج کمال کو طے کر لیا، سید صاحبؒ

---

[1] "ہندوستان میں علم حدیث بطریق تالیف و علوم حدیث" معارف جلد ۶۰ دسمبر ۱۹۴۷ء
[2] غایۃ الاوطار، طبع نولکشور، ج ۴ ص ۴۶۹

نے بھی آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا، چنانچہ محمد جعفر تھانیسری نے "تواریخ عجیبہ" میں جہاں سید صاحبؒ کے خلفاء کو نام بنام گنایا ہے، وہاں مولانا خرم علی کا نام بھی ہے[1]۔

چونکہ مولانا خرم علی رسم و رواج اور بدعت کے ابتدا ہی سے سخت مخالف تھے[2]، سید احمد بریلویؒ سے بیعت کے بعد یہ شراب اور بھی دو آتشہ ہوگئی، چنانچہ مولوی رحمان علی "تذکرۂ علمائے ہند" میں لکھتے ہیں:

"ہموارہ در قلع بدعت و احیاے سنت می کوشید"

سید صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد مولانا خرم علیؒ کے تعلقات سید صاحبؒ کے خلفاء سے عموماً اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے خصوصاً بڑے اچھے ہوگئے تھے، چنانچہ آپ نے بھی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے طرز پر رد بدعت اور احیائے سنت کے لیے بڑی کوشش کی اور "تقویۃ الایمان" کے انداز پر "نصیحۃ المسلمین" لکھی، مگر اس میں توازن قائم رکھا اور اعتدال کی راہ اختیار کی، بات وہی کہی جو شاہ اسماعیل شہیدؒ کہتے تھے، طرز بیان بھی سادہ اور دلنشین اختیار کیا، مگر اعتدال سے سرمو انحراف نہ ہوسکا اور یہی آپ کا بڑا کمال ہے۔

جب سید صاحبؒ نے جہاد کی دعوت دی اور سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا، اس زمانہ میں آپ نے ایک نہایت ہمت آفریں نظم لکھی، جو رسالہ جہادیہ کے نام سے مشہور رہی،

جہاد میں شرکت کے لیے روانگی | مولانا خرم علی جہاد میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ کم و بیش سو مجاہدوں

[1] "تواریخ عجیبہ موسوم بہ سوانح احمدی" مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۱۸۵

[2] بلہور کے بعض بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ مولانا خرم علی بلہوری جب تعلیم سے فارغ ہوکر وطن لوٹے، اسی زمانہ میں آپ کی بہن کی شادی ہوئی، والدہ ماجدہ شادی میں پوری رسمیں کرنا چاہتی تھیں، آپ نے سمجھایا، مگر وہ رسمیں کرنے پر مصر رہیں، آپ کو اسقدر ناگوار ہوا کہ اسی زمانہ میں بلہور سے اپنے ننہال قصبہ اسیون آگئے اور پھر کبھی بلہور نہیں گئے۔

کا ایک قافلہ ہندوستان سے لیکر سرحد پہنچے تھے، سید صاحبؒ جب دورۂ سوات سے فارغ ہوکر پنجتار پہنچے، اس وقت ہندوستان سے جو قافلے آئے، ان میں مولانا خرم علی بلہوریؒ کا قافلہ بھی تھا، چنانچہ مولوی رحیم بخش "اسلام کی دسویں کتاب" میں لکھتے ہیں:

"(سید صاحبؒ) فتحیاب ہوکر پنجتار کو لوٹ آئے اور راہ میں خبر سنی کہ ہندوستان سے قافلۂ احمد علی ہمشیرہ زادۂ سید صاحبؒ اور قافلہ مولوی مظہر علی عظیم آبادی اور قافلۂ مولوی خرم علی اور قافلۂ محمد علی رامپوری اور قافلۂ مولوی محبوب علی دہلوی آیا، یہ لوگ قریباً چھ سو آدمی کے تھے، لیکن مولوی محبوب علی دہلوی تیز مزاج تھے، بن نہ آئی اس لیے دہلی کو واپس تشریف لائے۔"[1]

منشی محمد جعفر تھانیسری کا خیال ہے کہ موصوف بھی ان لوگوں میں سے تھے جو کبیدہ خاطر ہوکر جہاد سے واپس گئے تھے، چنانچہ "تواریخ عجیبہ" میں لکھتے ہیں:

"مولوی خرم علی بلہوری صاحب نصیحۃ المسلمین، ان کی اور بھی تصانیف ہیں، رسالہ جہادیہ بھی ان ہی کی تصانیف سے ہے، افسوس ہے کہ یہ بزرگ باوجود اوصاف قبل از معرکۂ بالاکوٹ رنجیدہ ہوکر ہندوستان کو لوٹ آئے تھے۔"[2]

لیکن مولانا غلام رسول مہر کو موصوف کے اس بیان سے اختلاف ہے، چنانچہ "جماعت مجاہدین" (طبع لاہور ص ۲۹۴) میں لکھتے ہیں:

"مشہور ہے کہ سید صاحبؒ کے ساتھ جہاد کے لیے گئے تھے، وہاں سے واپس آگئے، اور غالباً سید صاحبؒ نے انھیں دعوت و تبلیغ کے لیے مقرر کر دیا"

[1] اسلام کی دسویں کتاب الملقب بہ تاریخ لب لباب" مطبع محمدی لاہور ۱۳۱۰ھ ص ۲۳۲

[2] "تواریخ عجیبہ" مطبع فاروقی دہلی ۱۳۰۹ھ ص ۱۸۵

ہمارا بھی یہی خیال ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ منشی محمد جعفر تھانیسری کا مذکورۂ بالا بیان کسی غلط فہمی پر مبنی تھا، کیونکہ مولانا خرم علیؒ سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، آپ کے حالات کے مطالعہ اور سید صاحبؒ کی مردم شناسی کے پیش نظر یہی بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ سید صاحبؒ نے موصوف کو دعوت و تبلیغ کے واسطے ہندوستان واپس بھیجدیا تھا، دراصل سید صاحب کا یہی بڑا کمال تھا کہ وہ ہر شخص سے اس کی صلاحیت اور منصب کے مطابق کام لیتے تھے۔

آپ ہندوستان تشریف لائے، ادھر بالاکوٹ کا معرکہ پیش آیا، اور سید صاحب شہید ہوگئے۔ بظاہر تحریک کا خاتمہ ہوگیا، لیکن سید صاحب کے خلفاء نے جہاد سے منہ نہ موڑا اور اس تحریک کو زندہ رکھنے کے لئے اور قوم و ملت ... کی صلاح اور فلاح کے لیے جو مناسب سمجھا برابر کیا، بعض نے جہاد بالسیف ہی کے لیے خفیہ کوششیں جاری رکھیں، اور بعض نے جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کی راہ اختیار کی، اور تصنیف و تالیف اور وعظ و تبلیغ سے اس دعوت کو قائم رکھنے اور دین کو توہمات اور شرک و بدعت سے پاک کرنے کے لیے تادم مرگ جد و جہد کی۔

مولانا مسعود عالم ندوی "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" میں لکھتے ہیں:

"سید صاحبؒ کے دست مبارک پر بے شمار علماء نے جہاد و اصلاح کی بیعت کی، ایک اچھی خاصی تعداد سرحد کے معرکوں میں کام آئی، دوسروں نے شرک و بدعت کے مٹانے میں بڑی نمایاں خدمتیں انجام دیں، اور بلاشبہ آج اسلامی ہند میں جو کچھ صحیح الخیالی اور اتباع سنت کا جذبہ پایا جاتا ہے وہ ان ہی ارباب صدق و صفا کی کوششوں کا رہین منت ہے۔"[1]

[1] "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" مولفہ مولانا مسعود عالم ندوی، مکتبہ ملیہ، راولپنڈی ص ۵۲

مولانا خرم علی معرکۂ بالاکوٹ کے بعد دعوت و اصلاح کی غرض سے مستقل طور پر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے، چنانچہ بعض کتابوں کا ترجمہ مسلمانوں کی اصلاح اور ترویج سنت کی غرض سے کیا، اور بعض کا احباب کے اصرار سے اور بعض کا اہل مطابع کی فرمایش پر، اخیر عمر میں نواب ذوالفقار علی رئیس باندانے اپنے یہاں بلایا تھا، اور ان ہی کی فرمایش سے فقہ کی عظیم الشان کتاب در المختار کا ترجمہ شروع کیا تھا۔

وہابیت کا الزام | بعض علماء نے ان مصلحین کو غلط فہمی کی بنا پر محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کا ہم مسلک اور ہم عقیدہ سمجھا، اور بعض نے عناد کی وجہ سے محض اپنی شہرت اور ناموری کی خاطر ان پر بے بنیاد الزامات لگائے، تاکہ یہ لوگ بدنام ہوں اور تحریک دعوت و اصلاح بھی کامیاب نہ ہو سکے، چنانچہ ان مصلحین کے متعلق مشہور کرایا کہ یہ بزرگوں کے قائل نہیں، نذر نیاز کے منکر ہیں، انہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہیں، حضور کی عظمت کے قائل نہیں، ان کے اعتقادات سلف صالحین کے خلاف ہیں، ان کا تعلق محمد بن عبد الوہاب نجدی سے ہے، اور یہ وہابی ہیں، غدر کے بعد برطانوی حکومت نے اس اختلاف سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور ان کے خلاف اسی حربے کو استعمال کیا، جو سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوا، چنانچہ سادہ لوح مسلمان ہی نہیں بلکہ ان کا اچھا خاصہ پڑھا لکھا طبقہ بھی اس پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں وہابیت کا کوئی متعین مفہوم اور اس کی کوئی واضح تعریف نہ تھی، بلکہ محض ایک پروپیگنڈا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اس کا مفہوم بدلتا رہا ہے، اور وہابی ہر جگہ جدا جدا معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ نواب صدیق حسن خاں "روضۃ الخصیب" میں لکھتے ہیں:

"پس اہل بدعت تقویۃ الایمان و نصیحۃ المسلمین و کتاب التوحید و اقتضاء الصراط المستقیم

وامثال ایں رسائل جاو را کتب مذہب وہابیہ نامیدہ اند، انصاف باید کرد کہ دریں رسائل جا و کجا است انچہ ہست بسوے مراتب تقویٰ و طہارت و ہدایت و ارشاد

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد　　　عیب نماید ہنرش در نظر

طرفہ آنکہ تہمت وہابیت در ہر شہر و ہر قطر رنگ دیگر دارد، در دکن وہابی کسے ست کہ مسکرات را مثل سیندھی تارک باشد، و در بمبئی وہابی کسے ست کہ یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ نگوید و در اودھ وہابی کسے ست کہ تقلید مذاہب مروجہ نہ نماید و در دہلی کسے ست کہ گورنمی پرستد و در بدایوں کسے ست کہ معتقد بدعات مشائخ نیست و در حرمین شریفین کسے ست کہ ہم عقیدۂ اہل نجد باشد"[1]

مولانا خرم علیؒ کے ابتدائی دور ہی میں یہ اعتراض اتنے عام ہوگئے تھے کہ موصوف کو اپنی تالیفات میں اس کی تردید کرنی پڑی، چنانچہ نصیحۃ المسلمین میں فرماتے ہیں:

بیان شرک سن کہتے ہیں مردک　　　کہ منکر ہیں بزرگوں کے بلا شک
ارے لوگو! زباں اپنی کو روکو　　　بزرگوں سے نہیں انکار ہم کو
خدا لعنت کرے اس روسیہ پر　　　کہ جس کے دل میں ہو بغض پیمبر
جسے ہو بغض آلِ مصطفےٰ کا　　　خدا اس کو کرے دوزخ کا کندا
جسے اصحاب حضرتؐ سے ہو انکا　　　رہے ہر دم خدا کی اس پہ پھٹکار
جسے کچھ بغض ہووے اولیا سے　　　ہمیشہ ابر لعنت اس پہ برسے
اب اتنا اور بھی سن رکھیے حضرت　　　جو حق پر نا چلے اس پر بھی لعنت
ہمارا کام سمجھانا ہے یارو　　　اب آگے چاہو تم مانو نہ مانو

[1] الروض الخضیب من تزکیۃ القلب المنیب" مفید عام اکبر آباد ۱۲۹۸ھ ص ۱۰۹

تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرمؔ　　　زباں اب بند کر واللہ اعلم[1]

مولانا خرم علیؒ اولیاء اللہ کے بڑے عقیدتمند تھے، چنانچہ "شفاء العلیل" کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ میری بھول چوک اور کج فہمی کو بہ برکت ارواح طیبۂ اولیا کرام رضی اللہ عنہم کے معاف کرے اور ان حضرات کے نور باطنی سے میرے ظلمتکدۂ دل کو نورانی فرمائے، آمین"[2]

اسی طرح آپ کو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی عقیدت اور بے حد محبت تھی، جس پر ان کے حسب ذیل اشعار شاہد ہیں،

یا رسول اللہ یا خیر البشر　　　لیجیے مجھ روسیہ کی اب خبر
خود بدولت کے ترحم کے سوا　　　اب کوئی صورت نہیں آتی نظر[2]

اسی طرح تحفۃ الاخیار کے خاتمہ پر ایک نہایت درد بھری نظم لکھی ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے:

یارب اس عاجز کی دعا کر قبول　　　خاتمہ بالخیر بحق رسول

شعر و سخن کا ذوق مولانا کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا، کبھی کبھی خود بھی شعر کہتے اور خرم تخلص کرتے تھے، مگر شعر ان کا مشغلہ نہ تھا، بلکہ جو کچھ لکھتے تھے وہ ضرورت سے مجبور اور حالات سے متاثر ہو کر لکھتے تھے، اسی لیے وہ مقبول بھی ہوتا تھا، البتہ ابتدائی دور کی زبان صاف نہیں اور نہ اس میں چنداں شعریت ہے، مگر قبولیت اس کو بھی حاصل رہی ہے، بعد میں جو نصیحت آمیز نظمیں کہی ہیں، ان کی زبان بہت صاف اور رواں ہے، یہی وجہ ہے کہ انھیں قبول عام

[1] نصیحۃ المسلمین، مطبع احمدی اموجان ص ۴۴ [2] شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل، مطبع درخشانی ۱۸۹۶ء ص ۱۲۶

[3] تحفۃ الاخیار، ترجمہ مشارق الانوار، مطبع انوار محمدی لکھنؤ ۱۳۰۰ھ ص ۴۹۴

اور شہرت دوام حاصل رہا ہے۔

تصانیف اور تالیفات | (۱) **نصیحۃ المسلمین**، تقطیع خورد، صفحات ۵۲، مطبوعہ ٹائپ کلکتہ،
یہ ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۳ء کی تصنیف ہے، اس رسالہ میں شرک و بدعت کی حقیقت اور اس کی قباحت کو قرآن
اور حدیث کی روشنی میں نہایت وضاحت سے سمجھایا گیا ہے، مولف نے وجہ تالیف اور
ترتیب رسالہ کو ابتدا میں یوں بیان کیا ہے۔

"بعد سب کے سنا چاہیے کہ اب ہندوستان میں عجب ایک بلا پھیل گئی ہے کہ
امت محمدی میں بہت لوگ شرک میں گرفتار ہیں، لیکن اکثر مسلمان بیچارے بسبب
بے علمی اور ناواقفی کے لاچار ہیں تو اس واسطے بندۂ عاجز خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک
کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف
بیان کر لیے[1]، تا ہر ایک کو فائدہ عام ہو، جو مسلمان بھائی کہ عربی نہیں جانتے اس کو

---

[1] اس جملہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موصوف نے نصیحۃ المسلمین دراصل اردو ہی میں تصنیف کی ہے،

نصیحۃ المسلمین کا ایک فارسی مخطوطہ اسلامیہ کالج پشاور میں بھی محفوظ ہے جس سے دھوکا ہوتا ہے کہ
شاید موصوف نے یہ کتاب پہلے فارسی میں لکھی ہو اور پھر اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہو، لیکن ایسا نہیں، کیونکہ
اس کا کوئی ثبوت مخطوطہ سے نہیں ملتا، اس کے برخلاف ایسے شواہد موجود ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ
نصیحۃ المسلمین کے بعد کسی عالم نے اس کو فارسی کا جامہ پہنایا ہے، وہ شواہد حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب کا سرورق موجود نہیں،

(۲) فارسی مخطوطہ میں خرم کا املا واؤ کے ساتھ خورم ہے، ظاہر ہے کہ اگر موصوف کی لکھی ہوئی ہوتی یا
آپ ہی کا کیا ہوا ترجمہ ہوتا تو خرم کا املا واؤ معدولہ کے ساتھ نہ ہوتا، کیونکہ موصوف کی تمام تصنیفات اور
تالیفات میں خرم کا املا بلا واؤ ہے۔ (باقی حاشیہ ص ۳۳۵ پر)

سمجھکر شرک کی آفت سے بچیں، اور اپنے پیغمبر کی راہ کو اختیار کریں، اور جو لوگ کہ اس کو بھی
نہ سمجھیں اور نہ مانیں تو اپنا سر کھاویں، قبر میں آپ ہی معلوم ہوگا، بسنہ لکھے، بارے الحمد للہ کہ
۱۲۳۸ھ میں یہ رسالہ بن چکا اور اس کا نام نصیحۃ المسلمین رکھا اور سب مطلب اس کا پانچ
فصلوں میں لکھا[1]"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۴) (۳) بعض اشعار کا املا بھی اس طرح لکھا ہے جس سے بعض شعر خارج الوزن ہو جاتے ہیں،

(۴) فارسی مخطوطہ میں سال تصنیف بھی ۱۲۳۸ھ درج ہے جو اصل تصنیف کا ہے، یہ بھی اسی امر کی
دلیل ہے کہ یہ اردو سے منتقل ہوا ہے،

(۵) یہ بعینہ نصیحۃ المسلمین کا فارسی ترجمہ نہیں ہے، بلکہ مترجم نے مطالب کتاب کو سامنے رکھکر بڑی
خوبی سے اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے، اس لیے آزاد ترجمہ ہے، لفظی ترجمہ نہیں،

(۶) اردو نظم کا ترجمہ بھی پورا نہیں ہے،

(۷) مخطوطہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مترجم ترجمہ پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے،

(۸) خاتمۃ الکتاب بھی نہیں ہے، جس سے سنہ کتابت اور کاتب کا نام معلوم ہو سکتا،

ان شواہد اور مولانا خرم علی بلہوریؒ کے اس جملہ "اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف
بیان کر لیے" سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ موصوف نے "نصیحۃ المسلمین" دراصل اردو ہی میں تصنیف فرمائی تھی،
اب ہم فارسی مخطوطہ سے کچھ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں اور اس کے سامنے دوسرے کالم میں اردو کی
اصل عبارت بھی لکھتے ہیں جس سے ناظرین کو اس امر کا خود اندازہ ہو سکے گا،

(فارسی)	(اردو)
لہذا بندۂ عاجز خورم علی را عزم جزم بریں	اس واسطے بندۂ عاجز خرم علی کے دل میں آیا کہ
مصمم شد کہ بدی قباحت شرک را از آیات قرآن مجید	اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجئے

(باقی ص ۳۳۶ پر)

[1] "نصیحۃ المسلمین" مطبع احمدی امرتسر ص ۲ و ۳ [2] صحیح "خرم" ہے،

یہ کتاب شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" کے بعد شرک و بدعت میں سب سے پہلی تصنیف ہے،
اس میں وہی باتیں ہیں جو تقویۃ الایمان میں ہیں لیکن مختصر اور مکمل، انداز بیان نہایت متین اور سلجھا ہوا،
کتاب کے آخر میں ان ہی مطالب کا خلاصہ نظم میں بھی کر دیا ہے، جس نے اس کتاب کو اور بھی دلکش بنا دیا ہے"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۵) بوجہ آں ثابت کنم و زیر ہر آیت
ترجمۂ آں از زبان فارسی صاف صاف بیان نمایم
تا ہر مسلمان فارسی خواں فوائد معانی ایں آیات را
فہمیدہ ... الخ
(سال تصنیف)
یکہزار و دو صد و سی و ہشت
(نظم فارسی)
خدا فرمودہ در قرآن مفسر
ہمہ محتاج اند پیر و پیغمبر[1]
بغیر از من کسے را نیست طاقت
بر آوردم شما را ذرہ حاجت
چو خود محتاج باشند دیگرے را
از ایشاں خواستن حاجت چہ معنی
نداند و نہ غیرش خواستن کام
ہمیں ما شرک شد لے دوستانم
ز قرآن شد ہمیں مضموں محقق
کہ ہر گز می نہ بخشد شرک مطلق

(اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف
بیان کریے، تا ہر ایک کو فائدہ عام ہووا ور جو مسلمان
بھائی کہ عربی زبان نہیں جانتے اس کو سمجھ کر شرک
کی آفت سے بچیں،
الحمد للہ کہ سنہ بارہ سو اڑتیس ہجری میں یہ رسالہ بن چکا،
(نظم اردو)
خدا فرما چکا قرآں کے اندر
مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر
نہیں طاقت سوا میرے کسی میں
کہ کام آئے تمھارے بے بسی میں
جو خود محتاج ہوئے دوسرے کا
بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا؟
خدا سے اور بزرگوں سے بھی کہنا
یہی ہے شرک یارو اس سے بچنا
خبر قرآں میں ہے یہ محقق
نہ بخشے گا خدا مشرک کو مطلق
(باقی ص ۳۳۷)

[1] یہاں صحیح "پیمبر" ہے [2] یہاں صحیح باشد ہے

یہی وجہ ہے کہ بہت مقبول ہوئی، اور بڑی کثرت سے چھپی، پہلے پڑھے لکھے خاندانوں میں اس نظم کا
بڑا چرچا رہتا تھا، بڑی بوڑھیاں اس کو بڑے شوق سے پڑھتی تھیں، چنانچہ محی الدین قادری زور
لکھتے ہیں: "یہ نظم راقم الحروف کے بچپن میں بہت مقبول تھی، اور اس کی ابیات اکثر بوڑھی خواتین کو یاد تھیں[1]"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۶) معاذ اللہ کسے را کو نہ بخشد
مقرر در جہنم باش لغزد
اگر ایمان بر قرآن دارید
چرا اندر و نیاز پیر آرید
شما را ایں رسوم بد کہ آموخت
محمدؐ کے چراغ شرک افروخت
بلے شیطان عدو آل آدم
نشان خود می دہد راہ جہنم
کسے را بت پرستی می نماید
. . . .
غرض ایں ہر دو را از حق جدا کرد
ز راہش بردہ در دوزخ رہا کرد

معاذ اللہ جسے اس نے نہ بخشا
مقرر وہ جہنم میں پڑے گا
اگر قرآن کو سچ جانتے ہو
تو پھر تم منتیں کیوں مانتے ہو
تمھیں یہ طور بد کس نے سکھایا
محمدؐ نے کہاں ہے یہ بتایا
ہے شیطاں دشمن اولاد آدم
سکھاتا ہے وہی راہ جہنم
کسی کو بت پرستی ہے سکھاتا
کسی کو ہے وہ قبروں پر جھکاتا
غرض اللہ سے دونوں کو روکا
بھلا کر راہ جا خندق میں جھونکا

اب آگے فارسی شعر نہیں ہیں۔

نصیحۃ المسلمین کے ان اشعار کی تضمین مولانا محمد انوار اللہ حیدر آبادی المتوفی ۱۳۳۶ھ[2] نے کی تھی،

[1] تذکرۂ اردو مخطوطات، مرتبہ سید محی الدین قادری زور، اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد دکن ۱۹۴۳ء ج ا ص ۱۷۹

[2] موصوف کے تذکرہ کے لیے ملاحظہ ہو "دکن میں اردو" مولفہ نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ لاہور ۱۹۵۲ء ص ۶۰۷

اس نظم کے چند شعر یہ ہیں:

مسلمانوں ذرا سوچو تو دل میں	پھنسے ہو کس طرح تم آب و گل میں
بہت غفلت میں سوئے اب تو جاگو	خدا کے ہوتے بندوں سے نہ مانگو
وہ مالک ہے سب آگے اس کے لاچار	نہیں ہے کوئی اس کے گھر کا مختار
وہ کیا ہے جو نہیں ہوتا خدا سے	جسے تم مانگتے ہو اولیا سے

بقیہ اشعار سابق میں گزر چکے ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۷) اور اس کا نام "خدا کی قدرت" رکھا تھا، یہ بظاہر ان اشعار کی شرح معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں مولانا خرم علی کے اشعار کی تردید ہے، چنانچہ مولوی انوار اللہ مرحوم نے اس نظم میں استعانت اولیا، وغیرہ کو جائز قرار دیا ہے، باوجود کوشش وہ نظم ہم کو دستیاب نہ ہو سکی، لیکن اس نظم کی حقیقت اور اس کے مطالب کا خلاصہ اس اعلان سے ہو سکتا ہے جو مفاتیح الاعلام یعنی فہرست افادۃ الاعلام کے ساتھ موصوف کی تصنیفات کے تحت نقل کیا گیا ہے، وھو ھذا

"خدا کی قدرت (نظم اردو) صفحات ۸ تقطیع متوسط مطبوعہ مجلس اشاعۃ العلوم حیدر آباد دکن، یہ رسالہ تضمین اشعار مولوی خرم علی صاحب مرحوم ہے، جس میں مرحوم نے پردۂ نظم توحید میں حضرت نبینا علیہ الصلوۃ والسلام اور اولیا اللہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم سے استمداد کی ممانعت اور تحذیر کی تھی، حضرت مولانا ممدوح نے ان ہی اشعار کی تضمین و تطبیق کے لحاظ سے جواز استمداد کا ثبوت دیا ہے، اگر بظاہر مرحوم کے اشعار کی شرح ہے، لیکن باطن میں منکرین استمداد کا جواب مدلل ہے، جو مفید دکارآمد اہل سنت و جماعت ہے"[1]

حکیم عبد الودود دسنیوی نے مولانا خرم علی کی اس نظم پر مسدس کہا جس میں ان ہی اشعار کی

[1] مفاتیح الاعلام مطبوعہ محمود پریس حیدر آباد دکن ج ۱ ص

"نصیحۃ المسلمین" ہی وہ کتاب ہے جس نے موصوف کو اردو لکھنے والوں میں بڑا ممتاز مقام عطا کیا ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ سید صاحبؒ کے خلفا نے جہاں اسلام کی صحیح ترجمانی کی وہاں انھوں نے اردو زبان کو بھی بڑی ترقی دی، چنانچہ غدر سے پیشتر عام طور پر فارسی لکھنے کا رواج تھا، ان بندگان خدا نے اسلام کی ترجمانی کے لیے جو زبان اختیار کی وہ اردو تھی، وہ اردو ہی میں وعظ کہتے اور اسی میں مذہبی عنوانات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھتے تھے، اور روزمرہ کی نہایت سادہ زبان استعمال کرتے تھے، گو یہ زبان پرانے طرز کی ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۸) شرح لکھی ہے، اور درپردہ مولانا انوار اللہ مرحوم کے اشعار کا جواب لکھا ہے، یہ نظم جو در اصل جواب الجواب ہے، ہم کو دستیاب ہو گئی ہے، لیکن طویل زیادہ ہے، اس لیے قلم انداز کی جاتی ہے،

نصیحۃ المسلمین اپنے ابتدائی دور ہی میں اتنی مقبول ہو گئی تھی کہ سید احمد شہیدؒ کے کسی غیر مقلد بنگالی مرید نے اردو میں اس کا رد لکھا، اور اس کا نام "تنبیہ المضلین" رکھا، یہ کتاب نثر میں ہے، مگر ابتدا میں حمد و نعت نظم میں ہے، اور خاتمہ بھی ایک نظم پر ہے، اس کتاب کا ایک مخطوطہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، چنانچہ بلومہارٹ کا بیان ہے،

"تنبیہ المضلین" (اس کا آغاز یوں ہے)

فصل اول حمد اور (۲) نعت اور (۳) سبب تصنیف کتاب کا،

معلم اور عالم تو ہے یا رب	جہاں میں ہو سکھایا تیرے سب[1]
ڈولائے بے تیرے تنکا نہ ڈولے	بلائے بن تیرے کوئی نہ بولے[2]
زبان کو خاک سے تو نے بنایا	پھر اس کو بات کرنا بھی سکھایا

[1] مصرعہ ثانی یوں ہونا چاہیے: جہاں میں ہے سکھایا تو نے ہی سب [2] یہ شعر یوں ہونا چاہیے،

ڈولائے بن ترے تنکا نہ ڈولے	بلائے بن ترے کوئی نہ بولے

احکامات الٰہی کے لیے جتنی سادہ اور سہل زبان لکھی جا سکتی تھی، ان بزرگوں نے لکھی، بلکہ بعض کی زبان تو ایسی صاف و سادہ ہے جو آج بھی سہل ممتنع سے کم نہیں، ان اردو لکھنے والوں میں مولانا خرم علی کا نام بھی بہت ممتاز ہے، اور اس حقیقت کا اعتراف اردو زبان کے تاریخ نگاروں کو بھی کرنا پڑا ہے، رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں:

"مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد، ہدایت المومنین

(بقیہ حاشیہ ص ۳۳۹) اس رسالہ کا مصنف مذہبی مصلح سید احمد بریلوی کا پیرو ہے، جو شاہ عبد العزیز دہلوی کے مرید اور شاگرد تھے، اس میں اس نے وہابی نظریہ کی تائید کی ہے کہ (بغیر مجتہدین کی تقلید کے) ہر شخص کو قرآن سے استنباط مسائل میں اجتہاد کا حق حاصل ہے، اور نیز یہ کتاب مولوی خرم علی بلہوری کی تصنیف نصیحۃ المسلمین ($\frac{۱۲۳۹ھ}{۱۸۲۳ء}$) کا جواب ہے"۔

یہ کتاب نثر میں ہے، جس کے شروع میں حمد باری تعالیٰ میں ایک نظم ہے، اور اس کا خاتمہ بھی ایک نظم پر ہے، مصنف نے اپنے دلائل اور براہین کی تائید میں نصوص قرآنی پیش کی ہیں جو خط نسخ میں لکھی ہوئی ہیں، اور خاتمہ پر یہ شعر ہیں:

نہ جاؤں گا کبھی اب مدرسہ میں	نہ شیطان کے پڑوں گا وسوسہ میں
گزشتہ سب گناہ اب معاف کر تو	دے اس عجز پہ الطاف کر تو[1] "[2]

"تنبیہ الغافلین" سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بنگال کے اندر اردو عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔

---

[1] مصرعہ ثانی یوں ہونا چاہیے: دے اس عجز پہ الطاف کر تو۔

[2] کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹ مطبوعہ لندن ص ۷

نصیحۃ المومنین[1]، موضح الکبائر والبدعات، مائۃ مسائل وغیرہ، یہ سب اسی زمانہ کی کتابیں ہیں جو در اصل اشاعت دین کی غرض سے لکھی گئی تھیں، جن سے زبان اردو کو بھی ضرور تقویت پہنچی"[2]

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

"ایک بہت بڑی تحریک جو ہر چند ادبی نوعیت نہیں رکھتی، مگر اس سے بلا شبہ نثر اردو کو بہت فائدہ پہنچا، اور اس کی تقویت کا باعث ہوئی .... اشاعت مذہب وہابیت کی صورت میں رونما ہوئی جس کی وجہ سے تبلیغ دین کی غرض سے مختلف کتب و رسائل عوام الناس کے فائدے کے واسطے صاف اور سہل زبان میں لکھے گئے"[3]

---

[1] اس کتاب کا صحیح نام نصیحۃ المسلمین ہے، نصیحۃ المومنین نہیں، رام بابو سکسینہ اور بعد کے مصنفین کا نصیحۃ المومنین لکھنا لغزشِ قلم ہے۔

بلوم ہارٹ (Blumhart) نے (کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹ مطبوعہ لندن ۱۹۲۶ء ص ۸۳ میں) اگرچہ نصیحۃ المومنین کا نام علیحدہ بھی لکھا ہے، اور اس کا ایک مخطوطہ بھی انڈیا آفس میں موجود ہے، مگر یہ کوئی مستقل اور جداگانہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ کاتب نے نصیحۃ المسلمین کی آخری نظم ہی کو نصیحۃ المومنین کا نام دیدیا ہے، چنانچہ بلوم ہارٹ لکھتا ہے:

"نصیحۃ المومنین" یہ شرک اور بے دینی کے خلاف ایک نظم ہے، یہ نظم اور مثنوی مولوی خرم علی بلہوری کی ہے، اور ان ہی کی کتاب "نصیحۃ المسلمین" جو ۱۲۳۰ھ کی تصنیف ہے، سے ماخوذ ہے،

اور اس کا پہلا شعر یہ ہے: خدا فرما چکا قرآں کے اندر مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر

اور آخری شعر یہ ہے: تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم زباں اب بند کر واللہ اعلم

[2] تاریخ ادب اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری، طبع سوم نولکشور، حصہ نثر باب ۱۵ ص ۲۰۵

[3] ایضاً ملاحظہ ہو کتاب مذکور، ص ۳۴

رسالۂ نصیحۃ المسلمین کی زبان اگرچہ سادہ ہے، لیکن جملوں کی ساخت اور انداز بیان میں قدامت ہے[1]

بلومہارٹ کا بیان ہے:

"یہ کتاب سب سے پہلے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء میں کلکتہ سے چھپی، اور پھر اس کے دوسرے اڈیشن دہلی، مدراس اور میرٹھ سے شائع ہوئے ہیں" [2]

لکھنؤ میں بھی متعدد بار چھپی ہے، چنانچہ مطبع مصطفائی سے بھی ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء میں متوسط تقطیع پر چھپی ہے، اس نسخہ پر سلطان المطابع کی مہر بھی ہے، یہ نسخہ کپتان مقبول الدولہ بہادر محمد مہدی علی خاں کی نگرانی میں نہایت آب و تاب سے شائع ہوا تھا، صحت کے لحاظ سے بے نظیر ہے، ایک نسخہ مطبع احمدی امو جان کا طبع شدہ میرے والد منشی محمد عبد الرحیم خاطر جے پوری کے پاس تھا، جو اب راقم السطور کے پاس ہے، یہ بھی بہت صحیح نسخہ ہے، نصیحۃ المسلمین ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء میں مطبع مصطفائی کانپور سے چھپی تھی، اس کے بعد پھر متعدد مطابع سے شائع ہوتی رہی ہے، (باقی)

---

[1] راقم نے اس رسالہ کی زبان کو ذرا بدل کر جدید انداز میں ڈھال دیا ہے، کتاب میں ذیلی عنوانات قائم کیے، تلمیحات پر مختصر نوٹ لکھے ہیں، اور تشریح طلب امور کی وضاحت کی ہے، جس سے اس کی افادیت اور بڑھ گئی ہے، انشاء اللہ عنقریب اصح المطابع، کارخانہ تجارت کتب، کراچی کی طرف سے شائع ہو جائے گی،

[2] کیٹلاگ آف ہندوستانی مینسکرپٹ (فہرست مخطوطات اردو برٹش میوزیم) طبع لندن ۱۹۲۶ء ص ۱۰

مولانا خرم علی بلہوری اور انکی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ

از مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی، فاضل دیوبند

(۲)

(۲) **تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار**:- یہ امام حسن صغانی لاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کی سب سے مشہور کتاب مشارق الانوار کا اردو ترجمہ اور شرح ہے، جو ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء میں تکمیل کو پہنچا تھا، ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان کے حدیث کے تراجم میں[1] اسی کتاب تحفۃ الاخیار

---

[1] متاخرین علماء میں مشارق الانوار کا ترجمہ میر قدرت اللہ قاسم مولف مجموعہ نغز کے استاد محمدی عرف میاں صاحب (جو اپنے نام سے زیادہ اپنے عرف اور تخلص بسمل سے مشہور ہیں) نے بھی کیا تھا، لیکن ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ فارسی میں ہوگا، جیسا کہ اس دور میں عام رواج تھا، ورنہ میر قدرت اللہ قاسم اس امر کی ضرور صراحت کرتے کہ موصوف کا ترجمہ اردو، ہندی یا ریختہ میں تھا، جس کا کہیں ذکر نہیں، ورنہ اولیت کا شرف اسی ترجمہ کو حاصل ہوتا، میر قدرت اللہ قاسم (مجموعۂ نغز طبع پنجاب یونیورسٹی ص ۱۰۴، ۱ دیادگار شعراء ترجمہ فہرست اسپرنگر طبع الہ آباد، ص ۳۸) میں لکھتے ہیں:

"مولوی محمدی صاحب ملقب بہ میاں صاحب عفی اللہ عنہ، حضرت ایشان حبرے بودند، محقق و فعلے بودند مدقق، از علوم عربیہ بہرۂ وافی داشتند و از فنون شرعیہ نصیبے کافی ....

(باقی ص ۴۰۶ پر)

کو اولیت کا شرف حاصل ہے، یہ کتاب سب سے پہلے ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء میں یعنی سنہ تالیف کے تین سال بعد مطبع محمدی میں محمد حسین کے اہتمام سے چھپی تھی، اور ایسی خوبصورت چھپی تھی کہ اس زمانہ میں پندرہ روپے اس کی قیمت تھی،[1]

ہندوستان میں اس سے پہلے نہ اردو میں کوئی کتاب چھپی تھی اور نہ عوام میں حدیث کا کچھ چرچا تھا، موصوف نے سب سے پہلے مسلمانوں کو تعلیمات نبوی سے باخبر کرنے کیلئے اس کتاب کا ترجمہ کیا جو بے حد مقبول ہوا، مولانا خرم علیؒ نے آغاز کتاب میں حدیث کی اہمیت اور ہندوستان میں اس سے بے اعتنائی کو بیان کیا ہے، اور ترجمہ کے لیے اس کتاب کے انتخاب کی وجہ یہ لکھی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۵)...... ہمیشہ درس شرح وقایہ و ہدایہ و مشکوٰۃ شریف و صحیح بخاری وغیرہ صحاح می دادند...... از یادان خاص حضرت قدوۃ السالکین مولانا فخر الدین قدس سرہ العزیز اند و چند کتب مستطاب چوں ترجمۂ مشارق الانوار حبل المتین کہ متنے است بے متین در اخبار سید المرسلین در دے احادیث متمسکہ حنفیہ رضوان اللہ علیہم اجمعین است تالیف یافتہ"

مشارق الانوار کے ترجمہ تحفۃ الاخیار کے بعد مولانا محمد احسن نانوتویؒ نے مشارق الانوار کا اردو میں ترجمہ کیا تھا لیکن نہ وہ چھپا اور نہ اس کے مخطوطہ کا کچھ پتہ چل سکا، بلکہ اس کا تذکرہ بھی صرف ایک ہی جگہ ضمناً نظر سے گزرا ہے، محمد عبد الباقی سہسوانی، حیوۃ العلماء (طبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ۱۱۰) میں حافظ سید غلام جیلانی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

"موصوف نے درسیہ معقول و منقول حاصل کیے، مولوی ہدایت علی تلمیذ مولانا فضل حق خیرآبادی سے منطق و فلسفہ و حکمت، و مولانا محمد احسن نانوتوی مترجم در مختار و مشارق الانوار سے دینیات کی تکمیل فرمائی"

[1] تحفۃ الاخیار مع فہرست تبصرۃ الابصار مطبع نظامی ۱۲۹۱ھ کا سرورق،

"حمد و نعت کے بعد دریافت کیا چاہیے کہ علم حدیث اشرف العلوم ہے، اس واسطے کہ اشرف الناس کا کلام ہے، مثل مشہور ہے کہ کلام الملوک ملوک الکلام اور سب علوم دینی اس کے محتاج ہیں، علم تفسیر بدون حدیث کے معتبر نہیں اور علم عقائد اور علم فقہ اور علم سلوک اور علم تاریخ بدون اس کے کچھ سند نہیں لیکن باوجود اس کے ہندوستان میں اس علم شریف کا چرچا نہیں، عوام کا تو کیا ذکر ہے، اکثر علماء کو خبر نہیں، اس واسطے نہایت مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عوام فہم اردو زبان میں کیجئے، سو سب کتابوں سے مشارق الانوار حسن صغانی کی بہت پسند آئی، اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے، اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے، کوئی اس کی ایسی حدیث نہیں، جو غیر معتبر ہو، بخلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی اور ضعیف بھی، بارے الحمد للہ کہ بارہ سو انچاس (۱۲۴۹) ہجری میں حسب دلخواہ ترجمہ تمام ہوا، اور تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار" اس کا نام مقرر کیا، حق تعالیٰ اپنے کرم سے اس کتاب کو مقبول کرے، اور اہل اسلام کو فائدہ عام بخشے اور بھول چوک کو معاف فرمائے" آمین[1]

اس کے بعد کتاب کا مقدمہ ہے، جس میں احادیث کے اقسام اور ان کی تعریف ہے، اس کے بعد امام بخاریؒ اور امام مسلم رحمہما اللہ کے حالات اور کمالات کا تذکرہ ہے، اور پھر حسن صغانی کے حالات اور تالیفات کا ذکر ہے، پھر اپنے ترجمہ کی بابت کچھ ضروری باتیں لکھی ہیں، اصل کتاب کے آغاز سے پہلے حدیث کی اہمیت پر نہایت بصیرت افروز نظم ہے، پھر اصل کتاب کا مع متن ترجمہ ہے، اس کے بعد فوائد کے تحت حدیث کا پورا واقعہ اور اہم امور کی وضاحت ہے، فوائد اگرچہ مختصر ہیں، لیکن بڑے کام کے ہیں، موصوف نے کتاب کی خصوصیت اور ترجمہ کی اہمیت کو ان الفاظ میں

[1] تحفۃ الاخیار طبع نولکشور کانپور ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء ص ۲

بیان کیا ہے،

"معلوم کیا چاہیے کہ اس کتاب کے ترجمہ میں چند امور کی رعایت کی ہے، اول یہ کہ مصنف نے اختصار کے واسطے احادیث کے اسناد یعنی راویوں کے نام کو حذف کیا، فقط صحابی کا نام جو اس حدیث کا اول راوی ہے، مذکور کیا، اس طرح ہر حدیث میں اول کتاب کا اشارہ کیا پھر صحابی کا نام لیا، پھر حدیث کو بیان کیا، اور اختصار کے واسطے ہر حدیث پر قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہا، لیکن مترجم نے ہر حدیث کے ترجمہ میں کہدیا ہے کہ حضرت نے یوں فرمایا اور کتاب کا نام ہر حدیث میں پہلے دیا ہے، تاکہ عوام کو شبہہ نہ پڑے، دوسرے یہ کہ حدیث کا ترجمہ تحت لفظ ترجمہ نہیں کیا، اس واسطے کہ عرب کا محاورہ ہند کے محاورے سے اکثر مطابق نہیں، بلکہ محاورہ مقدم رکھا ہے، مرادی مطلب جابجا لکھا، اور باوجود اس کے حتی المقدور تحت لفظ ترجمے کی بھی رعایت کی ہے، تیسرے یہ کہ اصل غرض اس سے یہ ہے کہ اہل اسلام کو فائدہ عام ہو، یہانتک کہ حرف شناس عوام بھی محروم نہ رہیں، اس واسطے نہایت مشکل مسائل نہیں لکھے، چوتھے یہ کہ اس کتاب کے خطبے کا ترجمہ نہیں کیا، عوام کو اس سے کچھ فائدہ نہ تھا........... مصنفؒ نے کمال اختصار سے ہر جگہ قصہ حدیث کا نہیں بیان کیا کہ حضرت نے یہ حدیث کس وقت کس تقریب سے فرمائی تو اس کا مطلب بخوبی نہیں معلوم ہوتا، اس واسطے حدیث کے ترجمہ کے بعد فائدہ میں اس کا پورا قصہ لکھ دیا، اور جہاں مطلب مجمل اور مشکل تھا اس کو مفصل کر دیا، اور چاروں اماموں کے مذہب جابجا مناسب مقاموں میں بے تعصب لکھے، شیعہ اور اہل بدعت کے شبہات جابجا مجملاً دفع کیے، غرض کہ بحمد اللہ یہ کتاب اہل اسلام کے واسطے عجیب تحفہ ہے، اکثر مطالب دینی کو شامل ہے، جس کے دریافت سے جاہل

عالم بنے اور عالم تازہ لطف اٹھائے، حضرت مولانا عبد القادر دہلویؒ کی ہندی تفسیر اور یہ کتاب طالب خدا کے واسطے کافی ہیں، دیندار کے حق میں یہ دونوں کتابیں گویا دو آنکھیں ہیں، جن سے دو جہاں کا انجام نظر پڑے یا دو پر ہیں جن سے عرش تک اڑ سکے۔"

اس کے بعد حدیث کی اہمیت پر ایک مختصر سی نظم ہے، جو نہایت دلچسپ اور بہت مقبول ہے، ہم بھی اس کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتے ہیں جو ناظرین کو پرانی یاد تازہ کریں گے۔

کیا تجھ سے کہوں حدیث کیا ہے	دروازۂ درج مصطفیٰؐ ہے
صوفی عالم حکیم دینی	کرتے رہے اس کی خوشہ چینی
بابا کے یہاں سے کون لایا	جس نے پایا یہیں سے پایا
یہ شاہراہ محمدی ہے	گنجینۂ راز احمدی ہے
ہوتے ہوئے مصطفیٰؐ کی گفتار	مت دیکھ کسی کا قول و کردار
جب اصل ملے تو نقل کیا ہے	یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے
اب زیادہ تو مجھ سے کر نہ کل کل	خورشید کے آگے کیا ہے مشعل
ناحق تجھے اور کچھ ہوس ہے	قرآن و حدیث تجھ کو بس ہے
حق ہوگا حدیث خواں سے خرم	ارشاد رسولؐ فخر عالم
تھا علم حدیث سخت مشکل	اور ہند کے لوگ اس سے غافل
چاہا کہ رہیں نہ یہ بھی محروم	ہوا ترجمہ اس سبب سے مرقوم
مقبول ہو یہ کتاب یارب	مشتاق ہوں اسکے اہل دیں سب[1]

ترجمہ اور فوائد کی زبان اگرچہ سادہ اور عام فہم ہے لیکن طرز بیان اور انداز ترتیب میں قدامت ہے،

---

[1] تحفۃ الاخیار ص ۱

ترجمہ اور شرح کا نمونہ درج ذیل ہے۔

م سمرة بن جندب والمغيرة	مسلم میں روایت ہے، سمرہ بن جندبؓ اور مغیرہ
بن شعبة من حدث عنی بحدیث	ابن شعبہؓ سے کہ حضرتؐ نے فرمایا کہ جو میری طرف سے
وهو یری انه کذب فهواحد	روایت کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ جھوٹی
الکاذبین	حدیث ہے تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے،

ف، دو جھوٹے یعنی مسیلمہ کذاب اور مختار یا اسود عنسی جنھوں نے پیغمبری کا دعوی کیا تھا، یا یہ مطلب کہ ایک جھوٹا وہ جس ناپاک نے حضرت پر جھوٹ باندھا، دوسرا جھوٹا یہ کہ اس جھوٹی حدیث کو روایت کرتا ہے، جان بوجھ کے، اکثر لوگ جو علم حدیث سے ناواقف ہیں، واہی تباہی حدیثیں نقل کیا کرتے ہیں، جن کی کچھ اصل نہیں، مسلمان کو لازم ہے کہ حدیث میں بہت احتیاط کیا کرے، ہر ایک کتاب کی حدیث کو سچا نہ جانے جو حدیث کی معتبر کتابوں میں ہو اس کو مانے، جیسے کہ یہ کتاب مشارق الانوار ہے کہ سب علمائے اہل سنت اس کو بہت صحیح جانتے ہیں۔"[1]

جب موصوف نے مشارق الانوار کا ترجمہ اور شرح مکمل کر لی تو پھر اس کے حسن قبول کے لیے ایک نہایت پُر درد نظم لکھی ہے، جو پڑھنے کے قابل ہے، اس کے چند شعر درج ذیل ہیں،

شکر کہ انجام کو پہنچی کتاب	علم احادیث کی لب لباب
چونکہ مطالب تھے بر اوج فلک	ترجمہ سے آئے اُتر ارض تک
یعنی کے اردو کی پہن کر قبا	شاہد تازی ہوا جلوہ نما
دوستو اب اس کا ادا حق کرو	خلق کو سمجھاؤ خود اسکو پڑھو

[1] مشارق الانوار ترتیب فقہی دالا ایڈیشن، مرتبہ راقم السطور، نور محمد اصح المطابع اکارخانہ تجارت کتب کراچی ص۱

یارب ان اوراق کو مقبول کر	ہند کو اس فیض سے کر بہرہ ور
خرم افسردہ کو پُر درد کر	الفت دنیا سے اُسے سرد کر
تیری ہی دھن روح کو ہر دم رہے	تیرے غم عشق میں خرم رہے
یارب اس عاجز کی دعا کر قبول	خاتمہ بالخیر بحق رسول

یہاں یہ بتا دینا بھی فائدہ سے خالی نہیں کہ "تحفۃ الاخیار" میں احادیث پر جو عام فہم اور مفید فوائد لکھے ہیں، وہ ان ہی متداول کتابوں کے مرہون منت ہیں، آپ کا یہی بڑا کمال ہے کہ جو موتی ان متداول کتابوں میں جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے، ان کو ایک ایک کرکے چنا اور نہایت سلیقہ سے ان کو ایک لڑی میں پرو دیا، وہ متداول کتابیں یہ ہیں:

(۱) احیاء علوم الدین، از امام غزالی (۲) استفتائے حرمت نان پاؤ، از عبد العلی بحر العلوم (۳) جامع الاصول از علامہ ابی السعادات ابن الاثیر الجزری (۴) رسالہ شق القمر، از شاہ رفیع الدین دہلوی (۵) شرح البخاری، از جلال الدین عبد الرحمن السیوطی (۶) شرح سفر السعادت، از شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۷) شرح المشارق، از علامہ گاذرونی (۸) شرح معانی الآثار، از امام ابو جعفر الطحاوی (۹) الشفا، از قاضی عیاض، (۱۰) عینی شرح الہدایہ، از بدر الدین عینی (۱۱) قوت القلوب، از ابو طالب مکی، (۱۲) کیمیائے سعادت، از امام غزالی،

ان کتابوں میں سب سے زیادہ فائدہ موصوف نے علامہ گاذرونی کی شرح المشارق اور علامہ ابی السعادات کی شہرۂ آفاق کتاب جامع الاصول سے اٹھایا ہے، اور ان ہی دونوں کتابوں کی مدد سے حدیثوں کا پورا پورا ترجمہ فوائد میں نقل کر دیا ہے، اور پڑھنے والے کے اس طرح ذہن نشین کرا دیا ہے کہ وہ اس کو پوری طرح قبول ہی نہیں کرتا بلکہ یاد بھی

کر لیتا ہے،

بعض مقامات پر علامہ ابو السعادات یا شارح گاذرونی نے کسی حدیث کے متعلق جس پر (ق) کی علامت بنی ہوئی تھی یعنی یہ حدیث صحیحین میں مروی ہے، کسی حدیث پر خ کی علامت تھی، کسی پر م کی یعنی یہ حدیث بخاری کی ہے، یہ حدیث مسلم کی ہے، اس کے بارے میں یہ لکھا کہ یہ حدیث مسلم کی ہے، بخاری کی نہیں، یا بخاری کی ہے مسلم کی نہیں، گو ان بزرگوں کا کہنا تحقیق ہی پر مبنی تھا، مگر مولانا نے خود بھی اس کو صحیحین میں تلاش کیا، اور اگر وہ حدیث نہ مل سکی تو بلا تکلف لکھ دیا ہے کہ یہ حدیث مجھے نہیں ملی، چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

اگرچہ ق کی حدیثوں میں اس حدیث پر قاف کی علامت ہے یعنی بخاری اور مسلم دونوں میں یہ حدیث بالاتفاق ہے، حالانکہ یہ صاف خطا ہے، اس واسطے کہ صاحب جامع الاصول اور شارح گاذرونی نے لکھا ہے کہ حدیث صرف مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں، اور اس عاجز نے بھی صحیح بخاری میں دیکھا، زید بن خالدؓ سے اس میں اس مضمون کی حدیث نہیں پائی، معلوم ہوا کہ کاتب کی غلطی ہے[۱]"

حدیث کی بہت سی کتابوں کے ترجمے شائع ہوئے، لیکن جو قبولیت مشارق الانوار کے ترجمہ تحفۃ الاخیار کو ہوئی، وہ کسی اور کو نہیں، چنانچہ یہ ترجمہ ابتک کم و بیش بیس مرتبہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے،

(۱) تحفۃ الاخیار سب سے پہلے ۱۲۵۲ھ / ۱۸۳۶ء میں یعنی سنہ تالیف ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۴ء کے ٹھیک تین سال بعد مطبع محمدی لکھنؤ میں محمد حسین کے اہتمام سے نہایت دیدہ زیب چھپی تھی، اس زمانہ میں اس کی قیمت پندرہ روپے تھی، پھر بھی لوگوں کی طلب باقی رہی، محمد عبد الرحمٰن بن حاجی

---

[۱] تحفۃ الاخیار مطبع نولکشور ص ۱۲۸

محمد روشن خاں (صاحب مطبع نظامی کانپور) کا بیان ہے،

"پہلے یہ کتاب ہدایت نصاب ۱۲۵۲ھ میں باہتمام حاجی محمد حسین مرحوم کے ایسی خوب چھپی کہ فی جلد پندرہ روپے کو بکی[۱]"

(۲) ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء میں عبد الملک بن محمد صادق نے مطبع محمدی بمبئی میں چھاپ کر شائع کی، اس کی تقطیع خورد اور صفحات ۴۶۴ ہیں، آخر میں صحتنامہ ہے اور خاتمۃ الکتاب پر یہ عبارت ہے:

"الحمد للہ کہ کتاب مستطاب تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار جو تالیف کی ہوئی واقف دقائق خفی و جلی مولوی خرم علی صاحب دامت فیوضہ کی ہے، تاریخ بست و ہفتم شہر رمضان المبارک ۱۲۶۳ ہجریہ مقدسہ کو جزیرۂ معمورۂ بمبئی میں عاصی عبد الملک بن مولوی محمد صادق مرحوم نے مطبع محمدی میں حلہ اختتام کا پہنایا[۲]"

عبد الملک نے یہ کتاب بمبئی میں تین مرتبہ طبع کرائی تھی، چنانچہ ان کا بیان ہے:

"لکھنؤ میں تو صاحب فیض زمان ...... نواب ذو الفقار علی خاں بہادر دام اقبالہ نے چھپوا کر مستحقوں کو للہ تقسیم کیا تھا لیکن کتاب مذکور پھر نایاب ہو گئی، لہذا عاجز نے جناب ناوخدا محمد علی صاحب بن ناوخدا محمد حسین روگھے کی تائید اور اعانت سے تیسری مرتبہ معمورۂ بمبئی کے مطبع محمدی میں حلہ طبع پہنایا"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۲ھ میں جو نسخے حاجی محمد حسین نے چھپوائے تھے، جب وہ سب فروخت ہو گئے اور نادار لوگ نہ خرید سکے تو نواب ذو الفقار علیؒ نے جو مولانا خرم علیؒ کے قدرشناسوں اور عقیدتمندوں میں تھے، اس کو چھپوا کر مستحقوں میں مفت تقسیم کرایا،

---

[۱] تحفۃ الاخیار مع تبصرۃ الابصار، مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ کا سرورق [۲] تحفۃ الاخیار، مطبع محمدی بمبئی ۱۲۶۳ھ یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے، لیکن یہ نسخہ آخر سے ناقص ہے، چنانچہ بعد کی عبارت ہم نے اپنے ایک دوست کے نسخہ سے نقل کی ہے،

(۳) ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۰ء میں محمد روشن خاں کے بڑے بھائی محمد مصطفےٰ خاں المتوفی ۱۲۶۹ھ نے اپنے مطبع مصطفائی کانپور سے متوسط تقطیع پر دو جلدوں میں چھاپی اور سات روپے قیمت رکھی، اس کے خاتمہ پر یہ عبارت ہے،

"کتاب مستطاب تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار بتصحیح بسیار و اہتمام فراوان مقدار در مطبع مصطفائی بندہ امیدوار مغفرت ایزد منان محمد مصطفےٰ خاں خلف حاجی محمد روشن خاں مرحوم واقع دار السرور کانپور محلہ پٹکاپور بتاریخ پانزدہم شہر رمضان المبارک ۱۲۶۷ھ نور بخش طبع گردید و دور ظلمت آباد جہاں آفتاب عالمتاب درخشید"[۱]

(۴) ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء میں پھر مطبع مصطفائی سے دو جلدوں میں چھپ کر شائع ہوئی، پہلی جلد ۴۱۲ صفحات اور دوسری جلد ۵۴۰ صفحات پر مشتمل ہے،[۲]

(۵) ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء میں مشکوٰۃ المصابیح کے ترجمہ کے حاشیہ پر مطبع محمدی مدراس سے چھپی،[۳]

(۶) ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء مطبع مخدومی بمبئی سے چھپکر شائع ہوئی،[۴]

(۷) ۱۳۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں محمد عبدالرحمن خاں نے اپنے مطبع نظامی کانپور سے بڑے سائز پر چھاپی جس کے آخر میں فہرست فوائد اور صحتنامہ دونوں موجود ہیں، یہ نسخہ چار روپے فی جلد بکا اور ہاتھوں ہاتھ نکل گیا،[۵]

---

[۱] یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے [۲] یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ہماری نظر سے گزرا ہے [۳] یہ نسخہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی کی پنجاہ سالہ جوبلی پر کتابوں کی نمائش ہماری نظر سے گزرا ہے، اور اب یہ نسخہ خیرپور پبلک لائبریری میں محفوظ ہے [۴] یہ نسخہ سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ہے،

[۵] مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ کا سرورق، یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے،

(۸) ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء میں پھر چھپی ہے،

(۹) ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء میں مطبع حیدری سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کی تقطیع متوسط اور ۶۷۰ صفحات ہیں، ابتدا میں آٹھ صفحوں کی فہرست مضامین بھی ملحق ہے۔

(۱۰) ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مطبع نظامی کانپور سے بڑے سائز پر چھپی، یہ مع صحتنامہ ۵۲۳ صفحات پر مشتمل ہے، اس نسخہ کے ساتھ ابتدا میں فہرست تبصرۃ الابصار بھی چھپی ہے۔[۱]

(۱۱) ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مطبع نولکشور کانپور سے چھپی، سائز کلاں اور صفحات ۴۱۵ ہیں،[۲]

(۱۲) ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں محمد تیغ بہادر کے زیر اہتمام مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے کلاں سائز پر چھپی اور ۴۹۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس نسخہ کی ابتدا میں نہ فہرست ابواب ہے، اور نہ فوائد کی فہرست فارسی میں ہے،

(۱۳) ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں مطبع نولکشور سے پھر چھپی،[۳]

(۱۴) ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں مطبع فخر المطابع لکھنؤ سے کلاں سائز پر چھپی، یہ مع فہرست ۴۰۴ صفحات پر مشتمل ہے،

(۱۵) ۱۳۳۸ھ/۱۹۲۰ء میں مطبع نولکشور سے کلاں سائز پر چھپی، اور ۵۳۳ صفحات پر مشتمل ہے،

(۱۶) اب نور محمد اصح المطابع کارخانہ تجارت کتب کراچی نے متوسط تقطیع کے ۴۱۰ صفحات پر شائع کی ہے،

(۳) رسالہ جہادیہ - یہ مولانا کی ۷۵ اشعار کی اردو میں ایک رزمیہ نظم ہے، پہلے ہی شعر میں فرماتے ہیں،

---

[۱] مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ کا سرورق، یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی میں ہماری نظر سے گزرا ہے،

[۲] تحفۃ الاخیار کا یہ نسخہ میرے والد منشی عبدالرحیم خاں رجب پوری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا، مشارق الانوار کی ترتیب فقہی کے زمانہ میں شروع سے آخر تک بس یہی ایک نسخہ میرے پیش نظر رہا ہے اور آج بھی یہ نسخہ میرے پاس ہے،

[۳] فہرست سبحان اللہ اورینٹل لائبریری مطبوعہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۳۵۱ھ ج ۲ ص ۶۹

بعد تحمیدِ خدا، نعتِ رسولِ اکرم　　یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم

اس میں پہلے جہاد کی تعریف اور اس کے فضائل بیان کیے ہیں، اور اس میں شرکت کی دعوت دی ہے، پھر اپنے زمانہ کے نام نہاد مولویوں کو جو جہاد سے گریزاں تھے، بھاڑا ہے، اس کے بعد فقہاء، علماء، اور صوفیا سے درخواست کی ہے کہ یہ کام تمھارے کرنے کا ہے، اٹھو اور جہاد میں شرکت کرو۔ اس نظم میں اگرچہ چنداں شعریت نہیں ہے، مگر نظم نہایت مؤثر اور بڑی ہمت آفریں ہے۔ اس نے سوتوں کو جگایا اور مردہ دلوں کو گرمایا ہے۔ اس نظم نے سید صاحبؒ کی تحریک میں وہی کام کیا جو آگ پر تیل کرتا ہے،

جہاد کے زمانہ میں اس کا بڑا چرچا تھا، اور ہر طرف یہی نظم پڑھی جاتی تھی، ہنٹر (Hunter) ہندوستانی مسلمانس (The Indian Musalmans) میں لکھتا ہے،

"اور ان کا سب سے ہر دلعزیز گیت (نظم) جس میں وہی (جہاد) اسلامی کی روح کارفرما تھی، یہ باغی اور مجاہدین، ہماری سرحدی چھاؤنیوں سے صبح و شام مریڈ کرتے اور اسی گیت اور نظم کو اک آواز ہو کر بڑے زور سے گاتے اور پڑھتے جاتے تھے، اور ان رنگ روٹوں (نو آموز مجاہدوں) کی جماعتیں جو ہمارے علاقہ کے شمالی حصہ سے گزرتیں، وہ اس نظم کے بندوں کو برطانوی شاہراہوں سے پڑھتے ہوئے گزرتی تھیں"[1]

یہ نظم بنگال تک کے مجاہدین اپنی روانگی کے وقت بڑے جوش و خروش سے پڑھتے تھے، چنانچہ مولانا محمد اکرم خاں اپنے "خطبۂ صدارت" میں لکھتے ہیں:-

"میں اس موقعہ پر رسالہ جہادیہ سے ایک شعر نقل کرتا ہوں......

یہ شعر میں نے اپنی ہفتاد سالہ نانی کی زبان سے سنا تھا،

[1] "ہندوستانی مسلمانس" بارسوم طبع جدید کلکتہ ۱۹۴۵ء، ص ۵۹

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد　　اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

یہ مجاہدین، بنگال کے مختلف گوشے سے جوق در جوق میری سابق بستی حکیم پور میں جمع ہوتے تھے، اور وہاں سے رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے راج محل اور بھاگلپور کی راہ عظیم آباد اور پھر وہاں سے سرحد روانہ ہو جاتے تھے"[1]

یہ نظم سید صاحبؒ کی موجودگی میں بھی متعدد بار پڑھی گئی، اور آپ نے بڑے شوق سے اس کو سنا، چنانچہ جس وقت آپ نے تورو سے پشاور کا قصد فرمایا، اس وقت یہ نظم پڑھی جا رہی تھی، اس موضوع پر اور بزرگوں نے بھی نظمیں اور مثنویاں کہیں، مگر جو قبولیت اس نظم کو حاصل ہوئی، وہ کسی اور کو نہیں ہوئی،

یہ رسالہ غدر سے پیشتر مولانا شیخ مسیح الزماں المتوفی ۱۲۹۵ھ نے اپنے مطبع مسیحائی کانپور سے قصہ اصحاب کہف کے ساتھ شائع کیا تھا، برطانوی حکومت نے بعد میں اسکو باغیانہ قرار دیکر اس کی طباعت ممنوع قرار دیدی[2]، مگر اس کے باوجود یہ نظم لوگوں کے حافظوں میں برابر محفوظ رہی، پھر مجاہدین چمرقند نے ۱۹۴۶ء میں چھاپ کر شائع کی اور مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "سید احمد شہید" میں اس کو نقل کیا ہے، تاہم اس کے کچھ اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں،

بعد تحمیدِ خدا، نعتِ رسولِ اکرمؐ　　یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمع بلاد　　اہل اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

ہے جو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد　　ہم بیان کرتے ہیں تھوڑا سا اسکو کر یاد

[1] خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ اسلام پاکستان ہسٹری کانفرنس اجلاس چہارم مطبوعہ کراچی ۱۹۵۴ء ص ۱۹

[2] "ہنٹر" نے اپنی کتاب "ہندوستانی مسلمانس" (ص ۹۰، ۹۵) میں اس کے بیشتر اشعار کا ترجمہ بھی کر دیا ہے، لیکن آپ کا نام کرم علی (Karam Ali) کانپوری لکھا ہے، جو صحیح نہیں، آپ کا نام خرم علی ہے،

فرض ہے تم پر مسلمانوں جہاد کفار   اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیندار

جس کے پیروں پہ پڑے گردِ صفِ جنگِ جہاد   وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد

جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر   روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر

اے برادر تو حدیث نبوی کو سن لے   باغ فردوس ہے تلواروں کے سائے تلے

دل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیویگا گر   سو سو اس کو خدا دیویگا روزِ محشر

اور اگر مال بھی خرچا اور لگائی تلوار   پھر تو دیویگا خدا اسکے عوض سات ہزار

مال و اولاد کی جورو کی محبت چھوڑو   رہِ مولیٰ میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو

بارہ سو سال کے بعد ایسے اراد ے والا   ہوا پیدا ہے مسلمانوں کرو شکر خدا

حضرت مولوی اب طاق میں رکھدیجئے کتاب   لیجئے تلوار و میدان کو چل دیجئے شتاب

ہادیِ دین ہو تم، تم کو ہے سبقت لازم   تم چلو گے تو بہت ساتھ چلیں گے خادم

اے گروہِ فقرا نفس کشی کے استاد   عمل نفس کون ہے بہتر ز جہاد

ان کا سر کاٹ لیا کہ کٹا اپنا سر   دونوں صورت میں جو سمجھو تو تمھیں ہو بہتر

اے خداوند سماوات و زمین، ربِ عباد   اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیق جہاد

ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اللہ   کر نہ آئے کوئی آواز جز اللہ اللہ[1]

اسی نام اور اسی مضمون کی ایک مثنوی فارسی میں بھی ہے، مولانا غلام رسول مہر کا خیال ہے کہ یہ رسالہ بھی آپ کی تصنیف ہے، چنانچہ "سید احمد شہید" (ج ۲ ص ۲۳) میں لکھتے ہیں،

"مولوی خرم علی بلہوری ناظم جہادیہ فارسی اردو و مصنف کتب عدیدہ"

فارسی مثنوی میں چونکہ تخلص حسن آگیا ہے، اس لیے نقل کے وقت اپنی "تازہ تالیف

[1] سید احمد شہید، کتاب منزل لاہور، ج ۲ باب ۲۷ ص ۲۵۸

"جماعت مجاہدین" (ص ۲۹۹) میں تردد کا اظہار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں،

"ایک جہادیہ کسی صاحب نے فارسی میں بھی نظم کر دیا تھا، اس میں ناظم کا نام یا تخلص حسن بتایا گیا ہے بعض اصحاب کے نزدیک یہ جہادیہ بھی مولوی خرم علی کا ہے، لیکن انھوں نے حسن تخلص کبھی استعمال نہ کیا، ممکن ہے یہ جہادیہ اس بزرگ نے مرتب کیا ہو جس نے ایک قصیدہ سفر حج سے مراجعت کے موقع پر پیش کیا تھا، اور اس کے منتخب اشعار "سید احمد شہید" میں درج ہو چکے ہیں،

ہمارا خیال ہے کہ یہ مثنوی مولانا اولاد حسن قنوجی کی ہے، جو سید احمد شہید کے اجلۂ خلفاء میں سے تھے، اور فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے، ان ہی کا نام اور تخلص حسن تھا، چنانچہ آپ کے نامور فرزند نواب صدیق حسن خاں قنوجی اتحاف النبلاء ص ۲۴۳ میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں:

"نام خود را در تصانیف و مکاتیب بر طریقۂ عرب حسن می نوشتند نہ اولاد حسن"

یہی وجہ ہے کہ بیشتر اہل قلم کو آپ کے نام میں دھوکہ ہوا ہے، اور انھوں نے اولاد حسن قنوجی اور حسن قنوجی کو دو جداگانہ شخصیتیں سمجھا ہے،

سید اولاد حسن قنوجیؒ نے مولانا خرم علی بلہوری کی تقلید میں بعض چیزیں لکھی تھیں، جن میں ہو بہو مولانا کا ایسا چربہ اتارا ہے کہ اگر تخلص کو بدل دیا جائے تو تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے، چنانچہ نصیحۃ المسلمین کے سال بھر بعد سید اولاد حسن قنوجی نے "ہدایۃ المومنین" لکھی جس میں نصیحۃ المسلمین ہی کا انداز اختیار کیا ہے، اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ہم نے نصیحۃ المسلمین دیکھی، اس میں چونکہ تعزیے وغیرہ کی قباحت کو تفصیل سے نہیں بیان کیا گیا ہے اس لیے ہم نے ہدایت المومنین لکھی اور جس طرح "نصیحۃ المسلمین" کا خاتمہ نظم پر ہے،

اسی طرح اس کا خاتمہ بھی نظم پر ہے، مضمون بھی واحد ہے، اور مقطع بھی دونوں کا یکساں ہی، صرف بحر اور قافیہ کا فرق ہے، دونوں کے مقطعے درج ذیل ہیں،

مولانا سید اولاد حسن قنوجی	مولانا خرم علی بلہوری
حسن خاموش ہو اتنا بہت ہے	تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم
جسے چاہے خدا دیوے سمجھائی	زباں اب بند کر واللہ اعلم

چونکہ دونوں بزرگوں کے پیش نظر محض شاعری نہ تھی، بلکہ حقائق کو دلنشین اور سادہ الفاظ میں اس غرض سے نظم کرنا تھا کہ اشعار آسانی سے یاد بھی رہ سکیں، اور ان کے ذریعہ جہاد کی حقیقت اور اس کا مقصد بھی ذہن نشین ہو جائے، اس لیے ان دونوں کتابوں کے مضامین میں تنوع نہ پیدا ہو سکا اور بعض لوگوں کو اشتباہ ہو گیا اور انھوں نے اختلافِ تخلص کے باوجود اس کا انتساب مولانا خرم علی بلہوری کی طرف کیا جو بداہۃً غلط ہے،

رسالہ جہادیہ پر غور کیجئے، اس میں بھی مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کا مضمون ایک مقصد اور جذبہ بھی ایک ہی تھا، پھر مولانا خرم علی کا جہادیہ پہلے سے مشہور ہو چکا تھا، اس کے مضامین مولانا اولاد حسن قنوجی کے ذہن میں تھے، چنانچہ انھوں نے جو مثنوی لکھی اس میں اس رسالہ جہادیہ کا چربہ اتارا، یہی وجہ ہے کہ فارسی مثنوی اردو مثنوی سے دگنی ہو گئی، اردو کی مثنوی ۵۰ شعروں پر مشتمل ہے اور فارسی مثنوی میں ۱۰۱ اشعر ہیں،

اسی جہاد کے موضوع پر حکیم مومن خان مومن المتوفی ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) نے فارسی اور اردو میں متعدد مثنویاں لکھیں جو ان کے فارسی اور اردو دیوانوں میں پائی جاتی ہیں، اور مولانا غلام رسول مہر نے بھی "جماعت مجاہدین" میں ان کو نقل کر دیا ہے، مگر جو شہرت اور مقبولیت مولانا خرم علی بلہوری کے "رسالہ جہادیہ" کو حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نہیں ہو سکی

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

(باقی)

مولانا خرم علی بلہوری اور اُن کی علمی خدمات کا تفصیلی جائزہ

از

مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی، فاضل دیوبند،

(۳)

(۴) **غایۃ الاوطار ترجمۂ درّ المختار**: یہ فقہ حنفی کی نہایت مشہور اور معتبر کتاب درّ المختار کا اردو ترجمہ ہے غایۃ الاوطار، اگرچہ ترجمہ کے نام سے مشہور ہے، مگر حقیقت میں یہ ترجمہ اتنا جامع ہے کہ گویا شرح کا کام دیتا ہے، چنانچہ مطبع اودھ اخبار کی طرف سے جو دیباچہ اس کتاب میں ہے اس میں اس کی جانب نہایت لطیف اشارہ ہے،

"الحمد للہ والمنۃ کہ یہ اردو ترجمہ درمختار جس کو عالم المعی فاضل لوذعی مولوی خرم علی صاحب مرحوم نے طحطاوی اور حاشیۂ مدنی کے ساتھ ترجمہ کیا تھا"[۱]

یہی وجہ ہے کہ حضرت مترجم اپنی تیرہ سالہ متواتر کوشش کے باوجود اُس کو پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے، اگر صرف ترجمہ ہی کرنا ہوتا، تو یہ کام اس سے پیشتر کبھی کا ہو جاتا، اور اتنا عرصہ ہرگز نہ لگتا،

یہ ترجمہ بھی موصوف نے نواب ذوالفقار علی بہادر رئیس باندا کی فرمائش پر ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں شروع کیا تھا،

ترجمہ کی تکمیل کس طرح ہوئی، اس کے متعلق مولانا محمد احسن نانوتوی کا حسب ذیل بیان

---

[۱] غایۃ الاوطار ترجمہ درّ المختار طبع سوم نولکشور ۱۳۱۰ھ ج ۱ ص ۲،

پڑھنے کے قابل ہے،

" اس کتاب جلیل الشان کو مرحوم خرم علی صاحب بلہوری نے حسب فرمایش نواب صاحب بہادر مبرور والی باندہ ۱۲۵۸ھ میں کتاب النکاح سے اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا، متواتر تیرہ برس ترجمہ کرکے رجب ۱۲۷۰ھ میں آخر کتاب تک پہنچا دیا، پھر محرم ۱۲۷۱ھ تک کتاب کا بچا ترجمہ پورا کرکے شروع سے باب الاذان تک لکھنے پائے تھے، کہ یکایک رہگرای عالم بقا ہوئے"[۱]

درالمختار جیسی بلند پایہ کتاب کا ترجمہ مولانا موصوف کا بہت اہم کارنامہ ہے، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھیں کبھی ایسے کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے، ترجمہ اگرچہ بہت سلیس نہیں لیکن بڑا عالمانہ ہے، اس کا نمونہ یہ ہے،

در مختار	اردو ترجمہ
والمُباح ما اجیز للمکلفین فعلہ وترکہ بلا استحقاق ثواب وعقاب نعم یحاسب علیہ حساباً یسیراً کذا فی الاختیار ،	اور مُباح وہ فعل ہے جس کے کرنے اور نہ کرنے کی مُکلف لوگون کو اجازت ہو بلا استحقاق ثواب اور بلا ترتب عتاب ہاں البتہ یہ ہے کہ مُباح پر کچھ ہلکا سا حساب ہوگا، کذا فی الاختیار، م، عدم ثواب اور عذاب درصورت عدم نیت کے ہے، اور اگر مباح میں عبادت کی نیت کرے تو ثواب ہوگا، اور اگر گناہ کی نیت کرے تو عذاب ہوگا، قال

---

[۱] ایضاً ملاحظہ ہو، کتاب مذکور ص ۳۔

صلی اللہ علیہ وسلم انما
الاعمال بالنیات،

کل مکروہ ای کراھۃ تحریم
حرام ای کالحرام فی العقوبۃ
بالنار عند محمد و اما المکروہ
کراھۃ تنزیہ فالی الحل
اقرب اتفاقاً،

جو مکروہ تحریمی ہے وہ حرام کے مانند ہر
دوزخ کے عذاب میں محمد کے نزدیک اور
مکروہ تنزیہی تو حلال کی طرف نزدیک تر
ہے، باتفاق امام اور شیخین کے،

. . . . م، حرام وہ ہے جو بدلیل قطعی یقینی ممنوع
. . . . ہوا، اور اس کا ترک فرض ہے، چنانچہ
. . . . شراب پینا اور مکروہ تحریمی وہ ہے جو
. . . . بدلیل ظنی ممنوع ہوا اور اس کو ترک کرنا
. . . . واجب ہے، جیسے سوسمار کا کھانا اور
. . . . شطرنج کا کھیلنا، تو امام محمد جب اپنی
. . . . کتابوں میں کراہت بولتے ہیں، تو
. . . . اس سے حرام مراد رکھتے ہیں، اور مکروہ
. . . . تحریمی کو حرام نہیں کہتے، اس واسطے کہ
. . . . اس کی دلیل قطعی نہیں، جو حرمت پر
. . . . دلالت کرے، تو جس کی حرمت دلیل
. . . . غیر قطعی یعنی خبر احاد یا قول صحابی سے

. . . . ثابت ہے، اوس کو مکروہ کہتے ہیں، اور
. . . . اور یہ جو کہا کہ مکروہ تنزیہی حلال سے
. . . . نزدیک تر ہے، یعنی اوس کے کرنے والے
. . . . پر اصلا عذاب نہیں، لیکن اس کا تارک
. . . . کچھ تھوڑا ثواب پاوے گا، کذا
. . . . فی الطحطاوی،[1]

مولانا کے پاس چونکہ قلمی کتابیں تھیں، اس لئے کہیں کہیں ترجمہ میں دشواری ہوئی، چنانچہ آپنے بعض عبارتوں کا ترجمہ چھوڑ دیا تھا، اور حاشیہ پر کہدیا تھا کہ اس کا ترجمہ تامل کے بعد لکھا جائیگا مگر مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے جب باقی حصہ کا ترجمہ کیا، تو انھوں نے چھوٹے ہوئے حصوں کا ترجمہ بھی کر دیا

یہ مولانا محمد احسن نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا بہت بڑا احسان ہے، کہ انھوں نے اس [illegible] ترجمہ کو مولانا خرم علی رحمہ کے ورثار سے خرید کر مکمل کیا، اور تصحیح کر کے چھپوایا،

پہلی بار یہ کتاب موصوف نے چند احباب کی شرکت میں چھپوائی تھی، لیکن سوء اتفاق سے ان میں سے بعض کا انتقال ہو گیا، اور کتاب کے چھپنے میں کھنڈت پڑ گئی، آخر نواب کلب علی خان کی امداد سے پھر طباعت کا کام شروع ہوا، اور پوری چار جلدیں چھپ کر منظر عام پر آگئیں، اور منشی نولکشور کے مطبع میں بار بار چھپیں، اور اب تک چھپتی رہتی ہیں،

۵۔ **شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل**:- یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی عربی کتاب "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" کا اردو ترجمہ اور مختصر شرح ہے، یہ تصوف کے

---

[1] غایۃ الاوطار ج۔۴۔ص ۱۹۳۔

اشغال و تعلیمات بیعت کے شرائط اور سلاسل صوفیہ پر نہایت مفید کتاب ہے، یہ ترجمہ ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، چنانچہ موصوف نے خاتمۃ الکتاب میں لکھا ہے،

"مترجم کہتا ہے الحمد للہ کہ اس کے حسن توفیق سے ترجمہ قول الجمیل کا چوبیسویں ربیع الآخر بارہ سو ساٹھ (۱۲۶۰ھ) میں پورا ہو گیا"

اس کتاب کا ترجمہ مولانا نے بعض عزیز دوستوں اور مخلص احباب کی فرمائش پر کیا تھا، چنانچہ آغاز کتاب میں لکھتے ہیں :-

"اما بعد عاجز بندہ و گناہوں سے شرمندہ، خرم علی عفی اللہ عنہ، خدمات اہل دین میں عرض کرتا ہے کہ بعض مخلص احباب نے فرمائش کی کہ کتاب مستطاب "قول الجمیل فی بیان سواء السبیل" تصنیف عالم ربانی، مرتاض حقانی، عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ترجمہ اردو میں کرے،"

آگے ترجمہ کی نوعیت اور فوائد کی ضرورت کے متعلق لکھتے ہیں :-

"اب معلوم کرنا چاہئے کہ ترجمہ اس کتاب میں محاورہ مقدم رکھا، گو اصل کے تراجم الفاظ میں تقدیم اور تاخیر واقع ہو، اس واسطے کہ ترجمہ کرنے سے سہولت فہم مقصود ہے، سو ترجمہ تحت اللفظ میں حاصل نہیں، اور حواشی مصنف قدس سرہ اور ان کے خلف الرشید علامۂ عصر، مسند دہر مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے اس کتاب پر صحیح پائے، از مزید توضیح اور تکثیر فوائد کے واسطے ان کا ترجمہ بھی ذیل فوائد میں مندرج کر دیا، جہاں کہیں مولانا کا لفظ آوے تو مولانا شاہ عبدالعزیزؒ مراد ہوں گے، اس کا نام شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل رکھا، حق تعالیٰ اس ترجمہ کو اپنے مزید کرم سے مقبول فرما دے، اور مترجم اور صاحب فرمائش اور سائر اہل دین کو اس کتاب کی برکات سے فائدہ مند کرے آمین"

مترجم کی یہ دعا قبول ہوئی، اور یہ کتاب بھی بارہا چھپی، اور کثرت سے شائع ہوئی، ترجمہ کی زبان اگرچہ قدیم ہے، مگر سہل ہے، ترجمہ کا نمونہ یہ ہے،

متن عربی	ترجمہ اور شرح اردو
ولعلك تقول اخبرنی عن	اور شاید کہ اے مخاطب تو کہے گا کہ مجھکو
البیعة ما ھی واجبة امْ	بیعت کا حکم بتائیے کہ کیا ہے واجب ہے
سنة ثمّ ما الحکمة فی	یا سنت، پھر بیعت کے مشروع ہونے
شرعھا ثم ما شرط من	میں حکمت کیا ہے پھر بیعت لینے والے کی شرط کیا ہے پھر
یاخذ البیعة ثم ما شرط	بیعت کرنے والے کی شرط کیا ہے پھر بیعت [illegible]
المبائع وما نکثه ثم هل	بیعت کس کو کہتے ہیں، اور عہد شکنی کیا ہے
یجوز تکرار البیعة من عالم	پھر جائز کیا ہے مکرر کرنا بیعت کا ایک عالم
واحد او علماء کثیرین ثم	یا علماء کثیر سے یا جائز نہیں پھر کون الفاظ
ما اللفظ الماثور عند البیعة	منقول ہیں سلف سے بیعت کے وقت،
فاقول اما المسئلة الاولی	سو میں کہتا ہوں ساتوں سوالات
فاعلم ان البیعة سنة ولیست	کے جواب مفصلاً پہلے سوال جواب کو تو
بواجبة لان الناس بایعوا	یوں سمجھ لے، کہ بیعت سنت ہے، واجب
النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتقربوا	نہیں، اس واسطے کہ اصحاب نے رسول
بھا الی اللہ تعالی ولم یدل	کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، اور
دلیل علی تاثیم تارکھا ولم	اس کے سبب حق تعالیٰ کی نزدیکی چاہی،
ینکر احد من الائمة علی	اور کسی دلیل شرعی نے تارک بیعت کے گنہگار

تارکھا فکان کالاجماع علی انھا لیست بواجبۃ،

ہونے پر دلالت نہ کی، اور ائمۂ دین نے تارکِ بیعت پر انکار نہ کی، تو یہ عدم انکار گویا اجماع ہوگیا، اس پر کہ وہ واجب نہیں

ف: اور اگر بیعت تقویٰ کی واجب ہوتی تو بالضرور اس کے تارک پر انکار وارد ہوتی، تو معلوم ہوگیا کہ بیعت سنت ہے، کہ حقیقت سنت بھی ہے کہ فعل مسنون بلا دلیل وجوب تقرب الی اللہ کا موجب ہے[1]

یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ پہلی بار یہ کتاب کس مطبع میں چھپی، ایک نہایت قدیم نسخہ جو مطبع درخشانی میں چھوٹے لعل کے زیر اہتمام ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء کا چھپا تھا، میرے والد مرحوم کے پاس تھا، جواب احقر کے پاس ہے، یہ متوسط تقطیع کے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، اور صحت میں اپنی نظیر آپ ہے،

شفاء العلیل ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں مطبع حیدری بمبئی سے چھپی، اور متوسط تقطیع کے ۱۰۶ صفحات پر مشتمل ہے، اس کے خاتمۃ الکتاب پر جو عبارت ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب اس سے پہلے بھی متعدد بار چھپی ہے، عبارت یہ ہے،

"حسن اہتمام سعی بلیغ کے جناب قاضی ابراہیم بن قاضی نور محمد صاحب کے در مطبع حیدری واقع بمبئی میں ۲ رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ کو چھاپی، ہرچند کہ اغلاط اعراب و الفاظ کہ جو نسخہ مطبوع سابق میں بمقتضائے بشریت کے باقی رہتے تھے، کئی نسخے بہم پہنچا کر بمقدور درست ہوئے[2]"

[1] شفاء العلیل ترجمہ قول الجمیل مطبع درخشانی ص ۹ ۔ [2] شفاء العلیل، مطبع حیدری بمبئی ۱۲۸۷ھ ہجری ص ۱۰۶، یہ نسخہ کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گزرا،

(۶) **ترجمہ شہادتین**: یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے عربی رسالہ "سر الشہادتین" کا اردو ترجمہ ہے، یہ ترجمہ مع متن ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں مطبع مصطفائی لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا ہے، لیکن ترجمہ کے متعلق اس رسالہ میں کوئی تفصیل نہیں ملتی، ہم نے اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں دیکھا ہے، جس میں صرف اردو ترجمہ ہے متن نہیں، یہ ترجمہ مولانا نے نواب ذوالفقار علی رئیس باندا کی فرمایش پر ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء میں کیا تھا، جیسا کہ ابتداء میں لکھتے ہیں،

"حمد بےشمار اس حاکم با اقتدار کو کہ جس کے بھید سے کوئی خبر نہیں اور اس کے تیر قضا کے بجز صبر و شکیبائی کے کوئی سپر نہیں، اور ہزاروں درود اس کے نبی کریم پر کہ جس نے اعدائے دین سے کیا کیا صدمے اٹھائے، اور اس کے آل و اصحاب پر جن سے حق بندگی کا کیا خوب ادا ہوا، یہاں تک کہ اس کی راہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہوئے، اور زخم پر زخم کھائے، بعد اس کے سنا چاہیے، کہ رئیس العلماء مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے شہادتِ امام حسن و حسین علیہما السلام میں عجب تقریر دلپذیر فرمائی کہ آج تک کسی عالم دانشمند کے خیال میں نہیں آئی، خلاصہ اس کا یہ ہے،

شہادت حسین درحقیقت شہادت نبی الثقلین ہے، اور اس مدعا کو نہایت خوبی اور لطافت سے ثابت کیا ہے، ازبسکہ رسالۂ نادرۂ روزگار عربی تھا، مقدام[1] والا مقام نامدار سردار بحر و بر جناب نواب ذوالفقار علی بہادر دام اقبالہ نے راقم الحروف عاجز خرم علی سے ارشاد فرمایا کہ اگر اس کا ترجمہ ہندی میں ہو جائے، تو ہر شخص اس کا لطف اٹھائے، چنانچہ بموجب ارشاد کے عمل میں آیا، اور خلاصہ مطلب ترجمہ میں ہندی محاورے کے

[1] افسوس یہ نسخہ نہایت غلط ہے، املا کی غلطیاں کثرت سے موجود ہیں، چنانچہ مقدام والا کو خدام والا مقام لکھا ہے، اسی طرح خط شکست میں "عاجز خرم علی" ہوگا، جس کو مرد ہی "خورم علی" لکھا ہے،

موافق کر کے جہاں مجمل تھا اس کو مفصل کیا تاکہ ہر شخص بے تکلف مطالب کو پوچھے اور کسی کا دل نہ الجھے، بارے الحمد للہ کہ ماہ محرم سنہ ۱۲۲۶ھ[1] میں انجام کو پہنچا، اور ترجمہ شہادتین اس کا نام رکھا۔"

رسالہ سر الشہادتین مطبع مصطفائی سے پہلے کسی مطبع میں چھپا تھا لیکن اس میں متن کے بہت اغلاط تھے، اس لئے محمد مصطفیٰ خان مالک مطبع مصطفائی المتوفی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء نے پھر اس کو اپنے مطبع میں مولانا خرم علی بلہوری کے اردو ترجمہ کے ساتھ چھاپا، لیکن مولانا خرم علیؒ کے نسخہ میں متن کی عبارت کم تھی، اس نسخہ میں بقیہ متن کا اضافہ کر دیا[2]، جیسا کہ محمد مصطفیٰ خاں خاتمۃ الکتاب میں لکھتے ہیں:۔

"ہزاران ہزار شکر پروردگار کہ باہتمام سراپا عصیان محمد مصطفیٰ خان ولد حاجی محمد روشن خاں اور تصحیح کمترین امت خیر البشر سعد الدین حیدر کے مطبع مصطفائی میں کہ بیت السلطنت لکھنؤ کے محلہ محمود نگر میں قریب اکبری دروازے کے واقع ہے، بیچ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۵۷ھ میں اختتام کو پہنچا چھپنا رسالہ شریف سر الشہادتین تصنیف افضل المتکلمین اشرف المتاخرین مولینا شاہ عبد العزیز دہلوی قدس سرہ العزیز کا ساتھ ترجمہ مشمول عنایت ازلی مولوی خرم علی بلہوری کے مگر جہاں ان کے نسخہ میں عبارت متن کی کم تھی وہاں موافق شرح تحریر الشہادتین تالیف عارف باللہ مولانا شاہ سلامت اللہ کے ترجمہ کر دیا، اور واسطے توضیح مطالب رسالہ کے عوام کی سمجھ کے موافق عبارت شرح اور صواعق محرقہ کے زبان اردو میں ترجمہ کر کے بطریق فائدوں کے حاشیہ پر لکھ دی، اور اس رسالہ کو بعد اس کے کہ مسخ ہوگیا تھا کہ کسی با بھکر

[1] یہ غالباً اصل میں سنہ ۱۲۴۶ھ ہوگا جس کو ناقل نے سنہ ۱۲۲۶ھ کر دیا، ورنہ پھر شاہ عبد العزیز لکھنا کیونکر صحیح ہوگا، اس لئے کہ شاہ عبد العزیزؒ کا انتقال سنہ ۱۲۳۹ھ میں ہوا ہے، اسی لئے ہم نے ابتدا میں ۱۲۴۶ لکھا ہے۔

[2] ہمارا خیال ہے کہ جو نسخہ مولانا خرم علیؒ کے پاس تھا، غالباً شاہ صاحبؒ کا اصل متن بھی اتنا ہی ہوگا، اور یہ

پھر درجہ صحت کو پہنچایا، ورحم اللہ امرأ انصف ولم یتعسف"[1]

مولانا خرم علیؒ نے نثر کا ترجمہ نثر میں کیا ہے، اور شعروں کا شعروں میں، ترجمہ کا نمونہ یہ ہے:

متن	ترجمہ
اعلم رحمک اللہ تعالیٰ ان	اس کو جانئے کہ جو کمالات، اور
الکمالات التی تفرقت فی	خوبیاں جدا جدا اور پیغمبروں علیہم
الانبیاء علیہم السلام قد	السلام میں ہیں سو ہمارے پیغمبر
اجتمعت فی نبینا محمد صلی اللہ	علیہ الصلوٰۃ والسلام
عَلَیْہِ وَسَلَّم،	میں بالکل یکجا جمع ہوگئیں،
فقد اُعطِیَ الخلافۃ کما	چنانچہ حضرتؐ کو خلافت ملی جیسے آدم
اعطی آدم وداؤد علیہما	اور داؤد علیہما السلام کو اور حضرتؐ کو سلطنت
السلام واعطی الملک کما	ملی جیسے سلیمان علیہ السلام کو اور حضرت
اعطیٰ سُلیمان علیہ السلام	میں حسن تھا جیسا یوسف علیہ السلام
واعطی الحسن کما اعطی یوسف	میں اور حضرت میں خلت تھی جیسے حضرت
علیہ السلام واعطی الخلۃ	ابراہیم علیہ السلام میں، اور حضرت سے
کما اعطی ابراھیم علیہ السلام	خدا ہم کلام ہوا، جیسے موسیٰ علیہ السلام
واعطیَ الکلام کما اعطی موسیٰ	سے اور حضرت عابد تھے جیسے یونس علیہ
علیہ السلام واعطی العبادۃ	السلام، اور حضرت بڑے شکر گذار تھے،

(بقیہ حاشیہ ص ۶۴) اضافہ الحاقی ہوگا، اس لئے کہ اس میں بعض باتیں ایسی ہیں، جو شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے قلم کی نہیں معلوم ہوتیں، ظاہر ہے جو شخص "تحفہ اثنا عشریہ" جیسی بلند پایہ کتاب لکھ سکتا ہے، اس کے قلم سے ایسی باتیں کیونکر نکل سکتی ہیں۔

[1] سر الشہادتین مطبع مصطفائی لکھنؤ سنہ ۱۲۵۷ھ ص ۳۲۔

کما اعطی یونس علیہ السلام	جیسے نوح علیہ السلام، اکو ان سے زیادہ
واعطی الشکر کما اعطی نوح	حضرت میں اور کمالات تھے، چنانچہ
علیہ السلام وقد زید لہ	ولایت، اور تصرفات ہر قسم کی اور
کمالات اُخر من انواع	سب طرح کی محبوبی، اور سب کاموں
الولایات والمحبوبیۃ	کی مقبولی، اور دیدار الٰہی، اور نہایت
المطلقہ والاصطفاء	خدا کی نزدیکی، اور شفاعت کبریٰ، اور
المطلق والرویۃ والقرب	کافروں سے جہاد، سوائے اس کے اور
الاتم والشفاعۃ العظمیٰ	کمالات جیسے علم بیشمار اور چھپے بھیدوں کا
والجہاد مع اعداء اللہ	کا عرفان، اور قضیے فیصل کرنا، اور
تعالیٰ الی غیر ذلک من الکمالات	فتوی دینا، اور اجتہاد اور محتسبی، اور
کالعلم الوسیع والعرفان التام	قرأت وغیرہ لیکن آپ میں ایک کمال
والقضاء والافتاء والاجتہاد	باقی رہ گیا تھا کہ حضرت کی ذات میں
والاحتساب والقرأۃ و	حاصل نہ تھا، یعنی شہادت،
غیرھا لکن بقی لہ کمال	

لم یحصل لہ بنفسہ أعنی الشہادۃ۔

مسح النبی جبینہ	فلہ بریق فی الخدود
اس جبیں کو نبی نے چوما تھا	تھی چمک کیا ہی اس کے چہرے پر
ابواہ فی علیا قریش	وجدہ خیر الجدود[1]
اُس کے ماں باپ تھے قریش کی جان	اُس کا نانا جہان سے بہتر تھا،

[1] سر الشہادتین ص ۵۰۔

(۷) **آداب الحرمین**: یہ رسالہ ۱۳۱۹ھ/۱۸۲۳ء کی تالیف ہے، تقطیع متوسط اور صفحات ۲۰ ہیں، مطبع محمدی لکھنؤ سے محمد حسین نے ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء میں شائع کیا تھا[1]، یہ رسالہ مولانا نے سید میرک جان تشنا ورلکھنوی کی فرمائش پر لکھا تھا، اس میں حج اور زیارت مدینہ منورہ کے متعلق ضروری مسائل درالمختار اور شرح الوقایہ سے مرتب کئے گئے ہیں، رسالہ کی ابتدا میں ہے،

"اما بعد یہ رسالہ ہے آداب الحرمین اس میں ضروری مسائل حج کے اور زیارت مدینہ کے اردو میں صاف صاف بیان ہیں، شرح وقایہ اور دُرالمختار وغیرہ سے بندہ عاجز خرم علی نے بموجب فرمائش سید میرک جان تشنا ورلکھنوی کے ۱۲۴۹ھ میں مرتب کیا، حق تعالیٰ مسلمین کو اس سے فائدہ بخشے، آمین"

عبارت کا نمونہ یہ ہے،

"حج فرض ہے جو اس کو نہ مانے وہ کافر ہے، حج اس مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہے جو آزاد اور تندرست اور مقدور والا ہو، یعنی آتے جاتے اہل و عیال کے خرچ کے سوائے اس کے پاس خرچ اور سواری کا میسر ہو، اور راہ میں امن ہو، اور عورت پر اس وقت فرض ہے کہ اس کے ساتھ خاوند یا محرم ہو، تمام عمر میں ایک بار حج فوراً فرض ہے یعنی مقدور ہو کر سُستی کرنا سخت گناہ ہے، "فرائض حج" حج میں تین فرض ہیں، ایک احرام، دوسرے وقوف عرفہ یعنی عرفے کے دن عرفات میں ٹھہرنا، اگرچہ ایک ساعت ہی ہو، تیسرے طواف الزیارۃ، ان تین میں سے اگر کوئی ترک ہو تو حج نہ ہو"[2]

[1] یہ رسالہ آداب الحرمین کتب خانہ خاص انجمن ترقی اردو (پاکستان) کراچی میں ہماری نظر سے گذرا ہے، اس پر سنہ طباعت درج نہیں لیکن اسی مطبع کا چھپا ہوا جو نسخہ کتب خانہ سعیدیہ ٹونک میں محفوظ ہے، اس پر یہی سنہ طباعت درج ہے [2] آداب الحرمین ص ۲

یہ رسالہ اگرچہ ۳۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن آداب تحریر ۱۳ صفحات پر ختم ہو جاتا ہے، چودھویں صفحہ سے پھر ادعیہ ماثورہ شروع ہوتی ہیں، جو محمد حسین خان نے حجاج کی سہولت کے لئے نقل کی ہیں۔

(۸) **رسالہ منع قرأت فاتحہ خلف الامام** : یہ رسالہ موصوف نے احناف کے معرکۃ الآراء مسئلہ مقتدی کے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کی تائید میں لکھا ہے، اگر یہ نسخہ ناپید ہے،

مولوی رحمان علی تذکرہ علمائے ہند[۵۱] میں لکھتے ہیں،

"رسالہ منع قرأت فاتحہ خلف الامام و ترجمہ مشارق الانوار...... از و یادگار اند"

وفات[۵۲] مولانا خرم علی بلہوری نے کم و بیش چالیس پینتالیس سال تک مسلسل مسلمانوں کی اصلاح،

۵۱ تذکرہ علمائے ہند طبع دوم نولکشور ۱۹۱۴ء ص ۵۰ ۵۲ مولانا کے سال وفات میں اختلاف ہے،

امام خان نوشہروی نے (تراجم علمائے حدیث ہند مطبوعہ دہلی ۱۳۵۶ھ جلد ۱ ص ۱۰۹) اور مولانا مسعود عالم ندوی نے ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک طبع راولپنڈی ص ۱۷ میں آپ کا سال وفات ۱۲۶۰ھ نقل کیا ہے، جو بداہتہً غلط ہے، کیونکہ یہ زمانہ آپکے درالمختار کے ترجمہ کا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا،

مولانا محمد احسن نانوتوی کا بیان ہے کہ آپنے ۱۲۶۱ھ میں انتقال کیا، چنانچہ غایۃ الاوطار (طبع نولکشور ۱۳۱۰ھ ج ۱ ص ۳) کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

"پھر محرم ۱۲۶۱ھ تک کتاب الحج کا ترجمہ پورا کرکے شروع کتاب سے باب الاذان تک لکھنے پائے تھے کہ یکایک رہگرائے عالم بقا ہوئے،

اسی عبارت کا ترجمہ فارسی میں مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں کر دیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں،

"پس از آن بماہ محرم بسال دوازدہ صد و شصت و یک ہجری ترجمہ کتاب الحج مکمل نمودہ از شروع کتاب تا باب الاذان ترجمہ نوشتہ بودند کہ ہمدریں سال داعی اجل را

ترویج سنت اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہ کر ۱۲۷۳ھ میں اپنے ننہیالی قصبہ آسیون میں انتقال فرمایا، اور وہیں آبادی کے شمال مغربی گوشہ میں عیدگاہ کے پاس دفن ہوئے، سقی اللہ ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ، آمین،

(بقیہ حاشیہ ص ۶۸) لبیک گفتہ رہگرائے عالم بقا شدند"

یہی سال وفات مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تازہ تالیف "جماعت مجاہدین" (طبع لاہور ص ۲۹۴) میں نقل کیا ہے، نواب صدیق حسن خان نے آپ کا سال وفات ۱۲۸۰ھ لکھا ہے، چنانچہ اتحاف النبلاء (طبع کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۱۴۹) میں لکھتے ہیں،

"شرح اردوئے مشارق مسمی تحفۃ الاخیار از مولوی خرم علی بلہوری المتوفی ۱۲۸۰ھ ثمانین و مائتین والف است و این شرح دو بار در ہند علیہ طبع پوشیدہ و عوام مسلمین بلکہ خواص مومنین را نفع خاص و عام بخشید"

مولانا محمد احسن نانوتوی اور نواب صدیق حسن خان کے بیان میں اتنا تفاوت ہرگز نہیں ہو سکتا، مولانا محمد احسن نانوتوی کے بیان سے زیادہ سے زیادہ دو تین سال کا فرق تو نکل سکتا ہے، لیکن سات آٹھ سال کا فرق ممکن نہیں، کیونکہ یہ زمانہ موصوف کی درالمختار کے ترجمہ پر نظر ثانی کا ہے، اس لئے نواب صدیق حسن خان کا بیان زیادہ قوی نہیں،

صحیح روایت یہی ہے کہ موصوف نے ۱۲۷۳ھ کے اختتام میں وفات پائی، مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں،

"۱۲۷۳ھ میں قاضی حسین الدین صاحب کے قاضی پرگنہ اسیون مقرر کئے جانے کے متعلق جو صورت حال یا محضر لکھا گیا تھا، اس پر شرفائے قصبہ اسیون کے دستخط ہیں، ان میں مولانا خرم علیؒ کے بھی دستخط ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ رجب ۱۲۷۳ھ تک بقید حیات تھے،"

مولانا سید ابو الحسن صاحب کی یہ تحقیق بھی دراصل حکیم عبد العلی آسیونی کے افادات میں سے ہے، جنھوں نے آسیون کی تاریخ لکھی تھی، مگر چھپی نہیں، افسوس! تین ماہ ہوئے کہ موصوف کا راولپنڈی میں انتقال ہو گیا رحمہ اللہ،

تذکرہ

حجۃ الاسلام مولانا قاسم نانوتویؒ

(ماہنامہ الرحیم، نومبر 1966ء)

تذکرہ حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ

مولانا محمد عبد الحلیم چشتی

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات میں فطرت کی طرف سے جو اوصاف وکمالات ودیعت کئے گئے تھے انہوں نے خلق خدا کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا، جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اپنے مذاق کے مطابق اپنے حوصلہ اور ظرف کے بقدر فائدہ اٹھاتا تھا اور ان کی ذات قدسی صفات کا والہ وشیدا ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی مستفیدین میں ایک بزرگ محمد حسین بن محمد مسعود مرادآبادی تھے۔ یہ سید امانت علی حسینی چشتی المتوفی سنہ ۱۲۸۰ھ کے مخلص مرید تھے۔

انہیں بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی اور ان کے حالات کی بڑی جستجو تھی جب کبھی حضرت نانوتویؒ کا مرادآباد یا بریلی میں ورود مسعود ہوتا یہ خدمت میں برابر حاضر ہوتے اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

انہوں نے سنہ ۱۲۸۲ھ میں بزرگان دین کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا تھا جو کم وبیش چار سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا، اس کا نام انوار العارفین ہے یہ سنہ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اب نہیں ملتا ہے ۔۔۔۔ یہ تذکرہ مختصر جامع اور مفید ہے۔ اس میں موصوف نے چار مشہور خانوادوں کے بزرگوں کا حال قلم بند کیا ہے اور ان بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے جن کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کتاب میں چشتیہ صابریہ سلسلہ کے بزرگوں کے تذکرے میں حضرت نانوتویؒ سے بعض بڑی اہم اور نہایت مفید معلومات

نقل کی ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالرحیم چشتی افغانی سہارنپوری شہید ۱۲۴۶ھ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں۔

بیعت جہاد با جناب سید احمد صاحب کردند حضرت حاجی مولوی محمد قاسم صاحب در مجلسے با راقم نقل می فرمودند کہ چوں ہر دو ذات بابرکات بعد فراغ مراقبہ باہم می نشستند اثر ہمت قویہ ایشاں بر جناب سید احمد صاحب خندہ ہائے قہقہہ کہ خاص اثر نسبت چشتیہ است ظاہر می شد واثر توجہ جناب سید بر ایشاں غلبۂ سکر می دارد رحمۃ اللہ علیہم وہم مولوی صاحب موصوف با راقم و با دو سہ از اہل علم نقل می فرمودند کہ عبداللہ خاں رئیس پنجلاسا مرید عقیدت کیش شاہ رحم علی قدس سرہ برائے دردزہ قند سیاہ دم می کرد و قبل از تولد مولود کہ پسر خواہد آمد یا دختر خبر می دادند چوں کیفیت آں

شاہ عبدالرحیمؒ نے حضرت سید صاحبؒ کے دست حق پرست پر بیعت جہاد کی حضرت حاجی مولوی محمد قاسم صاحب نے راقم سے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ مراقبہ سے فارغ ہونے کے بعد جب دونوں حضرات بیٹھے تو ان کی نسبت قویہ کے اثر سے حضرت سید احمد صاحبؒ پر قہقہہ کی صورت میں نسبت چشتیہ ظاہر ہوئی اور حضرت سید صاحب کی توجہ کے اثر سے ان پر غلبۂ سکر نمایاں ہوا تھا رحمۃ اللہ علیہم نیز مولوی صاحب موصوف نے راقم اور دو تین اہل علم سے بیان فرمایا تھا کہ عبداللہ خاں رئیس پنجلاسہ جو شاہ رحم علی قدس سرہ کے عقیدت کیش مرید تھے دردزہ کے سلسلہ میں گڑ دم کر کے دیا کرتے

۱؎ مولانا سید عبدالحی حسنی لکھنویؒ نے شاہ عبدالرحیم ولایتی کا تذکرہ نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۲۶۶ میں انوار العارفین کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

خبر از وے می پرسیدند می گفتند کہ
کہ مرشد من مرا صورت دختر و پسر معائنہ
می کنانند راقم وے را دیدہ بود مرد
بزرگ و خوش اوقات بودند از ینجا تصرف
ارواح بزرگان در عالم مثال ثابت
می شد کہ صورت مثالیہ را معائنہ می
کنانند[1]

تھے اور ولادت سے پہلے ہی بتلا
دیا کرتے تھے کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی؟
ان سے جب اس پیشگی اطلاع دینے
کی کیفیت دریافت کی جاتی تو فرماتے
کہ میرے مرشد لڑکے یا لڑکی کی صورت
میرے سامنے کر دیتے ہیں راقم نے
بھی موصوف کی زیارت کی ہے وہ ایک
خوش اوقات مرد بزرگ تھے اس سے
ارواح بزرگاں کا تصرف بھی ثابت
ہوتا ہے کہ یہ حضرات عالم مثال میں
مثالی صورتیں دکھا سکتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں حضرت نانوتویؒ سے ناقل ہیں۔

حاجی مولوی محمد قاسم صاحب با راقم
نقل فرمودند کہ شخصے گفت کہ جبہ آں
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ در لہاری
و جلال آباد است حاجی امداد اللہ صاحب
را پوشیدہ بخواب دیدم تعبیر آں
پر ظاہر است کہ ایشاں بلباس شریعت
و آداب طریقت آراستہ و پیراستہ

حاجی مولوی محمد قاسم صاحب ایک شخص
کا بیان راقم سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں
نے حاجی امداد اللہ صاحب کو خواب
میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ
جبہ پہنے ہوئے دیکھا جو لہاری اور
جلال آباد میں موجود ہے جس کی تعبیر
ظاہر ہے کہ موصوف لباس شریعت

۱؎ ملاحظہ ہو انوار العارفین ص۵۲

اندو طالبان را باتباع سنت و علوم شریعت و آداب طریقت تعلیم و تلقین می فرمایند و خدمت خود از عالم سید روا ندارند و از کسر نفسی خود تعلیم ظاهری از مریداں نہ پسندند و تعظیم باطن امر فرمایند۔

اور آداب طریقت سے آراستہ پیراستہ ہیں اور سالکین کو سنت اور علوم شریعت اور آداب طریقت کے اتباع کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں اور کسی عالم یا سید سے اپنی خدمت لینا پسند نہیں فرماتے اور اپنی کسر نفسی کی وجہ سے مریدوں کو باقاعدہ ظاہری تعلیم دینا بھی پسند نہیں فرماتے بلکہ انہیں باطنی تنظیم کا حکم فرماتے ہیں

محمد حسین مرادآبادیؒ نے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے بزرگوں[1] میں حضرت نانوتوی کا بھی تذکرہ کیا ہے یہ تذکرہ اگرچہ نہایت مختصر ہے لیکن اس میں تذکرہ نگار نے حجۃ الاسلام کی سیرت کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور موصوف کے عادات و اطوار گفتار و کردار، علم و فضل کمالات ظاہری و باطنی سب ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مختصر تذکرہ سے حضرت ممدوح کی زندگی کے بعض ایسے مخفی گوشے بھی سامنے آتے ہیں جن کے ذکر سے حضرت نانوتویؒ کی ضخیم سوانح عمریاں بھی یکسر خالی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی سیرت پر یہ ایک نہایت جامع بڑا بصیرت افروز اور بہت ہی حقیقت پسندانہ تبصرہ ہے اور یہ اس امر کا شاہد عدل ہے کہ جب حضرت نانوتویؒ کا کاروان عمر چونتیسویں منزل طے کر رہا تھا حضرت موصوف کا شمار کبار علماء ہی میں نہیں بلکہ اس دور کے کبار اولیاء اللہ کے زمرہ میں بھی ہونے لگا تھا۔ اس تذکرہ میں حضرت نانوتویؒ کی سیرت کے جن پہلوؤں پر

---

[1] محمد حسین مرحوم نے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے سب ہی بزرگوں کا انوار العارفین میں تذکرہ کیا ہے لیکن تعجب ہے کہ حضرت گنگوہی کا تذکرہ ان سے رہ گیا۔

محمد حسین مراد آبادی نے روشنی ڈالی ہے وہ ایک غیر جانبدارانہ بیان ہونے کی وجہ سے خصوصی توجہ کا مستحق ہے اس سے تذکرہ نگار کی فراست و بصیرت اور حق پسندی اور راست گفتاری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

یہ تذکرہ اس لحاظ سے کہ حضرت نانوتوی کی حیات ہی میں چھپا تھا، خصوصی اہمیت کا حامل ہے حضرت نانوتوی پر کام کا سلسلہ جاری ہے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

ہمارے اس مضمون سے اب حضرت نانوتوی کی سوانح و سیرت کے ماخذوں میں دو اور قدیم تر ماخذوں کا اضافہ ہو جاتا ہے اور یوں بنیادی ماخذوں کی تعداد دس جب کہ سوانح قاسمی کے مقدمہ میں حضرت قاری طیب صاحب زید مجدہم نے بیان کیا ہے) کے بجائے بارہ تک پہنچ جاتی ہے جن میں اولیت کا شرف اسی مختصر سے تذکرہ کو حاصل ہے۔

افسوس ہے کہ آجتک تذکرہ نگاروں کی نگاہ اس نادر تذکرہ کی طرف نہیں گئی۔ اب پہلی مرتبہ اس تذکرہ سے حضرت نانوتوی کے حالات نقل کر کے پیش کئے جا رہے ہیں، امید ہے کہ محمد حسین مراد آبادی نے حضرت نانوتوی پر جو کچھ لکھا ہے اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ موصوف لکھتے ہیں

ذکر حضرت مولوی محمد قاسم صاحب

وے حضرت حاجی خانہ خدا و زائر روضۂ	حضرت موصوف مہاجر بیت اللہ
رسول اللہ اند و از شاگردانے شیوخ صدیقی	اور زائر روضۂ رسول اللہ ہیں اور
قصبۂ نانوتہ ہستند عالم اند متقی و ربانی و	قصبۂ نانوتہ کے صدیقی روسائے
حقانی و واقف اسرار شریعت و طریقت	شیوخ میں سے ہیں عالم متقی ربانی
اند و قول و فعل وے بے ریا و بے	و حقانی ہیں اور واقف اسرار
تصنع است و معرض اند دنیا و ارباب	شریعت و طریقت ہیں ان کا
آں با وجود اہل و عیال آزادانہ و مجردانہ	قول و عمل نمائش و تصنع سے پاک
گزران می کنند و بقدر حاجت ضروری	ہوتا ہے وہ دنیا اور اہل دنیا

دنیوی کار برخود منقسر می نمایند
ولباس مولویانہ ومشائخانہ نمی
دارند وبا تکلف آشنا نہ مقلد
مذہب حنفیہ اند ونیز مشرب
چشتیہ بہشتیہ واجازت تعلیم علم
باطن بر چہار طرق از حضرت
حاجی امداداللہ سلمہ اللہ وسند
حدیث از شاہ عبدالغنی مجددی
می دارند ومانند محققاں وعارفاں
درمیان سخن حقائق ومعارف
ودر اثبات وجودی کلام می گویند
وبر شہود توحید شہودی انکار
ندارند ودر اکثر اوقات در
شغل تنزیہ وتشبیہ خود را
مشغول می دارند وسماع غنابے
مزامیر اگر بطریق امور اتفاقیہ
پیش می آید انکار ندارند واز ایشاں
پرسیدم کہ در طریقہ حضرات جناب
غلبہ چشتیت است فرمودند بلے
کہ آں از حضرت شاہ عبدالباری
رسیدہ است وقتے مرادآباد
بتکلیف خاں صاحب شیر علی

سے کنارہ کش رہتے ہیں عیالدار
ہونے کے باوجود آزادانہ اور مجردانہ
زندگی گزارتے ہیں اور ضرورت کے
مطابق ہی دنیا کے کام کرتے ہیں۔
اور مولویانہ اور مشائخانہ لباس استعمال
نہیں کرتے بلکہ سادہ اور بے تکلف
رہتے ہیں حنفی مذہب کی تقلید
کرتے ہیں اور چشتیہ بہشتیہ
مشرب رکھتے ہیں اور چاروں سلسلوں
کی اجازت حاجی امداداللہ سلمہ اللہ سے
اور سند حدیث حضرت شاہ
عبدالغنی مجددی سے رکھتے ہیں اور
محقق عارفین کی طرح حقائق ومعارف
بیان کرتے ہیں اور توحید وجودی کے
اثبات میں کلام کرتے ہیں اور توحید
شہودی کے مشاہدے سے بھی منکر نہیں
ہیں اور اکثر تنزیہ وتشبیہ کے
شغل میں خود کو مشغول رکھتے ہیں
اور کہیں بلا مزامیر سماع کی اتفاقیہ
نوبت پیش آجائے تو انکار نہیں
فرماتے میں نے موصوف سے ایک
مرتبہ دریافت کیا کہ آپ حضرات

تشریف آوردند و نیز بر مکان
خانصاحب موصوف فروکش شدند
روزے خانصاحب با راقم نقل
کردند کہ قوال بے مزامیر غزلے
گفت شنیدند و گرم شدند چوں نظر
ایشان بر بعضے ناواقفاں از حال
و اسرار عارفاں و بے خبر از
درد عاشقاں کہ در اینجا حاضر بودا فتاد
فرمودند کہ تاثیر ہر کس اثرے وارد
و من اہل آں نیستم، انتہی آرے
اخوان زمان و مکان دراں شرط
است و باقی شروط آں در کتب
قوم مرقوم است۔

سلمہ اللہ تعالیٰ

(صفحہ ۵۲۴)

ہیں چشتیت کا غلبہ رہتا ہے؟
فرمایا ہاں یہ حضرت شاہ
عبدالباری کا اثر ہے۔

ایک دفعہ شیر علی خانصاحب کی
عیادت کے سلسلہ میں مرادآباد
تشریف لے جانا ہوا۔ ایک روز
کا واقعہ خانصاحب راقم سے
نقل فرماتے تھے کہ ایک قوال نے
بغیر مزامیر کے غزل چھیڑ دی شکر
جوش میں آئے لیکن جب بعض
ایسے لوگوں پر نظر پڑی جو اہل
معرفت کے حال سے ناواقف
اور عشاق کے درد سے بے خبر
وہاں موجود تھے تو فرمانے لگے ہر
شخص کی تاثیر میں ایک اثر ہوتا
ہے لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں
اخوان زمان و مکان کا ہونا سماع
میں شرط ہے اور باقی شروط
سماع صوفیاء کی کتابوں میں
لکھی ہوئی ہیں۔

سلمہ اللہ تعالیٰ

(صفحہ ۵۲۴)

اسی طرح حضرت نانوتوی کے نیاز مندوں میں سے ایک بزرگ حافظ عبدالرحمن حسرت جھنجھانوی بھی تھے انہوں نے ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء میں جو حضرت نانوتوی کا سال وفات ہے ایک کتاب فارسی میں سفینۂ رحمانی لکھی تھی جو سنہ ۱۸۸۲ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی ہے اس کے سفینۂ دومی میں "درویشان سعادت پژوہ" کا تذکرہ ہے اس باب میں "مرگ یاراں" کے زیر عنوان سب سے پہلے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کا تذکرہ کیا ہے جس میں ان کا اشہب قلم رکنے ہی کو نہیں کہتا، تذکرہ کیا ہے۔ رنگین نثر میں مرثیہ لکھا ہے۔ اور خوب لکھا ہے پڑھیئے اور لطف لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

پانزدہم اپریل سنہ ۱۸۸۰ء چہ روز	۱۵ اپریل سنہ ۱۸۸۰ء کا دن بھی کس
قیامت وحشت بار است کہ	قدر وحشت بار قیامت کا دن نکلا اور
رو نمود چہ ہنگامہ محشر سینہ فگار	کیا سینہ فگار ہنگامہ محشر بپا ہوا یعنی
است کہ پیش آمد اعنی محب	دلنواز دوست اور سرمایۂ اعزاز
دلنواز سرمایہ اعزاز و امتیاز	افتخار امام الاتقیار سرتاج فضلائے
امام الاتقیار سراج العلما	زمانہ تاج دین و ایمان کا گوہر درخشاں
سرتاج فضلائے زمان درخشاں	مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور
گوہر اکلیل دین و ایمان مولوی	اس سرائیگاہ دنیا سے جنت الماویٰ
محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور	کی طرف روانہ ہو گئے اور ہمارے
ازیں سرائگاہ بجنت الماویٰ	دلوں کو نشتر غم سے زخمی کر گئے آپ
شتافتند و دل ما را از نشتر اندوہ	کی زندگی کے نورانی چہرہ کا نقاب
بنگافتند در نقاب خفا آمدن	میں چھپ جانا حقیقت یہ ہے کہ
دیدن چہرۂ نورانی حیات	زاہدوں عابدوں عالموں اور حکیموں
شان در حقیقت نور دیدن صف	کی صفوں کا پلٹ جانا ہے آپ کا
زاہدان و عابدان و علماء	اس غم آگیں وسوسہ گاہ سے گزر جانا

دعکمار است وگذشتن از شان
انبوہ وسواس گاہ حزن آگیں رفتن
قافلۂ سعادت منداں و ریاضت

گرایان تابان دل خورشید سیما است
سبحان اللہ چہ عالم باعمل ستودہ منش
گزیدہ طبع عظیم الشان ممدوح عالم
و عالمیان بود کہ در علوم ظاہریہ رشک
قدماء سلف و تازہ بہار گلستان
تقدس و ہر گونہ معلومات خلف بود
دل در پہلو ہمچو آفتاب روشن و
درخشاں داشتند کہ انوار اسرار
الہیہ و راز مخفیہ برآں تابان بود۔
و رموز نہانی را بہ بلاغتے و فصاحتے
بیان می فرمودند کہ عوام ہم بہ اندک
تقریر چاشنی از فہمیدگی می چشیدند
و بہرہ یاب از غوامض کہنہ و راز
دقیقہ می شدند، آئینۂ دلش نمونۂ
قدرت و توانائی کبریائے بود کہ
شور ہمہ اسرار باطنی و راز علوی
دراں جلوہ افزائے شہود بود۔ و
گنجینۂ سینہ پاکش خزینۂ جواہر
زواہر نعمائے ایزدی و دفینۂ لاہوتی

دراصل سعادتمند مرتاض روشن
ضمیر، اور آفتاب سیما بزرگوں
کے قافلہ کا گذر جانا ہے۔

سبحان اللہ کیسے عالم باعمل پاکیزہ
طینت، برگزیدہ طبیعت بلند
رتبہ سارے جہان کا ممدوح
علوم ظاہریہ میں متقدمین سلف
کے لئے باعث رشک اور گلستان
تقدس کی تازہ بہار اور خلف
کی ہر طرح کی معلومات کا حامل
تھے پہلو میں دل آفتاب کی طرح
روشن اور درخشاں رکھتے تھے
کہ اسرار الہیہ کے انوار اور مخفی
راز آپ پر ہویدا تھے۔ اور
رازہائے نہانی فصاحت و بلاغت
کے ساتھ اس طرح بیان
فرماتے تھے کہ عوام بھی تھوڑی
سی تقریر کی روشنی سے سمجھ
کی روشنی کا مزہ پالیتے تھے۔
اور پرانی گہری باتوں اور دقیق
رازوں سے بہرہ یاب ہو جاتے
تھے آپ کا آئینہ دل اللہ کی قدرت

بے بہا مبتلائے عطیۂ آسمانی
بود۔ ذات ملکی صفاتش
سراپا نور اسلام کہ در پردہ
صورت انسانی روشنی
یافتہ، حیات تقدس سماتش
شعشۂ دین و ایمان بود کہ خورشید
آسا بر سر جہاں و جہانیاں
تافتہ تابش فیض از زمین
تا فلک الافلاک درخشیدہ
بارش مکرمتش گلزار ورع
و اتقا را مطروریان گرداند
از جوش دریائے علوم گونا
گونش، دشت پرخار جہل و
نادانی مبدل بہ چمنستان
سعادت و تقوی گردید و از
خروش عمان حلم بوقلمونش
وادی پا فگار سور خلقی و خبث
باطنی از صفحۂ ہستی ناپدید گشتہ
گلستان شاداب ہمیشہ بہار
تہذیب و شائستگی و زندہ و
روانی شدہ۔
ازوالیسین یوم آنہا حال دل

و توانائی کا ایک نمونہ تھا کہ سارے
اسرار باطنی اور راز علوی جس میں
جلوہ گر رہتے ہیں۔

اور آپ کا سینۂ پاک کا گنجینہ
اللہ کی نعمتوں کے قیمتی جواہر کا خزانہ
اور بیش قیمت موتیوں اور آسمانی
روشن عطیہ کا دفینہ تھا فی الحقیقت
آپ کی فرشتہ خصلت اور سراپا
نور اسلام ذات انسانی صورت
میں جلوہ گر ہوئی تھی ان کی تقدس
مآب زندگی دین و ایمان کے لئے
ایک شعاع تھی، جو سورج کی طرح
دنیا اور اہل دنیا پر روشن ہوئی تھی
اور ان کے فیض کی تابانی سے زمین
سے لیکر فلک الافلاک چمک اٹھے
اور ان کی بزرگی کی بارش نے زہد
تقویٰ کے باغ کو سیراب کر دیا ہے
آپ کے گوناگوں علوم کے دریاؤں
روانی سے جہالت و نادانی کا دشت
پرخار، سعادت و تقوی کے چمنستان
میں تبدیل ہو گیا ہے اور ان کے
بوقلموں دریائے حلم کے جوش سے

تا چہ گویم کہ نتوانم گفت ودانہ ہائے
الم سینہ خراش را در سلک گفت
کسے، بہیچ نتوانم سفت، گروہ زہد و
تقوی وورع وریاضت مانند ارادت
کیشان راسخ الاعتقاد، حاشیہ نشینان
حلقہ طاعت او بود و گروہ سعادات
کونی والہی وطہارات دینی و دنیوی
وتزکیہ وتنزیہ خفی وجلی مانند خادمان
جان نثار ومریدان خوش انقیاد بساط
بوس بزم عقیدت او بود، از دیدن روئے
پاکش گلشن ایمان نضارت وسیرابی
می یافت واز نور جبین مبینش ضیائے
آفتاب اسلامی تافت ہر کہ او را دید
بدل وجان احکام اسلام ورزید وکسوت
تقوی وطیلسان صداقت پوشید
یکے از مریدان ارادت پناہ وعقیدت
مندان صداقت دستگاہ اعمال
صالحہ وکردار پسندیدہ است کہ برائے
حصول شرف دارین واقتباس انوار
طیبات کو بہ بیعت صادقہ بر دست
پاکش کردہ پیوستہ پا بوس
ملازمت می ماند وحضوری دائمی را

بد خلقی اور خبث باطنی کی پرخار
وادی صفحۂ ہستی سے نیست و
نابود ہو کر تہذیب وشائستگی کا
سدا بہار شاداب بہار بن گئی ہے۔
ان کی وفات کے وقت سے حال
دل کیا کہوں کیا ہے؟ کچھ کہا نہیں
جاتا اور سینہ خراش غم کے دانوں
کو کسی نہج سے بھی گفتگو کی کڑی
میں پرویا نہیں جا سکتا زہد وتقی
پرہیزگار اور مرتاض بزرگ نے
بھی ارادتمندوں اور پختہ اعتقاد
والوں کی طرح ان کے حلقۂ اطاعت
میں کنارہ نشین رہتے تھے دین و
دنیا کی سعادت سے بہرہ
مند ظاہری وباطنی طہارت سے
آراستہ تزکیہ وتنزیہ سے
بہرہ مند جماعت جاں نثار خادم
اور طاعت شعار مریدوں کی
طرح ان کی بزم عقیدت کے
زمیں بوس رہتی تھی ان کے روئے
پاک کے دیدار سے گلشن ایمان
تروتازہ ہوتا اور سیرابی حاصل کرتا

اعزاز و مباہات خود می پنداشت
پیدا است کہ از پدرود کردن صف
ہستی مولوی اقلیم علم و عمل و کشور
زہد و تقوی بے فرمان فرما ویران
شد و ہریک از آنہا فاتحہ رخصت
خواندہ راہی لامکاں شد
یارب چہ ملائکاں و ساکنان
ملاء اعلیٰ را ضرورت تعلیم ایمان
و اسلام بود کہ برائے رہنمائی و ہدایت
ایشاں این بحر معرفت را خواندند
یارب چہ منبر وعظ فردوسیاں
از ناصح برہنہ گو فراز بیان شیریں
زبان خالی بود کہ این کان علم و ہنر
را برآں نشاندند یارب چہ بالا
نشیناں و فرشتگاں چرخ را آرزوئے
شنیدن تقریر دلپذیر بود کہ ایں
عالم پاک گوہر را از فرشیان
جدا کردہ با عرشیاں انباز جاوید
بخشیدند۔ یارب چہ ملائکہ را دریائے
عشق تحقیق غواص عرفان بجوش
آمدہ بود کہ بپاس خاطر آنہا ایں
مہر سپہر فضل و کمال را از بزم دنیا

تھا اوران کے روشن جبیں کے نور سے
آفتاب اسلام کی ضیاء روشن ہو
جاتی تھی جس نے ان کو دیکھ لیا اس
نے دل و جان سے اسلامی احکام
قبول کر لئے اور لباس تقوی اور
صداقت پہن لیا جو شرف دارین
کے حصول اور دونوں جہان کے
انوار طیبہ سے منور ہونے کے لئے
آپ کے دست پاک پر سبھی
بیعت کر کے ہمیشہ پابوس ملازمت
رہتا ہے اور دوامی حضور کو اپنے
لئے اعزاز و افتخار سمجھتا ہے۔ وہ
مخلص مریدوں اور صادق عقیدت
مندوں میں سے اعمال صالحہ اور
پسندیدہ کردار کا حامل ہوتا تھا۔
ظاہر ہے کہ مولوی صاحب موصوف
کے صف ہستی سے اٹھ جانے کی
وجہ سے علم و عمل کی ولایت اور
زہد و تقوی کی سلطنت ویران ہو
گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک
فاتحہ رخصت پڑھ کر راہی لامکاں
ہوگیا۔

برداشتہ درحلقہ کروبیاں رسانیدند

آہ! ہزار آہ!! دنیا خوانیست مملو

از طعام ہائے رنگارنگ اما زہرآلود

وخوبیت شیریں وخوش نشہ لیکن عیش

مرگ حسرت آموز ریاضے است

خوشنماو پر فضا، لیکن از باد سموم

فنا پژمردہ و باغیست روح پرور

فرحت افزا مگر از لطمہ خزاں افسردہ

یارب! کیا فرشتوں اور ملاء اعلیٰ

باشندوں کو ایمان واسلام کی تعلیم

کی ضرورت تھی کہ جن کی رہنمائی اور ہدایت

کے لئے اس بحر معرفت کو وہاں

بلایا گیا؟ یارب کیا فرشتوں کا ممبر

وعظ، صاف گو واضح بیان شیریں بیانی

ناصحین سے خالی ہوگیا تھا کہ علم وہنر

کی اس کان کو اس پر لیجاکر بٹھلادیا گیا

ہے؟ یارب کیا بالانشینوں اور آسمانی

فرشتوں کو تقریر دلپذیر سننے کی آرزو

تھی کہ اس پاک گوہر عالم کو فرشیوں سے

الگ کرکے ہمیشہ کے لئے عرشیوں

سے وابستہ کردیا ہے-؟ یارب

کیا فرشتوں کی معرفت کی باریکیوں

کی تحقیق کا دریائے عشق جوش میں

آگیا تھا کہ ان کی خاطر اس آسمان

فضل وکمال کے آفتاب کو دنیا کی بزم

سے اٹھاکر فرشتوں کے حلقہ میں

پہنچادیا۔ آہ! ہزار آہ! دنیا ایک

دستر خوان ہے جو رنگارنگ مگر زہر

آلود کھانوں سے بھرا ہوا ہے اور

ایک شیریں اور پر نشہ خواب ہے

جس کی تعبیر حسرت آموز موت ہے، ایک خوشنما اور پر فضا باغ ہے مگر فنا کی لو سے پژمردہ ہونے والا۔ اور روح پرور اور فرحت افزا چمن ہے جو خزاں کے اثر سے مرجھا گیا ہے ؎

نظم

نہ مردہ است قاسم جہاں مردہ شد
گل تازہ از باغ افسردہ شد
یکے شمع گل شد جہاں شد سیاہ
بہ ابر فنا رفت رخشندہ ماہ
فنا ہست ہر چیز موجود را
بقا ہست بس رب معبود را
خدا را البقاء وہمہ را فنا
بجز او کسے را نہ باشد بقا
ہر آں کس کہ جاں زندہ دارد بہ تن
گل خوش نما ہست آں در چمن

صرف قاسم نہیں مرا بلکہ سارا جہان مر گیا ہے۔ باغ کا ایک تازہ پھول مرجھا گیا ہے۔ ایک شمع کیا گل ہوئی کہ جہان ہی سیاہ ہو گیا ہے۔ فنا کے بادلوں میں روشن چاند چھپ گیا ہے۔ ہر موجود چیز کے لئے فنا ہے۔ بس رب معبود کے لئے صرف بقا ہے۔ خدا باقی ہے۔ باقی سب فانی ہے اس کے سوا کسی کے لئے بقا نہیں ہے۔ جو شخص زندہ جان بدن میں رکھتا ہے وہ چمن کا ایک خوشنما پھول ہے

ایں غم جگر سوز و حادثۂ سینہ دوز	اس جگر سوز غم، اور سینہ دوز حادثہ نے
پردۂ زنگاری بر دلہائے ما	ہمارے دلوں پر ایسا پردۂ زنگاری کھینچ

کشیدہ کہ دراں گذر اندیشہ نیست د
این تیر الم دل فگار از پہلو ہم بروں
سو گذشتہ کہ از درد او جز دلم
کسے را خبر نہ۔ افسوس بر افسوس
ست کہ شمع جہاں افروز در تاریکی
از بزم دین و اسلام بہ طرفۃ العین
بمرد و رقم بہبودی علم و فضل از
جریدۂ کائنات بہ کزلک قضا بہ چشم
زدن برد، ازیں آتش اندوہ ہر زرد
خشک کہ داشتم ہمہ را بسوختم و از
خدنگ آہ دردناک سینۂ ہفت
ورق افلاک را دوختم، و نافہ ہائے
مشک مشام افروز ہر تمنا و آرزو
را در مجمر یاس خاکستر کردم و بساط
خودی و خودداری از ایوان اندرونہ
خود در نوردیدم، و پردۂ نیلگوں بر
چہرۂ عروس ہستی فرو انداختم،
دلوائے ماتمی در میدان زندگی بلند
افراختم۔ دریغ بر دریغ است
کہ بزم یاران برخاست و مینائے
خرمی و ساغر انبساط بر سنگ جفا
بشکست و ردۂ غمگساران۔ از تو د

رکھا ہے جس میں کسی اندیشہ کا
گذر نہیں ہے اور اس دلفگار رنج
کا تیر پہلو کے پار ہو گیا ہے جس
کی ٹیس کی خبر میرے دل کے سوا کسی
نہیں ہے۔ افسوس! افسوس!
کہ تاریکی میں جہان کو روشن کرنے
والی شمع دین و اسلام کی بزم سے
پل بھر میں بجھ گئی اور علم و فضل
کی بہترین تحریر قضا کے قلم سے
پلک جھپکنے میں صفحہ کائنات سے
محو کر دی گئی ہے غم کی اس آگ
نے جو خشک و تر میرے پاس
تھا سب پھونک دیا آہ درد
ناک کی سوزش سے ساتوں آسمان
کے سینہ کو میں نے سی دیا ہے
خودی اور ہر تمنا اور آرزو کے
دماغ کو معطر کرنے والی مشک
کی تھیلیوں کو یاس و ناامیدی
کی بھٹی میں جلا کر راکھ کر چکا ہوں
اور خودداری کی بساطِ دروں
لپیٹ کر رکھ دی ہے۔ وجود
کی دلہن کے رخسار سے نیلگونی

لبستہ از بازار کون وفساد
برفت و ما را تنہا بے یار و ہمراہ
دریں دشت پر خار کہ نامش
زندگی ست بگذاشت و نہال
خوش ثمر عزم خود را در چمن
فردوس بکاشت۔

یارب بر ما و بر گذشتگاں کہ از
پیش ما در گذشتند رحم کن
و خرمن معصیت را ز برق جہاں
سوز آہ نیم شبی نیکو بسوز و چشم
را آں سیلاب پر جوش دہ کہ
ہمہ خس و خاشاک بزہ و عصیاں
را فرا برد، و گرد ندامت و خجالت
را از چہرۂ سیاہ ما بشوید۔

بیامرز یارب مرایں بندہ را
تو آمرزگاراست من زشت کار

پردہ اٹار زندگی کے میدان میں
ماتمی جھنڈا بلند کئے ہوئے ہوں
افسوس! صد افسوس! کہ بزم یاراں
برخاست ہو گئی اور مسرت کی مینا
اور خوشی کا ساغر ظلم کے پتھر سے
چکنا چور ہو گیا اور جماعت غمگساراں
اپنا سامان اٹھا کر اس دنیا سے رخصت
ہوا۔ اور ہمیں اس دشت پر خار میں
جس کا نام زندگی ہے بے یار و مددگار
چھوڑ گیا ہے اور اپنے ارادے کے
اچھے پھلدار درخت کو چمن فردوس
میں جاکر بو دیا ہے۔

یارب ہم پر اور ہمارے اسلاف
پر رحم فرما۔ اور آہ نیم شبی کی برق
جہاں سوز سے خرمن معصیت کو
پوری طرح پھونک دے۔ اور
آنکھ کے چشمہ میں وہ جوش سیلاب
عطا فرما کہ گناہ و معصیت کے سارے
خس و خاشاک کو بہالے جائے اور
ندامت و شرمندگی کی گرد کو ہمارے
سیاہ چہرے سے دھو دے ؎
ندامت مدہ ایں سرافگندہ را

حکیم عبدالرحمن حسرت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سفینۂ سومی جس کا عنوان ہے۔
"حکایات مختلف فوائد خیز ندرت آمیز" میں بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے۔
لکھتے ہیں۔

شیر بیشۂ فضل وکمال بوئے دلاویز
گلزار عشق ایزد ذوالجلال۔
شمع شبستان طریقت وشریعت
مہر سپہر حقیقت ومعرفت عالم
کامل ودر جود وسخا رشک حاتم
جناب مولوی محمد قاسم صاحب نوراللہ
مرقدہ از گزیدۂ علماء وسنجیدہ
فضلاء قصبۂ نانوتہ بودہ است
ومنازل علوم گوناگوں ونشیب و
فراز رموز فنون بوقلموں، بقدم
ہمت ونیروئے خرتاب خداداد
نیکو پیمودہ بود۔ اوراکان علوم
ومخزن فنون باید گفت انچہ در
توصیف او خشی اندیشہ برنگارد
بجا است وہرقدر کہ تعریفش سرایند
آید زیبا است. براسرار تصوف
وصفائے باطنی از فیض ورہنمائی
حاجی امداداللہ صاحب عبور وافر
داشت ودر میدان ورع وتقوی

فضل وکمال کے شیر عشق الٰہی کے
گلزار کی بوئے دلآویز طریقت
شریعت کی رات کے لئے شمع
حقیقت ومعرفت کا آفتاب عالم
کامل بخشش وسخاوت میں رشک
حاتم جناب مولوی محمد قاسم صاحب
نوراللہ مرقدہ. قصبہ نانوتہ کے
برگزیدہ علماء اور سنجیدہ فضلاء میں
سے ہوئے ہیں گوناگوں علوم کے
منازل اور بوقلموں فنون کے
نشیب وفراز کے رموز انکی ہمت
اور خداداد طاقت کی بدولت طے
ہوگئے تھے۔ ان کو معدن علوم
اور خزانۂ فنون کہنا چاہیئے ان کی
توصیف کاتب فکر جو کچھ لکھ سکے
بجا ہے اور جتنی بھی ان کی تعریف
کی جاسکے درست ہے۔
حاجی امداداللہ صاحب کے فیض
ورہنمائی سے وہ تصوف اور

لوائے انالاغیری می افراشت
تابش ذہن وذکائش درخشاں تر
از برق خاطف بود و تقریر دلپذیرش
ہرگونہ مشکلات علمی وحکمی را کاشف
آنچہ در ہمہ عمر دیدہ وشنیدہ بود ہمہ
محفوظ خاطر بود سینۂ اورا نمونہ لوح
محفوظ باید گفت ولآئی آبدار اندرز
ونصیحتش را در رشتۂ جاں باید
سفت، ازبس شیریں کلام وعذب
البیان بودہ وگوئے سبقت از
ہمہ علمائے موجودہ زمان ربودہ
بتاریخ پنجم جمادی الاول سنہ ۱۲۹۷ھ
یکہزار ودوصد وہفت ونہ ہجری
ازیں کارگاہِ کن فیکون رخت
ہستی برداشتہ راہی ملک جاوید
شد زادگاہ نانوتہ وآرامگاہ واپسیں
قصبۂ دیوبند است۔

صفار باطن کے اسرار پر کامل عبور
رکھتے تھے۔ میدان ورع وتقویٰ میں
وہ بے مثال فرد تھے۔ ان کی ذکاوت
وذہانت کی روشنی بجلی سے بھی زیادہ
درخشاں اور ان کی "تقریر دلپذیر" علم و
حکمت کی ہر قسم کی مشکلات حل کرکے
رکھ دیتی تھی۔ ساری عمر جو کچھ دیکھا
سنا سب ان کو محفوظ تھا ان کے
سینہ کو لوح محفوظ کا نمونہ کہنا چاہیئے
ان کے وعظ ونصیحت کے آبدار موتیوں
کو رشتۂ جانی میں پرونا چاہیئے۔ وہ
انتہائی شیریں کلام اور خوش بیان تھے
اپنے زمانہ کے تمام معاصر علماء سے گوئے
سبقت لے گئے تھے۔ ۵ جمادی الاول سنہ ۱۲۹۷ھ
کو وہ اس دنیا سے رخت سفر باندھ کر راہی
ملک بقا ہوئے۔ ان کا پیدائشی وطن نانوتہ
اور دائمی خواب گاہ دیوبند ہے۔

امام العصر

علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

(ماہنامہ معارف، ستمبر-نومبر 1967ء)

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری

از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

علامہ سید انور شاہ کے سوانح اور ان کے علمی کارناموں پر سب سے پہلے وقت کے نامور وسیع النظر عالم مولانا سید محمد یوسف بنوری زید مجدہم نے قلم اٹھایا اور عربی زبان میں علامہ موصوف کی سوانح عمری نفحۃ العنبر فی ھدی الشیخ الانور کے نام سے لکھی جسے مجلس علمی ڈابھیل (سورت) نے ۱۳۵۵ھ میں شائع کیا تھا، اب یہ کمیاب ہے، اس میں موصوف نے علامہ سید انور شاہ کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے بحث کی ہے۔

دوسری کتاب جس کا نام حیات انور ہے۔ ۱۹۵۵ء میں دیوبند سے شائع ہوئی تھی، یہ اردو زبان میں علامہ موصوف کے متعدد نامور تلامذہ کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ ہے، جو اپنی افادیت، جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، بایں ہمہ سید انور شاہ کی جامع حیثیات شخصیت پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ لکھا گیا تھا، جس کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔

ہم نے اس مختصر مقالہ میں علامہ سید انور شاہ کے سوانح کے حصہ سے زیادہ تعرض نہیں کیا، یہ کام ان کے سعادت مند فرزندوں کے کرنے کا ہے، اور انھیں پہلی فرصت میں موصوف کی ایک جامع سوانح حیات مرتب کرنا چاہیے، اسی طرح ہم نے ان امور سے بھی زیادہ بحث نہیں کی ہے جن سے ان کے تلامذہ نے اعتنا کیا ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم نے علامہ سید

انور شاہ کشمیری کی علمی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے اس نوع پر بحث نہیں ہو سکی،

محمد انور نام اور انور شاہ عرف ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے:۔

محمد انور بن محمد معظم بن عبد الکبیر بن عبد الخالق بن محمد عارف بن حیدر بن علی بن عبد اللہ ابن مسعود النروری الکشمیری الحنفی۔[1]

ولادت اور تعلیم و تربیت

موصوف بوقت سحر بروز شنبہ، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ میں کشمیر جنت نظیر کی ایک چھوٹی سی بستی وودھوان (علاقہ لولاب) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت انکے والد امجد محمد معظم شاہ نے کی، پانچ برس کی عمر میں موصوف کو قرآن مجید پڑھایا، پھر فارسی شروع کرائی، ۱۲۹۹ھ میں مولوی غلام محمد رسول پورہ سے فارسی کے ساتھ عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں اور ضلع ہزارہ کے بعض علمائے تین برس تک درس نظامی کی کچھ درمیانی کتابیں پڑھیں۔

۱۳۱۰ھ میں مرکز علم دیوبند پہنچے، یہاں اساتذۂ وقت مولانا غلام رسول، حکیم محمد حسن وغیرہ سے درسی کتابیں جیسے حسامی، ہدایہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، قاضی مبارک، صدرا، تصریح، شرح چغمینی، نفیسی وغیرہ پڑھ کر ۱۳۱۴ھ میں مسند وقت مولانا عبد العلی[2]، مولانا خلیل احمد انصاری

---

[1] ملاحظہ ہو نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین، شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل سورت ۱۳۵۰ھ ص ۱۴۵

[2] مولانا عبد العلی بن نصیب علی شیخ پوری میرٹھی۔

موصوف، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور فیض الحسن سہارنپوری کے تلمیذ، جید عالم اور دار العلوم دیوبند کے صف اول کے مدرسین میں سے تھے، مولانا عبد العلی نہایت سادہ، متواضع ملنسار، مہمان نواز اور خوشحال بزرگ تھے، جن ارباب کمال کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے ان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ کا نام سرفہرست ہے

(باقی حاشیہ ص ۱۸۴ پر)

محدث سہارنپوری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے سند فراغ حاصل کی اور ۱۳۱۰ھ میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۳) افسوس ہے ان بزرگوں کی سوانحمریوں میں مولانا کا نام بار بار آیا ہے، مگر کسی نے ان کے حالات سے تعرض نہیں کیا، ہمیں موصوف کے متعلق جو معلومات مل سکی ہیں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں

مولانا عبد العلی کا آبائی وطن شیخ پور تھا، یہ میرٹھ سے چھ میل کی مسافت پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ان کے بزرگوں نے بسائی تھی،

شیخ نصیب علی کے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بڑے گہرے تعلقات تھے، حضرت نانوتوی جس زمانہ (۱۲۹۰ھ) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کرتے تھے، جمعہ کا دن موصوف کا شیخ نصیب علی کے یہاں شیخ پور ہی میں گذرتا تھا، شیخ نصیب علی جمعرات کو شام میں بہلی میں بٹھا کر موصوف کو شیخ پور لاتے اور شب و روز حجۃ الاسلام کے فیوضات ظاہری و باطنی سے کسب فیض کرتے رہتے تھے، ان ہی ایام میں میرٹھ میں مولانا عبد العلی نے موصوف سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان ہی نے حجۃ الاسلام سے یہ عرض کیا تھا کہ ان کی تقریر سے فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب پانی ہو جاتی ہے لیکن اثنائے درس میں جب موصوف اپنی تحقیقات عالیہ پیش کرتے ہیں تو ہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لہذا تقریر کا دائرہ نفس کتاب تک محدود رہنا چاہیے، ورنہ اسباق میں ہماری حاضری سود مند نہیں، حجۃ الاسلام نے ان کی حق گوئی کو پسند کیا اور ان کی وجہ سے درس میں نفس کتاب کے درس پر اکتفا کیا، مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں: "مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ جس خداداد ذکاوت کے مالک تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، کہتے ہیں کہ مولوی عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب (حسین بخش) دہلی) شروع شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی، مولوی عبد العلی نے سبق

(باقی حاشیہ ص ۱۸۵ پر)

امام سنت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی روایت حدیث کی اجازت لی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو، میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو، پھر ان کی سمجھنا، مولوی عبد العلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد وہ بے پاؤں گھر روانہ ہو گئے، مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا، شاید ان کے گھر پہنچے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی، مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں، مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آیندہ ایسا نہ ہوگا، کتاب ہی پڑھاؤں گا، تب پھر واپس ہوئے۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، محبوب المطابع و جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۳۶۳ھ ج ۱ ص ۲۲۲)

دار العلوم دیوبند میں ان کے درس کا آغاز غالباً ۱۲۹۵ھ سے ہوا اور یہ سلسلہ ۱۳۱۱ھ تک قائم رہا ۱۳۱۱ھ سے موصوف مدرسہ حسین بخش دہلی سے وابستہ ہو گئے، اور تا دم مرگ اسی مدرسہ میں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم کرتے رہے، حکیم الامت نے ایک موقعہ پر موصوف سے اپنے تلمذ اور ان کے اخلاق و عادات کا تذکرہ حسن العزیز (جلد دوم حصہ سوم مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون بجارت ۱۳۸۶ھ ص ۹۴، ۹۵) میں اس طرح کیا ہے۔

میں نے مولانا سے مقامات حریری، سبعہ معلقہ اور کچھ نسائی پڑھی ہے، مگر برتاؤ سے مولانا کے پتہ نہیں چل سکتا کہ استاد ہیں، چنانچہ جب میں دہلی سے چلتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور ساتھ کر دیتے ہیں، بے لوث اور بے تعلق ہیں، کسی سے کچھ مطلب نہیں، خود بھی مدرسہ میں چندہ دیتے ہیں، مقدار چندہ کی سب سے زیادہ ہوتی ہے، ۱۵۰ روپیہ یا زیادہ تک، مولانا سے جو کوئی ملنے جاتا ہے، بہت خاطر کرتے ہیں، چائے، شربت پلاتے ہیں، دیوبند میں جب تشریف رکھتے تھے تو طلبہ کی خوب تادیب فرماتے تھے،

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے سبق پڑھنے میں لیٹ کر پاؤں پیچھے کو پھیلائے، بس مولانا چلائے بدتمیز، بے ادب!

(باقی ص ۱۸۶ پر)

درس و تدریس کا مشغلہ

تحصیل علوم کے بعد موصوف نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، چنانچہ ۱۳۱۵ھ میں جب مدرسہ امینیہ[1] کی دہلی میں بنیاد رکھی گئی تو صدر مدرس کے معزز عہدے پر موصوف ہی کا انتخاب عمل میں آیا، یہاں علامۂ موصوف نے کم و بیش ساڑھے چار سال تک علوم مروجہ کا درس دیا، اور ۱۳۲۰ھ میں جب ان کے بڑے بھائی کا وطن میں اچانک انتقال ہو گیا تو ان کے پدر بزرگوار مولانا محمد معظم شاہ نے خانقاہ میں جانشینی اور بعض خاندانی امور کی انجام دہی کے لیے وطن طلب کیا، اس حادثۂ جانکاہ کی وجہ سے موصوف کو وطن جانا پڑا اور پھر والدین نے کشمیر سے باہر رہنے کی اجازت نہ دی اور یوں چار و ناچار کچھ زمانہ وطن ہی میں گزرا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) صرف اصلاح کی وجہ سے تنبیہ فرمائی، یہ نہیں کہ اپنا ادب کرایا۔ پھر فرمایا:

مولوی صاحب کے پاس بیٹھنے سے ایک خاص کیفیت معلوم ہوتی ہے، ہر شخص کے یہاں بیٹھنے سے جدا فرق معلوم ہوتا ہے کہ اسے تعبیر نہیں کر سکتے۔

خوبی ہمہ کرشمہ و ناز و خرام نیست — بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مولانا عبد العلی کا انتقال دہلی میں ۱۳۴۰ھ کے بعد ہوا، اور مہندیوں کے قبرستان میں خانوادۂ ولی اللٰہی کے پائیں میں سپرد خاک کیے گئے۔

مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی لکھنوی نے ۱۳۱۳ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، اس موقع پر وہ موصوف سے بھی ملے تھے۔ انھوں نے اپنی ملاقات کا حال اپنے روزنامچہ "دہلی اور اسکے اطراف" (شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۵۸ء ص ۵۷ تا ۶۰) میں تفصیل سے کیا ہے۔

(حاشیہ ص ہذا) [1] مدرسہ امینیہ کے لیے ملاحظہ ہو:- (۱) واقعات دہلی از بشیر الدین احمد دہلوی، شمسی مشین پریس آگرہ ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۳۰۰۔ (۲) مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، شائع کردہ ادارۂ حفیظیہ مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی ۱۳۷۷ھ

سفر حجاز اور واپسی کے بعد بارہ مولا میں فیض عام کا قیام

۱۳۲۳ھ میں کشمیر سے حجاز گئے، فریضۂ حج ادا کیا، مصر و شام کے نامور محدثین سے روایت حدیث کی اجازت لی، حجاز کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، سفر حج سے واپس آکر ۱۳۲۶ھ تک والدین کے پاس وطن میں رہے، پھر وطن سے باہر رہنے پر کسی نہ کسی طرح والدین کو راضی کر لیا اور ۱۳۲۶ھ میں خواجگان قصبہ بارہ مولا میں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا، اور سال بھر یہاں درس دیا، مگر بعض لوگوں کی بدمعاملگی نے جلد ہی یہاں سے دل برداشتہ کر دیا جس کا اظہار موصوف نے اپنے ایک دیرینہ رفیق اور خواجہ تاش مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ المتوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء کے ایک مکتوب مورخہ ۲۷ جمادی الاولیٰ میں ان الفاظ میں کیا ہے،

"میں کوئی ایک مہینہ گذرا جاتا ہے کہ مکان سے بعزم ہندوستان رخصت لیکر آگیا ہوں، ہر چند کہ والدین تو راضی نہ تھے، مگر میرے الحاح پر اجازت دیدی، یہاں بارہ مولہ پہنچکر کچھ توقف سا ہو گیا، حقیر کو یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں اگر مخلوق کی بدمعاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا، اتنا احساس مجھے ہندوستان میں نہیں ہوا، پھر اگر مجھے مخلوق کی طرف احتیاج مخالطت ہوتی تو لامحالہ یہ احساس کم ہوتا، مگر تجرد کے باعث یہ احساس کم نہیں۔ (ملتقطاً و مختصراً)[1]"

علامۂ موصوف یہاں سے خاطر برداشتہ ہو کر ربیع الاول ۱۳۲۷ھ میں اپنے استاد زمن شیخ مولانا محمود الحسن دیوبندی کی خدمت میں پہنچے۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ شیخ الہند نے اسی ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ/۱۹۱۰ء میں دیوبند میں ایک تاریخی جلسہ کیا جس میں فضلائے دار العلوم کی دستار بندی کی گئی اور علامۂ موصوف کو بھی

---

[1] ملاحظہ ہو مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، ص ۲۶۔

یہ سعادت حاصل ہوئی۔

دار العلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز

انھی ایام میں شیخ الہندؒ نے غالباً اس خیال سے کہ مدرسہ فیض عام میں طلبہ زیادہ نہیں اور نہ ان کی دلجمعی کا خاطر خواہ کوئی سامان ہے، ان کو روک کر دار العلوم دیوبند میں (جہاں تشنگان علوم کا تانتا بندھا ہوا تھا، ہندوستان کے کسی صوبہ یا شہر سے طلب علم کے لیے کوئی نکلتا تھا، وہ ادھر ہی کا رخ کرتا تھا، اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف اس کا خیال تک نہ جاتا تھا) درس و تدریس کے فرائض انجام دینے پر مامور کردیا، ان کو استاذ الکل کے حکم کے آگے یارائے سخن نہ تھا، سر تسلیم خم کردیا، اس طرح دار العلوم دیوبند میں سید انور شاہ کے درس کا آغاز ہوا، اور یہاں موصوف نے فن حدیث میں صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ جیسی امہات الکتب کا درس دیا، اور عرصۂ دراز تک کبھی اس خدمت کا معاوضہ نہیں لیا،

ازدواجی زندگی کا آغاز

علامہ موصوف اپنے غیر معمولی علمی شغف کی وجہ سے تجرد کی زندگی گزارنا پسند کرتے تھے، شیخ الہندؒ نے سنت رسول کی ترغیب دی اور دار العلوم کے ارباب حل و عقد نے گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں شادی کرادی، جب اولاد ذرا بڑی ہوگئی اور اخراجات کا سلسلہ بڑھا تو ارباب حل و عقد نے معاوضہ قبول کرنے پر بہت زور دیا، ان کے اصرار پر موصوف نے نہایت قلیل بقدر کفاف مشاہرہ قبول فرمایا،

شیخ الہندؒ نے جب ۱۳۳۶ھ میں سفر حج کا ارادہ کیا تو اپنی جانشینی کے لیے اپنے نامور تلامذہ میں سے جس جوہر قابل کا انتخاب کیا وہ سید انور شاہ ہی کی ذات ستودہ صفات تھی، جب علامۂ موصوف نے بحیثیت صدر مدرس جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیا اور یہ سلسلہ ۱۳۴۵ھ تک جاری رہا، پھر بعض انتظامی امور میں اختلاف کی وجہ سے موصوف نے دار العلوم

سے ترک تعلق کر لیا۔

دار العلوم دیوبند میں شیخ الہندؒ کے درس کا سلسلہ اگرچہ اس کے بام ترقی کا نیا پایہ تھا، لیکن علمی اعتبار سے سید انور شاہ کا زمانہ آخر المنازل تھا، اگر یہ اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا تو دار العلوم کو علامہ موصوف سے استفادہ کا کچھ اور موقع مل جاتا،

علامہ موصوف ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ میں دیوبند سے ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ۱۳۵۱ھ تک یہاں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم رہی، پھر طویل علالت کے بعد دیوبند میں ۲ر صفر ۱۳۵۲ھ کو آخر شب میں جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ

حافظہ

حق تعالیٰ شانہ نے موصوف کو عجیب و غریب صفات کا حامل بنایا تھا، حافظہ بلا کا ملا تھا، جو بات کبھی کان میں پڑگئی وہ قید حافظہ سے پھر کبھی نہیں نکلی، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں :-

"میں نے اپنے وطن کشمیر میں سنا تھا اور اس وقت میں چار برس کا تھا کہ دو آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ عذاب بدن کو ہوتا ہے یا روح کو، آخر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کی ایک مثال بھی دی، ایک نے کہا جسم اور روح کا ساتھ ایسا ہے جیسے ایک مرتبہ اندھے اور لولے کا ہوا تھا کہ وہ ایک باغ میں پھل توڑنے کے لیے گئے۔ اندھا پھلوں کے دیکھنے سے عاجز اور لولا ان کے توڑنے سے معذور، آخر ان دونوں نے باہم مشورہ کیا اور لولا اندھے کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا، اندھا اس کو لیکر درختوں کی طرف چلا، لولا پھلوں کو دیکھتا اور ان کو توڑ لیتا۔

بس یہی حالت بدن کی روح کے ساتھ ہے، بدن بغیر روح کے جماد محض ہے جس کو حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے کچھ کرنے سے عاجز ہے، لہذا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں، جب یہ دونوں کسب میں شریک ہیں، تو اجر و ثواب میں بھی دونوں شریک ہوں گے اور سزا و عذاب میں بھی ایک دوسرے کے شریک رہیں گے، پینتیس ۳۵ برس کے بعد میں نے یہ واقعہ علامہ قرطبی کے یہاں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ رضی اللہ عنہما سے مروی دیکھا اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ ان دونوں نے کہا تھا، دیکھو کیا اس قسم کی باتیں ارسطو سے بھی ممکن ہیں[۱]؟"

شاہ صاحب کو فطرت کی طرف سے ایسا زبردست حافظہ عطا کیا گیا لیکن نیرنگی قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ موصوف کو قرآن مجید یاد نہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے:-

"ان (شاہ صاحب) کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی، ہزارہا ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے جس کتاب پر ایک نظر پڑ گئی، گویا ان کے حافظہ کے الماری میں بند ہو جاتی تھی، جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے، لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت، اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا، درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رخ کر کے دریافت فرماتے پوری آیت کیا ہے،

فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا، پھر یہ کیا بات ہے!

جواب میں فرمایا کہ قسمت! بخت! واللہ اعلم کیا بات تھی[۲]"

---

[۱] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ دار المامون قاہرہ ۱۳۵۷ھ ج ۴ ص ۱۱۵ [۲] ملاحظہ ہو 'ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت' مطبع انتظامی حیدرآباد دکن ج ۲ ص ۱۰۳

وسعت معلومات و کثرت مطالعہ

تحصیل علوم سے فراغت کے بعد آغاز عمر ہی میں سید انور شاہؒ کا دائرہ معلومات اس قدر وسعت اختیار کر چکا تھا کہ اس عہد کے نامور علما جن کی وسعت معلومات اور کثرت مطالعہ پر ان کی تالیفات شاہد عدل ہیں، اپنی تحقیقات علامہ موصوف کے حضور پیش کرتے اور موصوف ان پر بیش بہا علمی فوائد کا اضافہ فرماتے، چنانچہ اس عہد کے نامور محدث شوق نیموی نے ۱۳۱۳ھ میں جب آثار السنن کی کتاب الصلوٰۃ مکمل کر لی تو اس زمانہ کے جن ارباب نظر اور اکابر اہل علم کو یہ کتاب بھیجی گئی، ان میں ایک صغیر السن محدث علامہ سید انور شاہؒ بھی تھے، لیکن ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اس پر بیش بہا اضافہ کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ صرف علامہ انور شاہ کی ذات ستودہ صفات تھی،

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید انور شاہ کی تحقیقات اور اضافہ معلومات کا دائرہ محدث نیموی کے مذاق تک محدود رہا ہے، موصوف نے متون احادیث اسناد، رجال اور جرح و تعدیل سے متعلق وہی تحقیقات پیش کی ہیں جو محدث نیموی کے مذاق کے مطابق تھیں، فقہ حدیث کی بحثیں، حقائق، معارف، اسرار بلاغت اور توجیہات حدیث سے بہت ہی کم اعتنا کیا، پھر بھی یہ اضافہ اصل سے دوگنا تگنا ہو گیا ہے[۱]، اور اسی افادۂ علمی کی وجہ سے موصوف نے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۵۶) میں یہ لکھا ہے "کنت مرافقاً فیہ" میں آثار السنن کی ترتیب و تدوین میں ان کا رفیق کار تھا چنانچہ محدث نیموی کے فرزند کا بیان ہے:-

---

[۱] علامہ موصوف کے اس بیش بہا اضافہ کا نام "الاتحاف للاحناف" ہے، مجلس علمی جس کا قیام ہی علامہ سید انور شاہؒ کے علوم کی نشر و اشاعت ہے، اس نے شاہ صاحبؒ کے اس نادرۂ روزگار شاہکار کے اصل نسخہ کا

(باقی ص ۱۹۲ پر)

"تو قانی کہتا ہے ناظرین باتمکین معلوم فرمائیں کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ تیرہ سو بارہ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں، جیسا کہ ان ہی کی شرح فیض الباری علی صحیح البخاری میں لکھا ہوا ہے، اور علامہ نیموی نے آثار السنن تیرہ سو چھ ہجری سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور تیرہ سو تیرہ ہجری میں آخر ابواب الصلوٰۃ تک تمام کر دیا، علامہ نیموی کا اوشحۃ الجید، حبل المتین رد السکین، تبیان تحقیق المعلی وغیرہ تالیف کرنا اور ان کا معجم طبرانی وغیرہ کا نشان و پتہ بتانا کہ فلاں فلاں کتب خانہ میں ہے، اور معرفۃ السنن بیہقی میرے کتب خانہ میں ہے، یہ سب مولانا انور شاہ کشمیری کے طالب علمی کے زمانہ میں تھا، جبکہ وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے۔ لہذا مولانا انور شاہ نے جو نیل الفرقدین میں یہ لکھا ہے کہ انی کنت مرافقا فیہ اس سے مراد بعد اتمام آثار السنن قبل الطباعت ہے، مولانا شوق نیموی اپنی تحقیقات عجیبہ و فوائد غریبہ نادرۂ جدیدہ دکھانے اور معلوم کرانے کے لیے تسویدات آثار السنن قبل طباعت بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے، جس طرح کہ اور بعض علماء کے پاس آثار السنن کو بھیجا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری کو مولانا نیموی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کے شاگرد حکیم مولوی محمد عیسیٰ مرحوم ساکن موضع جانا ضلع پٹنہ نے بندہ سے بیان کیا تھا کہ مولانا انور شاہ مدرسہ امینیہ دہلی میں کہتے تھے، کہ ہم مولانا شوق نیموی سے جو تمہارے جوار کے ہیں، ملاقات کریں گے مگر چونکہ ۱۳۲۲ھ میں بروز جمعہ، ۱۷ رمضان شریف مولانا نیموی کا وصال ہو گیا، اس وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی، خلاصہ یہ کہ آثار السنن جس کی آخر کتاب الصلوٰۃ سنہ تیرہ سو تیرہ ہجری میں تمام ہو گئی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۹۱) کا محمد و وتعدا دیں فوٹو کرا کر اسکو محفوظ کر لیا ہے، اور اب علامہ موصوف کے نامور فرزند سید محمد ازہر شاہ قیصر مدیر ماہنامہ دار العلوم نے اسکی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ جلد اس کام کو بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ آمین

اور مولانا انور شاہ سنہ تیرہ سو بارہ ہجری میں کتب درسیہ مروجہ سے فارغ ہوئے، سنہ تیرہ سو بارہ ہجری کے بعد شوق نیموی ان کو بھی اپنی تحقیقات کو جن سے کتب محدثین خالی ہیں دکھانے کیلئے اجزاء آثار السنن بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے اور علامہ کشمیری کچھ رائے و مشورہ دیتے ہوں گے واللہ اعلم۔ اس اعتبار سے من نوع موافقت کہی جا سکتی ہے، جو کہ بعد اصل تالیف و اتمام ہے نہ کہ وقت تالیف کیونکہ اس وقت تو مولانا انور شاہ محض طالب العلم تھے[۱]، فافہم"[۲]۔

تبحر علمی

ضبط و اتقان، ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، دقت نظر، حدت فکر، وسعت مطالعہ، کثرت معلومات، استحضار علوم اور تبحر میں اپنی نظیر آپ ہی تھے، صرف و نحو، معانی و بیان، شعر و ادب، منطق و فلسفہ، لغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، رجال، طبقات، تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، غرض ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، اور عربی و فارسی نظم و نثر پر یکساں قادر تھے، ایسی جامعیت اور ہر فن میں ناقدانہ مہارت کی وجہ سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی موصوف کو علوم میں ان کے اساتذہ سے بھی فائق سمجھتے تھے، وہ فرماتے تھے:-

"مولانا انور شاہ صاحب بہت بڑے متبحر عالم تھے، یہاں تک کہ ہے تو گستاخی لیکن سچی بات کو کیوں چھپاؤں، میرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بھی علوم میں بڑھ گئے تھے"۔[۳]

حفظ حدیث

علامہ سید انور شاہ بلاشبہ حفاظ حدیث میں سے تھے، حفظ حدیث کی حقیقت سمجھنے

---

[۱] شاہ صاحب کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں ہندوستان کے ایک نامور وسیع النظر محدث کے اہم علمی کام میں اضافہ کی سعادت اگر حاصل ہو گئی تھی تو یہ شاہ صاحب کی وسعت نظر کی اور بھی زیادہ قوی دلیل ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن وفی تائید آثار السنن از ابن نیموی اصح المطابع اسی پریس لکھنؤ ۱۹۶۳ء ج ۱ ص ۱۹ [۳] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) اشرف المطابع تھانہ بھون ۱۹۴۱ء ج ۷، ص ۱۱۱

کے لیے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ محدثین کی اصطلاح میں حفظ حدیث سے مراد استحضار اور تذکر نہیں ہے یعنی احادیث کا نوک زبان پر ہونا بلکہ معرفت یعنی ملکۂ فن مراد ہے اور حقیقت میں یہی معیار حفظ ہے، اور متاخرین ائمۂ فن کے یہاں اسی کا اعتبار ہے، اسی معیار پر متاخرین حفاظ میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے اکابر شیوخ کو جانچا اور پرکھا ہے، موصوف انباء الغمر میں حافظ زین الدین عبد الرحیم عراقی المتوفی ۸۰۶ھ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ نور الدین علی ہیثمی المتوفی ۸۰۷ھ میں موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

لم نر فی ہذا الفن اتقن منہ وعلیہ تخرج غالب اہل عصرہ ومن اخصہم بہ صہرہ شیخنا نور الدین الہیثمی وہو الذی دربہ وعلمہ کیفیۃ التخریج والتصنیف وہو الذی یعمل لہ خطب کتبہ وینسبہا لہ وصار الہیثمی لشدۃ ممارستہ اکثر استحضارا للمتون من شیخہ حتی یظن من لاخبرۃ لہ انہ احفظ منہ ولیس کذلک لان الحفظ المعرفۃ[1]

ہم نے فن حدیث میں حافظ عراقی سے زیادہ متقن و پختہ نہیں دیکھا، اس زمانہ کے اکثر اہل علم نے ان ہی سے کسب کمال کیا ہے، اور ان کے تلامذہ میں سب سے ممتاز ان کے داماد ہمارے شیخ نور الدین ہیثمی ہیں، شیخ عراقی نے انھیں پڑھایا، تصنیف اور تخریج احادیث کا ڈھنگ بتایا تھا، وہ انکی کتابوں پر دیباچے لکھتے اور انکی نسبت بھی حافظ ہیثمی کی طرف کرتے تھے، ہیثمی کو مزاولت اور کثرت مشق کی وجہ سے احادیث کے متون اپنے شیخ عراقی سے زیادہ یاد ہو گئے تھے یہانتک کہ جس کو حقیقت حال [illegible]

[1] ملاحظہ ہو انباء الغمر بحوالہ فہرس الفہارس و معجم المعاجم والمشیخات والمسلسلات از حافظ سید عبد الحی الکتانی المتوفی ۱۳۸۳ھ طبع فاس ۱۳۴۶ھ ج ۲ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات الذہب فی اخبار من ذہب از ابن العماد حنبلی مکتبۃ القدسی مصر ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۵۶۔ و ذیل طبقات الحفاظ للذہبی از حافظ جلال الدین سیوطی طبع دمشق ص ۳۷۳ و البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ ۱۳۴۸ھ ج ۱ ص ۴۴۲

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حفظ حدیث کے لیے حافظ میں ملکۂ فن کا پایا جانا کافی ہے، استحضار و تذکر شرط نہیں ہے، چنانچہ شیخ ہیثمی صاحب مجمع الزوائد اور شیخ زین الدین عراقی صاحب الالفیہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ ہیثمی فی الفور حدیث کی تخریج کرتے اور بتا دیتے تھے، اس بنا پر پڑھے لکھے لوگ ان کو بڑا حافظ سمجھتے تھے، حالانکہ نور الدین ہیثمی نے شیخ عراقی ہی سے سب کچھ سیکھا تھا، اور شیخ عراقی کو فن کا ملکہ تھا، گو فی الفور حدیثوں کی تخریج سے قاصر تھے، یہ بات علامہ سید انور شاہ کو بھی حاصل تھی، اسی لیے ہم نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، انکی متون احادیث پر نہایت غائر نظر تھی، وہ علل اسانید سے واقف تھے، مراتب رجال کا انھیں علم تھا، وہ صحیح و سقیم کو سمجھتے تھے، اور فن جرح و تعدیل اور وفیات کے ماہر تھے، راویوں کا تشابہ رفع کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور ان فنون میں ان کو بڑا اتقان و رسوخ حاصل تھا، ان کے رسائل اور امالی آج بھی اس امر پر شاہد عدل ہیں،

فقہ و خلافیات کا حفظ

علامہ سید انور شاہ حدیث ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ فقہ اور خلافیات کے بھی حافظ تھے، تذکرہ کی کتابوں میں بعض ارباب کمال فقہاء کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے کان حافظاً للفقہ والخلاف یا کان حافظاً للمذاہب، کہ وہ فقہ اور خلافیات کے حافظ تھے، مذاہب ائمہ ان کو یاد تھے، یہ بات علامہ سید انور شاہ کو بھی حاصل تھی، ان کو اصول و کلیات ہی نہیں جزئیات مسائل پر بھی عبور حاصل تھا، اور اختلافی مسائل میں ہر ایک امام کا مسلک بھی ازبر تھا، ہر مسئلہ میں ائمہ اور مشائخ کے مختلف اقوال بھی ازبر تھے، ائمہ اربعہ کے اختلافات کے منشا اور مبنی پر بھی ان کی نظر پوری طرح تھی، فقہ پر ان کی نظر جیسی غائر تھی اور ائمہ کے اقوال جیسے کچھ انھیں مستحضر تھے، اسکا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:-

لیس عندی فن اصعب من الفقہ

میرے نزدیک فقہ سے مشکل ترین فن کوئی نہیں

حتی انی فی الفنون کلھا ذو رأی و تجربۃ احکم بما ارید وانتخب من اقوالھم ما ارید وافترع (اتفرع) الآراء من عندی لا احتاج الی تقلید احد ولکنی فی الفقہ مقلد بحت لیس رای سوی الروایۃ ولذا اقد یصعب علی الافتاء فان الناس لا یکون عندھم الا قول واحد ویکون عندی فیہ اقوال عن الامام او عن المشائخ والتصحیح قد یختلف، ولست من اصحاب الترجیح وحینئذ افتی بما یقرب بمذاھب الائمۃ وآثار السلف والسنۃ[۱]

جملہ فنون میں میری ایک رائے اور تجربہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں فیصلہ کرتا ہوں اور ائمۂ فن کے اقوال میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں انتخاب کرتا ہوں، میں اپنی طرف سے انکی رایوں پر تفریع کرتا ہوں اور کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہوں لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں، بجز روایت امام کے کوئی رائے نہیں رکھتا، اسی وجہ سے مجھے فتوی دینے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ لوگوں کے سامنے ایک قول کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور میرے پیش نظر امام یا مشائخ کے متعدد قول ہوتے ہیں، پھر کبھی تصحیح میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور میں اصحاب ترجیح میں سے نہیں ہوں میں ...

طبقات فقہاء پر نظر طبقات فقہاء پر بھی انکی نظر غیر معمولی وسیع تھی، اور اس فن میں بصیرت کا یہ حال تھا کہ کبار فقہاء کے متعلق ان کی اپنی خاص آراء تھیں کہ کون کس درجہ کا فقیہ ہے، اور نقل میں اکی کیا حیثیت ہے، کون فقیہ النفس ہے اور کون نہیں، چنانچہ امام ابوجعفر احمد بن محمد طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

۱؎ ملاحظہ ہو فیض الباری ج ۴ ص ۱۹۷

"امام طحاوی، مذہب امام اعظم ہی کے سب سے زیادہ عالم نہیں بلکہ دیگر مذاہب ائمہ کے بھی سب سے زیادہ واقف تھے، وہ امام شافعی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور امام مالک سے بدو واسطہ تلمذ رکھتے تھے، اور امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کو بہ واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، کتاب شرح معانی الآثار کے باب الحج میں موصوف نے تصریح کی ہے کہ امام احمد سے بھی ان کو بیک واسطہ اجازت حاصل ہے، طحاوی مجتہد و مجدد ہیں، جیسا کہ ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے،

میں کہتا ہوں کہ شرح حدیث ان کا تجدیدی کارنامہ ہے، وہ شرح حدیث میں مجمل حدیث کو بتاتے ہیں، حدیث کے غوامض و دقائق بیان کرتے ہیں بحث و تحقیق کرتے ہیں اعتراضات کے جوابات دیتے ہیں اور وہ اس انوکھے طریقہ کے امام ہیں کیونکہ متقدمین صرف احادیث کو بطور سند و متن روایت کرنے پر اکتفا کرتے تھے[۱] اور فیض الباری میں ہے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے حنفیہ کی بنسبت زیادہ اعتناء کیا ہے[۲]"۔

علامہ موصوف ملک العلماء ابوبکر بن مسعود کاشانی المتوفی ۵۸۷ھ کی کتاب البدائع والصنائع فی ترتیب الشرائع کی بہت تعریف کرتے تھے، اور اس کے متعلق فرماتے تھے:۔

عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں خراسانی فقہاء حنفیہ کی تصانیف کی نسبت زیادہ رسوخ و اتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجودیکہ اس کا مؤلف ملک العلماء ابوبکر کاشانی، خراسانی ہے مگر اس کی یہ کتاب اتقان و تثبت میں فقہائے عراق کی مثل ہے بلکہ حسن ترتیب میں ہمارے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے، یہ نہایت نادر المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم ژرف نگاہی اور دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ

۱؎ ملاحظہ ہو العرف الشذی علی جامع الترمذی، مکتبہ رحیمیہ سہارنپور ص ۳۶ و معارف السنن از مولانا محمد یوسف بنوری طبع کراچی ۱۳۸۳ھ ج ۱ ص ۱۲، نیز فیض الباری ج ۳ ص ۳۵۱ و ج ۱ ص ۳۰۳۔ ۲؎ ایضاً فیض الباری ج ۳ ص ۶۹

فقیہ النفس ہیں جلنے، یہ کتاب مدرس اور مولف کے لیے مفتی کی بہ نسبت زیادہ مفید ہے۔[1]"

مولف کے بارے میں ایسا بصیرت افروز تبصرہ فقہا میں سے کسی اور فقیہ سے منقول نہیں، اسی طرح علامہ موصوف کی فقیہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی المتوفی ۹۷۰ھ، محمد امین بن عمر عابدین دمشقی حنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

ان ابن نجیم افقہ عندی من الشامی لما اری فیہ من امارات التفقہ تلوح والشامی معاصر للشاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ وھو افقہ ایضاً عندی من الشامی رحمہ اللہ تعالیٰ ولکن الشیخ مشائخنا رشید احمد الگنگوھی قدس سرہ افقہ عندی من الشامی[2]

میرے نزدیک بلاشبہ ابن نجیم علامہ شامی سے زیادہ فقیہ ہیں، کیونکہ مجھے ان میں تفقہ کے آثار بہت روشن نظر آتے ہیں، فقیہ شامی شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ تعالیٰ کے معاصر ہیں اور میرے خیال میں شاہ صاحب شامی سے زیادہ فقیہ ہیں اور اسی طرح ہمارے شیخ الشیوخ رشید احمد گنگوہی قدس سرہ میرے نزدیک شامی سے بڑھکر فقیہ ہیں

بعض مشاہیر ائمہ فن کے متعلق رائے

اسی طرح دیگر ائمہ فن اور بعض علماء کے متعلق بھی ان کی خاص رائیں ہیں، چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ، حافظ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ، شیخ تقی الدین بن دقیق العید المتوفی ۷۰۲ھ، حافظ ابن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ، جمال الدین زیلعی المتوفی ۷۶۲ھ اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کے متعلق علامۂ موصوف فرماتے ہیں:

[1] ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور از مولانا محمد یوسف بنوری مجلس علمی ڈابھیل (سورت) ۱۳۵۵ھ ص ۸۵

[2] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ حجازی، قاہرہ ج ۴ ص ۱۴۱ ج ۲ و ج ۱ ص ۱۲۰

"میرے نزدیک شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ اس امت کی عظیم ترین شخصیتوں سے ہیں، وہ حقائق کی تہ تک پہنچے ہیں اور اس فن میں وہ سب سے آگے ہیں اور اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں حافظ ابن تیمیہ بلاشبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بحر بیکراں ہے، لیکن چند اصولی اور فروعی مسائل میں وہ جمہور امت سے منفرد ہیں، حالانکہ حق پر جمہور علماء ہیں، ابن تیمیہ کشف و کرامات کے بھی منکر ہیں، البتہ مصداق کشف کے قائل ہیں اور وہ اسکو فراست مومن سے تعبیر کرتے ہیں...... انکی طبیعت میں تیزی بہت ہے وہ اپنی تحقیق کو وحی آسمانی سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت کے خلاف کیوں نہ ہوں اور مخالف کی وہ پرواہ نہیں کرتے، اگرچہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، یہ اہل علم کے وہ طبقات و مراتب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، ان میں سے بعض میں بڑا اعتدال ہے اور وہ نہایت انصاف پسند ہیں جیسے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید ابن عبد البر اور زیلعی، بعض میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کی طبیعت میں شدت و حدت ہوتی ہے، جیسے ابن تیمیہ ہیں، بعض میں شدت تعصب کے ساتھ بیدار مغزی بلا کی ہوتی ہے، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں۔[1]"

مصطلحات فن پر اضافے

علامہ سید انور شاہ نے مصطلحات فن پر بھی اضافے کئے ہیں، اصول فقہ جو ایک نہایت دقیق اور مشکل فن ہے اور ہمیشہ سے دقیقہ سنج اور دقیق النظر علماء کی بحث و نظر کی آماجگاہ بنا رہا ہے، اس اہم فن کی بعض مصطلحات پر علامہ موصوف کو اضافہ کا فخر حاصل ہے،

ائمہ فن نے متواتر کی تعریف کی ہے، اور تواتر اسناد کو بیان کیا ہے، لیکن نہ اس کے اقسام سے پورا اعتنا کیا اور نہ انھیں منضبط کیا اور نہ اس کے اقسام کو جدا گانہ ناموں سے

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ حجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۶۴

ممتاز و متعین کیا، تواتر کی بحث کلام اور اصول دونوں جگہ ہے، لیکن اصولیین اور متکلمین دونوں ہی اس باب میں خاموش ہیں، اسلامی دنیا میں علامہ سید انور شاہ نے پہلی مرتبہ تواتر کے اقسام سے اعتنا کیا اور اس کو اقسام اربعہ میں منحصر کیا، اس کی ہر قسم کو ایک خاص اور مستقل نام سے نامزد کیا، تواتر کے وہ اقسام اربعہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) تواتر الاسناد (۲) تواتر الطبقہ (۳) تواتر العمل والتوارث (۴) تواتر القدر المشترک۔

ان اقسام اربعہ کا تذکرہ علامہ موصوف نے اپنے رسالہ نیل الفرقدین فی مسئلہ رفع الیدین (ص ۲۲) میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم (ص۵) میں ان کی خوب وضاحت کی ہے، اور اردو میں اس کی تشریح فیصلہ مقدمہ بہاولپور طبع لاہور ۱۹۳۵ء میں بھی مذکور ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس تقسیم کی داد ان الفاظ میں دی ہے :-

وهذه الاقسام الاربعة للتواتر وان كانت جزئياتها منتشرة في كتبهم لكنهم لم يكونوا يذكرونها عند التقسيم واول من ربع القسمة وسمى كل قسم باسمه فيما نعلم الشيخ العلامة الانور اطال الله بقاءه وهو تقسيم حسن[1]

یہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، اگرچہ اس کی جزئیات اصولیین کی کتابوں میں منتشر طور پر پائی جاتی ہیں، لیکن وہ تقسیم کے موقع پر ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے، سب سے پہلے جس اصولی نے تواتر کو چار قسموں میں منقسم کیا اور ہر ایک قسم کو ایک مخصوص نام سے ممتاز و متعین کیا وہ ہمارے علم میں شیخ علامہ انور شاہ اطال اللہ بقاءہ ہیں۔[2]

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم، مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۲ھ ص ۶

علامہ سید انور شاہ کی اس تقسیم کی خوبی، ندرت اور جامعیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جن ماہران فن نے مصطلحات فنون پر مستقل اور جداگانہ کتابیں لکھی ہیں اور درسی کتابوں کے حواشی سے بھی مفید مفید باتیں سمیٹ لی ہیں اور گوناگوں معلومات جمع کرنے میں خوب داد تحقیق دی ہے، ان کے یہاں بھی تواتر کے اقسام تواتر لفظی و معنوی سے زیادہ نہیں ہیں۔[1]

اسی طرح علامہ موصوف نے حدیث صحیح کی بھی ایک جداگانہ تقسیم کی ہے، اور اس کو بھی اقسام اربعہ میں منحصر کیا ہے،[2] اسی طرح طبقات کتب حدیث میں بھی علامہ موصوف کی رائے جمہور علماء سے کچھ مختلف ہی ہے۔[3] (باقی)

[1] ملاحظہ ہو کتاب التعریفات از سید شریف علی جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ طبع مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۷۵، کتاب الکلیات از ابو البقاء حسینی کفوی المتوفی ۱۰۹۵ھ طبع بولاق مصر ۱۲۵۳ھ ص ۱۲۷، دستور العلماء از عبد النبی احمد نگری طبع دکن ج ۳ ص ۸، کشاف اصطلاحات الفنون از محمد اعلیٰ تھانوی طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۱۴۷۰ تا ۱۴۷۳

[2] ملاحظہ ہو (مقدمہ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸ [3] ایضاً ج ۱ ص ۵۷۔

مقالات

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

از

جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

(۲)

اہل کمال معاصرین کا خراجِ عقیدت | حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر ایسا متقن، وسیع النظر محقق اور جامع عالم پیدا نہیں ہوا، اور ہندوستان اور پاکستان کے متاخرین محدثین میں ملا محمد عابد سندی المتوفی ۱۲۵۷ھ کے بعد سید انور شاہ کے سوا کوئی حافظ حدیث نہیں گذرا۔

علامۂ موصوف بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے، اور اس دور میں اللہ تعالیٰ کی زبردست حجت اور برہان تھے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں ایک موقع پر علامہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

سالت الشیخ العلامۃ التقی النقی	میں نے خدا ترس، پاک طینت، شیخ العلامہ
الذی لم تر العیون مثلہ ولم	انور شاہ جن کا مثل آنکھوں نے نہیں دیکھا
یرھو مثل نفسہ ولو کان فی	اور نہ خود انھوں نے اپنا مثل دیکھا ہے

سالف الزمان لکان لہ شأن فی طبقۃ اہل العلم عظیم وھو سیدنا ومولانا الانور الکشمیری ثم الدیوبندی اطال اللہ بقائہ عن تفسیر اوائل سورۃ النجم وتحقیق رویۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربہ فقرر الشیخ تقریراً حسناً بلیغاً جامعاً لاشتات الروایات واطراف الکلام منبہاً علی اغوار القرآن فالتمست منہ ان یقیدہ بالکتابۃ لتعم الفائدۃ فاستجاب لملتمسی وعلی اللہ اجرہ مع وجود الشواغل الکثیرۃ[1]

اگر وہ گذشتہ زمانے میں ہوتے تو اہل علم کے طبقہ میں ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے سردار مولانا انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں تادیر قائم رکھے، میں نے ان سے سورۂ النجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار الٰہی کی تحقیق کے متعلق درخواست کی تھی جس کو انھوں نے شرف قبول بخشا اور نہایت نفیس اور فصیح و بلیغ تقریر کی جس میں متفرق روایات اور بحث کے تمام گوشوں کو سمیٹ لیا ہے، اور قرآن مجید کی گہرائیوں پر تنبیہ فرمائی ہے، پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں تاکہ اس کا فائدہ عام ہو جائے، انھوں نے گوناگوں مشغولوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان لی اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے۔

مفسر عثمانی آیت شریفہ قل یااہل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم، ج ۱، ص ۳۳۵

نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ کی تفسیر میں حیات مسیح علیہ السلام کے موضوع پر علامہ کے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"اس موضوع (حیات مسیح علیہ السلام) پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقائہ نے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" میں جو علمی لعل وجواہر ودیعت کیے ہیں ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی"۔

اور آیت شریفہ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً کی تفسیر میں روح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس (بحث) میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم سید انور شاہ صاحب اطال اللہ بقائہ نے فرمایا ہے"۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فیض الباری علی صحیح البخاری پر جو تقریظ لکھی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں

قال الشیخ تاج الدین السبکی فی حق القفال المروزی، کان اماماً کبیراً وبحراً عمیقاً غواصاً علی المعانی الدقیقۃ، نقی القریحۃ ثاقب الذھن، عظیم المحل کبیر الشان، دقیق النظر، عدیم النظیر (فی زمانہ) اھ

شیخ تاج الدین سبکی نے قفال مروزی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ بلند پایہ امام اور علم کے گہرے سمندر، دقیق معانی کے غوطہ زن، پاکیزہ طبع، روشن دماغ، باعظمت، بلند مرتبت، دقیق النظر اور یگانۂ عصر عالم تھے،

وحکی قول ابن السمعانی فیہ ا
کان وحید زمانہ فقہاً
وحفظاً وورعاً
ھذہ کلمات کنت ارای انھا
حق ذالک الامام، وصادقتھا
تصدق فی نابغۃ الھند الشھیر
وعالمہا بحر العلوم مولانا السید
محمد انور شاہ الکشمیری
ثم الدیوبندی رحمہ اللہ
سواء بسواء من غیر شطط
والحواء، فکان اماماً کبیرا
وبحرا عمیقا غواصا علی المعانی
الدقیقۃ الی اخر ما قال
لم اکن فی عداد اصحابہ وتلامذتہ
غیر انی وفقت للاستفادۃ
من صحبتہ ومجالسہ ومذاکرتہ
(فی المشکلات والغوامض)
برھۃ غیر قصیرۃ ومن لطالع
کتابی فتح الملہم علی شرح صحیح

اور ان کے متعلق ابن السمعانی کا بیان
نقل کیا ہے کہ وہ فقہ، حفظ حدیث اور
ورع وتقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔
یہ کلمات میں نے اس امام موصوف کے
بارے میں پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں
کہ یہی کلمات ہندوستان کے مشہور و
معروف عالم بحر العلوم سید محمد انور شاہ
کشمیری ثم دیوبندی رحمہ اللہ پر بھی
پورے پورے صادق آتے ہیں اور
اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہو کیونکہ یہ بھی
بلند پایہ امام، علم کے گہرے سمندر تھے
انھیں دقیق معانی تک رسائی حاصل
تھی ۔۔۔۔۔۔
میں نہ انکے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ
میرا ان کے ہم سبقوں میں شمار ہے،
بس مجھے انکی صحبت اور مجلسوں میں انکے
ساتھ مشکلات فن اور دقیق مسائل
میں مذاکرہ سے ایک زمانہ دراز تک
استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے جو کوئی

مسلم تبین لہ ذالک[1]
(ملاحظہ ہو مقدمہ فیض الباری ص ۱۸)

میری کتاب فتح الملہم شرح صحیح مسلم کا مطالعہ
کریگا اس پر یہ حقیقت روشن ہوجائیگی۔

مورخ ہند مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ موصوف کی جن الفاظ میں تصویر کھینچی ہے
وہ بھی دیدنی ناظرین ہے، فرماتے ہیں:-
"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی
اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور
ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال
تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں
ماہر، شعر وسخن سے بہرہ مند اور زہد وتقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں
کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم ومعرفت کے اس شہید نے
قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا ۔۔۔۔۔۔ حضرت مرحوم سے ملاقاتوں
میں علمی استفادہ کے موقعے ملتے رہے، ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے
یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوئے، اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے
کیونکہ وہ مشکلات سے عبور کرچکتا ہے، اب جب اس سے سوال کیا جاتا ہے
تو وہ شبہہ کے اصل منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دیکر خوش ہوتا ہے،
مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے،
ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے
مطالعہ سے بچی ہو۔"[1]

[1] ملاحظہ ہو یاد رفتگاں مکتبۃ الشرق آرام باغ کراچی ۱۹۵۵ء ص ۱۶۹ و ۱۷۰

علامہ سید انور شاہ کی جلالت علمی اور رفعت شان کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی جیسا عالم، بانی کسی موقعہ پر کسی علمی مسئلہ کی وضاحت کرتے اور وضاحت کی کہیں سید انور شاہ سے داد تحقیق ملجاتی تو ان کو بڑی مسرت ہوتی تھی، چنانچہ الافاضات الیومیہ میں مذکور ہے :-

"مولانا سہول احمد صاحب نے کچھ سوالات علمی فرمائے، حضرت والا نے اس سلسلہ میں فرمایا کہ اصول فقہ کا جو یہ مسئلہ ہے کہ "العبرۃ لعموم الالفاظ لا بخصوص المورد" اس میں میرے نزدیک اتنی قید اور ضروری ہے کہ وہ عموم مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو، دلیل اس کی وہ واقعہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سفر میں ہے اور بیہوش پڑا ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ روزہ رکھے ہوئے ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیس من البر الصیام فی السفر تو یہاں پر اس حدیث کے الفاظ تو عام ہیں ہر مسافر کے لیے، چنانچہ بعض نے یہی سمجھا مگر بعض صورت میں اذن صوم فی السفر سے اس کا تعارض ہوگا لیکن قرائن سے کوئی مجتہد ذوق یہ حکم کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عموم مقصود نہیں بلکہ اس قید کے ساتھ عموم مقصود ہے کہ جس کی ایسی حالت ہو جائے، اور جمہور کا یہی مذہب ہے بس معلوم ہوا کہ جمہور کے نزدیک اس اصولی مسئلہ میں عموم کے اندر عدم تجاوز از مراد متکلم کی قید معتبر ہے گو مصنفین نے تصریحاً اس کا ذکر نہیں کیا،

میں نے مرادآباد میں ایک وعظ میں یہ مضمون بیان کیا تھا اس میں مولانا انور شاہ صاحب مرحوم بھی تھے، بعد وعظ کے شاہ صاحب سے کسی شخص نے ایک مسئلہ دریافت کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ کیا تم نے سنا نہیں، ابھی تو وعظ میں (میری طرف اشارہ کر کے کہا) اس نے

مسئلہ بیان کیا ہے کہ اس قاعدہ میں یہ قید بھی ملحوظ ہے، پھر حضرت حکیم الامت دام ظلہم العالی نے فرمایا کہ اس سے مجھکو خوشی ہوئی کہ شاہ صاحب نے اس پر انکار نہیں فرمایا بلکہ اس سے اثبات فرمایا"[1]

ایک اور موقعہ پر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے موصوف کی حق پسندی اور کمال علمی و عملی کی داد تحقیق یوں دی ہے، فرماتے ہیں:-

مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریکات حاضرہ میں بہت سرگرم تھے، اور میں بالکل علیحدہ تھا لیکن باوجود اس اختلاف مشرب کے میرے رسالہ ترجیح الراجح سے بہت متاثر تھے اور کہتے تھے کہ صدیوں کے بعد یہ بات نظر آئی ہے کہ اپنی لغزشوں سے رجوع کر کے اس کو شائع کیا جاوے۔

یہی ایک بات حق پسندی اور کمال علمی و عملی کے لیے کافی ثبوت ہے جس کی اس وقت میں کہیں نظیر نہیں"[2]

انسان کا چہرہ اس کے خیالات اور علوم کا آئینہ دار ہوتا ہے، علامہ سید انور شاہ کا چہرہ اس حقیقت کا پورا پورا مصداق تھا، چہرۂ انور پر علم کا ایسا نور تھا کہ مسلمان ہی نہیں، کافر بھی اگر نظر بھر کر دیکھ لیتا تو پکار اٹھتا تھا کہ یہ چہرہ تو کسی بہت ہی بڑے عالم کا ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بیان ہے :-

"مولانا (انور شاہ) کسی جلسۂ مناظرہ (بھاگلپور) میں شریک تھے جس میں اور بڑے بڑے علماء موجود تھے، اس جلسہ کا صدر ایک ہندو کو بنایا گیا تھا جو بہت معمر اور تجربہ کار شخص تھا، وہ جس وقت جلسہ میں آیا اس نے سب علماء کو دیکھکر مولانا کے متعلق

[1] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ ج ۷، ص ۶۳ [2] ایضاً ج ۲، ص ۲۷۷

کہا کہ ان سب میں یہ بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں، واقعی غضب کا قیافہ شناس شخص تھا، کہ محض صورت دیکھ کر پہچان گیا کہ یہ سب سے بڑے عالم ہیں، حالانکہ اس وقت تک کسی کی تقریر بھی نہیں سنی تھی۔[1]"

علامہ سید انور شاہ ورع و تقویٰ کی صفات سے آراستہ اور محاسن اعمال اور مکارم اخلاق کے پیکر تھے، حق گوئی اور اتباع سنت کے بڑے دلدادہ تھے، اس کے آثار ان کے چہرے بشرے سب پر نمایاں تھے، ان کی ذات حقیقت میں نور علیٰ نور تھی۔

اردو کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق | علامہ سید انور شاہ نے درس و تدریس اور وعظ و تقریر میں طلبہ اور عوام کی سہولت کی وجہ سے اردو زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا، لیکن اردو زبان میں حقائق و علوم چونکہ منتقل نہیں ہوئے تھے اس لیے موصوف نے اردو میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کو پسند کیا، مگر جب اہل حق نے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کر کے علوم کو عام کرنا شروع کیا تو موصوف نے بھی اردو کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کا اندازہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:-

"مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب سے فرمایا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ اردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں، اس لیے میں کسی کی اردو تصانیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا تھا، لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن[2] دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو کی تصانیف میں بھی اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور

---

[1] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ ج، ص ۱۱۲ [2] حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف میں جو کتابیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں تفسیر بیان القرآن کا نام سرفہرست آتا ہے، اس کی وجہ موصوف کی اس فن سے مناسبت اور اس فن میں مہارت ہے، موصوف کا بیان ہے:- (باقی حاشیہ ص ۲۵۳ پر)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۲) "الحمد للہ میں اپنی کھلی ہوئی حالت رکھتا ہوں اس خیال سے کہ کسی کو دھوکہ نہ ہو اور جو بات میرے اندر منجملہ نعم الٰہیہ ہو اس کو بھی ظاہر کر دیتا ہوں اور جو نقص کی ہو اس کو بھی ظاہر کر دیتا ہوں، چنانچہ چار علوم جو بڑے ہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف ان میں سے دو سے مجھکو بقدر ضرورت مناسبت ہے، وہ بھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کی برکت سے ہے، ایک موقع پر یہ فرمایا تھا کہ تفسیر اور تصوف سے تجھکو مناسبت ہوگی، اگر اس وقت خیال آتا تو حدیث و فقہ کے لیے بھی دعا کرا لیتا اور یوں بقدر حاجت حدیث و فقہ سے بھی اللہ کے فضل و رحمت سے کام نکال لیتا ہوں مگر جس کو مناسبت کہتے ہیں وہ نہیں۔"

(الافاضات الیومیہ طبع تھانہ بھون ۱۹۳۹ء ج ۵ ص ۱۸۴ و ۱۸۵)

حکیم الامت کو تصنیف سے چونکہ زیادہ شغف اور دلبستگی نہیں تھی اس لیے تفسیر بیان القرآن میں موصوف نے بڑی محنت کی ہے، اس امر کا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہو:-

"ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کو تو علاوہ اور کاموں کے ڈاک ہی کا مستقل کام بہت ہے، فرمایا کہ نرے ڈاک کے کام سے مجھ پر تعب نہیں ہوتا، البتہ تصنیف کے کام سے تعب ہوتا ہے، سو تصنیف کا کام اب نہیں ہوتا، تصانیف میں تمام مضامین پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے تصنیف کا کام بہت بڑا ہے، پہلے دماغ میں تمام مضامین کا جمع کرنا، پھر مرتب کرنا، ان کو محفوظ رکھنا بہت ہی بڑی مشقت کا شغل ہے،

ایک سبب تصنیف کی دشواری کا میرے لیے یہ بھی ہے کہ کتابوں پر میری نظر نہیں، درسی کتابوں کے علاوہ اور کتابیں میں نے دیکھیں نہیں، ہاں درسی کتابیں پہلے بحمد اللہ اچھی طرح مستحضر تھیں، مگر اب ان میں بھی ذہول شروع ہو گیا، اور تصنیف کے لیے صرف درسی

(باقی حاشیہ ص ۲۵۴ پر)

جو بے وقعتی اردو کی کتابوں کی میرے خیال میں پہلے تھی وہ جاتی رہی۔ (ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ کا حاشیہ)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۳) کتابیں کافی نہیں، یہی وجہ ہے کہ میری تصانیف کا زیادہ حصہ غیر منقولات میں ہے اگر
میرے پاس کتابیں نہیں اور جو ہیں ان پر نظر نہیں، اور تصنیف بدون کتابوں پر نظر ہوئے مشکل ہے
جس کا اب تحمل نہیں۔" (الافاضات الیومیہ ج ۶ ص ۲۳۴ و ۲۳۵)

تفسیر بیان القرآن کی افادیت و اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب
جب اس فن کی مشہور تفسیریں نظر سے گذر چکی ہوں اور جو اشکال ان کتابوں میں حل ہونے سے رہ گیا ہے
موصوف نے اس میں حل کر دیا ہے اور بعض مقامات پر فخر رازی سے اونچی اور بہتر تفسیر کی ہے اور یہی اس
کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے، اس سلسلہ میں حکیم الامت کا بیان پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ تمہاری تفسیر میں کیا ہے، میں کہا کرتا ہوں کہ کسی مقام پر اشکال ہو
تو اول اور تفسیروں میں دیکھو، پھر اس میں دیکھو تب معلوم ہوگا کہ اس میں کیا ہے۔"

(حسن العزیز مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۳۸۶ھ ج ۲ حصہ سوم ص ۸۴)

اسی وجہ سے اکابر اہل علم اس تفسیر کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور ان ہی وجوہ سے موصوف کو اس
تصنیف ہی سے اس کی تکمیل کی بڑی آرزو تھی، چنانچہ حسن العزیز (ج ۲ ح ۳ ص ۴۲) میں مذکور ہے:

"ایک صاحب نے حضرت والا سے تفسیر بیان القرآن کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں ......
ان صاحب کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد فرمایا کہ زمانہ تصنیف تفسیر میں بالکل بیمار نہیں ہوا
کان بھی گرم نہ ہوا، اس زمانہ میں تھانہ (تھانہ بھون) میں طاعون بہت تھا، میں اللہ سے
دعا مانگتا تھا کہ اے اللہ میں تفسیر لکھنے سے پہلے نہ مروں۔"

اس اہم تفسیر کی تکمیل کی مدت بھی زیادہ نہیں ہے، حکیم الامت مقالات حسنہ ملقب بہ لمعان ال
فی رمضان الاربعین (ص ، طبع تھانہ بھون ۱۳۴۹ھ) میں فرماتے ہیں:-

دار العلوم دیوبند میں درس حدیث کی اہم خصوصیت

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) "تفسیر بیان القرآن اڑھائی سال میں لکھی گئی، اس عرصہ میں کوئی سفر نہیں کیا،
تفسیر اور مثنوی کی شرح لکھنے کا بہت شوق تھا، الحمد للہ کہ خدائے برتر نے میرے شوق کو پورا کیا۔"

حکیم الامت نے تفسیر بیان القرآن کے لکھتے وقت کن باتوں کا التزام کیا تھا، اس کے متعلق
موصوف کا بیان پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:-

"تفسیر میں میرا یہ التزام تھا کہ پہلے معری قرآن مجید لیکر اس کا خوب مطالعہ کرتا تھا، جب شرح صدر
ہو جاتا تو پھر تفسیروں کا مطالعہ کرتا، اگر وہ تفسیروں کے مطابق ہوتا تو درج کرتا، اگر محض
قرآن مجید کے مطالعہ سے شرح صدر نہ ہوتا تو پھر تفاسیر کی طرف رجوع کرتا، اگر تفاسیر کے
مطالعہ سے شرح صدر ہوتا تو درج کرتا ورنہ بارگاہ خداوندی میں نہایت ابتہال اور تضرع
زاری سے دعا کرتا تو کبھی عین دعا میں شرح صدر ہو جاتا اور کبھی آدھ گھنٹہ بعد، کبھی کبھی شرح صدر
ہونے کے انتظار میں دیر دیر تک ٹہلتا، پھر بعد شرح صدر تفاسیر کو دیکھتا اگر اس مضمون کی
تائید ان سے ہوتی تو درج کرتا ورنہ چھوڑ دیتا، اور میں نے کبھی تفسیر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا
بلکہ اکابر کی طرف منسوب کیا، ہاں بعض نکات کو اپنی جانب منسوب کیا۔

اس عرصہ میں طاعون کا بھی زور تھا، مجھے خدشہ تھا کہ تفسیر رہ نہ جائے مگر حق تعالیٰ کے فضل
سے میں اس عرصہ میں بیمار تک نہیں ہوا، البتہ بعض دفعہ معمولی زکام تو ہوا، اور اسی طرح
مثنوی کی شرح میں بھی اور بعد فراغت کے تعب کا ظہور ہوا اور خوب بیمار ہوا۔

اور عنوان جو تفسیر میں جلی قلم سے لکھے ہیں ان کے قائم کرنے میں نہایت دقت ہوئی اور یہ گویا
علوم قرآن ہیں، اور بعض جگہ بدلنے بھی پڑے، ایک شخص نے عرض کیا کہ گویا یہ تراجم بخاری ہیں
فرمایا ہاں، مگر تراجم مغلق ہیں یہ سہل ہیں،

تفسیر لکھنے کے زمانہ میں روپیہ بھی بہت آیا اور خوب کھایا اور بڑے بڑے منی آرڈر ذرا شبہ پر واپس کیے اور
پھر لوٹ لوٹ کر آئے۔" (مقالات حسنہ ص ۴۹ و ۵۰)

امتیازی شان طلبہ میں حدیث فہمی کا صحیح مذاق اور فقہ حدیث کا ملکہ راسخہ پیدا کرنا تھا، فقہ حدیث نہایت غامض علم ہے، اسی لیے محدثین اور فقہا کے مقابلہ میں فقہا، محدثین کی تعداد نہایت قلیل ہے، اس فن کے ماہرین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے "عجالہ نافعہ" میں چند ائمہ فن کو نام بنام گنایا ہے، دار العلوم دیوبند کے قیام کی اصل غایت اسی علم کی نشر و اشاعت ہے، اس فن میں اکابر دیوبند کا طریقہ انیقہ نہایت معتدل ہے، درس حدیث میں علامہ سید انور شاہ کے تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اکابر دیوبند کے طریقہ انیقہ کو سمجھنا ضروری ہے، اس کی وضاحت کے لیے علامہ سید انور شاہ کی وہ تاریخی تقریر جو موصوف نے ۱۳۲۹ھ میں عالم اسلام کے نہایت نامور فاضل اور وسیع النظر محدث علامہ سید رشید رضا المتوفی ۱۳۵۴ھ کی دار العلوم دیوبند میں آمد کے موقعہ پر کی تھی، پیش کرنا کافی ہے، اس اہم تاریخی تقریر کا موضوع "فقہ حدیث اور اکابر دیوبند کا طریقہ انیقہ" ہے، علامہ موصوف کی یہ تقریر عربی میں ہے لیکن طویل ہے اس لیے اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے :-

"مدرسہ دیوبند کی غایت و غرض درس حدیث اور فقہ حدیث ہے ...... ہمارے اکابر کا حدیث اور فقہ حدیث میں ایسا معتدل و بہتر طریقہ ہے، جس میں افراط و تفریط نہیں ہے، میری مراد اس سے یہ ہے کہ ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ) اکثر و بیشتر اصول اربعہ کی پابندی کرتے ہیں، اور وہ اس طرح سے کہ امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل کی اقتدا کرتے ہیں، بلکہ کبھی وہ حدیث مرفوع پر بھی اس کو ترجیح دیتے ہیں، امام شافعیؒ ہر باب میں اصح حدیث سے استدلال کرتے ہیں، امام احمدؒ اصح، صحیح، حسن اور ضعیف حدیث سے بھی جس کا ضعف کمتر درجہ کا ہو استدلال کرتے ہیں، اور وہ ان دونوں طریقے (اصح و صحیح اور حسن و ضعیف) کو درست سمجھتے ہیں، موصوف نے اپنی مسند

میں اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے، اور ابو حنیفہؒ ان قسموں کی تمام حدیثوں کو قابل عمل سمجھتے ہیں، اور اختلاف کی صورت میں ان کو ایک محمل پر جمع کرتے ہیں، اسی وجہ سے حنفیہ کے یہاں تاویلات زیادہ ہیں اور شوافع کے یہاں کے راویوں پر جرح زیادہ ہے، امام شافعیؒ پہلے امام ہیں جو بلا مؤید و عاضد اور شاہد حدیث مرسل کو قابل حجت نہیں سمجھتے ہیں۔

فن حدیث کے نکتہ شناس امام بخاریؒ نے امام مالکؒ و شافعیؒ کے اصول کو اپنایا اور اپنا خضر راہ بنایا، چنانچہ وہ صحیح بخاری میں اصح ما فی الباب کو لاتے ہیں، اور عمل سلف کی موافقت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث ذکر نہیں کرتے جو دوسری حدیث کے معارض و مخالف ہو، انھوں نے صلوٰۃ کسوف کے بیان میں دو رکوع والی حدیث پر اکتفا کیا اور اپنے اصول و قواعد کی پابندی کی، تین، چار اور پانچ رکوع والی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا،

امام مسلمؒ نے راویوں کی ثقاہت پر اعتماد کیا، چنانچہ انھوں نے باب الکسوف میں تین چار رکوع والی حدیثوں کو ہی نہیں بلکہ پانچ رکوع والی حدیث کو بھی جو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے (کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے) صحیح مسلم میں درج کیا ہے، امام بخاری نے تحقیق و تنقیح کی ہے اور امام مسلم نے اصول و قواعد کی رعایت کی ہے، ایسی اختلافی صورتوں میں ہمارے مشائخ توسط و اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، تشدد اور تساہل سے گریز کرتے ہیں اور متعارض حدیثوں کی ایسی توجیہ کرتے ہیں کہ جو غور سے سنتا ہے قبول کرتا ہے، اس کی مثال حدیث قلتین ہے، اس کو یزید بن زریع کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ہدبہ بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن حسان نے اذا بلغ الماء قلتین او ثلاثا، "جب پانی دو تین قلہ (بڑا مٹکا جس میں اڑھائی مشک پانی آتا ہے) ہو

وہ ناپاک نہیں ہوتا، لفظ تنویع (او) کے ساتھ روایت کیا ہے تو یہ تخمین واندازہ کے لیے ہے کہ جب دو تین قلہ پانی ہوگا تو ایک طرف سے دوسری طرف نجاست کا اثر نہ ہوگا اور امام ابو حنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا یہی اصل مذہب ہے، چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ اور شیخ ابن نجیم نے اس امر کی تصریح کی ہے، حدیث قلتین کے محمل کے تعین سے جو حدیثیں اس کے معارض تھیں وہ اپنے حال پر باقی رہیں اور معارضہ سے بچ گئیں، جیسے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت والی حدیث، اور سو کر اٹھنے والے کو پانی میں ہاتھ ڈالنے کی ممانعت والی حدیث، اور برتن میں کتے کے منہ ڈالنے والی حدیث، اپنے اپنے محل میں قابل عمل ہیں۔

اور اس کی مثال دیگر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والی حدیثیں ہیں، حنفیہ نے نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے پر قرآنی آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا وانصتوا لعلکم ترحمون جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو، اور حدیث رسول واذا قرئ القرآن فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو، اور حدیث من کان له امام فقراءة الامام له قراءة (جس کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے) سے استدلال کیا، اور انھوں نے حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن (سورہ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھا کرو) والی حدیث کی تاویل کی کیونکہ جس نے سورہ فاتحہ نماز میں نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی، اور یہ اس لیے کیا کہ آیت شریفہ کے شان نزول میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے، لہذا لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا (نہ خصوص مورد کا) نیز امام بیہقی نے کتاب القراءۃ میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت کے بارے میں اتری ہے اور حدیث واذا قرئ فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو،

صحیح حدیث ہے، امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد ابوبکر بن الاثرم نے اس کی تصحیح کی ہے، پھر امام مسلم نے باب التشہد میں حدیث کے ہر دو طریق، ابو موسیٰ اشعریؓ و ابوہریرہؓ کی تصحیح کی ہے اور بعد ازاں ابن خزیمہ، حافظ ابو جعفر جریر طبری، حافظ ابو عمر بن عبد البر، حافظ ابن حزم اندلسی ظاہری، حافظ زکی الدین عبد العظیم منذری، خاتم الحفاظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث کی تصحیح کی ہے، یہ تو اسناد کے اعتبار سے اس حدیث کا پایہ ہے، اور با عتبار تعامل سلف وائمہ تو اس پر صحابہ کرام کی بڑی جماعت امام مالک، احمد، ابو حنیفہ کا اس پر عمل ہے، اور ایسی حدیث جس کے راوی ثقہ ہوں پھر سلف کا عمل بھی اس کا مؤید ہو تو وہ حدیث صحیح ہے، وہ نہ کسی جرح سے متاثر ہوتی ہے اور نہ کسی قدح سے اثر پذیر۔

اور حدیث من کان له امام فقراءة الامام له قراءة کو شیخ ابن الہمام نے مسند احمد ابن منیع سے نقل کیا ہے، اور اس کی تصحیح بھی کی ہے، کیونکہ اس کی سند بخاری و مسلم شرط پر ہے، اور ابھی ابتک اس میں کسی علت کا سراغ نہیں لگ سکا ہے، اس کی سند یہ ہے اخبرنا اسحٰق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبد اللہ بن شداد عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث، اور پھر ترمذی کی ایک موقوف اور حدیث کی دیگر کتب میں ایک مرسل حدیث اس کی مؤید اور معاضد ہے، اب تو وہ بلاشبہہ صحیح ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ مولانا رشید احمدؒ نے حدیث عبادہؓ کی جو محمد بن اسحٰق کے طریق سے مروی اور اس کے سیاق لعلکم تقرأون خلف امامکم قالوا نعم یا رسول اللہ نهذ هذا قال فلا تفعلوا، الحدیث شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، لوگوں نے

عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ہم جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں، تو آپ نے فرمایا سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو، کی توجیہ میں فرمایا یہ اباحت اور جواز کی دلیل تو ہوسکتی ہے اوجوب کی دلیل نہیں، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر پڑھتے تھے، اسی بنا پر آپ نے ان سے دریافت فرمایا تھا کہ شاید تم میرے پیچھے پڑھتے ہو، انھوں نے جواب دیا جی ہاں تو آپ نے فرمایا بس سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو، کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں میں سورۂ فاتحہ کا نماز کے لیے پڑھنا متعین ہوچکا ہے، کہ امام اور منفرد کی نماز اس کے پڑھے بغیر نہیں ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے جواز کی علت یہ بتائی ہے کہ وہ قرآن کی تمام سورتوں میں نماز کے لیے متعین ہوچکی ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، امام اور منفرد کے حق میں اس سورہ کے پڑھے بغیر نماز کا نہ ہونا ظاہر ہے، اور مقتدی کے حق میں اس کا اثر کم سے کم اباحت ہوا، حنفیہ کا اس کے واجب ہونے پر اتفاق ہے البتہ اس کی اباحت و کراہت کا مسئلہ احناف میں مختلف فیہ ہے۔

اور ہمارے مشائخ نے مسئلہ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا اور باواز بلند آمین کہنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے ثابت ہے، اور اسی طرح رفع یدین اور اخفائے آمین بھی صحیح سند سے ثابت ہے، چنانچہ سنن ابی داؤد میں امیر المومنین عمرؓ اور علیؓ سے ترک رفع یدین اور اسی طرح اخفائے آمین صحابہؓ کی ایک جماعت اور سلف صالحین سے ثابت ہے، تو ایسی صورت میں ان دونوں باتوں کو سنت ہونا چاہیے، اب بحث صرف ترجیح میں رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی آغاز و انجام میں راہ راست کی توفیق دینے والا ہے۔

پھر مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تلمذ سے ہمارے شیخ عدل، حجۃ ہند وقت مولانا محمود حسن نے علوم کی تکمیل کی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے فیوض سے مستفیض فرمائے،

وہی اس وقت مدرسہ کے صدر مدرس ہیں، اس ملک میں ان ہی کی اسناد پر مدار ہے، موصوف اپنے مشائخ کے طریق حق پر قائم ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو روایات متعارضہ میں مطابقت پیدا کرنے اور تعارض کو رفع کرنے اور مشکلات حدیث کو حل کرنے کا ملکۂ خاص عطا فرمایا ہے بطور مثال ایک واقعہ پیش خدمت ہے، انھوں نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ کسوف کی نماز میں جو تعدد رکوع احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ آپ کے ساتھ خاص ہے، کسی خاص وجہ سے آپ نے ایسا کیا ہے لیکن امت کو آپ نے ایک ہی رکوع کی ہدایت کی ہے، چنانچہ فرمایا ہے صلوا کا حدث صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ (جو فرض نماز کہ تم عنقریب پڑھ چکے ہو اس جیسی نماز پڑھو، یعنی صبح کی ایسے ہی کسوف کی نماز پڑھو، میں نے عرض کیا کہ سادات شافعیہ تو اس تشبیہ کو تعدد رکوع پر محمول کرتے ہیں، و حدت رکوع پر نہیں، فرمایا یہ تو بدیہی کو نظری بناتا ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سب کی آنکھوں کے سامنے مجمع عام میں کسوف کی نماز متعدد رکوع سے پڑھی اور امت کے لیے تعدد رکوع ہی کو مشروع کرنا تھا تو پھر آپ نے جو صحابہ نے مشاہدہ کیا تھا اس کا حوالہ کیوں چھوڑ دیا اور صبح کی نماز سے تشبیہ کی طرف میلان فرمایا، یہ محض اس لیے کیا کہ آپ نے متعدد رکوع کسی اور عارض کی وجہ سے کیے تھے اور آپ نے امت کو نماز کے مشہور و معروف طریقہ کی طرف ہدایت فرمائی۔" (ملاحظہ ہو القاسم ج ۳ شمارہ نمبر ۲ ۱۳۳۰ھ دیوبند، ص ۲۹-۳۲)

اس تقریر سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بزرگان دیوبند نے جس طرح فقہ حدیث سے خصوصی اعتنا کیا اسی طرح اس فن کے مشکلات کے حل کرنے پر بھی خاص توجہ کی ہے، سید انور شاہ نے یہ کام بہمہ وجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا

(باقی)

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

از

جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی، ایم۔ اے، فاضل دیوبند

(۲)

درس حدیث میں تجدیدی کارنامہ علامۂ موصوف درس میں کتاب ہی نہیں پڑھاتے بلکہ علوم کا درس دیتے تھے جس سے طلبہ کے ذہن میں جلا، نظر میں وسعت اور معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا تھا اور انہیں اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا اور اس حیثیت سے طلبہ کے لیے یہ درس بڑی افادیت کا حامل تھا، اور ان کے معراج کمال کے لیے یہ بھی کچھ کم نہ تھا، لیکن درس حدیث میں علامہ موصوف کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی شرح میں ہر فن کا اجرا کیا اور جس طرح علامہ شرف الدین طیبی شافعی المتوفی ۷۴۳ھ نے احادیث کی شرح میں نقد حدیث کے فن کو برتا اور فن بلاغت کے اسرار و معارف اور لغت و کلام کے نکات کو سمجھایا اور ان فنون کو شرح حدیث میں جاری کر کے دکھایا ہے، اسی طرح علامہ سید انور شاہؒ نے درس حدیث میں تمام متداول علوم و فنون کو حدیث کی شرح میں برتنا اور ان کے اجرا کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے، اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مغز حدیث تک رسائی کے لیے جملہ علوم میں دستگاہ ضروری ہے۔

اس درس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے اس میں مشکلات علوم کو حل کیا ہے، اور فن کی دقیق باتوں کو سمجھایا ہے، ہندوستان اور پاکستان ایسے بہت سے جید علماء

گزرے ہیں جن کے حواشی و شروح نے مشکل سے مشکل کتاب کو پانی کر دیا ہے اور ان سے استفادہ آج آسان ہو گیا ہے، لیکن ایسے علما جنھوں نے کسی خاص فن کے مشکلات کو حل کیا ہو خال خال ہی ہیں، صرف علامہ سید انور شاہ کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی علوم کے مشکلات کو موصوف ہی نے سب سے زیادہ حل کیا ہے، ان وجوہ سے ان کے درس کی تقریروں (امالی) میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ امالی کی علمی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا، تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، ادب اور نحو کی متعدد امالی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور یہ سب ائمۂ فن کی امالی ہیں، اور بعض امالی تو ایسے ائمۂ فن کی ہیں جن کو مختلف علوم میں اجتہاد کا دعویٰ ہے، مگر ان میں سے کسی میں اس نوع کا تنوع اور ہمہ گیری نہیں ہے، فقہ کی امالی میں فقہی مسائل ہی سے بحث ہے اور لغت کی امالی کا دائرہ شعر و ادب تک محدود ہے، نحو کی امالی کا تعلق نحوی مسائل سے ہے، علامہ سید انور شاہ کی امالی میں ہر فن سے اعتنا ہے اور اس کے مشکلات کو حل کیا گیا ہے، اس لیے اس میں تنوع پایا جاتا ہے، اور اس کی حیثیت دائرۃ المعارف کی ہو گئی ہے، اس بنا پر یہ کہنا بیجا نہیں کہ علامہ موصوف کو اگرچہ نہایت محنتی اور ذکی تلامذہ ملے جنھوں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کے درس کی تقریروں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے قلمبند کیا، اور ان کے علوم نے علمی دنیا کو متعارف کرایا، جو ان کا ناقابل فراموش علمی احسان ہے،

ضبط امالی کے صفات اربعہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامۂ موصوف کے علوم کو قید تحریر میں لانے کے لیے محض ذکاوت و محنت ہی کافی نہ تھی، بلکہ علوم و فنون میں تبحر اور وسعت نظر بھی درکار تھی، جو ان صفات اربعہ سے آراستہ ہوتا وہی اُن کے درس سے پورا پورا استفادہ کر سکتا اور اُن کی درس کی تقریروں کو اچھی طرح قید تحریر میں لا سکتا تھا، اس حد تک یہ علامہ سید انور شاہ کے درس کے متعلق بے ساختہ وہ فقرہ زبان قلم پر جاری ہو جاتا ہے، ---------

جو علامہ محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے علامۃ الدہر شیخ محمد بن محمد البساطی المتوفی ۸۴۲ھ کے درس کے متعلق کہا تھا کہ

هذا الرجل لا ينتفع بكلامه	اس مرد کامل کی باتوں سے ماہر فن
لا ينبغي ان يحضر درسه الا	علما ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، اور
الاحذاق العلماء[1]	ان ہی کو اس کے درس میں حاضر
	ہونا سزاوار اور لائق بھی ہے،

علامہ سید انور شاہؒ کے تلامذہ کو علوم میں وہ حذاقت و مہارت حاصل نہ تھی جس سے وہ امام عصر کی درسی تقریروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے، اور قید تحریر میں لا سکتے، دوران مطالعہ میں امام عصر کی امالی میں کہیں کہیں جو بعض موٹی موٹی غلطیاں نظر آجاتی ہیں، وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ اس اہم کام سے عہدہ برآ ہونا اُن کے تلامذہ کے بس کا کام نہ تھا، مجھے اس کا اندازہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی امالی صحیح مسلم کے دیکھنے سے ہوا، جو انھوں نے مسلم شریف کے سبق میں علامۂ موصوف سے سُن کر قلم بند کی تھیں، حالانکہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے علوم کی تحصیل اس دور کے ارباب کمال سے کی تھی، اور فقہ، منطق، فلسفہ، اصول، اور کلام وغیرہ کی چوٹی کی کتابیں ان اساتذہ سے پڑھی تھیں، جن کے درس کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی، لیکن انھوں نے جیسی کچھ درسی تقریریں سمجھی اور لکھی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایسے محنتی اور ذکی طالب علم بھی امام عصر کی پوری باتیں سمجھ نہیں پاتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے عجز کا اعتراف امالی صحیح مسلم[2] میں کیا ہے، اور جس مقام پر جو بات سمجھ میں

---

[1] ملاحظہ ہو البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی، طبع قاہرہ ج ۲ ص ۲۴۸

[2] امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

نہیں آئی ہے، وہاں نقطے ڈال دیئے ہیں، علامۂ موصوف کے علوم کی عظمت اُن کے دل و دماغ میں ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ امالی اُن کو جان سے زیادہ عزیز تھی، اس کے گم ہو جانے کا ان کو ساری عمر افسوس رہا، اور وہ اس کی گم شدگی پر بڑی حیرت سے یہ شعر جس کو مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں بکثرت نقل کرتے ہیں، پڑھتے تھے،

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیماں گم شدی	ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

علامہ سید انور شاہؒ کے تلامذہ کا اُن کے علوم کو کما حقہٗ مدوّن نہ کر سکنے پر بھی امام شافعیؒ کا وہ قول یاد آتا ہے، جو انھوں نے امام مالکؒ کے معاصر امام لیثؒ بن سعد المتوفی ۱۷۵ھ کے متعلق فرمایا تھا، امام شافعیؒ کا قول یہ ہے،

اللیث افقه من مالك الا ان اصحابه ضیّعه،	امام لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے، لیکن امام لیث کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا،

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۱) کے ہاتھ آگیا تھا، موصوف نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا، اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے، (ملاحظہ ہو فتح الملہم، ج ۳ ص ۳۲۳) لیکن معلوم نہیں کیوں جامع امالی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے نام لینے سے گریز کیا،

ہمیں مولٰنا محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدہم کے توسط سے یہ مجموعہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے چھوٹے بھائی فضل احمد عثمانی سے دیکھنے کے لئے ملا تھا، گو یہ مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں، مگر علامہ سید انور شاہ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد کا حامل ہے،

یعنی لم یدونوا فقهه کما دونوا فقه مالك وغیره وان کان بعضهم قد جمع منها شیئاً	امام شافعیؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ امام لیث کے شاگردوں نے اُن کی فقہ کو مدوّن نہیں کیا، جس طرح امام مالک وغیرہ کی فقہ کو شاگردوں نے مدوّن کیا ہے، گو بعض تلامذہ نے اُن کے کچھ مسائل فقہیہ کو جمع کیا ہے، لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے،

یہی صورت علامہ سید انور شاہؒ کے ساتھ پیش آئی، اُن کے شاگردوں نے اُن کے علوم کو مدوّن نہ کر کے اُن کو ضائع کر دیا، آج اُن کی جو امالی ہم کو ملتی ہیں، وہ اُن کے علوم کا ایک شمہ ہیں، اور یہ بھی وہ باتیں ہیں جو اُن کے شاگردوں نے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق لکھ لی تھیں، اور علامہ نے بھی طلبہ کی استعداد کے پیش نظر بغیر طلب عام واقفیت کے لئے بیان کر دی تھیں، اگر رسائل محقق ہوتا، اور سوالات بھی علمی کرتا، تو امالی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا، کاش سید انور شاہ کو بھی کوئی ایسا شاگرد مل گیا ہوتا، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی کو حافظ شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ ملے تھے، کہ جب جی چاہا تقریر ضبط کرانے کے لئے خادم کو بھیج کر بلا لیا، یا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح انھیں بھی کوئی محمد عاشق پھلتی مل گیا ہوتا، جو باصرار اُن سے اُن کے علوم کو مدوّن کراتا، تو علمی دنیا اُن کی امالی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی،

علامہ سید انور شاہ کی امالی کو قید تحریر میں لانے کے لئے موزوں ترین شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی

---

[۵] ملاحظہ ہو الرحمۃ الغیثیہ بالترجمۃ اللیثیہ فی مناقب سیدنا الامام اللیث بن سعد از ابن حجر عسقلانی طبع بریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ ص ۹

کی تھی، وہ بڑے ذہین، طبّاع، اور علوم معقول و منقول میں حاذق تھے، انھیں افہام و تفہیم کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، زور بیان اور حسن ترتیب کا بھی ملکہ تھا، عربی تحریر و تقریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی، علامہ سید انور شاہؒ کو بھی اُن کے فہم و فراست پر پورا اعتماد تھا، اور یہ بھی علامۂ موصوف کی جامعیت، ژرف نگاہی اور وسعت معلومات کے قائل اور قدر دان تھے، اسی لئے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں جگہ جگہ ائمۂ فن اور کبار علماء کے اقوال کے ساتھ علامہ سید انور شاہؒ کے اقوال کو بھی زیب قرطاس کیا ہے،

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں بڑی محنت کی، اپنی پوری جوانی اس میں لگا دی تھی، پھر بھی وہ پوری نہ ہو سکی، قرآن مجید پر اردو میں حواشی اور تفسیر ان کا بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے آیندہ نسلیں اُن کی ممنون ہوں گی، لیکن اُن کے مرتبہ کا کام یہ تھا کہ وہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں کے مضامین اپنی زبان میں بیان کر جاتے تو عوام و خواص دونوں ان سے استفادہ کر سکتے، یا علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی صحاح ستہ پر امالی (درسی تقریروں) کو قید تحریر میں لے آتے، تو یہ علمی دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہوتا، اور اُن کی بقا کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ کام نہیں کیا، اُن کے مقابلہ میں سید انور شاہؒ نے اپنی فطری صلاحیتوں سے وہی کام لیا، جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا، ان کی اس دماغی فوقیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوتوں سے وہ کام لیا، جو اُن کے ہمعصروں کی دسترس سے باہر تھا، علوم قرآن و حدیث، فقہ، اصول، کلام و فلسفہ سے متعلق اپنی تالیفات اور امالی میں جس قدر مواد یکجا کر دیا ہے، وہ علوم کا گویا نچوڑ ہے،

تاہم علامہ سید انور شاہ کے بعض تلامذہ نے ان کے علوم کو جس قدر اور جس صورت میں

بھی مرتب و مدون کر دیا ہے، وہ بھی اہل علم کے لئے بڑا کارآمد اور قیمتی سرمایہ ہے اور آج علامۂ موصوف کے گوناگوں علوم میں تبحر کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ یہی امالی ہیں، گو ایک ہوشمند عالم کو مختلف موضوع پر اُن کے مختصر رسالوں کے مطالعہ سے ان کی جامعیت، جلالت شان، اور ہر ان میں مجتہدانہ بصیرت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے، لیکن جو تنوّع اُن کی امالی میں ہے، وہ تالیفات میں نہیں، کیونکہ اُن کے موضوع خاص ہیں جن کی بحث کے گوشے بھی مخصوص اور محدود ہوتے ہیں، اس کے برعکس درس کے حدود نہایت وسیع ہیں، اس میں بہت سے مسائل زیر بحث آجاتے ہیں،

علامہ سید انور شاہؒ کی امالی اگرچہ پوری صحاح ستہ پر ہیں، لیکن العرف الشذی علی جامع ترمذی، فیض الباری علی صحیح البخاری اور معارف السنن جس میں علامۂ موصوف کے مشکلات علوم کی توضیح و تشریح کی ہے، امالی علی صحیح مسلم، امالی علی سنن ابی داؤد، امالی علی سنن ابن ماجہ زیادہ اہم ہیں، اول الذکر تین کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کی سرزمین پر پہلی اور آخری ہیں، ہند و پاک میں علوم سے معمور ایسی مفید اور جامع کتابیں کبھی نہیں لکھی گئیں، میں جب ان امالی کو دیکھتا ہوں تو استاد اور شاگرد دونوں کو دعائیں دیتا ہوں۔

ان امالی میں علامہ سید انور شاہؒ نے اس زمانہ میں حنفی مذہب کو حدیث کی بنیاد پر جس طرح مستحکم کیا ہے، وہ حقیقت میں اُن کا بڑا کارنامہ ہے، اکثر مواقع پر علامۂ موصوف کی دقت نظر اور علوم و فنون میں حذاقت ان کو متقدمین کی صف میں بھی ممتاز و نمایاں کر دیتی ہے، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء پھر کمال یہ ہے کہ اُن کی تنقید کے الفاظ میں ایسی احتیاط ہے کہ ادب کا پہلو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف باینہمہ علم و فضل اخلاق و تقوی کے کیسے بلند مقام پر فائز تھے،

اکابر دیوبند کے کمالات جانچنے کا معیار

اکابر دیوبند میں محقق عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی امام سُنت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس اللہ اسرارہم کے علمی وعملی کمال کے جانچنے کا جو صحیح ترین معیار ہے، بحمد اللہ اس معیار پر علامہ سید انور شاہ کشمیری پورے اترتے ہیں، یہ حقیقت پسندانہ معیار بھی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے بتادیا ہے، فرماتے ہیں:

"لوگ کہتے ہیں کہ رازی اور غزالی پیدا ہونا بند ہوگئے، مگر بالکل غلط ہے، ہمارے حضرات رازی اور غزالی سے کم نہ تھے، علوم میں بھی کمال میں بھی،

بات یہ ہے کہ حیات میں قدر نہیں ہوتی، مرجانے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ اور پچاس برس گذر جانے کے بعد قدس سرہ ہوجاتے ہیں، اور تماثل کے معلوم ہونے کا بڑا اچھا معیار ہے، اُن کی تحقیقات کو بھی دیکھ لیا جائے، اور ان حضرات کی بھی، اس سے معلوم ہوجائے گا[1]،

عارف تھانویؒ حسن العزیز میں فرماتے ہیں،،

ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرا دیا جائے، اور بتلایا جائے تو دیکھنے والے رازی وغزالی کے زمانہ کی تبلادیں گے[2]،،

جس کو اس امر میں تامل ہو وہ علامۂ موصوف کی تصانیف کا موازنہ قدمار کی تصانیف سے کرکے دیکھ لے حقیقت آشکارا ہوجائے گی، مثلاً تکفیر کے موضوع پر جن ائمۂ فن نے قلم

[1] ملاحظہ ہو: الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ طبع کراچی ج ۲ ص ۲۹۹
[2] ملاحظہ ہو حسن العزیز (ملفوظات حکیم الاُمت مولانا اشرف علی تھانوی) شائع کردہ مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون، بھارت ج ۲ ص ۳۰۴ و ۳۰۰،

اٹھایا، اُن میں حجۃ الاسلام امام غزالی ابن حزم ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ کا نام سرفہرست ہے، لیکن جیسی جامعیت استیعاب مباحث اور تنقیح مناط علامہ سید انور شاہؒ کے رسالہ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین (مجلس علمی ڈابھیل سورت) میں ہے، ان ائمہ کے یہاں نہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا دعوی کس حد تک صداقت پر مبنی ہے،

علامۂ موصوف نے اپنی خداداد فہم وفراست اور ذکاوت وبصیرت سے اپنے رسائل اور امالی میں مشکلات علوم کو جس طرح حل کیا ہے، ان کو بلحاظ جامعیت، وسعت نظر، عالمانہ تدقیق اور کمال فن بڑے بڑے اہل کمال ائمہ کی تحقیقات کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے، اسکی توضیح سے مضمون کتاب بن جائے گا، اسلئے ہم اُس کی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں،

کتاب الایمان کی معرکۃ الآرا بحث "الایمان یزید وینقص" میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ شیخ عبدالوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ اور علامہ ابو محمد علی بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ کا قول پیش کرنے کے بعد علامہ سید انور شاہ کا قول نقل کیا ہے[1]

اس مسئلہ پر کہ کفار بھی معاملات میں مخاطب ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ اور علامہ بدرالدین عینی کا کلام نقل کرنے کے بعد حافظ سید انور شاہ کا فیصلہ نقل کیا ہے[2]،

نزول عیسیٰ کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم میں سید انور شاہ کی پُرمغز بحث کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے[3]،

اسی طرح معراج کے باب میں آیت شریفہ ولقد راٰہ نزلۃً اخری کی توضیح

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۵۹ [2] ایضاً ص ۱۸۲ [3] ایضاً ص ۳۰۱؛

وتشریح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار الٰہی کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے صرف علامہ سید انور شاہؒ کے کلام کو نقل کیا ہے، اور کسی اور محقق کے کلام کو پیش کرنے کی حاجت نہیں سمجھی ہے[1]،

حدیث شریف نورٌ انّی اراہُ کی تشریح میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں مشہور شارح بخاری شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی مازری مالکی المتوفی ۵۳۶ھ کا قول نقل کرنے کے بعد سید انور شاہ کا قول پیش کیا ہے، پھر یہ لکھا ہے، ولا یخفی ما فیہ من اللطافۃ[2]،

اسی طرح مسح رُبع راس (چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت) کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فقیہ ابو الولید محمد بن رشد مالکی المتوفی ۵۹۵ھ اور محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ وغیرہ کی بحث کے بعد علامہ سید انور شاہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے[3]،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وضو میں سات مرتبہ پاؤں دھونے کے متعلق حافظ ابو زکریا محی الدین نووی المتوفی ۶۷۶ھ کا کلام نقل کرنے کے بعد علامہ عثمانیؒ نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی توجیہ پیش کی ہے، اور علامہ سید انور شاہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جو مستدل پیش کیا ہے، وہ نقل کیا ہے، یہ مستدل ان دونوں حفاظ حدیث کی نظر میں نہیں آیا[4]،

علامہ موصوف کی تحقیقات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کا فیضان آج بھی اس امت پر ویسا ہی جاری و ساری ہے، جیسا کہ پہلے تھا، ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۴ھ نے حدیث ان اللہ یبعث علی راس کل مائۃ من یجدد لہا دینہا پر بحث کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے،

ان ھذا التجدید امر اضافی   یہ تجدید ایک امر اضافی ہے، کیونکہ

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱، ص ۳۳۵ [2] ایضاً ص ۱۴۱ [3] ایضاً ص ۲۹۰،
[4] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱، ص ۳۹۳،

لان العلم کل سنۃ فی التنزل
کما ان الجہل کل عام فی
الترقی وانما یحصل ترقی علماء
زماننا بسبب تنزل العلم
فی اداننا والا فلا مناسبۃ
بین المتقدمین والمتاخرین
علما وعملا وحلما وفضلا
وتحقیقا وتدقیقا[1]،

علم سال بسال گھٹتا جا رہا ہے، اور
جہل بڑھتا جا رہا ہے، ہمارے دور
کے علماء کی ترقی ہمارے علم کے تنزل
کے سبب سے ہے، ورنہ متقدمین اور
متاخرین علماء میں علم و عمل، حلم و
فضل اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے
کوئی مناسبت ہے،

یہ کوئی حکم کلی نہیں ہے، متاخرین علماء میں جو ارباب کمال اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، ان میں علامہ سید انور شاہؒ بھی داخل ہیں، سچ ہے،

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
نقصان زقابل است وگرنہ علی الدوام   فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

موصوف کی علامہ سید انور شاہ کے الفاظ سے شہرت کی وجہ

علامہ سید انور شاہ کشمیری اکثر ایسی اونچی بات کہتے ہیں جس کو بغیر تمہید و ترتیب مقدمات طلبہ کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اس امر کا صحیح اندازہ ایک مدرس مزاج انسان ہی کر سکتا ہے، جس طرح علمی دنیا میں دقت نظر، علوم عقلیہ میں مہارت، اور جلالت علمی کی وجہ سے علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ کو علامہ سید شریف جرجانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح محمد انور شاہ کو اہل علم کے طبقہ میں علامہ سید انور شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے،

[1] ملاحظہ ہو مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح از ملا علی قاری مطبوعہ میمنہ مصر ۱۳۰۹ھ ج ۱، ص ۲۴۸،

جن اہلِ علم نے اس خوانِ علم کی زلہ ربائی کی وہ آسمانِ علم کے درخشاں ستارے بنے اور اس عہد کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوا، ان میں جو وسعتِ نظر پیدا ہوئی وہ علامہ سید انور شاہ کے حلقۂ درس کا فیضان ہے، ایسے ہی نامور تلامذہ کو مولانا سید سلیمان ندوی نے دائرۂ علم سے تعبیر کیا ہے، یادِ رفتگاں میں لکھتے ہیں:

"بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپردِ قلم کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمان اعظمی محمود، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے[۵۱]"

شکل پسندی اور مختصر نگاری

حقیقت و صداقت، عقیدت و محبت سے بلند ہے، اس لئے علامہ انور شاہ کے کمالات کے ساتھ اس کا بھی اعتراف ہے کہ ان کی طبیعت میں شکل پسندی اور مختصر نگاری تھی، اس لئے ان کی تحریر و تقریر کو عوام کیا خواص کے لئے سمجھنا بھی مشکل ہے، ان کی تقریر کے متعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے، فرماتے ہیں:-

"وہاں (تھمله) کے بعض معززین تعلیم یافتہ صاحبوں نے مولانا انور شاہ صاحب سے کہ وہ بھی اسی سفر میں تھے، اعجاز القرآن پر بیان کرنے کی فرمائش کی، چنانچہ بیان کیا گیا، مضمون غامض تھا، وہ لوگ بھی نہیں سمجھے، پھر ان پر اعتراض کیا گیا کہ ایسے بیان سے کیا نفع جو سمجھ میں ہی نہیں آیا، یہ بیان تو مدرسۂ دیوبند میں بیٹھ کر کرنا تھا، اس کا جواب بھی وعظ میں میں نے ہی دیا کہ شاہ صاحب نے

[۵۱] ملاحظہ ہو یادِ رفتگاں، طبع کراچی ۱۹۵۵ء ص ۱۵۳،

جو ایسا بیان کیا ہے، وہ اضطراراً نہیں کہ سہل بیان پر قادر نہیں، بلکہ ایک مصلحت سے قصداً بیان کیا ہے، اور مصلحت یہ ہے کہ آج کل مدعیانِ علم بہت زیادہ پیدا ہوگئے ہیں، اور اجتہاد کا دروازہ کھل گیا ہے، حتیٰ کہ انگریزی پڑھ پڑھ کر قرآن و حدیث کا اردو ترجمہ دیکھ کر علوم میں دخل دینے لگے ہیں، تو شاہ صاحب نے دکھلا دیا کہ تم اہلِ علم کے کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ قرآن و حدیث میں اجتہاد کر سکو،

بتلائیے اس بیان سے یہ نفع تھوڑا ہوا کہ تم کو اپنے جہل پر اطلاع ہوگئی، سب شرمندہ ہوگئے، مجھ کو جاہلوں کا علماء پر اعتراض کرنا بھی ناگوار ہوتا ہے، اس لئے بھی یہ جواب دیا گیا"[۵۲]

اسی شکل پسندی اور مختصر نگاری کی بنا پر ان کے قلم سے جو دو چار رسالے نکل گئے ہیں، ان کو بڑے سے بڑا محقق بار بار مطالعہ کے بغیر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ فاتحہ خلف الامام جیسے پامال موضوع پر جب علامہ نے قلم اٹھایا، تو ایسا رسالہ لکھا کہ اہلِ علم کو اشتہار میں یہ لکھنا پڑا کہ بڑے بڑے علماء اس کو مشکل سے سمجھ سکتے ہیں، اس لئے معمولی استعداد کے لوگ طلب کرنے کی زحمت نہ کریں،

یہ عجیب و غریب اشتہار، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی نے کلیات شیخ الہند کے سرورق کی پشت پر دیا تھا کہ:

"فصل الخطاب فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ

[۵۲] ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافادات القومیہ طبع تھانہ بھون ۱۳۶۱ھ ج ۶ ص ۱۶۶،

مضامین کافی الحقیقت بے مثل رسالہ جو اکابر محدثین کی تصنیفات کا سچا نمونہ
دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے عربی
زبان میں بکمال انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھے
ہیں، کم استعداد مولوی طلب نہ فرمادیں[1]"

علامہ سید انور شاہ میں اگر تصنیف و تالیف کا اچھا سلیقہ ہوتا، اور ان میں مشکل
پسندی ایجاز، اور مختصر نگاری نہ ہوتی، اور اُن کو اپنے معاصر محدث ناقد شیخ محمد زاہد
کوثری کا پیرایۂ بیان اور ترتیب و تہذیب مل جاتی، اور یہ کام اُن کے ہاتھوں انجام
پاتا، تو دنیا میں صحاح ستہ کے سمجھنے کے لئے کسی اور کتاب کی حاجت نہ رہ جاتی، اور
کسی کو اس پر قلم اٹھانے کی گنجائش باقی نہ رہتی، مگر اُن بے نفسوں کو اخفائے حال
میں اتنا اہتمام تھا کہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ دنیا میں اُن کو عالم کی حیثیت سے پہچانا جائے،
بزرگوں کے جبر نے تدریس پر بھی آمادہ کیا، ورنہ اُن کو یہ بھی گوارا نہ تھا،

---

[1] ملاحظہ ہو کلیات شیخ الہند، مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۰ھ

تذکرۂ رحیمی

(اپنے خاندان کا تذکرہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

نامور و باکمال شخصیات کے تذکرے وسوانح عمریاں عموماً ان کی وفات کے بعد لکھی جاتی ہیں تا کہ ان کے مکارم اخلاق وکارنامے آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ کا کام دیں، یہاں جن نامور شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان کی منجملہ دیگر خصوصیات، ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ انہوں نے غیر علمی شہر میں رہ کر اپنی اولاد کی تربیت کچھ اس انداز سے کی کہ ان کا مزاج سراپا علمی و تحقیقی بن گیا اور ان کا فیض دور تک پہنچا، نیز یہ بھی ان کی حسنات سے ہے کہ ان کے خاندان کا تذکرہ پہلی بار قلمبند ہوا۔

ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ خاندان کے بعض افراد کا ذکر بھی اس میں آیا ہے وہ بحمد اللہ بقید حیات ہیں، انہیں میں نے جب دیکھا اور پایا ان کے متعلق اپنے تاثرات ومشاہدات صفحۂ قرطاس پر نقل کرتا چلا گیا، میں انہیں اس دور میں خیر خلف خیر سلف کا مصداق سمجھتا ہوں، ممکن ہے اخلاف میں کسی کی طبع نازک پر کوئی بات گراں گذرے لیکن یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آدمی کے فخر کے لئے یہی کافی ہے کہ اس کی خامیاں بتائی جائیں تا کہ لوگ سمجھ سکیں کہ ان چند باتوں کے سوا اس میں سب خوبیاں ہیں، یہ باتیں دراصل اس کے کمال کا اعتراف ہے۔

میں عقیدت کو حقیقت سے بالاتر نہیں سمجھتا چنانچہ میں نے اپنی دانست میں اس مختصر تذکرے میں بزرگوں کی خوبیاں وخامیاں بیان کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے جہاں تک ہوسکا تصویر کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ہم ''خذما صفا و دع ما کدر'' (وہ لو جو ستھرا ہے جو میلا ہے چھوڑو)۔ پر عمل کر کے اپنے اسلاف کا نمونہ بن سکیں، یہی وہ دعا ہے جس کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے۔

رب اوزعنیی ان اشکر نعمتک التی	اے میرے رب، مجھے توفیق دے کہ میں تیرے
انعمت علی و علیٰ و الدی	اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں جو تو نے مجھ پر
و ان اعمل صالحا ترضاہ وادخلنی	اور میرے والدین پر کیا ہے اور اپنی رحمت سے
برحمتک فی عبادک الصالحین	مجھ کو اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔

(سورۃ النمل: آیت نمبر ۱۹)

محمد عبدالحلیم چشتی

۱۷/اپریل/۱۹۸۵ء

سینئر لائبریرین بیرو یونیورسٹی، کانو، نائیجریا۔

یہ تحریر چوبیس برس پہلے لکھی تھی جن کے متعلق لکھا تھا ان میں سے اکثر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میں نے اب ان میں چند مفید معلومات کا اور اضافہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سے پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچے اور اسے حسن قبول حاصل ہو۔ (آمین)

محمد عبدالحلیم چشتی

۲۸/ذی الحجہ ۱۴۳۰ھ بمطابق ۱۶/دسمبر ۲۰۰۹ء

مشرف تخصص فی الحدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ

علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

تذکرۂ رحیمی

از

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

ہیں حسیں اور بھی پر تجھ میں ہے بات نئی
دھج نئی، گھات نئی، وضع نئی، بات نئی

میں نے جب آنکھیں کھولیں گھر کا کیا ذکر آس پڑوس تک سے صبح سویرے قرآن شریف پڑھنے کی آواز آتی تھی۔ اپنے بزرگوں کو قرآن مجید پڑھتے، خوشنویسی اور اللہ اللہ کرتے دیکھا کسب معاش کے لئے سوداگری کرتے تھے، یہی ان کا آبائی مشغلہ تھا، دس گیارہ بجے دن چڑھے دکان پر جاتے اور دن چھپے گھر آتے کھانا کھاتے نماز پڑھتے یاد اللہ کرتے کرتے سو رہتے تھے۔

محمد بخشؒ :۔ ہمارے دادا محمد بخشؒ المتوفی ۱۳۳۷ھ بمطابق 1919ء کے اللہ بخشے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑے محمد عبدالغنی، منجھلے حافظ محمد عبدالکریم اور سب سے چھوٹے محمد عبدالرحیم تھے۔

محمد عبدالغنیؒ :۔ غالباً ۱۲۷۷ھ بمطابق ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے جنہیں ہم بڑے ابا کہتے تھے، کتابی چہرہ اور دراز قد تھے، ڈاڑھی لمبی اور رنگ صاف تھا، ممکن ہے جوانی میں ڈیل ڈول اچھا ہو میں نے انہیں بڑھاپے

میں دیکھا تھا جب وہ ڈھل چکے تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند نیک ومتقی تھے، اپنا دھندا کرتے اور مست رہتے تھے، ان کی پہلی بیوی کا انتقال ہوگیا اس کے بطن سے دو بیٹیاں ہوئیں ایک کا نام صفیہ اور دوسری کا نام حمیدہؒ تھا دونوں صاحب اولاد تھیں صفیہ کا انتقال متھرا میں ہوا اور حمیدہؒ کا انتقال کراچی میں ہوا، دوسری شادی غالباً ۱۸۹۸ء میں کی، جن سے ایک لڑکی فاطمہ تھی اور تین لڑکے محمد عبد المغنی، محمد عبد الخالق اور مصطفیٰ تھے، مصطفیٰ سب سے چھوٹا تھا۔ اس نے میٹرک کیا پھر تجارت کرنے لگا لیکن عمر نے وفا نہ کی جوانی ۱۹۳۹ء میں داغ مفارقت دے گیا، بڑے ابا کو جب اس کی یاد آتی تڑپ اٹھتے سچ ہے۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

محمد عبد المغنیؒ:۔ موصوف ۷ اشعبان ۱۳۱۸ھ بمطابق ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۳ء میں بی۔اے کیا، ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل کیا، ۱۹۲۸ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا، ۱۹۳۰ء میں آبکاری کے محکمہ میں ملازم ہوئے، کچھ ہی دنوں بعد ۱۹۳۰ء میں مہاراجہ کالج جے پور میں لیکچرار کی آسامی پران کا تقرر ہوا، ۱۹۳۶ء میں ایم۔اے کو پڑھانے لگے اور پروفیسر ہوگئے، جب ۱۹۴۷ء میں راجپوتانہ یونیورسٹی کا جے پور میں قیام عمل میں آیا تو عربی وفارسی کے صدر شعبہ رہے، ۱۹۵۲ء میں اس منصب سے سبکدوش ہوئے، اس زمانے میں یہ ڈگریاں اور یہ منصب شہرت کا اچھا ذریعہ تھے، یہ وہ دور تھا جب انگریز بہادر کا طوطی بولتا تھا، اور اس کی قلمرو میں سورج نہیں ڈوبتا تھا مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا بہت کم چلن تھا پھر راجستھان اور جے پور میں خاص طور پر مسلمانوں میں کسی کالج سے۔بی۔اے کر لینا ہی بڑی بات تھی۔ایم۔اے اس دور میں بہت بڑی بات تھی، ایم اے کرنے والا اس دور میں بڑا خوش نصیب ہوتا تھا، میں اگر یہ کہوں کہ راجپوتانہ میں پروفیسر صاحب پہلے ایم۔اے تھے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔دوسرے مسلمان پروفیسر حامی الدین خان تاریخ کے ایم۔اے تھے۔

موصوف نے ۱۹۳۷ء میں جب ہماری زیریں منزل پر بالائی منزل تعمیر کرائی، جس کے استعمال کا انہیں جدّی اعتبار سے حق حاصل تھا، اس منزل کے بالائی حصہ پر نہایت جلی حروف میں ابا میاں نے ''محمد عبد الغنی۔ایم۔اے۔منشی فاضل، پروفیسر مہاراجہ کالج جے پور'' بھی لکھ کر کندہ کرایا تھا جسے ہر آتا جاتا

پڑھتااوران کے منصب سے آگاہ ہوتا تھا۔

انہوں نے معلوم ہوتا ہے طالب علمی کے زمانے میں اتنا پڑھ لیا تھا کہ پھر انہیں کتاب سے مراجعت کی کم ہی حاجت ہوتی تھی میں نے انہیں ایم۔اے کے پرچے جانچتے دیکھا ہے کتاب پڑھتے کم ہی دکھائی دیئے، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے، حضرت حافظ شبیر علی چشتیؒ اور حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوریؒ کے مجاز بیعت بھی تھے۔(۱)

ان کی زندگی بہت آسودہ وخوش حال گذری ہے یہ ''دنیا خورد وعقبیٰ برد کا مصداق تھے، میری سب سے بڑی بہن عائشہ آپا کے جو ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئی تھیں، ان کے شوہر تھے۔ ۱۹۴۷ء میں اہلیہ کے ساتھ حج کیا پھر ۱۹۶۷ء میں انہیں دوبارہ یہ سعادت حاصل ہوئی، سو یہ بھی چل بسے، اللھم اغفر له و ارحمه و انت خیر الراحمین۔ ان کے چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں، سب سے بڑے بیٹے۔ محمد عبدالقدوس ہیں۔

محمد عبدالقدوس:۔ یہ ۱۳۴۴ھ بمطابق ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے، منشی فاضل کیا اور پھر ایم۔اے کیا یہ عمر میں مجھ سے تین برس بڑے ہیں، کمشنر آفس کراچی میں گورنمنٹ ملازم تھے، بھٹو کے دور حکمرانی میں جب شریفوں پر بن آئی تھی، عزت سے سبکدوشی حاصل کی، موصوف کی پنشن پر گذر بسر ہے کنبہ بڑا نہیں رکھتے ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہے، لڑکی بھی ایم۔اے تھی، اس کی شادی آغا بھائی کے لڑکے حافظ محمد عبدالودود ایم۔اے سے ہوئی تھی اس کا بھی انتقال ہوگیا، یہ بینک میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدہ پر ممتاز رہے اور ان کا بیٹا محمد عبدالقوی ہے اس نے بھی ایم۔ایس۔سی کیا ہے اور اس کے بعد سینڈوز کمپنی میں ملازمت اختیار کی بعد میں کسی اور پرائیویٹ کمپنی میں ملازم رہا، اور اب اپنے والد کے ساتھ مستقلاً مسی ساگا کینیڈا منتقل ہوکر وہیں کی سکونت اختیار کرلی ہے اور الحمدللہ بقید حیات ہیں۔

محمد عبدالوھاب:۔ یہ ۱۳۴۸ھ بمطابق ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے، ایم۔اے کیا ہے۔ بھولے بھالے

(۱) تاریخ وفات مورخہ ۷رجمادی الثانی سن ۱۴۰۷ بمطابق ۸رجنوری ۱۹۸۷ء۔ یہ چاشت کی نماز کے لئے وضو کررہے تھے دایاں پاؤں دھویا تھا کہ دل کا دورہ پڑا اور دن گیارہ بج کر بیس منٹ پر ہوا تھا غسل کے فرائض مولانا نعمانی کی نگرانی میں بھائی غضنفر صاحب نے انجام دیئے۔ اللہ مغفرت کرے۔ آمین۔

ہیں ریش مبارک بالکل سفید ہوگئی ہے۔ جو دیکھتا ہے کسی خانقاہ کا درویش سمجھتا ہے اسکول میں پڑھاتے تھے، باتیں مزے کی کرتے تھے مردوں سے زیادہ خاندان کی خواتین اور لڑکیاں ان کی باتوں سے مزے لیتی تھیں، یہ بزرگ دیدنی وشنیدنی تھے، بہت ہی مختصر کنبہ رکھتے ہیں نہ پوچھیں تو اچھا ہے ایک لڑکا عبدالقادر ہے اسے بزرگی وسادگی میں باپ سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ عبدالوھاب کا بھی مورخہ ۱۰ مئی ۲۰۰۹ء کو انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفرله و ار حمه و انت خیر الر احمین۔

ڈاکٹر محمد عبدالباری عرف شمیم :۔ یہ ۱۳۵۳ھ بمطابق ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کیا عابدہ خاتون سے جو ایف۔ آر۔ سی۔ ایس تھی شادی کی پھر لندن جا کر خود بھی ایف۔ آر۔ سی۔ ایس کیا، ناک، کان، حلق کا اختصاصی ڈاکٹر تھا۔ پھر مسقط صلالہ میں ملازمت اختیار کی۔ عابدہ خاتون سے ایک لڑکی ہے جس کا نام ڈاکٹر عارفہ ہے اس کی شادی بھی اس کے والد ہی نے کی تھی اس کے بعد ۱۹۸۸ء میں ڈاکٹر عابدہ خاتون کا بھی انتقال ہو گیا، دوسری شادی شمیم نے اپنے عزیزوں میں کی جس سے ایک لڑکا عمر ہے۔

محمد عبدالباسط عرف نسیم :۔ یہ ۱۳۵۹ھ بمطابق ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوا، ایک اسکول میں استاد ہے، اس کا کنبہ بڑا ہے، بیگم بھی ایم۔ اے ہے اور خود بھی ایم۔ اے ہے۔ اب میاں بیوی دونوں رٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں اور خوش ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔

پروفیسر صاحب کی چار لڑکیاں ہیں۔

زھرہ :۔ یہ حافظہ ہے عبدالتواب سے اس کی شادی ہوئی ہے، اس کے آٹھ لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں، جن میں دو عالم ہیں۔ عبدالمعز اور دو لڑکیاں حافظہ ہیں اور باقی ڈاکٹر انجینئر ہیں۔

قدسیہؒ :۔ اس کی شادی عبدالرؤف سے ہوئی، اس کی چار لڑکیاں ہیں اور چار ہی لڑکے ہیں، اس کی بھی ایک لڑکی خالدہ حافظہ ہے اور فرح بھی حافظہ ہے۔

اُم الخیر عرف زاہدہ: ۔یہ ایم۔ایس۔سی ہے اس کی شادی ڈاکٹر عابدہ خاتون کے بھائی حفیظ الرحمٰن سے ہوئی یہ نواب شاہ گرلز میڈیکل کالج سندھ میں لیکچرار تھی اور میڈیکل کالج سندھ کراچی سے رٹائر ہوئی۔اس کے تین لڑکے ہیں۔

اسماء: ۔یہ سب سے چھوٹی ہے، ایم۔اے ہے دہلی اسکول کراچی میں پڑھاتی تھی۔

محمد عبدالخالق: ۔پروفیسر صاحب سے چھوٹے ہیں ۱۳۲۴ھ بمطابق ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۳۱ء میں بی۔ایس۔سی کیا، ۱۹۳۵ء میں ریلوے میں ہیڈ کلرک رہے اور ۱۹۶۹ء میں سپرنٹنٹ کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔

ان کی شادی عائشہ آپا کی چھوٹی بہن ہاجرہ آپا سے ہوئی تھی وہ ایک لڑکی سردار زمانی کو چھوڑ کر جوانی میں اللہ کو پیاری ہوگئی غفر اللہ لہاوجعل الجنة مثواھا، یہ محمد عبدالقدوس صاحب کے عقد نکاح میں تھی، اس کا انتقال ۱۹۹۸ء میں ہوا۔محمد عبدالخالق صاحب فارغ اوقات میں طلبہ کو میٹرک کی تیاری کراتے تھے، یہ چھوٹا موٹا تعلیمی ادارہ ان کے گھر ہی میں قائم تھا، یہ ادارہ اپنی نوع کا غالباً پہلا ادارہ تھا اور علم کی بقا اور ان کی آمدنی کا اچھا ذریعہ تھا، اس عارضی تعلیمی ادارہ کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ جے پور میں ان کے شاگردوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا اور ۱۹۴۷ء کے جے پور میں پڑھے لکھے اکثر ان کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں۔

قوم جو حکمرانی کرتی ہے محکوم قوم اس کی تہذیب کو اپنا نا فخر سمجھتی ہے، خاندان میں پروفیسر صاحب کو پتلون پہنے ہیٹ لگاتے کبھی کبھی دیکھا، گھر میں انہیں انگریزی بولتے نہیں اخبار پڑھتے دیکھا تھا۔بھائی عبدالخالق صاحب کو انگریزی بولتے خوب دیکھا، ہیٹ لگانا اور نیکر پہننا تو گویا ان کی عادت سی تھی یہ اس وقت کی بات ہے لیکن قوم میں ایسے افراد کی کبھی کمی نہیں رہی جو شعوری یا غیر شعوری طور پر نظریہ درحیثیت دار (چلو ادھر کو ہوا ہو جدھر کی) کے قائل و عامل رہے ہیں۔جزرسی سے انہیں اپنے بھائی بہنوں میں زیادہ حصہ ملا ہے، آدمی اچھے اور مرنجان مرنج تھے، تقریباً ۱۹۵۷ء میں انہوں نے دوسری شادی کی اب ماشاء اللہ بڑا کنبہ ہے، ان کا ایک لڑکا محمد ذاکر مظاہر العلوم سہارنپور سے فارغ التحصیل ہے اور (مولانا حکیم

مفتی احمد حسن خان ٹونکی کے زیرنگرانی مفتی بھی بن گئے، باقی بچے انگریزی پڑھتے پڑھاتے ہیں)۔

الٰہی غنچۂ امید بکشا

گلی از روضۂ جاوید بنما

بخندان از لبان غنچۂ باغم

وزیں گل عطر پرور کن دماغم

مشقہ فقیر حقیر زین حافظ محمد عبدالکریم غفرلہ

مادہ تاریخ وفات عم محترم

حافظ فرقان مجید محمد عبدالکریم خیپوری

۱۹۴۶ء

حافظ محمد عبدالکریم:۔ یہ ۱۲۹۷ھ بمطابق ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔

حلیہ:۔ درمیانہ قد، آفتابی چہرہ، چوڑی پیشانی، چندیا صاف، موٹے اور توانا تھے، میرے بچپن میں ڈاڑھی میں مہندی لگاتے تھے، مزاج میں حدت تھی، سردی میں بھی کبھی پیشانی پر پسینہ آتا تھا، خوش خوراک و خوش پوشاک تھے، بچپن میں قرآن شریف حفظ کیا پھر حافظ ظفریاب خاں کو سنایا، انہیں قرآن مجید ایسا پختہ یاد تھا کہ پورا قرآن مجید محراب میں سناتے حفاظ سنتے رہتے کہیں متشابہ نہیں لگتا تھا، قرآن مجید سے انہیں بہت شغف تھا تجوید سے قرآن نہیں پڑھا تھا، لیکن ان کے مخارج ٹھیک تھے اور پڑھتے رہتے تھے، قرآن مجید سے انہیں سیری نہیں ہوتی تھی۔

خوشنویسی:۔ منشی بہاری لال جی اور ان کے چھوٹے بھائی منشی ہیرالال جی سے خوشنویسی سیکھی تھی۔ خط پختہ و پاکیزہ تھا بطور پیشہ اس فن کو کبھی نہیں اپنایا تھا لیکن فن کو قابو میں کیا ہوا تھا، بڑھاپے میں بھی ان کی مشق جاری تھی۔

ابتداء میں ترپولیہ بازار جے پور میں دکان پر سوداگری کرتے تھے، غالباً ۱۹۳۰ء میں دکان چھوڑی اور قرآن مجید کی خدمت میں لگ گئے ۱۹۳۰ء میں مدرسہ تعلیم الاسلام جے پور سے ایسے وابستہ ہوئے کہ آخر دم تک بچوں کو قرآن مجید پڑھاتے اور حفظ کراتے رہے، فارغ اوقات میں گھر پر بھی یہی مشغلہ تھا، خاندان کے بچوں بچیوں کو قرآن اور اردو فارسی پڑھاتے لکھنا سکھاتے تھے، اور خود بھی خوشنویسی کی مشق کرتے رہتے تھے، موصوف نے مدرسہ سے وابستہ رہ کر قرآن مجید کی ایسی خدمت کی کہ کم کسی کو نصیب ہوگی۔

جوانی میں رنگین مزاج تھے ستار بجاتے تھے، اور دل بہلاتے تھے، میں نے بچپن میں انہیں ستار بجاتے دیکھا تھا، لیکن (التائب من الذنب کمن لا ذنب له) جس نے گناہ سے توبہ کی اس نے گویا گناہ کیا ہی نہیں کا مصداق تھے۔ بہت وضع دار بزرگ تھے دوستوں اور ان کی اولاد کے حقوق کی بھی رعایت کرتے تھے ہر ایک کے دکھ درد میں کام آتے، صلہ رحمی ان کا شعار تھا سب قرابت داروں کا خیال رکھتے تھے سب سے ملتے، سب کی خدمت کرتے تھے، ان کی شخصیت بہت بارعب تھی، چھوٹا بڑا ہر ایک ان کا ادب و

لحاظ کرتا۔قرآن ان کے سینے میں نقش تھا ہر شخص ان کی تعظیم کرتا اور عزیز رکھتا تھا،طبیعت میں ایثار،مزاج میں انکساری تھی ،کاموں کا تجربہ تھا بصیرت اچھی تھی ان گوناگوں صفات کی وجہ سے خاندان میں بڑوں کی موجودگی میں سربراہی انہی کو حاصل تھی سچ ہے۔بزرگی بعقل است نہ بسال۔غرض خاندان میں ہر مرض کی دوا حافظ جی تھے،ہم انہیں حافظ جی ابا کہتے تھے۔

حافظ جی ابا کے کوئی اولاد نہ تھی ان کی اہلیہ شکور آپا بی بی اور میری اماں بی حبیباً بی بی دونوں سگی بہنیں تھیں، میری سب سے بڑی ہمشیرہ عائشہ آپا اور میرے سب سے بڑے بھائی مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کو انہوں نے گود لیا تھا، عائشہ آپا کی شادی میری ولادت سے بہت پہلے ہوگئی تھی ،اس لئے ان کو تو میں نے ان کے مکان میں رہتے نہیں دیکھا ،ابا میاں کو چچا جان کہتے سنا ہے ابا میاں کو ان کے شوہر بھی چچا جان کہتے تھے، ممکن ہے اسی نسبت سے وہ بھی ابا میاں کو چچا جان کہتی ہوں مولانا نعمانی کو میں نے حافظ صاحب کے یہاں کھاتے پیتے رہتے سہتے دیکھا ہے لیکن ان کی زبان سے ہمیشہ ابا میاں کو ابا میاں کہتے ہی سنا اور دیکھا ہے۔

حافظ صاحب ہم سب کے مربی تھے ہمیں غصہ کے ذرا تیز لگتے تھے،مگر میں نے انہیں مولانا نعمانی یا بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم ندوی صاحب پر کبھی خفا ہوتے نہیں دیکھا یا تو یہ دونوں سدا کے نیک تھے کہ ان کے خلاف مزاج کوئی بات نہیں کرتے تھے یا وہ از راہ شفقت ومحبت ان سے چشم پوشی کرتے تھے یا ہمارے سامنے ڈانٹنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے،یا ان کی طرف سے مطمئن تھے،اللہ انہیں غریق رحمت کرے مجھ پر تو بہت ہی مہربان تھے یا پوش مبارک سے میری تواضع کرتے تھے کیا مجال ہے ابا میاں،اماں بی ،یا کوئی چھڑائے یا ان سے دو لفظ کہے یا میری ہمدردی کرے، گھر میں ایک بڑی بوڑھی تھیں جنہیں ہم منی اماں کہتے تھے اور ابا میاں انہیں پھوپھی منی کہتے تھے اللہ انہیں جنت نصیب کرے ان سے نہیں دیکھا جاتا وہ بیٹھی صدا لگاتی کہ بہت پتھر دل ہے اس کے اولاد نہیں دوسروں کی اولاد کا اسے کیا درد ایسا مارے ہے توبہ توبہ کبھی چوک میں جوتے پڑتے تو وہی آکر چھڑاتی تھیں۔ہائے وہ دوسروں کی اولاد کو کب مارتے تھے وہ تو اپنی اولاد سمجھ کر مارتے تھے ان کے یہاں دوئی کب تھی اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے وہ

میری خیر خواہی کرتے تھے، انہوں نے بہت کوشش کی کہ مجھے قرآن حفظ کرائیں لکھنا پڑھنا سکھائیں تجارت سکھائیں لیکن میں ایسا بد شوق اور نکما، نالائق واقع ہوا تھا کہ پٹتا تھا میری سسکیاں بندھ جاتی تھیں مگر سبق یاد ہی نہیں کرتا تھا سچ ہے۔ **تہی قسمت راچہ سود از رہبر کامل**

اپنی جہالت میں اضافہ ہی کرتا رہا ان کی عنایت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ وہ جب کہیں جاتے مجھے ساتھ لیتے، راستے میں سبق یاد کراتے، میلے ٹھیلے میں لے جاتے، کھیل تماشے دکھاتے، مٹھائی دیتے، دلجوئی و دلداری کرتے طرح طرح سے بہلاتے، وقت ضائع نہ ہونے دیتے، اپنی گرفت میں رکھتے، غیرت دلاتے مگر میری روش میں فرق نہیں آتا، میں نہیں کہہ سکتا کہ انہیں میری اس روش سے کیسا کچھ دکھ پہنچا ہوگا اور میں نے انہیں کتنا آزردہ کیا ہوگا، ان کی برداشت و خیر خواہی دیکھئے، اور میری بدخواہی ملاحظہ فرمائے، میں انہیں دل میں کوستا، اللہ معاف کرے ایسے ناصح و مشفق کو کیا کچھ دل میں کہا ہوگا میری کیفیت بالکل ایسی ہی تھی جیسا قرآن نے کہا ہے۔ (و لکن لا تحبو ن النا صحین) تم خیر خواہوں کو نہیں چاہتے، اللہ تعالیٰ انہیں ان کی دلسوزی و ہمدردی کا اپنی شایان شان بدلہ دے وہ کیسے شفیق و محسن تھے اور ہم کیسے نالائق و ذلیل۔ **اللھم اغفر له و وسع مدخله و ارحمه، و اجزه عنا خیر الجزاء.**

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے میری نالائقی و بدشوقی کو دیکھ کر معلوم نہیں بارگاہ الٰہی میں میرے لئے کس درد و اخلاص و دلجمعی سے دعائیں کی ہونگی کہ میں اس لائق ہوسکا کہ آج ان کے متعلق دو لفظ لکھ سکا ورنہ اس کے سرچشمہ و فیض سے کتنے بندگان خدا سیراب ہوئے یہ سعادت کس کے حصہ میں آئی۔ **اللھم واعف عنه و ارفع درجته، و اجعل الفردوس منزله۔**

میں جب ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد دکن سے آیا، منشی کیا اور عربی پڑھنے لگا تو ایسے پیار سے مجھے اچھے میاں کہہ کر یاد فرماتے کہ دل پسیجنے لگتا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی مراد برآئی جو چاہتے تھے وہ پالیا باتیں اس انداز سے کرتے جیسے کوئی اپنے بڑے سے کرتا ہے، میں ان کے اخلاق کریمانہ کو دیکھ کر دل میں پشیمان ہوتا اللہ اکبر کیا اخلاص وللہیت تھی۔

بہت نفاست پسند تھے ان کا کمرہ اور بسترہ نہایت صاف اور ستھرا رہتا ہر چیز قرینہ سے جگہ پر رکھی ہوتی

تھی کمرے کی دیواروں پر طغرے آویزاں تھے قرآنی آیات وسبق آموز وعبرت انگیز اشعار سے جو نامور خوشنویسوں کے لکھے ہوئے تھے، کمرہ سجا ہوا تھا یہ چیزیں ہر آنے والے کے قلب ونظر کو اپنی طرف کھینچتی تھیں، سرہانے گھنٹہ لٹکا ہوا تھا اس کے پاس ایک وصلی پر ان کے ہاتھ سے یا کسی خوشنویس کے قلم سے نہایت خوش خط حسب ذیل شعر لکھا ہوا تھا۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

ان کا ذکر بھی مولوی احترام الدین شاغل عثمانی مرحوم نے اپنی کتاب ''صحیفۂ خوشنویساں میں حسب ذیل الفاظ میں کیا۔

حافظ عبدالکریم:۔ جے پور وطن تھا۔ بساط خانہ کی تجارت کرتے تھے، منشی احسان الٰہی نارنولی کے شاگرد تھے اور عبدالرحیم خاطر کے برادر کلاں، صرف خط نستعلیق لکھتے تھے، خفی وجلی دونوں کی یکساں صفائی وشان تھی۔ جے پور میں انتقال ہوا۔

وفات:۔ آخری وقت برادر محترم آغا بھائی سورۂ یٰسین سنا رہے تھے کہ ایک جگہ متشابہ لگا تو دوبارہ پڑھنے کا اشارہ کیا اور جب صحیح پڑھا بس آخری ہچکی آئی اور جان جان آفرین کے سپرد کردی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مادۂ تاریخ وفات

حافظ فرقان مجید محمد عبدالکریم (۱۹۴۶ء) علامہ روزگار حافظ عبدالکریم (۱۹۴۶ء)

حافظ عبدالکریم (۱۳۶۶ھ) (۱۹۴۶ء)

محمد عبدالرحیم خاطر جیپوری

نام ونسب:۔ محمد عبدالرحیم بن محمد بخش بن بلاقی بن چراغ محمد بن ھمت رحمھم اللہ تعالیٰ۔

ولادت:۔ موصوف نے تقریباً اٹھتر ۷۸ سال کی عمر میں وفات پائی تھی اس حساب سے سال ولادت ۱۲۹۵ھ بمطابق ۱۸۷۸ء قرار پاتا ہے۔

حلیہ:۔ گول چہرہ، دراز قد، کشادہ پیشانی، کشادہ سینہ، چندیا پر تھوڑے تھوڑے بال، موٹی آنکھیں بھری اور لمبی ڈاڑھی گلابی رو اور ڈیل ڈول اچھا تھا، بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے، ماں باپ کے فرمانبردار اور لاڈلے تھے۔

تعلیم وتربیت:۔ ابامیاں نے حافظ ظفریاب خان صاحب رام پوریؒ سے قرآن شریف پڑھا تھا اور منشی تک مہاراجہ کالج جے پور میں تعلیم حاصل کی، اس کالج سے فارسی میں منشی کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔(۱)

ابامیاں کو اردو فارسی دونوں زبانوں میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ زبان وادب کا ذوق ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا، ان کے ادبی ذوق سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو فارسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا، عربی کی تحصیل کسی مدرسہ میں رہ کر نہیں کی تھی، انگریزی اور ہندی کی عبارت بھی لکھتے تھے جو ان کی زبان وادب سے طبعی مناسبت محنت وذہانت کی روشن دلیل ہے حافظہ و یادداشت اچھی تھی جو پڑھتے یاد رہتا تھا۔

---

(۱) شمس العلماء مولانا عبدالرحمٰن جے پوری:۔ صاحب مرأۃ الشعراء اور مترجم مقدمہ ابن خلدون جو دہلی کے مشن کالج میں عربی وفارسی زبان کے پروفیسر تھے اس میں ۲۰ برس پڑھایا تھا کراچی میں ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا۔ یہ ابامیاں کے مہاراجہ کالج جے پور میں ہمسبق تھے۔ میں بھی مولانا نعمانیؒ کے ساتھ ان سے ملا تھا دراز قد وجیہہ خوبصورت وخوب سیرت تھے اردو فارسی کے ادیب وشاعر اور ادب عربی کے بالغ نظر عالم تھے جے پور کے وہی ایسے عالم تھے جنہیں انگریزی سرکار نے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا تھا۔

تلاوت قرآن وادعیہ ماثورہ:۔ انہوں نے قرآن مجید اگرچہ تجوید سے نہیں پڑھا تھا لیکن قرآن صاف اور خوش الحانی سے پڑھتے تھے اور مخارج بالکل درست تھے، ان کی قرأت میں درد و کیف اور دلکشی وجاذبیت تھی، وہ تلاوت شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدین دہلوی کے اردو ترجمہ والے مصحف میں کرتے تھے، نماز میں جو رکوع اور سورتیں پڑھتے تھے ان کے معانی و مطالب سمجھتے تھے، اس لئے جب پڑھتے ان پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی جس سے سننے والا بھی لطف اٹھاتا اور متأثر ہوتا تھا، وہ پارہ تبارک الذی کے علاوہ سورۃ التغابن، سورۃ یٰسین، سورۃ الطارق، سورۃ الحشر، سورۃ الصف، سورۃ المنافقون، سورۃ الجمعہ، سورۃ یوسف، سورۃ لقمان و سورۃ الفتح عموماً نماز میں پڑھتے تھے، انہیں حدیثیں بکثرت یاد تھیں، حدیثوں کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جملے انہیں زبانی یاد تھے، اسی طرح ادعیہ ماثورہ کا بیشتر حصہ انہیں یاد تھا۔ الحزب المقبول ازبر تھی۔ نماز کے بعد دعاؤں میں ادعیہ ماثورہ پڑھتے تو بلند آواز سے پڑھتے تاکہ بچوں کے کان ان دعاؤں سے مانوس ہو جائیں، اور یہ دعائیں انہیں بآسانی یاد ہو سکیں، کھانا کھانے کے بعد کی دعا، مسجد میں داخل ہونے اس سے نکلتے وقت کی دعا، سوتے وقت کی دعا ہمیں ان کے زور سے پڑھنے سے یاد ہوئی تھیں۔

شعروشاعری:۔ طبیعت موزوں پائی تھی، شعروادب سے طبعی مناسبت تھی، زبان وادب کا ذوق پاکیزہ وبلند تھا، اردو فارسی کے نامور شعراء کے ہزاروں شعر انہیں زبانی یاد تھے، برمحل پڑھتے تھے، گاہ بگاہ خود بھی شعر کہتے اور خاطر تخلص کرتے تھے، چنانچہ شاغل عثمانی نے موصوف کا تذکرہ صحیفۂ خوشنویساں میں کیا ہے نمونۂ کلام ہدیہ ناظرین ہے۔

حمد

حمد کے لائق تو ہی کرتا رہے — تو نے ہی پیدا کیا سنسار ہے

کرتا ہے تو عیب پوشی خلق کی — نام تیرا ساتر و ستار ہے

رحم کرتا ہے تو ہی اور تو ہی قہر — ہے تو ہی رحمان، تو ہی قہار ہے

عمر گذری ہے گنہ کرتے مجھے میں ہوں عاصی اور تو غفار ہے
ہوگی طے کس طرح راہِ پُل صراط سر پہ عصیاں کا بہت سا بار ہے
کچھ نہ کی نیکی اے خاطر جزبدی اس کی رحمت پر ہی بیڑا پار ہے

(مطبوعہ غنچۂ نوبہار مطبع ابوالعلائی، آگرہ۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء/۱۹۶۱ء بکرمی ہندی۔ ص ۲۸، ۲۹)

نعت

سلامُ اللہ وصلّی اللہ اے فیضانِ ربّانی تری صورت سے ظاہر ہے مکرم رحم و رحمانی
ترے دربارِ اقدس میں ہر اک کو باریابی تھی نہ پہرہ تھا، نہ چوکی تھی، نہ حاجب تھا، نہ دربانی
تری وہ شانِ ارفع ہے کہ جبریلِؑ امیں جیسے کیا کرتے تھے آ آ کر خوشامد سے مگس رانی

خدا توفیق دے تم کو تو اے خاطر کبھی تم بھی
شریکِ بزمِ اقدس ہو کے کرلو قلب نورانی

(مطبوعہ ''مظہر معرفت'' طبع شدہ ۱۹۳۵ء بحوالہ تذکرۂ شعرائے جے پور۔ ص ۳۶ مرتبہ احترام الدین شاغل)

نعت

ملا ہے تجھ کو پٹہ دوجہاں کی پاسبانی کا بجاتا ہے دوعالم ڈنکہ تیری شہجہانی کا
گرے بے ہوش ہوکر طور پر حضرت کلیم اللہ کھلا پھر بھی نہ کچھ عقدہ انہیں رازِ نہانی کا
برہمن ہوگیا مومن، شجر آیا، حجر بولا بیاں کیا ہو سکا مجھ سے تری معجز بیانی کا
ہوا منظور جب شاہِ دوعالم کو وصالِ حق نہ رہنا پھر پسند آیا انہیں اس دارِ فانی کا
یہ نعتِ احمدِ مرسل ہے اے خاطر، ادب سے لکھ ملے گا حشر میں ثمرہ تجھے اس جاں فشانی کا

(مطبوعہ غنچۂ نوبہار مطبع ابوالعلائی، آگرہ۔ ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴/۱۹۶۱، بکرمی ہندی۔ ص ۲۸، ۲۹)

(مطبوعہ غنچۂ نور بہار مطبع ابوالعلائی، آگرہ۔۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴/۱۹۶۱، بکرمی ہندی۔ص ۲۸، ۲۹)

نعت بحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم (بزبان فارسی)

اے شہنشاہ جمال واے کمالِ دلبری
وے شہِ خوبانِ عالم، سرورِ پیغمبری

ہر دو عالم جاں نثارِ نرگس شہلائے تو
نرگسِ بیمار کے آرد بچشمت ہمسری

خادمِ درگاہِ والائے تو جبریلؑ امین
عاشقِ شیدائے تو جنؔ و بشر حوٗر و پری

جلوۂ معراج تو اندر مکان ولا مکاں
از ملک ہم بہتری از انبیاء شُد برتری

حضرتِ موسیٰ کلیم اللہ شُد برکوہ طُور
تو کلیم اللہ شدی بر عرشِ خاص دادری

قم باذنی و انا الحق خودازیں جا گفتہ اند
دردلِ منصور سمسی کردۂ جلوہ گری

ایں تمنا دار خاطر از خدائے لایزال
بہر خلاق جہاں برسُوئے عاصی بنگری

آخری نظم

اے مری اردو زبان اللہ رے تیری یہ دھوم
کابل وزابل مدینہ اور مکہ شام و روم

جرمن و امریکہ جاپان وفرانس واندلس
سب جگہ پر بولتے ہیں تا بہ لندن بالعموم

قائد ملت(۱) نے تیرا خود کیا تھا انتخاب
جانتے تھے گو زبانیں اور بھی عالی جناب

سندھی پنجابی بلوچی بنگلہ وانگلش بھی سب
سب کی سب موجود تھیں پیش نظر زیر نصاب

تیرے سر سہرا بندھا اور تو ہی سرکاری ہوئی
اوج پر اردو ترے بنگالی اب حاسد ہوئی

رشک آتا ہے اسے اب ہائے میں سوکن بنوں
کیونکہ یہ تو سب جگہ جاری وساری ہوئی

شور وغوغا اب مچاؤ تا کہ ہووے کچھ فساد
ہے یہی بنیاد بنگلہ دیش کی اے خوش نہاد

یہ اشعار بالکل آخری ایام کے ہیں۔ جب کہ بنگالی اور اردو زبان کے درمیان تنازعہ پیدا ہوگیا تھا۔

(۱) قائد ملت لیاقت علی خان شہید مرحوم وزیر اعظم پاکستان۔

خوشنویسی:۔ نامور خوشنویس منشی ہیرالال مونس بہار گو آنجہانی سے سیکھی تھی، خط پاکیزہ و پختہ تھا نوک پلک، کشش اور دائرے دیکھنے کے لائق تھے، اس فن کو شوقیہ سیکھا تھا، پھر اسے بھی کسب معاش کا ذریعہ بنایا، فن خوشنویسی میں انہیں کمال حاصل تھا، خط نسخ و نستعلیق کے استاد تھے، خط غبار و شفیعہ کیا ہر نوع کا خط لکھنے پر قادر تھے، انگریزی ہندی لکھنے پر بھی پوری قدرت حاصل تھی، جلی و خفی دونوں خط بلا تکلف خوب لکھتے تھے، ان کے نوشتے پر کسی شاعر کا حسب ذیل شعر صادق آتا ہے۔

قابل دید اس کی ہے ندرت　　　نظر آتی خدا کی ہے قدرت

ان کے قطعات و وصلیاں دیکھئے مرصع نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، حرفوں کی ساخت اور ان کے جوڑ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جواہر جڑے ہوئے ہیں۔

کاتب نرا نہیں ہے مرصع نگار ہے　　　حرفوں کو کیا کہوں جو جواھر جڑے نہیں

وصلیوں پر اردو فارسی کے عبرت انگیز و سبق آموز اشعار لکھتے تھے جن سے ان کے پاکیزہ مذاق، للّٰہیت و دین سے شیفتگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں بعض بطور گلے از گلزار ے۔ مرقع رحیمی میں ملاحظہ فرمائیں۔

موصوف نے خوشنویسی کے فن میں ایسی بصیرت پیدا کی تھی کہ نامور خوشنویسوں اور ماہر خطاطوں کے قطعوں اور وصلیوں کو ان کے دستخطوں کے بغیر ایک نظر دیکھتے ہی طرز خط سے پہچانتے اور اساتذہ فن کے نوشتوں کے مابین فرق و امتیاز کو بتاتے تھے، ان کے طرز نگارش و خصوصیات قلم کو خوب جانتے تھے فرماتے تھے یہ عبدالرشید دیلمی کا قلم ہے یہ میر پنجہ کش کا لکھا ہوا ہے۔ یہ آغا مرزا کی تحریر ہے، یہ اعجاز رقم کا شاہکار ہے، یہ پروین رقم کا نوشتہ ہے۔

ایسے ارباب بصیرت اور اساتذۂ فن متحدہ ہندوستان میں معدودے چند تھے، جے پور میں ان کا اس فن میں کوئی ہمسر نہ تھا، حیدرآباد دکن میں ان کا سارا وقت دفتر میں پورا ہو جاتا تھا، فن کے مظاہرہ کا وہاں کوئی موقعہ نہ تھا، ساری عمر جے پور میں گوشۂ گمنامی میں بسر ہوئی اس لئے ان کی شہرت پورے ہندوستان

میں نہ ہوسکی۔

شادی:۔ والدین نے ان کی شادی ان کے بڑے بھائی حافظ محمد عبدالکریم صاحب کے ساتھ کی تھی دو حقیقی بھائیوں کو دو حقیقی بہنیں شکوراً بی بی اور حبیباً بی بی بیاہی گئیں۔

دکان:۔ غالباً ۱۹۰۰ء میں کسب معاش کی خاطر ترپولیہ بازار میں نواب فیاض علی خان صاحب کی حویلی کے نیچے بساط خانہ کی ایک دکان کی تھی، یہ دکان کیا تھی جے پور کی نامور شخصیات کی بیٹھک اور چھوٹی موٹی علمی اکیڈمی تھی، یہاں سوداگری وکتابت کی جاتی اور خوشنویسی سکھائی جاتی تھی، علمی چرچا رہتا تھا سہ پہر کو یہاں علماء، شعراء، صوفیا اور ہندوستان کے مشاہیر اہل علم جن کا ورود جے پور میں ہوتا آتے تو علمی گفتگو شعر و سخن کی باتیں ہوتیں لطیفے بیان ہوتے تاریخی واقعات معرض بحث میں آتے تھے۔ جے پور میں یہی اس دکان کی وہ خصوصیات تھیں جن میں یہ سب سے ممتاز و یکتا تھی۔

میں نے بچپن میں صوفی ہدایت علی نقشبندی رامپوری مولانا قدیر بخش بدایونی صدر مدرس مدرسہ تعلیم الاسلام المتوفی ۱۹۵۲ء (۱) مولانا بدرالدین سہوانی داماد مولانا شبیر احمد سہوانی، حافظ حمید اللہ پیش امام جامع مسجد جے پور حامد حسن خان ان کے بڑے بھائی حامی الدین خاں رامپوری، مولانا حیدر حسن خان شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ (۲) برادر خورد مولانا محمود حسن خان ٹونکی صاحب معجم المصنفین، سید طلحہ پروفیسر اورنٹیل کالج لاہور اور ہندوستان کے نامور لغوی ادیب مولانا ابوعبداللہ محمد سورتی المتوفی ۱۹۴۴ء جیسی نادرۂ روزگار ہستیوں اور پاکیزہ نفوس کو گفتگو کرتے دیکھا اور بھی شخصیات تھیں جن کی صورتیں یاد ہیں نام حافظہ میں محفوظ نہیں۔

ایک زمانے میں اس دکان پر اہلحدیثوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، ابا میاں دیندار و خدا ترس انسان تھے، حافظ یوسف مرحوم صاحب حقیقۃ الفقہ آتے انہیں حدیثیں سناتے دکھاتے کہتے یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے اسے مسلم نے نقل کیا ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا مسلک اس حدیث کے سراسر خلاف ہے، انہیں حدیثیں سننے کے بعد مجال سخن نہ تھی سر تسلیم خم کرتے اور عمل پیرا ہوجاتے ان کی یہ کیفیت تھی۔

اگر بخشے زہے قسمت، نہ بخشے تو شکایت کیا

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔

بچپن میں ابا میاں کو رفع یدین کرتے اور بلند آواز سے آمین کہتے دیکھا تھا، یہ اسی کا اثر تھا، اس دور میں ان پر اہلحدیثوں کا رنگ چڑھا ہوا تھا چنانچہ حافظ یوسف کی کتاب حقیقۃ الفقہ کی کاپی ابا میاںؒ نے لکھی تھی، اس کے آخر میں ایک قطعہ میں اس کی تاریخ طبع چھپی ہے فرماتے ہیں۔

اس سے ان کی حدیث وسنت سے گرویدگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے بھائی جان (مولانا نعمانیؒ) نے دوران تعلیم دکان پر جب اہل حدیث کے دلائل کو سنا اور ابا میاں کو حنفیہ کا مسلک جن احادیث وآثار پر مبنی تھا، ان سے آگاہ کیا، انہوں نے حافظ یوسف کو وہ حدیثیں دکھائیں بتائیں دونوں طرف سے احادیث کا تبادلہ ہونے لگا جس طرح شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے جواب نے ان کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہیدؒ کو لاجواب کیا تھا کہ ایک مردہ سنت پر عمل کرنے سے سو شہیدوں کا اجر اس وقت ملتا ہے جب اس کے مقابلے میں کوئی دوسری سنت موجود نہ ہو یہاں دوسری سنت آہستہ آمین کہنے اور رکوع کے وقت رفع یدین نہ کرنے کی موجود ہے یہ بات جب ابا میاں کے علم میں آئی، انہوں نے دونوں باتیں چھوڑ دیں۔(۱)

امیر دیر وحرم سے الگ جو جاتے ہیں　　وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں

یہ دکان جس کی حیثیت ایک مجلس علمی (Academi) کی تھی اس نے مولانا نعمانیؒ کو مناظرانہ ادب کے مطالعہ پر مائل کیا انہوں نے احناف کی کتابوں کو غائر نظر سے دیکھا ان کی بالغ نظری اور تفقہ کے قائل ہوگئے اسی تعلق سے وہ اپنے آپ کو نعمانی لکھتے ہیں۔

(۱) اہل حدیث اور ظاہر یہ میں فقہی بصیرت وگہرائی نہیں ہے اس لئے یہ (امام ابوحنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمد بن حنبلؒ) کے مسلک سے گریز کرتے اور شاذ حدیثوں پر عمل کر کے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں۔

یہ دکان ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھی اس سے گھر کا خرچ چلتا اور ان کے علمی ذوق کی تسکین ہوتی تھی اس لئے انہوں نے ۱۹۴۲ء میں دکان اس وقت چھوڑی جب ان کی آنکھیں جواب دے رہی تھیں اور اس پر بیٹھنے والا کوئی نہیں رہا تھا، یہ دکان جے پور میں بیالیس ۴۲ برس تک اہل علم کی بیٹھک رہی اور یہاں علم کا چراغ روشن رہا۔

مطبع رحیمی :۔ ابا میاں کے استاد منشی ہیرا لال جی نے غالباً ۱۹۰۰ء میں ایک پریس اپنے نام پر (ہیرا لال پریس) ترپولیہ بازار میں قائم کیا تھا۔ جس سے ہندی اور فارسی کی متعدد کتابیں شائع کی گئی تھیں، اُپنشد اور دارا شکوہ کی ''سر اکبر'' اس پریس میں اشاعت پذیر ہوئی تھیں، منشی ہیرا لال جی کے مرنے کے بعد ۱۹۲۱ء میں اس پریس کو ابا میاں نے خریدا، اور اس کا نام رحیمی پریس (مطبع رحیمی) رکھا یہ ترپولیہ بازار میں نواب صاحب کی حویلی کے سامنے واقع تھا، اردو کی بعض کتابیں اس پریس سے شائع کی گئی تھیں، مرآۃ الانساب، مولفہ ضیاء الدین امروہوی جس کی کاپی بھی ابا میاں نے لکھی تھی، ۱۹۳۵ء میں اس پریس میں پندرہ ہزار کی تعداد میں سفید اور حنائی کاغذ پر طبع کی گئی تھی، میں نے بچپن میں وہ پتھر دکان اور گھر پر دیکھے تھے۔

اس دور میں جن پریسوں نے جے پور میں اردو کی خدمت کی ان میں رحیمی پریس کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، انہی وجوہ سے شاغل جے پوری نے اس پریس کا تذکرہ اپنی کتاب ''صحیفۂ خوشنویساں'' میں کیا ہے۔

دفتر معجم المصنفین سے وابستگی :۔ ۱۹۳۸ء میں جب مولانا محمود حسن خان ٹونکی (۱) کی تالیف معجم المصنفین (جو عربی زبان میں ان علماء اسلام کے تذکرہ و تراجم پر مشتمل ہے جن سے کوئی تصنیف و تالیف یادگار رہے) کی تدوین و ترتیب نو کے لئے حیدرآباد دکن میں دائرۃ المعارف العثمانیہ کے زیر انتظام دفتر کا قیام عمل میں آیا اس میں مولانا نعمانی اور ابا میاںؒ کا تقرر بھی ہوا موصوف نے کم و بیش چھ ۶ برس یہاں کام کیا

---

(۱) ولادت تقریباً ۱۲۷۸ھ۔ انتقال ۱۳۶۶ء یہ مولانا حیدر حسن خان صاحب۔ سے چار برس بڑے تھے۔

اور۱۹۴۴ءمیں جے پور آ گئے۔

اخلاق وعادات:۔ اخلاق وعادات ایسی تھیں کہ ہر شخص ان سے مل کر خوش ہوتا کبھی کسی کو ان سے شاکی نہیں پایا۔جو احباب واہل علم دکان پر آتے نہایت خندہ پیشانی سے انہیں خوش آمدید کہتے خوش اخلاقی و انکساری سے باتیں کرتے خود بھی ہنستے اور ان کو بھی ہنساتے تھے۔

شفقت ومحبت:۔ وہ بہت نرم دل ونہایت شفیق تھے اولاد پر بہت شفقت فرماتے تھے آیت شریفہ

یاایھاالذین آمنو اان من ازواجکم واولادکم عدوالکم فاحذروھم وان تعفواوتصفحووتغفروافا ن الله غفورالرجیم۔
(آیت نمبر۲۴سورۃ التغابن)

اے لوگوں جو ایمان لائے ہو،تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں،ان سے ہوشیار رہو،اور تم عفوودرگذر سے کام لو اور معاف کردو تو اللہ غفوررحیم تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔

اس آیت پر عمل کرتے تھے،بڑے سے بڑا نقصان کرتے کچھ نہ کہتے،خفا نہیں ہوتے ہاتھ لگانا جانتے نہ تھے مارنا پیٹنا آتا نہ تھا۔بہت پیار محبت سے باتیں کرتے،اور ساتھ بٹھا کر کھلاتے تھے،ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں مزہ آتا تھا،ادلے کی بوٹیاں،گودے والی نلیاں،گردے اور سینے کی کڑیاں مجھے بہت پسند تھیں۔فرماتے بیٹے کھاؤ روٹیوں میں گھی لگواتے،دکان سے تشریف لاتے،مجھے کندھوں پر بیٹھا کر لاتے،راستے سے مٹھائی کے دونے دلواتے جن سے صبح کا ہمارا ناشتہ ہوتا تھا۔

اللّٰھم الرحمھما کمار بیانی صغیرا (سورۃ بنی اسرائیل آیت نمبر۲۴)

ترجمہ:۔ پروردگار عالم ان پر رحم فرما،جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے پالا تھا۔

صبر وشکر اور رضا بالقضاء:۔ وہ بہت ہی صابر وشاکر تھے،جوان بیٹی ہاجرہ کا انتقال ہوا بعض لڑکے اور لڑکیاں بچپن میں مرگئیں،صبر کیا،اماں بی سے سنا تھا کہ پیارے میاں کا جب انتقال ہوا،بہت دل

گرفتہ ہوئے اور دعا کی! بار الٰہی بہتر نعم البدل عطا فرما۔ اس کے بعد میں پیدا ہوا۔ آنکھیں جیسی نعمت چھن گئی، پڑھنے لکھنے سے جاتے رہے، دنیا تاریک ہوگئی، گھر پکڑلیا کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں آیا، میری والدہ ماجدہ جوان کا ہر طرح خیال رکھتی تھیں، جب انتقال کرگئیں، دم نہ مارا۔ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا اس کی رضا پر راضی اور ہر حال میں شاکر رہے، یہی شان عبدیت ہے، یہ اونچا مقام ہے۔

تحمل و برداشت:۔ تحمل و برداشت کے پیکر تھے، خلاف مزاج بات پر انسان کو جلد غصہ آجاتا ہے، بعض اوقات اپنے آپ کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا ہے، عزت نفس ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے، اس پر جب بن آتی ہے انسان جان کی پرواہ نہیں کرتا، برسر عام مجمع میں کسی شریف کو برا بھلا کہنا گالیاں دینا اور اس کا سب کچھ سننا کچھ نہ کہنا، انتقام کی قدرت کے باوجود خاموش رہنا اور اپنوں کو بھی خاموش رہنے کی تاکید کرنا بہت برداشت ہے، ایک بار میں نے دیکھا کہ ان کے عزیز اور چھوٹے نے انہیں گالیاں دیں، انہوں نے اس کے ارمان نکلنے دیئے، یہ انہی کا ظرف تھا۔

جگر میں چٹکیاں لیتے ہیں وہ دل کو مسلتے ہیں
جو کچھ کہیئے تو کہتے ہیں میرے ارماں نکلتے ہیں

ایک مرتبہ غالباً ۱۹۴۶ء میں مظفر میاں انہیں بتائے بغیر میرے پاس دیوبند آگئے جواں سال جگر گوشہ جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا ہو اس کا گھر میں اطلاع کیئے بغیر پردیس چلے جانا کیا کچھ ماں باپ کی پریشانی، رنج و ناراضگی کا موجب ہوگا اس امر کا اندازہ ایک باپ ہی کرسکتا ہے۔

اس نے جب مجھے یہ بات بتائی، میں نے اسے جلدی واپس بھیجا، یہ جب ان کے پاس پہنچا اس سے یہی کہا، شاباش بیٹا شاباش۔ ان کا یہ طنز بھی بہت شفقت آمیز تھا، مقصد یہ تھا، ہائے کوئی ایسا کام کرتا ہے، طنز بہت لطیف کرتے تھے، جو شی لطیف سے بہرہ ور ہوتا ہے وہی اس سے لطف اٹھاتا ہے، یہ اسلوب شفقت ومحبت کی وجہ سے اختیار کیا تھا کچھ اور کہتے تو اس کا دل آزردہ ہوتا اور اسے آزردہ پاتے خود بھی آزردہ ہوتے، خاموش ہوگئے۔

جگر کو داغ، کلیجے کو زخم، دل کو ملال جناب عشق نے بھیجے ہیں ارمغاں کیا کیا

اماں بی:۔ بہت بھولی بھالی، سیدھی سادھی خاتون تھیں، ہیرا پھیری، چالا کی جانتی نہ تھیں ابا میاں کے خلاف مزاج کوئی بات ہو جاتی، ان پر خفا ہو جاتے تھے، میاں بیوی میں اس قسم کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔

ایثار و سخاوت:۔ طبیعت میں سخاوت تھی کوئی فقیر دکان پر آتا کہتا اللہ کے نام پر دو جو ہوتا دیتے، ورنہ معذرت کرتے، مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ گھر میں آٹا نہ تھا دکان سے واپسی پر آٹا گھر لانا تھا تا کہ گھر میں چولھا جلے، اور روٹی پک سکیں، راستہ میں فقیر ملا، اس نے کہا، میں فاقہ سے ہوں، اللہ کے نام پر دو، جو پاس تھا اسے دے دیا اور خالی ہاتھ گھر آ گئے۔

و یو ثر و ن علی انفسھم	اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی
و لو کا ن بھم خصاصہ (سورۃ الحشر آیت نمبر ۹)	جگہ خود محتاج ہوں۔

دکان سے جو لاتے گھر میں دیتے یا راہ خدا میں، پاس کچھ نہ رکھتے تھے، اللہ پر توکل تھا۔ فرماتے تھے جس نے صبح دیا وہ شام کو بھی دے گا پھر حدیث پڑھتے۔

تغدو اخما صا و تر و ح بطانا	پرندے صبح خالی پیٹ بھوکے نکلتے ہیں اور شام پیٹ بھرے لوٹ جاتے ہیں۔

خودداری و بے نیازی:۔ طبیعت میں خودداری و غیرت اور مزاج میں بے نیازی تھی، زندگی میں انہیں اولاد سے کوئی مالی فائدہ نہیں ہوا، نہ انہوں نے کبھی کسی سے کوئی توقع رکھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسب ذیل دعا ان کے ورد زبان رہتی تھی۔

اللھم اکفنی بحلالک عن حرامک	اے اللہ حرام کے بدلے تو مجھے بقدر حاجت حلال
و اغنی بفضلک عمن سو اک	روزی عطا فرما اور اپنے فضل سے اپنے ماسوا سے بے نیاز کر۔

انہوں نے خوب کمایا اور خرچ کیا ان کے جب تک ہاتھ پاؤں چلتے رہے قرض لیا تو ادا بھی کیا

جب گھر بیٹھ گئے پھر اپنی اولاد سے بھی کسی کام کے لئے نہیں کہا نہ کسی قسم کی خدمت لی، ان کا اصول ہی یہ تھا۔۔۔ دیکھو اپنی بات اپنے ہاتھ ہے۔ انہوں نے اپنے اخلاص وصدق نیت کو کبھی مجروح نہیں کیا۔ ان اجری الا علی اللہ اللہ ہی اجر دے گا پر نظر رکھی۔

وعدہ کی پاسداری و پابندی:۔ وعدہ کرتے نبھاتے، وقت دیتے پابندی کرتے، کوئی کچھ لکھواتا جو وقت کسی کو دیتے اس کا کام وقت سے پہلے تیار کر کے رکھتے، وہ وعدہ خلافی سے بچتے تھے، کسی کو شکایت کا موقعہ نہیں دیتے کسی وجہ سے تاخیر ہوتی، شرمسار ہوتے، وجہ بتاتے، معذرت کرتے تھے۔

قرض کی ادائیگی اور قرض داروں سے خاموشی:۔ تاجروں میں لین دین ہوتا ہے تجارت اس کے بغیر نہیں ہوتی ابا میاںؒ کا ابتدائی دور نہایت خوشحالی کا دور تھا، پریس تھا، دکان تھی، نوکر چاکر تھے، آمدنی خوب تھی، بیٹیوں کی شادی دھوم دھام سے کی دولت ٹھکانے لگی، پریس چھوٹا، دکان اور کتابت سے گھر کا خرچ چلنے لگا، سیر چشم تھے، خرچ خوب کرتے تھے، جو سامان لیجاتا روپے دینے میں ہیرا پھیری کرتا نوبت قرض کی آگئی، ادائیگی جب ہو جب قرض دار دیں وہ لے لوٹ ہو گئے جن سے لیا تھا ان کی ادائیگی رہ گئی، دکان میں سامان گھٹنے لگا، آمدنی کم اور تنگ دستی بڑھنے لگی ۱۹۳۸ء میں مولانا محمود حسن خان ٹونکیؒ کی معجم المصنفین کی تدوین وترتیب نو کے سلسلہ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن گئے، تو مجھے دکان پر بٹھایا گیا، میں لاابالی، نہ علم نہ تجربہ نہ ہر وقت کسی بڑے کی سر پر موجودگی، حافظ صاحب نگرانی کرتے تھے، لیکن ان کے اوقات مقرر تھے مجھے کھلی چھٹی مل گئی اس طرح دکان کی بربادی میں جو کمی رہ گئی تھی وہ میرے ہاتھوں پوری ہوئی، حیدر آباد میں سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ہر ایک کا قرض ادا کیا جن پر قرض تھا انہیں دو چار بار یاددہانی کرائی، انہوں نے کچھ اثر نہ لیا، فرمایا ان کی نیت ادا کرنے کی نہیں، خاموشی اختیار کی تقاضا کرنا بھی چھوڑ دیا، اللہ مغفرت کرے کھا کر ہی مر گئے۔

تصوف وسلوک:۔ غالباً ۱۹۰۸ء میں سلسلہ نیازیہ نظامیہ چشتیہ میں مولانا محمد ابراہیم روحی ٹونکیؒ المتوفی ۱۳۵۲ھ بمطابق ۱۹۳۶ء سے بیعت ہوئے انہی سے منازل سلوک طے کئے اور خرقۂ خلافت سے سرفراز

ہوئے ،(ا) انکساری وفروتنی اور اخفاء حال طبیعت میں بہت تھا کسی کو یہ بھی نہیں بتاتے تھے کہ وہ کسی سے بیعت ہیں یا کسی صاحب نسبت بزرگ کے خلیفہ ومجاز ہیں نہ کسی کو بیعت کرتے تھے ،فرماتے تھے ،تصوف کا حاصل ،احکام شریعت کی بجا آوری کرتے رہنا اور کسی لمحہ یاد الٰہی سے غافل نہ رہنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات کہنا آسان ہے اس پر عمل کرنا اسے نبھانا آسان نہیں ،وہ اپنے معمولات کے بہت پابند تھے ،نماز پنجگانہ مسجد میں جماعت سے ادا کرتے ،جلد مسجد جاتے اور کوئی کام نہ ہوتا تو دیر سے آتے تھے ،نماز بہت اطمینان سے پڑھتے تعدیل ارکان کا خیال رکھتے تھے ،جے پور میں دکان پر ہوتے تو ظہر وعصر نواب صاحب کی حویلی کی مسجد میں پڑھتے مغرب کا وقت راستے میں ہو جاتا تو کسی بھی مسجد میں پڑھ لیتے ،ورنہ عموماً مغرب عشاء اور فجر منھیاروں کی مسجد میں ادا کرتے تھے ،تہجد کا بہت اہتمام فرماتے تھے ،رات میں جلد سوتے اور آخر شب میں جلد اٹھتے تھے۔

حیدر آباد دکن میں صوفی صاحب سے شہرت کی وجہ:۔ اللہ کی شان ہے انہوں نے جتنا اخفاء حال چاہا اتنی ہی ان کی شہرت وقبولیت ہوئی ۱۹۴۰ء میں جب میں ابا میاںؒ کے ہمراہ حیدر آباد دکن گیا تو مجمع المصنفین کے دفتر میں ہر شخص کو انہیں صوفی صاحب قبلہ کے لقب سے یاد کرتے پایا یہ لقب میرے لئے اجنبی تھا ،میں نے اپنے ہوش میں کبھی ابا میاںؒ کو صوفی صاحب کہتے کسی کو نہیں سنا تھا کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ یہ دار الشفاء (بلدیہ حیدر آباد) کی مسجد میں تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے ،بجلی کڑکی یہ اس کی زد میں تھے ، اس کے گرتے وقت یہ ذرا جگہ سے ہٹے منارہ مسجد کا کنارہ اسی جگہ آکر سجدہ ریز ہوا۔

توڑی واعظ نے اگر گردن مینا ناسخ مے پرستوں نے بھی مسجد کا منارہ توڑا

سچ ہے ،جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ،ورنہ کبھی کے واصل بحق ہو گئے ہوتے صبح جب اس واقعہ کی شہرت ہوئی تو مولانا عبد القدوس صاحب ہاشمی ندویؒ نے انہیں صوفی صاحب قبلہ کہنا شروع کیا پھر کیا تھا اس لقب سے مشہور ہو گئے۔

تربیت:۔ ابا میاں کی تربیت کا انداز نرالا تھا۔ راست کم ہی کچھ کہتے جب موقع پاتے ایسا انداز اختیار

کرتے کہ بات بچے کے ذہن میں نقش ہو جاتی، کہیں دو میں تکرار ہوتی، ایک دوسرے کو برا بھلا کہتا ہوتا،
فرماتے جو کسی کو برا بھلا کہتا ہے ویسا ہی سنتا ہے، جو گالی دیتا ہے گالی کھاتا ہے، ذوق نے کیا خوب کہا ہے۔

بد نہ بولے زیر گردوں گر کوئی میری سنے

ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

کبھی صائبؒ کا مصرعہ پڑھتے۔

؎ ایں زر قلب بہر کس کہ دہی باز دہد

یہ کھوٹا سکہ تو جسے دے گا وہ تجھے لوٹا دے گا۔

دکان پر سائل وفقیر آتا رہتا تھا میں جانتا تھا کہ یہ روز آتا ہے پیشہ ور فقیر ہے، کہتا بابا آگے بڑھو، کبھی
لہجہ بدل جاتا، فرماتے فقیر سے نرمی سے کہتے ہیں پھر آیت شریفہ پڑھتے۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ جو مانگتا ہو اس کو نہ جھڑک۔

بچوں کی عادت ہوتی ہے، راہ چلتے جانور کو چھیڑتے مارتے ہیں، میں تھا ہی نالائق چھیڑ دیتا، فرماتے،
جانور کو نہیں ستاتے اور یہ شعر سناتے۔

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد — کہ رحمت برآں تربت پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است — جاں دارد و جان شیریں خوش است

دیکھا گیا ہے بعض لوگوں کو بات بات پر غصہ آتا ہے، ذرا سی بات میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں،
حدود کا خیال نہیں رکھتے، کسی کو طیش میں دیکھتے تو شاہ ظفر کا یہ شعر پڑھتے۔

ظفر ہرگز آدمی نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم وذکا

جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

وہ فجر کے وقت مسجد جاتے ہمیں جگاتے، نماز پڑھو، ہم اٹھتے پھر پڑ جاتے نیند آتی سو جاتے، عشاء کی

نماز کے لئے اٹھاتے، فرماتے نماز پڑھ کر سو جاؤ، ایسی عادت ڈال گئے کہ فجر وعشاء بھولے سے بھی نہیں چھوٹتیں۔

وہ نہایت خاموشی واطمینان سے لڑکوں کے رجحان طبع کو دیکھتے تھے ان کا میلان علم کی طرف پاتے تو اس راہ پر گامزن رہنے دیتے چنانچہ مولانا نعمانی کی علم سے دلچسپی دیکھی اور مطالعہ کا شوقین پایا کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ ان کی معلومات کو سراہا جن کتابوں کی فرمائش کی انہیں مہیا کیں دلائل سے خصم کو قائل کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی کی لیکن جس بیٹے کا رجحان طبع کھیل کود کی طرف دیکھا اس کا ماحول بدلا دینی علوم کے لئے جگر گوشوں کو دیس سے پردیس بھیجنے میں بھی تامل نہ کیا چنانچہ مجھ سے بڑے آغا میاں (مولانا عبدالعلیم ندویؒ) جنہیں کشتی وکبوتر بازی کا شوق تھا جے پور سے سورت ڈابھیل بھیجا، جب علم کا شوق ہوگیا، انہیں مولانا حیدر حسن خاں شیخ الحدیث ندوۃ العلماء المتوفی ۱۳۶۱ھ کی خدمت میں پہنچایا انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پڑھا اس نسبت سے ندوی لکھتے ہیں۔

میں نرا نکما، نالائق تھا گھر کے کم وبیش ہر فرد کی میرے بارے میں یہی رائے تھی، کہ یہ سرکش ونالائق ہے۔ اس لئے کہ میں کسی کی سنتا نہ تھا ہر ایک کے منہ آتا تھا، ایسے لڑکے کے بارے میں کب کوئی اچھی رائے رکھ سکتا ہے، اسے ہر شخص برا کہتا اور برا سمجھتا ہے، بقول ریاضؔ میری یہ کیفیت تھی۔

ریاض ان کو چھیڑا ہے تم نے ہم نہ مانیں گے
وہ تم کو کوستے ہیں جب تمہارا نام آتا ہے

جب میری نالائقی وسرکشی کی داستان سنی اور دکان دیکھی، مجھ سے کچھ نہیں کہا، بس کہا تو یہ کہا تم میرے ساتھ حیدر آباد چلو، مجھے کب تامل تھا، یہ غالباً ۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے، ہم جے پور سے حیدر آباد دکن کو چلے، سفر سقر بھی ہے اور ظفر بھی، یہ سفر میرے لئے سقر ہی کا نمونہ تھا، بقول میرؔ۔

بس کے پہلے پہل کا تھا یہ سفر　　آفتیں ساری آپڑیں سر پر

یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا ریل گاڑی کے ڈبوں میں ریل پیل بہت ہوتی تھی، آدمی مور وملخ کی طرح بھرے ہوتے تھے، تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی، جس ریل گاڑی میں ہمیں سوار ہونا تھا اس ریل

گاڑی کے ڈبوں میں فوج براجمان تھی اسے سکندر آباد (حیدر آباد دکن) اترنا تھا، جوں توں کر کے باپ بیٹے ڈبے میں گھس گئے، نہ لیٹنے کی جگہ نہ بیٹھنے کا آرام، سفر لمبا مثل ہے سولی پر بھی نیند آتی ہے، میں سہارے سے نیند بھر کر سو رہا مگر ابا میاں اللہ اللہ کرتے رہے اور اسٹیشنوں پر اتر کر نماز پڑھتے رہے انہیں نیند نہ آتی تھی نہ آئی، وہ بے کل ہی رہے، قہر درویش بر جان درویش اردو میں مثل ہے سفر اور سقر میں ایک نقطہ کا فرق ہے، اس کی حقیقت اسی سفر میں کھلی لیکن۔

یہ سفر میرے لئے وسیلہ ہے ظفر کا۔

یہ سفر میری زندگی کا ایسا موڑ اور ایسا سفر ہے جہاں سے میں جہالت سے تو نہیں نکل سکا لیکن جہالت کا احساس ہوا، اور میرے علمی سفر کا آغاز سمجھئے، اسی منزل سے ہوا۔ جس کا اس وقت مجھے شعور بھی نہ تھا، کسی عربی شاعر نے خوب کہا ہے۔

اتانی ھواھا قبل أن أعرف الھویٰ   فصادف قلبا فارغا فتمکنا

اس محبوبہ (علم) کی محبت اس وقت آئی جب میں محبت کو پہچانتا نہ تھا۔ اس نے دل خالی پایا تو دل میں جم گئی۔

حیدر آباد پہنچے تو دار الشفا منزل میں اترے یہ معجم المصنفین کا دفتر تھا، یہاں مجھے نورتن کا دربار ملا، نہایت شائستہ، مہذب، تعلیم یافتہ افراد کا مجمع دیکھا، کھانے کی نشست ہوتی، میر مجلس مولانا سید عبد القدوس ہاشمی ندویؒ ہوتے یہ بلا کے ذہین، سخن فہم، سخن سنج، فی البدیہہ شعر کہنے والے ہر موضوع پر بولنے والے شگفتہ قلم، شگفتہ مزاج، مولانا عبد الرحمن چشتی ٹونکی، مولانا نعمانی محمد رمضان کاتب، ڈاکٹر میر معظم علی علوی، زکریا مائل، علمی نکتوں، لطیفوں، ادبی چٹکلوں، سیاسی تبصروں سے مجلس باغ و بہار ہوتی تھی، اس ادارے میں نامور علماء ادباء و شعراء کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ماہر القادری یہاں آتے رہتے تھے بھائی صاحب کو گھیر گھار کر کبھی شطرنج کھیلنے لگتے تھے، اس زمانے میں محسوسات ماہر کی کتابت ابا میاں نے کی تھی۔

یہاں مجھے ابا میاں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتاب مکمل اردو پڑھائی، قرآن مجید پڑھایا، ایک ادھ بار کسی فاحش غلطی پر چٹکی بھی بھری تھی، یہ ابا میاں کی خفگی کی انتہا تھی، اللہ اکبر حدود شریعت کا کتنا لحاظ رکھتے تھے، پھر مدرسہ نظامیہ میں داخل کرایا۔

اس علمی مجلس نے مجھے شعروسخن [کا] سے آشنا کیا میں کتب خانہ آصفیہ میں جاتا اور اردو شعراء کے دواوین نکلوا کر پڑھتا تھا، شعر سے طبعی مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے شعر گوئی نہ کر سکا لیکن نامور شعراء کے نام و کلام سے واقف ہوا۔

معلوم نہیں ابا میاں کی فراست و دانائی تھی یا باطنی تصرف تھا کہ وہ سمجھ گئے اسے علم کا نشہ چڑھا ہے جو مرتے دم تک اترتا نہیں، ع یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

انہوں نے ڈیڑھ دو سال بعد ۱۹۴۲ء میں مجھے بھائی جان (مولانا نعمانی) کے ساتھ گھر بھیجا، فرمایا منشی کرو، بڑے بھائی (آغا میاں) کے ایک دوست مولانا شریف الحسن صاحب شیرکوٹی فاضل دیوبند جے پور میں سلاوٹوں کے محلہ میں قیام پذیر تھے، دار العلوم دیوبند کی طرف سے سفیر بن کر آئے تھے چندہ جمع کر کے مدرسہ دیوبند بھیجتے تھے، اور پنجاب یونیورسٹی سے منشی کے امتحان کے طلبہ کو تیاری کراتے تھے، ان کے پاس مجھے بٹھایا گیا، انہوں نے چھ ہفتوں میں تیاری کرائی، چمڑے کے بستہ بند کے پٹکے سے پٹائی کرتے تھے، گاہ بگاہ میری بھی ہوئی۔

ابا میاںؒ کی دعاء و توجہ نے علم کی محبت دل میں ایسی بٹھائی تھی کہ یہ سختی بھی جھیل گئے، امتحان دیا ۱۹۴۲ء میں بزرگوں کی دعا سے کامیاب ہوا۔ حوصلہ بڑھ گیا بھائیوں کی رائے ہوئی کہ اسے منشی فاضل کرایا جائے، یا انگریزی پڑھائی جائے، فوری طور پر منشی فاضل کی تیاری میں لگا، تھوڑے دنوں بعد ابا میاںؒ حیدرآباد سے جے پور آ گئے، فرمایا عربی پڑھو، دینی تعلیم حاصل کرو، چنانچہ جہاں بڑوں نے پڑھا تھا، میں بھی وہیں پہنچا، مولانا قدیر بخش بدایونیؒ سے مدرسہ تعلیم الاسلام میں کافیہ تک پڑھا تھا کہ ابا میاںؒ نے بھائی جان (مولانا نعمانی) سے کہا اسے دیوبند بھیجو، یہ ندوۃ المصنفین کے رفیق تھے، لغات القرآن لکھ رہے تھے، انہوں نے حامد الانصاری غازی کو (جو قاری محمد طیب مہتمم دار العلوم دیوبند کے داماد تھے اور ندوۃ المصنفین چھوڑ کر دار العلوم کے دفتر اہتمام سے وابستہ ہو گئے تھے، خط لکھا داخلہ ہو گیا)۔ یہاں چھ برس شوال ۱۳۶۳ء سے ۱۳۶۹ھ مئی ۱۹۴۹ء تک علوم دینیہ کی تکمیل کی یوں ابا میاںؒ کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی بعد ازاں مولانا نعمانی کا ساتھ رہا اور ان کی تربیت و علمی صحبت نے نکھارا اوروں سے بھی فائدہ پہنچا، لیکن ابا میاںؒ کی دعاؤں سے

علم کا چسکا ایسا لگا کہ میں اب تک تین مرتبہ دائیں آنکھ کا کورنیاcornea لندن جا کر تبدیل کرا چکا ہوں۔ لیکن پڑھنا لکھنا نہیں چھوٹتا، دن بغیر مطالعہ نہیں گذرتا۔ اپنی جہالت کا احساس ہر لمحہ بڑھتا ہے اور علم کی جستجو رہتی ہے، جی نہیں بھرتا، رب زدنی علما ۔ میرے رب میرا علم بڑھاتا رہ۔

ابا میاں نے ہر موڑ پر کچھ اس انداز سے تربیت ورہنمائی کی کہ ان کی مراد برآئی اور ہم علمی راستے سے نہ بھٹکے اس ڈگر پر چلتے رہے، یہ انہی کی نیکیوں کا صلہ ہے۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

راج ہٹ، بالک ہٹ، تریا ہٹ، جوگی ہٹ، ایک مشہور مثل ہے، ان کی ضد کو طرح دیجاتے تھے، بھائیوں میں اختلاف ہونا خاص طور پر جہاں الفت ومحبت ہوتی ہے اختلاف ہو جاتا ہے، پھر خدانخواستہ مولویوں میں اختلاف ہو تو ہر طرف دلائل ہوتے ہیں، اور ہر ایک اپنے آپ کو برسر حق سمجھتا ہے، ایسا کوئی موقعہ آتا تو کسی کی جانبداری نہیں کرتے، دونوں کو سمجھاتے پھر خاموشی اختیار کرتے، انہوں نے زمانہ دیکھا تھا، سمجھتے تھے وقتی جوش ہے، جاتا رہے گا، حالات معاملات سلجھا دینگے، آگے چل کر دونوں کو پشیمانی ہوگی، ایسا ہی ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔

اخلاص وحسن عمل:۔ دین سے محبت اور علماء وصوفیاء کی صحبت نے ان کے قلب ونظر میں دین ایسا رچایا اور اس کی عظمت ایسی بٹھائی تھی، کہ وہ دینی تعلیم کی تحصیل اور اس کی خدمت ونشر علم کو حاصل زندگی سمجھتے تھے، ان کی دلی آرزو تھی، کہ میری ساری اولاد عالم بنے اور دین کی خدمت کرے ان کی کیفیت فقیہہ شمس الائمہ ابو محمد عبدالعزیز حلوائی بخاری المتوفی ۴۵۶ ھ کے باپ احمد بن نصر حلوائیؒ کی سی تھی جو مٹھائی بیچ کر پیٹ نہیں بھرتے، علماء وفقہاء کو مٹھائی پیش کرتے ان سے دعا کی درخواست کرتے کہ میرا بیٹا بھی عالم وفقیہہ بن جائے، چنانچہ ان کے اخلاص نیت ودعا کی برکت سے ان کے بیٹے کو شمس الائمہ کا اعزاز ملا اس نسبت سے یہ حلوائی مشہور ہوئے ورنہ یہ تو فقیہہ تھے حلوائی نہ تھے۔

ابا میاںؒ نے اس دور میں اولاد کو دینی علوم سے آراستہ کرانے کا فیصلہ کیا جب کہ کم وبیش ہر شخص اپنی اولاد کو انگریزی پڑھانے کا خواہش مند تھا۔

داغ نے کیا خوب کہا ہے ۔

بعد مدت کے یہ اے داغؔ سمجھ میں آیا وہی دانا ہے، کہا جس نے نہ مانا دل کا

اس لئے عالم کیلئے مسجد کی امامت، یا کسی دینی مدرسہ کی ملازمت یا کہیں کی خطابت زندگی کی معراج تھی، پھر عیش و آرام کو تجنا، سرکاری منصب و وجاہت کے دروازے اپنے اوپر بند رکھنا، یہ وہ کٹھن مراحل تھے جن سے ہندوستان میں برطانوی سامراج میں ایک عالم کا گذرنا ناگزیر تھا ایسے ناسازگار حالات میں ارباب عزیمت نے اپنی اولاد کے لئے یہ راستہ اختیار کیا، ان حوصلہ مند ارباب صدق وصفا میں ابا میاںؒ بھی تھے، یہ ان کا اخلاص وحسن عمل تھا کہ ان کے اس اقدام سے اپنوں اور غیروں سب کو فائدہ پہنچا جب تک ان کی آنکھوں میں دم اور ہاتھ میں قلم رہا اولاد پر خرچ کیا کتابیں نقل کر کے دیں ۔ جب آنکھیں پڑھنے لکھنے کے لائق نہ رہیں، گھر بیٹھ رہے، اپنے توکل واخلاص کو کبھی مجروح نہیں کیا، انہیں زندگی میں اگر کسی امر کا افسوس رہا تو اس امر کا رہا کہ وہ اپنے دو چھوٹے بیٹوں محمد عبد العظیم عرف مظفر لطیف اور محمد عبد الرحمٰن عرف غضنفر میاں کو عالم نہ بنا سکے، لیکن نِیَّۃُ الْمُؤمِن خیر من عمله، مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے، ان کا ارادہ انہیں بھی عالم بنانے کا تھا لیکن انہیں موقعہ نہ مل سکا اس لئے ان کا اجر کہیں نہیں گیا (مظفر لطیف تو اللہ کو پیارے ہوگئے، غضنفر میاں ان شاء اللہ دینی علوم کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہیں الرحیم اکیڈمی کے نام سے ان کا ایک اشاعتی ادارہ ہے جس سے سینکڑوں نادر علمی تصانیف شائع کر کے اہل علم میں قبول عام حاصل کر رہے ہیں)۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی میں دیکھا کہ ان کا سب سے بڑا بیٹا مدرس، مصنف اور وقت کا نامور عالم بنا، جس کی تصنیفی وتدریسی خدمات سے علمی دنیا کو فائدہ پہنچا، جس نے اردو عربی میں نہایت مفید تالیفات کیں، بعض اہم علمی گتھیوں کو سلجھایا، تاریخی حقائق سے پردہ اٹھایا، ہندوستان اور اسلامی دنیا کے نامور اہل علم شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنیؒ، مفتی مہدی حسن شاہجہانپوریؒ، عبد الفتاح ابوغدہؒ نے ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا اور ان کی علمی تحقیقات سے بیرونی دنیا کو روشناس کرایا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اولاد میں سب کو صاحب اولاد کیا ان کا سلسلہ بہت پھیلا، ان کی اولاد کے علوم

میں بھی برکت رکھی، انہیں اہم موضوعات پر لکھنے اور نئی تحقیقات پیش کرنے کی توفیق بخشی، ان کے پوتا پوتیوں نواسے نواسیوں کی اولاد میں بہت حافظ ہیں، ایسے خوش نصیب خانوادے ہندوستان و پاکستان میں انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں اور پھر ان کی اولادوں میں یہ سلسلہ جاری ہے اس میں عالم بھی بن رہے ہیں، اور جدید علوم سے بھی بہرہ ور ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس میں مزید اضافہ فرمائے۔ (آمین)

کلمة طیبة کشجر ة طیبة اصلها	ایک بات ستھری، جیسے ایک درخت ستھرا، اس کی جڑ
ثا بت و فر عها فی السماء تو ء تی	مضبوط ہے، اور ٹہنی آسمان میں لاتا ہے پھل دیتا ہے
ا کلها کل حین با ذن ر بها	وقت پر اپنے رب کے حکم سے۔

(آیت ۲۴/۲۵ سورة ابراہیم)

ان کا حسن عمل اس امر کا مصداق ہے، **ذ لک فضل اللہ یو تیه من یشاء و اللہ و اسع علیم** (آیت ۵۴ سورة مائدة) یہ اس کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

زندگی میں تین کام:۔ ان کے اوقات زندگی بہت منضبط تھے وہ وقت ضائع کرنا نہیں جانتے تھے، زندگی میں ان کے تین ہی کام تھے، ا۔ دکان پر سوداگری، ۲۔ کتابت، ۳۔ اور اللہ اللہ کرنا، فضول کاموں سے بچتے، بے کار باتوں سے گریز کرتے تھے، دکان پر ہر قسم کے لوگ آتے رہتے تھے، ایک بار بعض کیمیا کے شوقین اور مہوس بھی آئے، انہوں نے سونا بنانے کے نسخے بتائے یقین تو نہ آیا لیکن ان کے کہنے سے دو چار نسخے آزمائے، کامیابی کے آثار نہ پائے، چھوڑ دیا فرماتے تھے۔

حرص و طمع سہ حرف دارد و ہر سہ تہی، حرص و طمع میں تین حرف ہیں، اور تینوں نقطوں سے خالی ہیں، حرص و طمع سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

جوانی میں پان کھاتے اور حقہ پیتے تھے، فرماتے تھے دانت پان کھانے سے جلدی گرے، گورے چٹے تھے، پان ان پر خوب کھلتا تھا، بدن سڈول تھا، شیروانی کرتا پہنتے خوب سجتا تھا چلتے تیز تھے اور ان کی زبان ذکر اللہ سے تر رہتی تھی۔

اہلیہ کا انتقال:۔ اماں بی بہت نیک خدمت گذار وخدار سیدہ خاتون تھیں بھری گود خالی ہو جاتی، جوان بیٹی مرجاتی، ان کے صبر کا دامن نہیں چھوٹتا ہر حال میں شاکر رہتی، چولھے ہانڈی اور گھر کے کام کاج کر کے نماز روزہ کرتی تھیں اس میں ان کی زندگی پوری ہوگئی، ۱۹۴۹ء کے آخر میں جب دیوبند سے آیا تو دیکھا بیماری سے سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھیں، تھوڑے دنوں میں حالت غیر ہوگئی جانکنی کے وقت سرہانے بیٹھے سورہ یٰسین سنا رہا تھا۔ جب میں آیت شریفہ ''سلامٌ قولا مِن رب الرحیم'' ترجمہ رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہا گیا ہے، پر پہنچا روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، یہی ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہے ان کی قبولیت کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

ایک مرتبہ بستی نظام الدین (دہلی) سے تبلیغی جماعت جے پور آئی اس نے ہمارے چوک میں تقریر کی میواتیوں کی تقریر بہت سادہ دل پذیر ہوتی ہے وہ دل سے نکلتی اور دل میں اترتی ہے۔

اماں بی ان کی تقریر سے متاثر ہوئیں ان کے منہ سے بیساختہ نکلا اے اللہ جب مروں یہ نیک بندے میری نماز جنازہ پڑھیں مجھے کندھا دیں۔

عجیب حسن اتفاق ہے ۱۹۴۹ء میں جب انتقال ہوا۔ وہی تبلیغی جماعت ہندوستان سے آکر مکی مسجد کراچی میں ٹھہری ہوئی تھی، انہیں اطلاع کی گئی، نماز جنازہ وتدفین میں شریک رہی میوہ شاہ قبرستان کراچی کے دھوبی گھاٹ کی طرف قبرستان میں انہیں دفن کیا گیا تھا، اللہ کی شان ہے آج مزار کا نام ونشان بھی نہیں ہے، جس جگہ دفن کیا گیا تھا، وہاں مکان تعمیر ہو چکا ہے۔

کل من علیہا فان ویبقٰی وجھہ	ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی
ربک ذوالجلال والاکرام	ہے اور صرف تیرے رب جلیل وکریم
(سورۂ الرحمٰن آیت ۲۷)	ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔

برمزار ما غریباں نے چراغاں نہ گلے

نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

بے گناہوں کی اسی کوچہ مین مٹی ہے خراب

دادخواہوں کو یہاں زیست سے ملتا ہے جواب

وفات :۔ ابامیاں ۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ کو میری سب سے بڑی ہمشیرہ عائشہ آپا سے ملنے بہار کالونی گئے شام ہوگئی انہوں نے کھانے پر اصرار کیا کھانا تناول کیا، رات گئے پی اینڈٹی کالونی آئے طبیعت خراب ہوئی علاج کے لئے عرض کیا گیا، آمادگی ظاھر نہ فرمائی، لیٹے رہے ۱۸ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۳ھ مطابق ۲۴ جنوری ۱۹۵۴ء کو جب کاروان عمر غالباً اُٹھترویں منزل طے کر رہا تھا، قبیل مغرب حالت بگڑی اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

ابامیاںؒ کا ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک شومارکیٹ لارنس روڈ پر لکشمی نواس مینشن میں قیام رہا تھا، قریب ہی گاڑی احاطہ میں ایک چھوٹی سی مسجد الانہ تھی پھر وہ دوبارہ کئی منزلہ بنائی گئی اس مسجد میں پنجگانہ نمازیں جماعت سے پڑھتے تھے، امام وموذن اور پابندی سے مسجد میں آنے والے نمازی انہیں جانتے تھے، اس مسجد میں ایک مجذوب بھی پانچ وقت کی نماز جماعت سے پڑھتا تھا، اس کا جذب بھی عجیب تھا ہمہ وقت طاری رہتا تھا، جو کہتا تھا وہ سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن امام کی تکبیر تحریمہ پر اس کا جذب ختم ہوتا اور سلام امام کے بعد اس کا جذب شروع ہو جاتا تھا نماز جنازہ سے قبل دیکھا کہ امام وموذن اور مقتدی اور یہ مجذوب، پی اینڈ ٹی میں جہاں جنازہ تیار تھا، آئے نماز جنازہ میں شرکت کی گذری کے قبرستان میں تدفین تک شریک رہے مگر اس عرصہ میں اس مجذوب پر خاموشی طاری رہی بعد تدفین اس کا جذب پھر عود کر آیا، اور ایک ہی رٹ زبان پر جاری تھی، کامیاب گیا کامیاب گیا گذری کے پہاڑی قبرستان میں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر دفن کئے گئے، قبر پر نہ کوئی لوح ہے اور نہ کتبہ لیکن مزار آج تک محفوظ ہے۔(۱)

(۱) گورکن بھی صاحب قبر کا منتظر تھا، پوچھا گیا' کس کا انتظار ہے ، کہنے لگا کہ مجھے ایک عرصہ دراز گذرا کہ میں یہاں قبریں کھودتا ہوں یہ سارا پہاڑی علاقہ ہے، یہاں کی زمین انتھائی سنگلاخ پتھریلی ہے اور بہت دیر میں ایک قبر کھد کر تیار ہوتی ہے لیکن اس قبر کو جب میں نے کھودنا شروع کیا تو بغیر کسی زحمت کے کھودتا چلا گیا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا مٹی از خود اوپر آرہی ہے۔ اس لئے میں بھی صاحب قبر کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اللھم اغفرلہ و ارحمہ و انت خیر الراحمین۔ غفنفر عفی عنہ'

کتب خانہ واساتذۂ فن کی مشقوں اور وصلیوں کا ذخیرہ:۔ انہوں نے اپنی اولاد کو عالم ہی نہیں بنایا ان کی علمی سرگرمیوں کی بقاء وترقی کے لئے ناسازگار حالات میں بھی اردو عربی وفارسی کی نادر واہم کتابیں فراہم کیں، بعض قلمی نسخے خریدے، بعض کتابیں خود نقل کر کے ان کے علمی تشنگی کو دور کیا چنانچہ موصوف نے توضیح الافکار لمعانی تنقیح الانظار مؤلف محمد بن اسماعیل الامیر المتوفی ۱۱۸۲ھ کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ نسخہ اپنے بیٹے محمد عبدالرشید کے لئے نقل کیا ہے۔

خود چونکہ خوشنویس، ناشر وصاحب مطبع تھے، ذوق علمی ونظر وسیع تھی، اس لئے بہترین مطبعوں اور نامور خوشنویسوں کی لکھی ہوئی، اچھے کاغذ پر چھپی ہوئی کتابیں جمع کی تھیں، ہندوستان کے قدیم ومشہورترین مطابع میں مصطفیٰ خان بن روشن خان حنفی کے مطبع مصطفائی لکھنؤ اوران کے برادر خورد عبدالرحمٰن خان کے مطبع نظامی کانپور کی مطبوعات کو منشی نولکشور کی مطبوعات کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتے تھے، آگرہ کے مطابع میں مفید عام پریس آگرہ کی مطبوعات کی تعریف کرتے تھے، جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے۔

مفید عام پریس آگرہ کا اچھا ہے ۔۔۔۔۔ کہ ہند میں چھپائی کا یاں شہرہ ہے۔

رعد پریس کانپور کی چھپی ہوئی کتابوں کے بھی دلدادہ تھے، دلی کے قدیم مطابع میں مطبع العلوم دہلی، مطبع اموجان اور عبدالاحد کے مطبع مجتبائی کی شائع کی ہوئی کتابوں کی قدر کرتے تھے، مطبع مجتبائی میرٹھ کی شائع شدہ کتابوں کو دل سے چاہتے تھے، اس لئے کہ ان کے یہاں اچھے کاتب اور نامور خوشنویس کاپی لکھتے تھے، تصحیح کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا، کاغذ، چھپائی اور سرورق قابل دید ہوتا تھا، ایسی کتابیں کیوں مرغوب خاطر نہ ہوں۔

کتاب ایسی نہ کیوں ہو دل کو مرغوب ۔۔۔۔۔ خط نسخ اچھا تو نستعلیق تھا خوب

یہ ذخیرہ کتب کم وبیش ہر فن کی کتابوں پر مشتمل تھا، اور اتنا زیادہ ذخیرہ تھا کہ میں نے جے پور میں کسی کے یہاں ذاتی ذخائر کتب میں نہیں دیکھا یہ کتب خانہ مولانا نعمانی کے تصرف میں رہا اور صحیح معنی میں انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، آنکھیں بنوانے کے بعد ابامیاںؒ جب لکھنے پڑھنے کے لائق نہیں رہے کسی

سے کچھ نہیں کہا، نہایت خاموشی سے گھر بیٹھ رہے، مظفر میاں سے چھوٹا موٹا دھندہ کرایا وہی ان کی روزی کا حیلہ ہو گیا، یہ اس کی سعادت مندی تھی کہ یہ ان کی خدمت کرتا رہا انہوں نے ساری عمر کھلایا تھا وہ بہت غیرت مند تھے ان کی طبیعت پر اس کی یہ خدمت بھی گراں تھی۔

بقول ناسخ ان کی یہ حالت تھی۔

وہ تو کیا مرتا ہے بس غیرت سے مرا جاتا ہوں میں۔

آخری ایام میں ان کے پاس نقد کچھ نہ تھا مکان وسامان جے پور میں رہ گیا تھا، یہاں ایک کتب خانہ اور اساتذۂ فن خوشنویسوں کی وصلیوں اور مشقوں کا نادر ذخیرہ ہی عمر بھر کا سرمایہ تھا، بڑے لڑکے سب عالم اور برسرکار تھے گو آمدنی زیادہ نہ تھی لیکن ان کی گذر بسر ہوتی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنے ذوق کے مطابق کتابوں کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ کیا ہے، ان کا ذوق علمی ہے یہ احتیاج کے مطابق آج نہیں کل کتب خانہ بنالیں گے اب انہیں ان کتابوں کی چنداں احتیاج نہیں، (الحمدللہ آج ہر ایک کے پاس اپنی ضروریات کے مطابق نہایت عمدہ کتب خانہ موجود ہے) انہوں نے اپنا سارا علمی ذخیرہ مظفر میاں کو دے دیا، یہ علم سے محروم رہا ہے، تو ان کے علمی سرمایہ سے کیوں محروم رہے، اس نے خدمت کی اس کا صلہ بھی انہوں نے اسے اپنی زندگی میں دے دیا، اس نے رفتہ رفتہ پورا ذخیرہ فروخت کر دیا جس کی بیشتر کتابیں آج نیشنل لائبریری کراچی میں موجود ہیں اور وصلیاں وقطعات نیشنل میوزیم کراچی کی زینت ہیں۔(۱)

اولاد واحفاء:۔ ابا میاں کے پہلے چار لڑکیاں ہوئیں، اور پانچ لڑکے اور درمیان کے اللہ کو پیارے ہو گئے سب سے بڑی عائشہ آپا، دوسری حاجرہ آپا تیسری قریشی آپا اور چوتھی رقیہ آپا تھی محمد عبدالرشید نعمانی موصوف میرے بڑے بھائی ہیں۔ ۱۸/ذی العقدہ ۱۳۳۲ھ بمطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۱۵ء میں محلہ بساطیان میں پیدا ہوئے، میں نے انہیں شیروانی پہنے اور عربی کی موٹی موٹی کتابیں اٹھائے مدرسہ تعلیم الاسلام جاتے دیکھا ہے ان کے سرہانے کتابوں کی الماری اور صندوق رکھے ہوئے تھے، انہیں جب دیکھا کتاب پڑھتے اور کتابیں الٹ پلٹ کرتے جھاڑتے دیکھا کھانا کھا کر بستر پر جاتے تو بھی سرہانے سے کتاب اٹھاتے اور

(۱) مظفر بھائی کے بقول کچھ وصلیاں لاہور میوزیم میں منتقل ہوگئی ہیں۔

لیٹے لیٹے کتاب پڑھتے رہتے، جب نیند کا غلبہ ہوتا کتاب تکیہ کے پاس رکھتے اور سو رہتے، میں نے اپنے خاندان میں ان سے زیادہ پڑھنے کا شوقین اور کتابوں کا رسیا نہیں دیکھا۔

اس دور میں انہیں اسماعیل بن اسحاق القاضی المتوفی ۲۸۲ھ کا مثیل پایا، جس کے متعلق ابوھفان عبداللہ بن احمد المتوفی ۲۵۷ھ کا بیان ہے۔

اما اسماعیل بن اسحاق فانی مادخلت الیه الاّ رأیته ینظر فی کتاب او یقلب کتباً او یقضها۔	لیکن اسماعیل بن اسحاق کے پاس جب بھی میں آیا انہیں کتاب دیکھتے یا کتابیں الٹتے پلٹتے یا جھاڑتے دیکھا۔

ہر وقت ان کے منہ سے کتاب لگی رہتی تھی چنانچہ نوعمری میں آنکھوں پر زور پڑا اوران کے عینک چڑھی، ساری عمر لکھا پڑھا اور پڑھایا اس لئے انہیں اصلاح کی کبھی حاجت نہیں ہوئی، اردو عربی دونوں زبانیں خوب لکھتے تھے مطالعہ نہایت وسیع تھا، جس موضوع پر قلم اٹھاتے تھے، خوب داد تحقیق دیتے تھے ۱۹۳۳ء میں مولوی فاضل و ۱۹۳۴ء میں منشی فاضل کیا، لیکن ان امتحانات سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی، ۱۹۳۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنوء میں رہ کر شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان سے ترمذی پڑھی اور خصوصی استفادہ کیا جوانی ۱۹۳۷ء میں کمانے کا خیال ہوا تو گھر میں نہ کہا کہ اجازت نہ ملتی بریلی کا رستہ لیا۔ مجھے یاد ہے سہ پہر سے گھر میں کھسر پھسر ہونے لگی، آپا بی (میری خالہ) حافظ جی ابا، ابا میاںؒ اور اماں بی کی نیندیں اڑ گئیں، پڑھے لکھے تھے، ہشیاری کی، اسٹیشن سے خط ڈاک میں ڈالا کہ میں بریلی مولانا یٰسین کے مدرسہ میں جا رہا ہوں دوسرے دن خط ملا تو دھوم مچی کہ بریلی گئے ہیں۔

۱۳۵۷ھ بمطابق ۱۹۳۸ء دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن میں دفتر معجم المصنفین سے وابستہ ہوئے اور چار برس اس میں کام کیا ۱۹۴۰ء میں شادی ہوئی ۱۹۴۲ء کے اواخر میں ندوۃ المصنفین دہلی میں لغات القرآن لکھنا شروع کی ۱۹۴۵ء کے اواخر میں ایک سال تبلیغ کے سلسلے میں بستی نظام الدین میں قیام رہا اگست ۱۹۴۲ء میں جے پور آگئے اور یہیں لغات القرآن لکھتے رہے غالباً اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کراچی پاکستان آئے، یہاں مولانا محمد صادق صاحب سندھی المتوفیٰ ۱۹۵۳ء کے مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کے کتب خانہ کی

فہرست مرتب کی ۱۹۴۹ء میں دار العلوم ٹنڈ و الله یار سے وابستہ ہو گئے اور یہاں ۱۹۵۰ء تک تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۵۵ء میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے مدرسہ اسلامیہ (جامعۃ العلوم الاسلامیہ) میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے ۱۹۶۲ء میں یہاں سے ماہنامہ رسالۂ بینات نکالا ۱۹۶۳ء میں الجامعۃ الاسلامیہ بہاولپور کی یونیورسٹی بننے کے بعد نائب شیخ الحدیث کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ آخر میں شیخ التفسیر اور صدر شعبہ ہو کر ۱۶ ستمبر ۱۹۷۶ء میں اس منصب سے سبکدوش ہوئے، پھر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے مدرسہ سے وابستہ ہو گئے اب یہاں تخصص کے طلبہ کے نگران اعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے اور تحقیقی مقالات کی نگراں رہے، اور تین بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے پہلی مرتبہ پھر ۱۹۷۹ء میں اہلیہ کے ہمراہ حج کیا۔ ۱۹۴۵ء میں حضرت شاہ عبد القادر رائپوریؒ سے بیعت ہوئے، سلوک وارشاد کا سلسلہ بھی موصوف سے قائم ہے، ان کی وجہ سے خاندان میں بدعات و رسوم کا خاتمہ ہوا عقائد درست ہوئے، جے پور میں تبلیغ کا کام شروع ہوا تدریسی خدمات کی وجہ سے پاکستان میں ان کے تلامذہ کا ایک وسیع سلسلہ پایا جاتا ہے۔ علمی و تحقیقی خدمات نہایت وسیع و متنوع ہیں، اس دور میں موصوف سلف کی یادگار تھے، میرے مربی و محسن اور استاد و باپ کی جگہ تھے، بعض علوم اصول حدیث و رجال حدیث، طبقات حنفیہ میں ان کی نظیر پاکستان میں مشکل ہی سے مل سکے گی، اللہ تعالیٰ نے موصوف کی ذات سے امت کو زیادہ فائدہ پہنچایا۔

اولاد:۔ دو لڑکے محمد عبد المعید و محمد عبد الشہید اور تین لڑکیاں امۃ الرحمٰن، امۃ اللہ اور امۃ الرحیم ہیں محمد عبد المعید نے ۱۹۶۹ء میں عین شباب کے عالم میں انتقال کیا بہت ہی نیک باادب ماں باپ کا خدمت گذار صالح اور سخی تھا، سب سے چھوٹی بیٹی امۃ الرحیم کا بھی جوانی میں انتقال ہوا۔

عبد الشہید سلمہ کراچی میں پیدا ہوا، قرآن مجید حفظ کیا درجہ رابعہ تک نیو ٹاؤن کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، بھائی صاحب کے بہاولپور منتقل ہونے کے بعد مفتی فاروق رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ میں پڑھا پھر شاہ ولی اللہ کالج منصورہ سے امتیازی درجات کے ساتھ مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کئے۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے امتیاز کے ساتھ کیا بعد میں اسی

شعبہ سے پی ۔ایچ ۔ڈی کیا اور جامعۃ الریاض سعودی عرب سے الدبلوم العالی حاصل کیا ۱۹۷۳ء سے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں تدریس سے وابستہ ہے متعدد مرتبہ صدر شعبہ کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مؤلف ہیں اور شیخ زاید اسلامک سینٹر کے ڈائریکٹر بھی رہے ہیں اب موصوف ڈین فیکلٹی آف آرٹس کراچی یونیورسٹی کے عہدہ پر فائز ہیں حضرت نفیس شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز وخلیفہ ہیں۔(۱)

مولانا نعمانی کی دو صاحبزادیاں امۃ الرحیم اور امۃ اللہ بھی حافظ قرآن ہیں امۃ الرحیم مرحومہ نے کینیڈا میں متعدد بچیوں کو قرآن مجید پڑھایا امۃ اللہ بھی امریکہ کے شہر بفیلو میں ڈاکٹر اسماعیل کے قائم کردہ دینی مدرسہ میں فی سبیل اللہ قرآن مجید پڑھاتی ہے۔

بھائی صاحب کے دامادوں میں ڈاکٹر محمد احمد قمر پی ۔ایچ ۔ڈی اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے فاضل ہیں رابطہ عالم اسلامی میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں اور ایک عرصہ سے مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں ان کا ایک بیٹا عبدالقاھر قمر بھی پی ۔ایچ ۔ڈی ہے۔

دیگر دامادوں میں ضیاء خورشید چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں اور پروفیسر شمیم احمد فلسفہ نفسیات اور اسلامیات میں ایم ۔اے ہیں اور کیڈٹ کالج پٹارو سے صدر شعبہ اسلامیات کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ اس وقت بفیلو کے دینی مدرسہ میں استاد اور مہتمم کتب خانہ ہیں ڈاکٹر اسماعیل صاحب سے ان کو اجازت بیعت بھی حاصل ہے۔

تالیفات:۔ (۱) اردو میں لغات القرآن ۔(۲) امام ابن ماجہ اور علم حدیث ۔(۳) یزید کی شخصیت اہل سنت کی نظر میں ۔(۴) شہداء کربلا پر افتراء ۔(۵) قصاص عثمانؓ اور حضرت علیؓ ۔(۶) ناصبیت تحقیق

(۱) محمد عبدالشہید کی تین لڑکیاں اور چار لڑکے ہیں ماشاء اللہ لڑکے لڑکیاں سب حافظ ہیں تینوں لڑکیاں مدرسہ عائشہ صدیقہ للبنات کی فاضلہ ہیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی مدرسہ میں بھی ہے لڑکوں میں سب سے بڑا عبدالحمید نبیل شعبہ عربی کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار ہے عبدالمجید بلال کراچی یونیورسٹی میں امام وخطیب ہے عبدالوحید حارث نے انگلش میں ڈبل ایم ۔اے اور اسلامیات میں ایم ۔اے کیا ہے قرآن مجید بہت عمدہ پڑھتا ہے، انگریزی کا بہترین شاعر ہے اس وقت فاسٹ یونیورسٹی میں انگریزی کا استاد ہے سب سے چھوٹا عبدالمعید انٹر کر رہا ہے اور ایک دینی مدرسہ میں زیر تعلیم ہے۔(غضنفر عفی عنہ)

کے بھیس میں ۔(۷)تبصرہ بر المدخل فی اصول الحدیث للحاکم النیشاپوریؒ۔(۱)عربی میں، ما تمس الیه الحاجه لمن یطالع سنن ابن ماجه (اب یہ کتاب بیروت سے الامام ابن ماجه و کتابه السنن کے نام سے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیقات کے ساتھ شائع ہوئی ہے)،مکانة الامام ابی حنیفه فی الحدیث ،مقدمہ کتاب التعلیم تالیف امام مسعود بن شیبہ سندھی پر عربی مقدمہ وتعلیقات، دراسات اللبیب فی الاسوة الحسنته بالحبیب تالیف ملا معین سندھی،ذب ذبابات الدراسات عن المذاهب الاربعة المتناسبات تالیف مخدوم عبداللطیف سندھیؒ۔

محمد عبدالعلیم ندوی عرف آغا میاں :۔موصوف میرے بڑے بھائی ہیں ۷/دسمبر ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے لڑکپن سے انہیں کشتی وکبوتر بازی کا شوق رہا ہے،ابا میاں نے انہیں سورت ڈابھیل بھیجا ،جب علم سے لگاؤ ہوا تو ندوۃ العلماء لکھنوء میں شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ کی خدمت میں پہنچایا ان کی زیر تربیت رہ کر ندوۃ العلماء میں پڑھا اسی نسبت سے ندوی لکھتے ہیں ۱۹۴۰ء میں اورنٹیل کالج لاہور سے مولوی فاضل کیا ۱۹۴۱ء میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن میں دفتر معجم المصنفین میں کام کیا ۱۹۴۲ء میں شادی کی،اورجے پور میں جواہرات کا بیوپار کیا ۱۹۴۹ء میں کراچی آئے، یہاں ایک اسکول میں پڑھایا،اور ابن الجزریؒ کی کتاب الحصن الحصین کا قول متین کے نام سے اردو میں ترجمہ وشرح جسے ماصح المطابع نور محمد کارخانہ تجارت کتب نے شائع کیا، میں موصوف حیدرآباد سندھ منتقل ہوگئے ،لطیف آباد میں قیام کیا۔تاریخ انتقال ۲۹/ستمبر ۱۹۸۷ء۔

ان کے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں،سب سے بڑا لڑکا محمد عبدالمقیت ہے اس نے اردوادب میں پی۔ایچ۔ڈی کیا،ہمارے خاندان میں اردوادب میں یہ پہلا پی۔ایچ۔ڈی ہے کراچی میں سندھ مسلم کالج میں لیکچرار رہا اور مختلف مراتب پر فائز ہوکر ریٹائر ہوا اس نے حیدرآباد سندھ سے ایک اردو ماہنامہ نکالا تھا جو

(۱) یہ سب کتابیں الحمدللہ الرحیم اکیڈمی سے شائع ہوچکی ہیں۔اس کے علاوہ الامام ابن ماجہ وکتابہ السنن تالیف نعمانی کو شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے اپنے مقدمہ وتحقیق کے ساتھ بیروت سے شائع کیا، یہ بھی عکسی الرحیم اکیڈمی کراچی سے شائع ہوگئی ہے،علاوہ ازیں مکانة الامام ابی حنیفه فی الحدیث بھی شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تحقیق کے اور مصنف کے مزید اضافہ کے ساتھ الرحیم اکیڈمی سے شائع ہوگئی ہے،اور مقالات محدث نعمانی بھی ان شاءاللہ عنقریب شائع ہوجائینگے۔غفنفر عفی عنہ

اس کے ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے اس کے دو تین شمارے ہی شائع ہوئے بس اور ان کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہے اور یہ دونوں امریکہ میں مقیم ہیں۔

محمد عبدالودود:۔ جے پور میں ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۶۶ھ بمطابق ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوا۔ حافظ قرآن ہے اس نے ایم۔ اے کیا اور بینک میں آفسر ہے ۱۹۸۰ء میں شادی ہوئی اس کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

محمد عبدالوارث:۔ یہ بھی حافظ ہے۔ اس نے بی۔ کام کیا بینک میں ملازم ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد جرمنی چلا گیا وہیں شادی کی اور آباد ہو گیا۔

محمد عبدالمغیث:۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۰ء کو پیدا ہوئے۔ حافظ ہے ایم۔ بی۔ بی ایس ڈاکٹر ہے آغا بھائی نے لڑکوں کی اس طرح تربیت کی ہے کہ عبدالودود نے مڈل کے ساتھ حفظ کی بھی تکمیل کر لی۔ عبدالوارث اور عبدالمغیث نے جس سال میٹرک کیا اس سال قرآن مجید بھی پورا حفظ کیا۔ خاندان میں یہ امتیاز انہی کے لڑکوں کو حاصل ہے۔ لڑکیوں میں بڑی لڑکی عذرا نے بی۔ اے کیا ہے نظام الدین سے اس کی شادی ہوئی ہے اور صاحب اولاد ہے۔

محمد عبدالحلیم عرف اچھے میاں:۔ ۶ر اپریل ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوا، ابتداء میں حافظ جی ابا نے قرآن مجید کے ابتدائی تین پارے یاد کرائے ۱۹۳۶ء میں دکان سنبھالی اور تجارت کی، ۱۹۴۰ء میں حیدرآباد دکن چلا گیا غالباً ۱۹۴۱ء میں مدرسہ نظامیہ حیدرآباد میں پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے جے پور آیا ۱۹۴۲ء میں منشی کیا پھر مدرسہ تعلیم الاسلام میں عربی پڑھی شوال ۱۳۶۳ھ ستمبر ۱۹۴۳ء میں دارالعلوم دیوبند بھیجا گیا یہاں پڑھتا رہا ۱۹۴۷ء میں کراچی آ گیا ۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم دیوبند گیا اور موقوف علیہ اور دورہ کیا شعبان ۱۳۶۳ھ مئی ۱۹۴۹ء میں کراچی آیا۔ ریڈیو پاکستان کراچی میں مولانا احتشام الحق تھانویؒ کے یہاں تفسیر قرآن میں معاون کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

کچھ عرصہ آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی میں ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں لیاقت نیشنل لائبریری سے وابستہ ہوا۔ اور یہاں کم وبیش چودہ برس کام کیا، اپریل ۱۹۶۸ء میں اورنٹیل کٹیلاگر کی حیثیت سے کتب خانہ جامعہ کراچی میں کام کیا اور ترقی کر کے اسسٹنٹ لائبریرین ہوا۔ نومبر ۱۹۷۷ء سے ہیرویونیورسٹی کانو میں سینئر لائبریرین کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔

۱۹۵۳ء میں میٹرک کیا، ۱۹۵۷ء میں مولوی فاضل کیا ۱۹۶۷ء میں جامعہ کراچی سے اسلامیات میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۷۱ء میں جامعہ کراچی سے علم کتب خانہ میں ایم۔اے کیا، ۱۹۸۱ء میں اسلامی کتب خانوں کے موضوع پر اسی جامعہ سے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔

۱۹۵۷ء سے معارف اعظم گڈھ اور دیگر علمی رسائل میں مقالات لکھ رہا ہوں، ۱۹۵۷ء میں حیات وحید الزماں لکھی۔

۱۹۵۸ء میں تحفۃ الاخیاء ترجمہ مشارق الانوار کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا۔

۱۹۵۹ء میں نصیحۃ المسلمین مؤلف مولانا خرم علی بلہوریؒ کو از سر نو ترتیب دیا۔

۱۹۶۳ء میں عجالہ نافعہ کا اردو ترجمہ اور اس کی شرح فوائد جامعہ کے نام سے لکھی۔

۱۹۷۲ء میں البضاعۃ المزجاۃ لمن یطالع المرقاۃ فی شرح المشکوٰۃ لکھی جو مکتبہ امدادیہ ملتان سے شائع ہوئی یہ عربی میں ہے۔

اس دوران تذکرۃ الخلیل کی ترتیب نو کی۔

۱۹۶۱ء میں الاتقان فی علوم القرآن کے ترجمہ پر نظر ثانی اور مقدمہ لکھا۔

پہلی شادی ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی لیکن اس کا انتقال ہو گیا دوسری شادی ۲۷ رذوالحجہ ۱۳۷۲ھ بمطابق ۲۸ راگست ۱۹۵۴ء میں کی جس سے چار لڑکے اور آٹھ لڑکیاں ہیں۔

۱۔ محمد الاول، یہ حافظ ہے۔

۲۔ محمد الثانی، یہ بھی حافظ ہے جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی میں دورۂ حدیث تک تکمیل کر کے اول پوزیشن حاصل کی، بعد ازیں تخصص فی الحدیث مولانا نعمانیؒ کی نگرانی میں کیا اور ممتاز رہا، بعد ازیں سندھ یونیورسٹی

سے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔اوراب تک دسیوں تحقیقی مقالات جومختلف رسائل میں طبع ہوئے،اور متعدد کتابیں بھی تصنیف کر چکا ہے۔جس پر کئی بار صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا ہےاور مسلسل روز نامہ جنگ میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں،اردو یونیورسٹی کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہیں اور متعدد اہل علم ان کی زیرنگرانی پی۔ایچ۔ڈی کر چکے ہیں۔

۳۔محمود۔یہ بھی حافظ اور عربی میں ادیب فاضل اور ایم۔اے ہے اور ڈیفنس اسکول ڈی۔ایچ میں پڑھاتا ہے۔

۴۔حماد۔اس نے بھی انٹر کیا ہے۔

۵۔حبیبہ۔یہ حافظ ہے۔اس کی شادی مولانا نعیم الدین صدیقیؒ مشیر امور مذہبی جامعہ کراچی سے ہوئی،یہ صاحب اولاد ہے۔

۶۔بشریٰ یہ بھی حافظ ہے اس کی شادی مولانا عبدالحلیم خان ناظم کتب خانہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی سے ہوئی ہے،یہ بھی ماشاءاللہ صاحب اولاد ہے۔

۷۔شاکرہ۔یہ بھی حافظ قرآن ہے اس کی شادی شکیل احمد خاں سے ہوئی ہے اور صاحب اولاد ہے۔

۸۔سلمہ بھی حافظ ہے۔اس کی بھی شادی ہو چکی ہے اور صاحب اولاد ہے۔

۹۔ذکیہ۔ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہے۔یہ بھی شادی شدہ ہے۔

۱۰۔راشدہ۔یہ بھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہے۔

۱۱۔سلمہ،۱۲۔نقیہ،۱۳۔صفیہ۔ان کی شادی عظیم الدین سے ہوئی ہے مدرسہ عائشہ کی فاضلہ اور ایم۔اے ہے۔

محمد عبدالعظیم عرف مظفر میاں:۔ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔یہ ۱۳۵۹ھ بمطابق ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے ابتداء میں چھوٹی موٹی تجارت کی ۱۹۴۷ء میں پاکستان آگئے سٹی پوسٹ آفس کراچی میں ملازمت کی اور ۱۹۸۰ء میں اس سے سبکدوش ہو گئے،۱۹۴۹ء میں میٹرک کیا،اور ادیب کا امتحان دیا۔۱۹۵۴ء میں شادی کی ماشاءاللہ صاحب اولاد ہیں،نیک وصالح ہیں،۱۳۰۲ھ میں مکتبہ اہل سنۃ و جماعۃ کراچی ۱۹ قائم کیا

اس سے حسب ذیل کتابیں اب تک شائع ہوچکی ہیں۔

۱۔شہداء کربلا پر افتراء از مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ۔

۲۔یزید کی شخصیت۔

۳۔کتاب الآثار لامام ابی حنیفہؒ۔

۴۔قصاص عثمانؓ اور حضرت علیؓ۔

۵۔کریما۔جلی و خفی،اردو منظوم ترجمہ،اور انگریزی ترجمہ۔

۶۔یزید علماء دیوبند کی نظر میں،از ڈاکٹر قاری محمد ضیاء الحق۔اب یہ تمام کتابیں الرحیم اکیڈمی سے شائع ہوگئی ہیں۔

اولاد:۔ (۱)سعیدہ۔(۲)احمد مرحوم۔(۳)محمد عبدالواسع۔(۴)محمد عبدالرافع۔(۵)محمد عبدالنافع۔(۶)عفت ناہید۔(۷)محمد عبدالجامع عرف طارق۔(۸)محمد عبدالصانع عرف شارق۔(۹)شازیہ۔(۱۰)مبشرہ۔(۱۱)محمد عبدالمنیر۔(۱۲)محمد عبدالوالی عرف فیصل۔(۱۳)امۃ اللطیف عرف حناء۔(۱۴)محمد عبدالمتعالی،عرف نعمان۔(۱۵)میمونہ عرف ثناء۔

محمد عبدالرحمٰن غضنفر:۔ یہ میرے سب سے چھوٹے بھائی ہیں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے عربی فارسی مدارس عربیہ میں پڑھی لیکن تکمیل نہیں کی۔ابتداء میں تجارت کی پھر پوسٹ آفس میں ملازمت اختیار کی بعدازاں سعودی عرب میں کسی کمپنی میں ملازم ہوکر چلے گئے وہاں تین سال کام کیا۔اسی اثناء میں عمرے اور حج کئے،یہ ہرفن مولیٰ ہیں اردو فارسی میں شعر کہتے ہیں،موٹر رکشہ بھی چلاتے رہے ہیں،کسی کو تعویذ درکار ہوں تو اس سے بھی دریغ نہیں فرماتے ہیں۔ہومیو پیتھ ڈاکٹر بھی مستند ہیں کوئی بیمار ہو تو علاج معالجہ میں بھی انہیں پس و پیش نہیں ہے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے آج کل علمی و دینی ترقی اور اپنی آخرت کی بہتری کی خاطر دینی کتابیں شائع کرتے ہیں اور شب و روز اس میں سرگرم عمل ہیں۔چنانچہ ایک کثیر رقم سے الرحیم اکیڈمی یعنی (دارالنشرۃ العلمیہ) قائم کی ہے۔آدمی باغ و بہار ہیں،جتنی دیر آپ ان کے پاس بیٹھیں گے

خوش رہیں گے ،اللہ تعالیٰ ان کی دنیا و آخرت سدھارے اور دونوں جہان کی نعمتوں سے انہیں سرفراز فرمائے۔(آمین)

۱۹۵۹ء میں شادی کی تھی ،کنبہ ماشاءاللہ بڑا ہے ،لڑکے لڑکیوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

(۱) محمد اعجاز الرحمٰن عرف مسعود اختر ۔ یہ حافظ قرآن ہے اور ۱۶؍اپریل ۲۰۰۸ء سے مفقود الخبر ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ جلد اسے جلد بخیر و عافیت اپنے گھر لوٹائے ۔(آمین)۔

(۲) محمد اعزاز الرحمٰن عرف سلمان اختر ۔ ان کا عین جوانی میں ۱۷؍جون ۲۰۰۸ء کو ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا ،اللهم المغفرله و ارحمه و جعل الجنة مثواه ۔

(۳) محمد عبید الرحمٰن ۔

(۴) عالیہ خانم ۔

(۵) محمد عبد الحنان ضیغم ۔

(۶) محمد عبود الرحمٰن عرف زرغام ۔

(۷) عائشہ خانم ۔

(۸) محمد عباد الرحمٰن ۔

(۹) محمد عابد الرحمٰن ۔

(۱۰) سعدیہ ۔

الحمد للہ ان کی اولادوں میں چھ حافظ قرآن ہیں پانچ لڑکے اور ایک لڑکی عائشہ خانم ،اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے ۔ آمین

حضرت مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ:۔حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء میں سے تھے، حاجی امداد اللہؒ نے انہیں جو سند خلافت عطا کی تھی وہ مطبوعہ تھی، اس کی فوٹو کاپی ہدیہ ناظرین ہے، حضرت مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ بھی اپنے خلفاء کو یہ ہی سند دیتے تھے چنانچہ مولانا نعمانیؒ کو دی تھی، اس پر مولانا حیدر حسن خانؒ کے دستخط بھی موجود ہیں، یہ میں نے مولانا نعمانیؒ کے پاس دیکھی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاجی امداد اللہؒ ہجرت کے بعد اس طرح کی مطبوعہ سند خلافت واجازت اپنے خلفاء کو دیا کرتے تھے، یہ سلسلہ مکہ مکرمہ میں شروع کیا تھا، اس لئے کہ وہاں شامی اہل علم حضرات ان سے وابستہ تھے ان کی وجہ سے حضرت نے اجازت نامہ عربی میں چھپوایا تھا اسی وجہ سے اس نوع کا مطبوعہ خلافت نامہ تذکرۃ الخلیل میں نظر سے نہیں گزرا۔اس اجازت نامہ کی فوٹو کاپی ہدیۂ ناظرین ہے۔(۱)

(۱)ان کا تذکرہ نقوش ''شخصیات نمبر'' لاہور۱۹۵۴ص ۱۹۸میں ملاحظہ فرمائیں۔

ابا میاں محمد عبد الرحیم خاطر رحمہ اللہ سلسلۂ عالیہ چشتیہ میں شرف بیعت رکھتے تھے اور سلوک کی تکمیل مولانا حکیم محمد ابراہیم خاں رُوحی ٹونکی رحمہ اللہ (المتوفی ۶ ۲ فروری ۱۹۳۴ء) سے کی تھی۔ ابا میاں ان کے خلیفۂ مجاز تھے لیکن کسی کو بیعت نہیں کیا اور اس میں اخفاء ایسا کیا تھا کہ قریبی حضرات کو بھی اس کا علم نہ تھا۔

سلسلہ طریقت حسب ذیل ہے:۔

محمد عبد الرحیم خاطر، حضرت مولانا محمد ابراہیم خاں رُوحی، حضرت شاہ محمد علی، حضرت شاہ سکندر علی، حضرت غلام محمد شاہ کشمیری عرف مسکین شاہ، حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی، حضرت شاہ فخر الدین دہلوی، حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی، حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی رحمہم اللہ تعالیٰ۔

خلافت نامہ

الٰہی عاقبت برادر دینی مسمّیٰ شیخ عبدالرحیم صاحب را بالخیر والعافیۃ باد بالنبی وآلہ الأمجاد بحق رب العباد و نیز برادر دینی شیخ موصوف را اجازت بیعت دادم کما اجازنا شیخنا و مرشدنا مولانا محمد علیشاہ قدس سرہ العزیز باید کہ شیخ موصوف حسب توفیق الٰہی پابند شریعت وصوم وصلوٰۃ مدام باشند و معروف باشاعت واعلاء کلمہ اللہ تعالیٰ خود را دانند۔ فقط والسلام

العبد

محمد ابراھیم عفی عنہ روحی چشتی نظامی

بقلم خود

شجرۂ چشتیہ معینہ نظامیہ فخریہ نیازیہ مسکینیہ منظومہ مجید اللہ خاں صاحب متخلص بخاور، جیل پریس (ریاست) جھالاواڑہ، ۱۳۳۰ھ (۱۹۰۰ء) ص ۹ تذکرہ روحی میں الہام الدین خان نے اس شجرہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہم نے اس کا یہاں ذکر کیا ہے۔

الحمد للہ والمنة کہ بہنگام محمود و آوان مسعود حسب الارشاد پیر و مرشد

حضرت مولوی محمد علی شاہ صاحب

این شجرہ المسمی بہ

شجرہ چشتیہ معینیہ نظامیہ فخریہ نیازیہ مسکینیہ

منظومہ محمد مجید اللہ خان صاحب خلف

صاحبزادہ بخشی صالح محمد خان صاحب مرحوم المتخلص بہ خاور

در مطبع محمدی سرکار ٹونک باہتمام غالب علیخان مہتمم مطبوع شد

مولانا محمد ابراہیم روحی ٹونکی رحمہ اللہ کا اجازت نامہ خلافت مجاز کا عکس ملاحظہ فرمائیں۔

اب درد فراق سے ہوں میں سقیم اے مظہر ذات خدائے کریم

مرشد مولانا ابراہیم اے صاحب علم و یقین مدد

الٰہی عاقبت برادر دینی شیخ عبدالرحیم صالح بالخیر والعافیۃ باد

بالنبی وآلہ الامجاد بحق رب العباد و نیز برادر دینی شیخ موصوف را

اجازت بیعت دادم کما اجازنا شیخنا و مرشدنا مولانا محمد علی شاہ قدس سرہ العزیز

باید کہ شیخ موصوف حسب توفیق الٰہی پابند شریعت و صوم و صلوٰۃ مدام باشند [illegible]

[illegible] والسلام

محمد ابراہیم روحی چشتی نظامی

(۱) مولانا حکیم محمد ابراہیم روحی کی وفات ۱۱ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ / بمطابق ۲۶ فروری ۱۹۳۴ء کو ہوئی۔ ان کا مزار شریف بھی بھیرہ (ٹونک) اپنے شیخ مولانا محمد علی شاہؒ کی درگاہ شریف کے چبوترے پر ہی ہے۔ "خورشید روحی" کے تعارف کے ذیل میں صفحہ ۱۶۷ و ۱۶۸ پر دو قطعات جناب منشی عبدالرحیم صاحب خوشنویس جے پوری متخلص بہ خاطر نے لکھے ہیں۔ (تذکرہ روحی ص: ۱۲-۱۳، طبع ٹونک، راجستان، رجب المرجب ۱۳۹۶ھ / جون ۱۹۷۶ء)

پروفیسر محمد الیاس برنیؒ

(ماہنامہ معارف، فروری-مارچ 2002ء)

پروفیسر محمد الیاس برنی

از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی٭

محمد الیاس برنی صاحب بہت محنتی، حوصلہ مند، ذہین و زیرک انسان تھے، انہوں نے جس میدان میں قدم رکھا اسے سرکر کے چھوڑا، انہوں نے معاشیات پڑھی اور تمام عمر پڑھایا جو لکھا ارباب فن نے اس کی داد دی، اردو ادب کی خدمت کی، اسلام پر بھی لکھا جو لکھا بار بار چھپا اور ہاتھوں ہاتھ نکلا، ان کا اصل میدان روحانیات اور تصوف تھا، دین سے ان کا رشتہ پختہ تھا، فاروقی ہونے کے ناطے ان کی اسلامی غیرت، اخلاص اور دردمندی، للّٰہیت وخلوص ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں وتاباں ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے متحدہ ہندوستان میں قادیانیت کے سلسلہ میں ان سے جو کام لیا وہ اپنی نظیر آپ ہے، علمی وعملی اعتبار سے اس فتنہ کی سرکوبی میں سب ہی شریک رہے ہیں، اکابر دیوبند کی مساعی اس باب میں بہت درخشاں اور روشن ہیں، اب بھی وہی یہ خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کا دائرہ کار زیادہ تر اردو زبان تک محدود ہے، یہ کام بین الاقوامی زبانوں میں کرنا وقت کی اہم ذمہ داری ہے، وسائل اور رجال کار کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ رکاوٹ بھی دور فرمائے، آمین۔

٭مشرف تخصص علوم حدیث، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔

الیاس برنی نے "قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ" میں اپنی طرف سے بہت کم لکھا ہے، میرے بھائی محقق عصر مولانا محمد عبدالرشید نعمانی کے بقول برنی صاحب نے قادیانی مذہب میں قادیانی کی تضاد بیانیوں کو یکجا کر کے ہر شخص کی نظر میں اسے پکا جھوٹا نبی ثابت کر دکھایا ہے جس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

یہ اللہ کی توفیق اور ان کی ماں کی دعا کا ثمرہ ہے کہ ایسا عظیم کام ان سے لیا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس گروہ میں بلند مقام عطا کیا جس نے ارتداد کے خلاف جان کی بازی لگائی تھی اور وہ شہرت انہیں نصیب فرمائی جو انہیں کسی تصنیف سے نہ ہو سکی اور دنیا میں انسان کی اس سے بڑھ کر بھلا اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ اسے اس جماعت میں شرکت نصیب ہو جائے جس کی سربراہی امت میں افضل بشر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔

محمد الیاس برنی نے اپنی اور اپنے دوستوں کی سرگذشت صراط الحمید جلد اول و دوم اور برنی نامہ میں جس انوکھے اور دلچسپ انداز میں پیش کی ہے وہ سبق آموز اور بہت دلچسپ ہے، اردو زبان میں ان کی علمی اور ادبی خدمات گوناگوں ہیں، ان کی مطبوعہ تصنیفات وتالیفات اور تراجم کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے، بعض تصنیفات اپنا جواب آپ ہیں، پاکستان میں کراچی اور لاہور کے مشہور کتب خانے، کراچی یونیورسٹی لائبریری، لیاقت میموریل لائبریری، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، پنجاب پبلک لائبریری میں دو چار کتابوں سے زیادہ نہیں ہیں، انجمن ترقی اردو میں دس پندرہ کتابیں مل جاتی ہیں، اردو ادب کے شائقین اور محققین کے ذاتی کتب خانوں میں ممکن ہے ان کی کچھ زیادہ کتابیں محفوظ ہوں لیکن ان تک رسائی اور تعاون دونوں آسان

کام نہیں، بہرحال جہاں سے جو مل سکا فائدہ اٹھایا اور یہ مختصر مقالہ ترتیب دیا ہے
میرے علم میں نہیں کہ کسی محقق نے ہندوستان اور پاکستان کی جامعات میں برنی
صاحب کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے موضوع بنایا ہو، ان پر کئی حیثیت سے ڈاکٹریٹ
کی جاسکتی ہے۔

نام و نسب | محمد الیاس نام، صلاح الدین لقب اور برنی[1] تخلص تھا۔ باپ کا نام محمد ابراہیم
تھا۔ موصوف کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور اس
نسبت سے کبھی فاروقی لکھتے ہیں، رسمی تعلیم کے لحاظ سے مولوی نہ تھے لیکن مولوی عبدالحق
کی طرح مولوی محمد الیاس بھی کتاب پر لکھا جاتا تھا۔

ولادت | ۲۸ شعبان ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۹۰ء یوم شنبہ بوقت ۹ بجے
شب اپنے ننھیال خورجہ میں پیدا ہوئے[2]۔

تعلیم و تربیت | ابتدائی تعلیم و تربیت گھر میں پائی۔ چنانچہ برنی صاحب کا خود بیان

[1] سنسکرت میں پہاڑی قلعہ کو ڈرن کہتے ہیں۔ برن کیا تھا؟ ایک بلند اور وسیع ٹیلے پر قلعہ تھا
اس کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ یہ قدیم سے ایک ہندو راج دھانی تھی، شاید دہلی سے قریب
ہونے کے سبب اس کو جنگ میں کوئی خاص اہمیت حاصل ہو۔ جب کہ یہاں راجہ ڈودحکمران
تھا۔ سلطان شہاب الدین محمد غوری علیہ الرحمہ نے اس کو ۵۸۶ھ میں فتح کیا تھا۔ مزید تفصیل
کے لئے ملاحظہ ہو "صراط الحمید" یعنی سفرنامہ عراق، شام، فلسطین، حجاز۔ ط ۲۔ حیدرآباد دکن
مطبع برقی، اعظم جاہی۔ ۱۳۵۸ھ۔ ج ۱ ص ۳۱۶۔ ۳۱۸ (قصہ چہار درویش) تاریخی اعتبار
سے برن اور عرف عام میں بلند شہر کہلاتا ہے۔ یہ ضلع ہے جو موصوف کا جدی وطن ہے اور خورجہ
اس کی تحصیل ہے۔ یہ ان کا ننھیال ہے۔ [2] برنی نامہ حیدرآباد دکن، مطبع ابراہیمیہ۔ ۱۹۵۰ء، ص ۱

ہے: "قرآن شریف گھر میں پڑھا، فارسی و حساب، انگریزی وغیرہ والد صاحب سے
اس وقت پڑھی تھی جب وہ چند سال کے واسطے حیدرآباد سے تشریف لاکر مکان پر
مقیم رہے تھے۔ اس وقت فارسی پر توجہ زیادہ رہی عربی کو اتنا موقع نہ مل سکا جتنا
ملنا چاہئے تھا، تاہم قرآن کریم کی برکت سے عربی سے خاصا ربط ہو گیا[1]۔ باپ حیدرآباد
میں وکیل تھے، تعطیلات میں کبھی بلند شہر آتے۔ اس لئے ان کی تربیت ماں کی آغوش
میں ہوئی[2]۔

وہ بہت دولتمند باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں، ساری دولت و جائیداد وغیرہ
کی تنہا وارث تھیں۔ اللہ کا دیا گھر میں سب کچھ تھا لیکن ان کی طبیعت کا رنگ ڈھنگ،
ہی کچھ اور تھا، باوجودیکہ کپڑے اچھے سے اچھے موجود ہوتے تھے لیکن کبھی سادہ لباس پہنتی
تھیں اور موٹا جھوٹا ہی کھاتی تھیں اور بچوں کو بھی اسی طرح رکھتی تھیں۔ دکھ درد میں
غریبوں کے کام آتیں، دامے درمے سخنے قدمے ان کی مدد کرتی تھیں، اچھا کھانا دوسروں
کو کھلاتیں خود جو کی روٹی اور چٹنی پر گزارا کرتی تھیں۔ چکی پیسنے سے انہیں عار نہ تھا بیٹیوں
کو چکی پیسنے کی نصیحت کرتی تھیں، چاہتی تھیں کہ بچے عیش پسند نہ بنیں۔ کھاتے وقت
غریبوں کا خیال آتا تو آب دیدہ ہو جاتی تھیں۔ بہت نرم دل و مسکین طبع تھیں۔ بچوں کی غلطی
پر سزا یہ تھی کہ انہیں اپنے ساتھ نہیں کھلاتی تھیں، پاس نہیں بٹھاتی تھیں، عزیزوں میں ساتھ
نہیں لیجاتی تھیں۔ یہ ایسی سزا تھی کہ وہ رونے آجاتے تھے، غیر کی ڈانٹ ڈپٹ کو اچھا نہیں
سمجھتی تھیں، کہتی تھیں اس سے بچوں کی غیرت نکل جاتی ہے، نماز، روزے کی پابند تھیں نقشبندیہ
سلسلہ میں بیعت تھیں[3]۔

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۳۱ [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۶۰۔ ۳۲۱ [3] ایضاً ص ۳۱۸۔ ۳۲۱۔

ابتدائی و ثانوی تعلیم | لڑکپن میں والدہ صاحبہ کے زیر اثر تربیت پائی، ان کا بیان ہے کہ میٹرک پاس کئے تک ہم ان کی خدمت میں رہے[1] والد صاحب حیدر آباد چھوڑ کر چند سال کے لئے چھٹی میں بلند شہر رہے تو یہاں اپنے لڑکوں کو پڑھاتے، حافظ محمد اسمٰعیل اور محمد اسحاق کو وکالت کے امتحانات کی تیاری کراتے تھے۔ برنی صاحب نے قرآن فارسی حساب انگریزی وغیرہ گھر پر انہی سے پڑھی۔ پھر مڈل کی جماعت میں خورجہ کے ہائی اسکول میں جو سیٹھ لالہ مٹھی مل نے قائم کیا تھا داخل کئے گئے[2]۔ برنی صاحب کا بیان ہے "ابھی میٹرک سال اول میں تھے کہ انسپکٹر سید مہدی حسین بلگرامی تشریف لائے نویں جماعت کی انگریزی کا امتحان لیا، ہماری باری آئی تو ہم بڑھ چڑھ کر بولے۔ ہماری جسارت پر وہ چونکے میٹرک کا طالب علم انگریزی لٹریچر میں دم مارتا ہے۔ اللہ کے فضل سے بات رہ گئی، انسپکٹر صاحب نے رپورٹ اچھی لکھی اسکول کا نام روشن ہوا[3] خانگی تربیت کے سوا خدا کا فضل تھا کہ شروع سے انہیں اچھی صحبتیں ملیں جن سے ان کا دینی مزاج بن گیا۔

خورجہ ہائی اسکول سے ۱۹۰۸ء میں میٹرک کا امتحان اول درجہ میں پاس کیا اور سرکار سے انعامی وظیفہ ملا پھر اللہ تعالیٰ کے فضل سے انعامی وظیفوں کا سلسلہ ایم۔ اے تک برابر قائم رہا۔

۱۸۹۰ء سے اس وقت تک زندگی کا پہلا دور خورجہ بلند شہر میں گزرا[4]

علی گڑھ کالج میں داخلہ | ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں کا ماحول ہی کچھ اور تھا برنی صاحب لکھتے ہیں:

"جب ہم علی گڑھ پہنچے تو لڑکوں نے ہماری وضع قطع خیالات و اعتقادات سے اندازہ

[1] صراط الحمید ج۱، ص ۳۳۲ [2] ایضاً [3] ایضاً ص ۳۴۲ [4] ایضاً۔

لگایا کہ ایک مذہبی دیوانہ آگیا خوب لطف رہے گا۔ مگر اللہ کا فضل اس نے عزت و وقار کے ساتھ ہوشیاروں کے ساتھ بسر کرادی، طالب علمی کے دائرہ میں انعام، تمغہ، اعزازی عہدے سب کچھ دلائے۔ ... کالج یونین کی صدارت حاصل کی بیسود مشرقی بنگال پہنچے"[1]

جنگ طرابلس کے لئے چندہ | جنگ طرابلس و بلقان کے موقع پر اپنی ضروریات مختصر کیں جو ہو سکا خود نکالا اور چندہ کرکے پچاس ہزار کی امداد ترکی پہنچائی الزام لگایا گیا نگرانی رہی حساب میں ایک پائی کا فرق نہ آیا۔

بی اے میں کامیابی کا ثمرہ | ۱۹۱۲ء میں بی اے میں برنی کی کامیابی سب سے اعلیٰ رہی جس کی پوزیشن صوبہ میں ایسی ہوتی تھی ڈپٹی کلکٹری اس کے قدم چوما کرتی تھی۔ چنانچہ بلا درخواست ایسے طالب علم کا ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر تقرر کیا جاتا تھا انہیں بھی اس کا مستحق قرار دیا گیا[2]

استادوں کی توجہ اور شفقت | علی گڑھ میں جو بزرگ خدا رسیدہ استاد ملے ان سے ان کا تعلق قائم رہا اور یہ ان کی توجہات کا مرکز بنے رہے، ان میں مولانا خلیل احمد تھے جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں حضرت کی صحبت سے اسلام کی رفعت کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ یوں تو طلبہ کے ساتھ اخلاق عام تھا لیکن ہم پر عنایت و محبت اس درجہ بڑھی کہ ملے بغیر چین نہیں، گفتگو کی وہ نوبت کہ تخلیہ لابد۔ کالج میں پروفیسر بنے رہے، دینیات اور عربی ادب پڑھاتے رہے اپنا کام بھی کرتے رہے مگر کالج کا رنگ کچھ سے کچھ ہو گیا[3]

برنی نے "بی اے" پر بس نہیں کیا نہ ڈپٹی کلکٹری کی طرف دیکھا شملہ سے پرنسپل

[1] صراط الحمید ج۱ ص ۳۴۲ [2] ایضاً ۳۴۵، ۳۴۶ [3] ج۱ ص ۳۲۳۔

مسٹر ٹول جو ان کے استاد بھی تھے اور ان کی طبیعت سے واقف تھے ان کا خط آیا، اس میں لکھا "مجھے کسی صورت پر اصرار نہیں چاہو ملازمت کرو چاہو تعلیم جاری رکھو۔ استاد کا اشارہ ظاہر تھا کہ تعلیم بہتر ہے"، برنی صاحب کی خواہش بھی یہی تھی، مگر والدین کی رضامندی درکار تھی، وہاں حوصلہ کی کمی نہ تھی انہوں نے بھی اجازت دے دی برنی صاحب کے ملازمت نہ کرنے کے عذر کی خبر جب میگزین میں چھپی تو اقربا و احباب نے شور مچایا یہ کفران نعمت ہے کوتہ اندیشی اور غرور ہے لیکن ہم خوش والدین خوش تو اللہ خوش[۱]

علی گڑھ میں ایم اے معاشیات میں داخلہ لیا اور ساتھ ہی ایل ایل بی بھی کرتے رہے۔

سوسائٹی کی عمارت میں قیام اور ایک بزرگ سے ملاقات اور دوستی

اب کالج کا بورڈنگ چھوڑ کر وہ سوسائٹی کی عمارت میں آ گئے یہ گویا گریجویٹوں کا بورڈنگ تھا۔ یہاں قریب ہی بنگلہ میں عبداللہ نام کے ایک بزرگ رہتے تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی، تعلق بڑھا۔ برنی صاحب ان کے متعلق فرماتے ہیں۔ یہ سن رسیدہ بزرگ مردانہ حسن کا نمونہ تھے ان کا تکیہ کلام جل جلالہ تھا جرمن، فرانسیسی، انگریزی، عربی، فارسی، اردو کئی زبانوں میں عبور تھا قوم کے جرمن تھے، جنات سے بھی ربط تھا۔ باپ ان کے ہندوستان میں ڈاک خانہ جات انسپکٹر جنرل رہ چکے تھے، یہ بغداد میں مسلمان ہوئے اور علی گڑھ میں انتقال ہوا تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کا خوب فیضان تھا۔ بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے، دوستی بڑھی بے تکلفی بڑھی، برنی صاحب کہتے ہیں:

۱؎ صراط الحمید ص ۳۴۶۔

• حضرت نے انتہائی محبت سے چاہا کر خاص خاص شغل مفیدہ سہولت سے طے کرا کر بعض نادر کمالات سے سرفراز فرمائیں لیکن اپنا ذوق ہے۔ کمال کے اکتساب پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی، اگر بے کمالی تحقیق ہو جائے، یہی انسان کا سب سے بڑا کمال ہے حضرت اصلی منشا پا گئے اس کو عالی ہمتی قرار دے کر بہت داد دی سینہ سے لگایا کہ اب کسی کمال کے حصول کی ضرورت نہیں ہزار کمالات ہوں، عبدیت ہی اصل اور انتہائی مقام ہے۔ اس میں خوف و گزند نہیں حفاظت یقینی ہے"[۱]

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد کے اعزازی پرنسپل اسسٹنٹ

تعلیم کا آخری زمانہ تھا اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا کام چل رہا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد یونیورسٹی کے کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کے معتمد تھے۔ برنی اعزازی پرنسپل اسسٹنٹ کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کام کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب دل کھول کر کھلاتے اور کس کر کام لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب طلبہ کو بہت عزیز رکھتے تھے اور خود بہت ہر دل عزیز تھے۔ سر راس مسعود بھی یہاں آتے تھے اسی زمانے میں ان سے بھی دوستی ہوئی[۲]

اسی طرح برنی صاحب نواب وقار الملک بہادر المتوفی ۱۹۱۷ء کے بھی اعزازی مددگار رہے، یہاں خورد و نوش کہاں مگر صحبت ایسی نعمت تھی جس کا کوئی بدل نہ تھا شام کو جب فرصت ہوئی تو راس مسعود تشریف لاتے ڈاکٹر صاحب سے بہت تعلق تھا، روزانہ یہی معمول تھا[۳]

علی گڑھ میں سر آدم جی پیر بھائی کے پوتوں کی اعزازی اتالیقی

سر آدم جی پیر بھائی وہ شخص تھے جنھوں نے یک مشت لاکھ روپیہ نقد دیا تھا جس سے علی گڑھ کالج میں

۱؎ صراط الحمید ج ۱ ص ۳۲۳-۳۲۴ ۲؎ ایضاً ص ۳۳۳ ۳؎ ایضاً ج ۲ ص ۲۰۰۔

سائنس کا شعبہ قائم کیا گیا تھا۔ سر آدم جی نے جب اپنے پوتوں حسن علی، محبت علی، اشرف علی کو اسکول میں داخل کیا، انہیں ان کی اخلاقی تربیت کا بہت خیال تھا۔ نواب وقار الملک نے بہت غور و خوض کے بعد برنی صاحب کے سپرد کیا۔ موصوف نے اتالیقی کی خدمت بعض اختیارات و شرائط کے ساتھ قبول کی، چونکہ اقتدار برتنا ضروری تھا۔ اس لئے معاوضہ قبول کرنے سے معذرت کی اعزازی حیثیت سے یہ ذمہ داری قبول کی ان سے تعلقات بھی قائم رہے۔

یوں برنی صاحب کی راس مسعود المتوفی ۱۹۳۷ء سے دوستی ہوگئی اور تعلقات میں اتنی ترقی ہوئی کہ جب راس مسعود کی علی گڑھ میں شادی ہونے لگی تو ان کے قدیم دوست بہت تھے لیکن انہوں نے اس موقع پر برنی صاحب کو سینہ سے لگایا اور کہا تم میرے حقیقی بھائی کے برابر ہو۔ شادی کا اہتمام تم اپنے ذمہ لو تو مجھے اطمینان اور خوشی ہو، چنانچہ لینا، دینا، نقدی، نیوتہ، بری، جہیز کل اہتمام ان کے ہاتھ میں رہا اللہ تعالیٰ نے حسن انجام سے سرخرو فرمایا۔ اس شادی کی مصروفیت میں ایک ہفتہ ایسا گزرا کہ نہ دن کی خبر نہ رات کا ہوش مگر خوشی کا جوش تھا نہ گرانی نہ تکان جب موقع ملا کھا لیا جب موقع ملا سو لئے، ہر دم تازہ دم، عجیب تقریب تھی۔ اس کے بعد ان سے دوستی و محبت اور پختہ ہوگئی۔[1]

شہسواری کالج میں ہمیشہ سے کھیلوں کا معیار بلند رہا باقاعدہ ٹیم میں جگہ نہ پاسکے، کپتان وغیرہ تعلق میں اچھے تھے۔ اپنی ٹیم بنا کر کھیلتے تھے[2] گھوڑے سواری کا اسکول تھا جس میں بارہ گھوڑے تھے یہ کبھی گرے پڑے بعض موقع پر جان پر بھی بنی۔

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۳۴ [2] ایضاً ص ۳۴۴۔

اللہ کا فضل رہا حادثہ سے محفوظ رہے، اس کی امتحانی دے کر سند بھی لی اور والد کی ہدایت پر عمل کیا کہ بغیر وضو گھوڑے پر سوار نہ ہوا اور سواری کے وقت آیت شریفہ پڑھی۔ والدیہ دونوں باتیں مسنون بتاتے تھے[1] کالج میں تیراکی سیکھنے کے لیے حوض نہیں بنایا گیا تھا اس لئے یہاں نہ سیکھ سکے۔[2]

قادیانیوں سے معرکہ آرائی قادیانیوں سے معرکہ آرائی قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ اور "قادیانی قول و فعل" میں ملاحظہ فرمائیے جو ہند و پاک میں ہر جگہ دستیاب ہے۔

بی اے کو معاشیات پڑھانے پر تقرر ایم اے میں داخلہ ہوجانے کے بعد علی گڑھ کالج میں بی اے کی کلاس کو معاشیات پڑھانے پر ان کا تقرر عمل میں آیا اور چار برس تک علی گڑھ کالج میں پڑھایا۔ نتائج بہت اچھے رہے اور طلبہ بھی خوش رہے، بجٹ میں گنجایش نہ تھی ڈائننگ ہال کی بچت سے سو روپے ماہوار الاؤنس دیا جاتا تھا تین مہینے کی چھٹی میں یہ بند رہتا تھا اس حساب سے اوسط پچہتر روپیہ ماہوار ہی ہوتا تھا۔ برنی کہتے ہیں ہم مگن تھے کہ بی اے کی تعلیم کا موقع ملا۔[3]

یہ ایسا زمانہ تھا کہ ہندوستانی پروفیسروں کو بھی بی اے کلاس نہیں ملتی تھی۔ اس لحاظ سے بھی یہ ایک اعزاز تھا۔

حیدرآباد دکن سے ولایت میں حصول تعلیم کے لئے وظیفہ کی منظوری برنی صاحب نے بی اے کو معاشیات پڑھانے کے زمانے میں ولایت میں مزید تعلیم کی غرض سے وظیفہ کے لئے حیدرآباد میں کوشش کی۔ چنانچہ سید مہدی حسن بلگرامی سے ملے، انہوں نے اسکول میں معائنہ کے موقع پر جو امتحان لیا تھا، یاد دلایا پھر کیا تھا وہ

[1] صراط الحمید ص ۳۴۴ [2] ایضاً ص ۳۴۵ [3] ایضاً ص ۳۳۲

مدد کے لئے تیار ہوگئے اور اسکالرشپ کمیٹی کے ارکان کے پاس انہیں لے گئے وہ مہربانی سے پیش آئے لیکن بات فینانس کے صدر المہام مسٹر گلانسی پر ٹھہری۔ موصوف سے پہلی ملاقات ہی میں معاشی مسائل پر طویل بحث چلی وہ اتنا خوش ہوئے کہ اسی نشست میں خلاف معمول وظیفہ کا وعدہ فرمایا، وظائف میں گنجائش نہ تھی۔ ایک خاص وظیفہ منظور کرا کر وعدہ پورا کیا[1] اور کیمبرج میں داخلہ کا انتظام ہوگیا۔ روانگی میں ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا کہ یورپ میں جنگ چھڑ گئی اور جانا ملتوی ہوگیا لیکن دس برس ۱۹۲۴ء تک یہ وظیفہ برنی صاحب کے نام پر باقی رہا اور جب انہوں نے ولایت جانے سے معذرت کردی تو وہ منسوخ ہوگیا[2]

اس طرح برنی صاحب کی زندگی کا دوسرا دور ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۷ء علی گڑھ میں گزرا۔[3]

ماں کی دعا کا ثمرہ اور انتقال

برنی صاحب نے اپنی والدہ کے سنہ انتقال کی تصریح سفرنامے میں کہیں نہیں کی۔ تاہم وہ ۱۹۱۴ء تک بقید حیات تھیں اور برنی صاحب کا جو وظیفہ سرکار حیدرآباد سے منظور ہوا تھا اس کے لئے وہاں اس عرصہ میں بارہا سرکار کی طرف سے بار بار تقاضا ہوتا رہتا تھا، ان کی والدہ نے بھی کئی مرتبہ انہیں تنہائی میں سمجھایا کہ اپنی ترقی کا یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دو، میں بخوشی تم کو سفر کی اجازت دیتی ہوں لیکن برنی صاحب کو ان کی ضعیفی اور پیری میں اپنی جدائی کا صدمہ انہیں دینا گوارا نہیں تھا چنانچہ ان سے دریافت کیا کہ جدائی میں آپ کا کیا حال ہوگا۔ ماں نے کہا اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی، دل پر کس کو قابو ہے۔ تاہم جب میں خوشی سے اجازت دے رہی ہوں تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں، برنی صاحب نے کہا:

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۲۲ و ۳۲۹ [2] برنی نامہ ص ۲ [3] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۴۷-۳۴۸۔

ہم بھی تو دل سے مجبور ہیں، اس قیمت پر ہم کو ترقی مطلوب نہیں، صبح کا سہانا وقت تھا یہ فقرہ سن کر والدہ کا دل بھر آیا، دوپٹہ کا پہلو پھیلا کر وقت سے برنی صاحب کے حق میں دعا کی وہ کارگر ہوئی اور برنی صاحب کو بڑی عزت و ترقی ملی ان کے والد بھی ان کی اس استقامت پر بہت خوش ہوئے اور برنی صاحب کو تصنیف و تالیف کا چسکا لگ گیا۔

ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا، دنیا نے گھیر لیا۔

اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاد اسلامیہ کے سفر سے پہلے وہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں، انتقال کا واقعہ بھی عجیب ہے برنی صاحب فرماتے ہیں:

"صرف دو تین روز علالت رہی ایک دن علی الصباح جب آسمان صاف تھا، یٰسین شریف سنتے سنتے فرمانے لگیں کیسے بادل آتے ہیں کیسی خوش رنگ گھٹائیں ہیں کیسی ٹھنڈی ہوا ہے کیا سہانا وقت ہے۔

حضرت والد صاحب نے فرمایا۔ الحمد للہ برزخ کھلا تو رحمت کی گھٹائیں نظر آئیں۔ منزل قریب معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اِدھر اُدھر دیکھا جیسے کوئی نئی جگہ غور سے دیکھتا ہے، کلمہ پڑھا تو منکا ڈھل گیا اور جنت کو سدھاریں"[1]

جامعہ عثمانیہ کے دار الترجمہ سے وابستگی

۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں دار الترجمہ کا قیام عمل میں آیا تو اچانک ان کے مخلص دوست سر راس مسعود نے جو جامعہ عثمانیہ میں ناظم تعلیمات تھے کالج کے پرنسپل اور برنی صاحب دونوں کو تار اور خط بھیجا کہ برنی کو چھوڑ دو وہ یہاں آئیں حیدرآباد میں باپ، بھائی،

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۰۱ و ص ۳۲۱۔

سب برسرکار تھے، کام بھی اردو کا تھا پرنسپل نے روکنا چاہا لیکن دس دن میں اجازت مل گئی اور ۱۱ستمبر ۱۹۱۷ء کو برنی صاحب حیدرآباد آگئے۔ دارالترجمہ میں معاشیات میں ترجمہ کا کام سپرد ہوا اور مختلف عہدوں پر کام کیا۔

دو سال بعد جامعہ عثمانیہ میں کالج کھل گیا تو معاشیات کا شعبہ ان کے سپرد ہوا اور ترجمہ و تصنیف کا کام بھی ہوتا رہا[1]

اس طرح معیشت الہند اور علم المعیشت اور کئی کتابیں تالیف ہوگئیں جو دارالترجمہ سے شائع ہوئیں۔ تقریباً ۱۶ سال جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبہ معاشیات کی حیثیت سے تعلیم دی۔ ضمناً کالج میں سال دو سال وقتی طور پر معاشیات کے پروفیسر بھی رہے[2] اور پانچ سال تک دارالترجمہ میں ناظم رہے۔[3]

بزرگوں سے فیض برنی صاحب کو روحانیات و تصوف سے فطری دلچسپی تھی، بچپن ہی سے بزرگوں کی صحبت میسر آتی رہی۔ ان کا بیان ہے:

"لڑکپن تک خورجہ کے قیام میں حکیم سید زین العابدین ایک صاحب نسبت و صاحب کرامت بزرگ کی تعلیم سے فیض ملتا رہا علی گڑھ کالج کے دس سالہ قیام میں حضرت مولانا خلیل احمد اور حضرت عبداللہ شاہ قادری کی عنایات و التفات سے قال و حال میں جان پڑگئی، وہ سنا وہ سمجھا اور وہ دیکھا کہ اللہ کی شان نظر آنے لگی"[4]

اور جب حیدرآباد میں آنا ہوا تو لکھتے ہیں:

"یہاں بزرگوں کا کیا کہنا ماشاء اللہ حقائق و معارف کے چمن کھلے ہوئے ہیں البتہ ؎

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

---

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۴۹-۳۵۰۔ [2] برنی نامہ ص ۲۶ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۵۔

جامعہ عثمانیہ میں عبدالقدیر صدیقی سید ابراہیم ادیب پروفیسر شعبہ عربی سے گفتگوئیں ہوتیں تو ایمانیات اور تصوف کے مسائل تازہ ہوجاتے، ملاقاتوں میں بڑی خیر و برکت رہی"[1]

بیعت و خلافت مرشد کی طلب و تمنا کیسے پوری ہوئی اس کا حال برنی صاحب ہی کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

"ابتداءً (۱۹۱۷ء-۱۹۲۱ء) جب محلہ جام باغ ترپ بازار میں قیام تھا حسن اتفاق کہئے مشیت الٰہی کی کسی تحریک کے بغیر ایک دن بعد نماز فجر نادانستہ طور پر کرایہ کے مکان کا خیال آیا ایک نو تعمیر مکان پر کرایہ کے لئے خالی تختی لگی ہوئی تھی دستک دی مالک آئے، پھر بحیثیت مکاندار ایک بزرگ آئے، تعارف ہوا یہ شاہ محمد حسین صاحب تھے جو عارف باللہ شاہ کمال قادری کیمل والے کے خلیفہ تھے ان سے بات طے ہوگئی، پھر دینی و روحانی روابط بڑھے اور راہ حق کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ چلا"[2]

یہ وجودی بزرگ تھے۔ ماہ شوال ۱۳۴۳ھ ۱۹۲۵ء میں موصوف کے دست حق پرست پر قادری چشتی نقشبندی [illegible] میں بیعت کی پھر خلافت سے سرفرازی حاصل کی اور جب موصوف ناظم عدالت [illegible] وغیرہ چلے تو خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا چنانچہ مورخہ ۱۱ خورداد ۱۳۳۶ف کو شاہ محمد حسین نے ایک گرامی نامہ میں لکھا:

"میری دعا ہے کہ آپ کے فیض ولایت سے سارا عالم فیضیاب ہو یہ قیام خانوادۂ الیاسیہ علوم الٰہیہ کی تبلیغ مقتضائے وقت کے مطابق ہو آپ کا وجود نورانی اور نور ہے کہ جس سے افراد عالم متمتع ہوگا۔ الحمدللہ کہ اس کے آثار مختلف اعتبارات سے

---

[1] برنی نامہ ص ۵ [2] ایضاً ص ۷۔

نمایاں ہورہے ہیں جب کام اخلاص سے ہو تو مقبولیت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے کاموں میں برکت اور ہر قسم کی نصرت شامل رکھے۔ آمین ثم آمین"۔

خلافت نامہ پر دستخط کئے اور نقل پر شاہ کمال اللہ شاہ کے دستخط کے ساتھ بطور گواہ عبدالخالق خاں اور محمود علی بیگ کے دستخط کرا کر بھیجا اور برنی صاحب کو تاکید کی تھی کہ یہ سلسلہ جاری رکھیں چنانچہ مصروفیت کے باوجود خاص دائرہ میں اس پر عمل ہوتا رہا شاہ محمد حسینؒ کی وفات کے بعد مریدوں کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا تو ۹ر ذوالحجہ دوشنبہ ۱۳۷۶ھ ۲۶ر جولائی ۱۹۵۷ء سے بیعت کا عمومی آغاز برنی صاحب کے اپنے خاندان سے ہوا[1]

اس سے پہلے محدود حلقہ میں جو کام جاری تھا وہ بھی تکمیل کو پہنچا چنانچہ مرزا محمود علی بیگ، عبدالحلیم، عبدالخالق خاں، غلام دستگیر رشید اور احمد حسین خاں کو ۲ر ذی الحجہ مطابق ۱۹ر جولائی ۱۹۵۷ء کو خلافت سے سرفراز کیا گیا[2]

فن تجوید و قرأت کی تحصیل برنی صاحب نے اس فن کو مولانا عبدالقدیر صدیقی[3] قادری حیدرآبادی (۱۲۸۸-۱۳۸۱ھ) سے سیکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

"حضرت کی صحبت میں ہم کو بھی قرأت کا خیال پیدا ہوا، اول تو ہم اس کو محض زیبائش اور تکلف سمجھتے تھے مگر جب سمجھے تو معلوم ہوا کہ تلاوت قرآنی میں اس کی بڑی ضرورت ہے بلکہ قرأت کا حق ادا کرنا ہو تو قرأت لابد ہے۔

---

[1] برنی نامہ ص ۱۲ [2] ایضاً [3] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۰۸-۳۰۹، موصوف کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو صراط الحمید ج ۱ ص ۳۰۵-۳۱۳ و تذکرہ قاریان ہند۔ مرتبہ بسم اللہ بیگ۔ کراچی۔ میر محمد کتب خانہ (۱۲۶۱) قرائے دکن، ص ۱۷-۱۸۔

البتہ عام طور پر اس کے نکات و تفصیلات جاننے ضرور نہیں۔ بنیادی اصول جاننے کافی ہیں۔ ان کی مشق ہوجائے تو تلاوت درست ہوجائے صحتِ تلاوت سے قرآن کریم کا لطف آئے فیض کا راستہ کھل جائے یہ کام اتنا دشوار نہیں جتنا دشوار سمجھتے ہیں، چنانچہ چند ماہ کی توجہ اور محنت سے ہم نے فن قرأت کو سمجھا۔ اس کی مشق کی حتیٰ کہ قرأت کے قاعدہ سے حضرت کو تمام قرآن کریم از اول تا آخر ایک ماہ میں پڑھ کر سنایا۔ حضرت نے ہمارے عبور کو پسند فرمایا اور اطمینان ہونے پر قرأت کی سند عطا کی لیکن پختگی کے واسطے مزاولت کی ضرورت ہے، جب تک کافی مدت دور نہ رہے مشق پختہ نہیں ہوتی فن قابو میں نہیں آتا۔ ہم اپنی مصروفیتوں سے ہمیشہ عاجز رہے۔ ع ایک تبر دو ہزار سودا۔ ہمیشہ یہی حال رہا۔ دور باقاعدہ جاری نہ رکھ سکا۔ درمیان میں وقفے ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ کہ عبور غائب ہوگیا۔ سرسری خاکہ ذہن میں رہ گیا۔ پھر موقع ملے تو تجدید کی جائے۔ جس زمانہ میں عبور حاصل تھا۔ رفاہ عام کے خیال سے کہ فن قرأت کے سمجھنے میں آسانی و دلچسپی ہو جدید طرز پر ایک رسالہ بھی لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ تقریباً نصف لکھ لیا مگر پھر جو سلسلہ ٹوٹا تو اب تک نہ جڑ سکا۔ مسودہ یوں ہی ادھورا پڑا ہے اور فی الحال عبور بھی باقی نہیں۔ اللہ کو منظور ہو اور آئندہ موقع ملے تو امید ہے کہ منصوبہ پورا ہوجائے۔ فن قرأت پر رسالہ شائع ہوجائے"۔ وما توفیقنا الا باللہ۔ (ج ۱ ص ۳۰۸-۳۰۹)

بعد میں یہ کتاب مکمل کی۔

کھیلوں پر تبصرہ بنوٹ کے فن پر رسالہ کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی اور بنوٹ کے بارے میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا، جس پر دلچسپ گفتگو کی ہے ملاحظہ ہو:

"یوں تو ہر کام میں قوت کی ضرورت ہے۔ لیکن کشتی میں جتنی قوت درکار ہے بنوٹ میں اس کی اتنی ضرورت نہیں۔ رگ پٹھوں سے کام زیادہ لیتے ہیں حریف بآسانی زیر ہو سکتا ہے۔ فن سے کام لیں تو تھوڑی قوت کافی ہوتی ہے اور یہی بنوٹ کی بڑی خوبی ہے۔ دست بدست پکڑ کے سوا۔ خنجر تلوار سے بھی مقابلہ کرتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ کمال چھڑی میں ظاہر ہوتا ہے اور یہی اس کا خاص ہتھیار ہے۔"

کھیل اور ورزش کا تو پہلے ہی شوق تھا۔ حیدرآباد میں بنوٹ کی فضائل حضرت مولانا عبدالقدیر حیدرآبادی کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی شوق ہوا۔ حضرت کے ہاں کام دیکھا۔ پھر حضرت ہی مشورے سے ایک مستند استاد مقرر کیا۔ اس سے کئی سال کام سیکھا۔ ان دنوں علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا تو مسلم یونیورسٹی میں برلی کے ایک استاد سید صاحب بنوٹ سکھانے پر مامور تھے۔ اچھے استاد تھے۔ انہوں نے بھی کام دکھایا۔ پھر بنگلور میسور جانا ہوا تو وہاں بھی پرانے استاد جمع ہوئے۔ کام کا مظاہرہ ہوا۔ غرض کہ بہت کچھ دیکھا اور خود بھی سیکھا تھا۔ کام میں فنی حیثیت سے ایک بڑی خامی نظر آئی۔ وہ یہ کہ اصول کا فقدان تھا۔ عمل میں کوئی اصولی ربط نہ تھا۔ جو فن کے واسطے لابد ہے۔ بس مشق ہی مشق تھی۔ یہ کام کیا وہ کام کیا۔ دہراتے دہراتے مشق ہوگئی۔ جیسے کوئی اقلیدس کی چند متفرق شکلیں یاد کرلے مگر یہ نہ جانے کہ نقطہ کیا ہے۔ خط کیا ہے؟ سطح کیا ہے۔ جسامت کیا ہے؟ اصول کیا ہیں اشکال کیا ہیں۔ ان میں ترتیب کیا ہے۔ تعلق کیا ہے۔ ثبوت کیا ہے۔ نتیجہ کیا ہے؟ اور جب تک فن میں لوازم نہ ہوں محض رسمی تقلید پر تعلیم یافتہ نوجوان آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ یہ صورت حال دیکھ کر ہم نے کئی سال غور و فکر کیا۔ تجربات کئے کہ علم و عمل کا کوئی

اصولی ربط قائم ہو جائے تو فن میں جان پڑ جائے۔ جس حد تک بھی کامیابی ہوئی خدا کا شکر ہے۔ چنانچہ اپنی تحقیقات کے مطابق اس فن میں ایک رسالہ تصنیف کرلیا البتہ طبع نہیں کرایا۔ اول تو زمانہ کی نزاکت مگر اس کا طرز بیان حسن اتفاق سے ایسا بن پڑا جس کو سمجھا دو اس کے واسطے آئینہ جس کو نہ سمجھاؤ اس کے واسطے معمہ۔ دوسرے خوف یہ کہ رسالہ کی اشاعت پر تعلیم کی فرمائش بڑھی تو اپنے پاس وقت کہاں خود ہم کو مزاولت کہاں۔ تاہم ممکن ہے آئندہ کوئی صورت نکل آئے اور محنت کام آئے۔ ان شاء اللہ"[1]

(باقی)

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۰۹-۳۱۰

پروفیسر محمد الیاس برنی

از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی*

(۲)

۱۹۲۷ء میں بلاد اسلامیہ کا سفر اور حج و زیارت کا شرف

برنی صاحب کے مرشد شاہ محمد حسین چشتی قادری نے ۱۳۴۴ھ مطابق ۱۹۲۵ء میں حج کیا تو آکر انہیں بشارت دی کہ ان شاء اللہ قریب ہی آپ کو بھی یہ سعادت نصیب ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ برنی صاحب نے ایک دن فرصت میں مولانا عبدالقدیر صاحب حیدرآبادی سے دوران گفتگو میز سے جنتری اٹھائی تعطیلات پر نظر پڑی تو رخصت ملاکر دیکھا اتنی مدت ہوگئی سفر بخوبی کیا جاسکتا ہے[۱]۔

عبدالقدیر صاحب، ان کے مرید سید حبیب[۲] علی اور مخلص دوست لطف احمد[۳] بھی تیار ہوگئے۔ دو سید ایک صدیقی اور برنی فاروقی چاروں کا قافلہ تیار ہوگیا۔ امیر قافلہ برنی صاحب کو بنایا گیا چنانچہ موصوف فرماتے ہیں:

"خدا کا فضل تھا ایک جان چہار قالب تھے، یک دل و یک زبان تھے۔ چنانچہ ہمارے دوست سید امجد حسین امجد فرماتے ہیں ؎

۱؎ مراۃ الحمید ج ۱ ص ۵۱ ۲؎ ایضاً ص ۳۱۱۔۳۱۳ ۳؎ ایضاً ص ۳۱۵۔

* مشرف تخصص علوم حدیث، جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی۔

اک راگ بنا ہے مختلف سر مل کر — تصدیق ہوئی چند تصور مل کر

برنی، حسرت، حبیب، لطف احمد — اک جسم بنا ہے چار عنصر مل کر [1]

قرآن کریم کھولا یہ آیت شریفہ نکلی:

وَهُدُوْا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ٥

اس سفر نامہ کا نام "صراط الحمید" رکھا۔۔۔۔ جیسی نظر ویسی دید، جیسی طلب ویسی یافت ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

بہر حال روحانی فیوض و برکات کی بحث بہت نازک ہے جس پر گزرے وہی جانے ؎

لذتِ مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی"

برنیؒ اس سفر کی مدت اور اس کی برکات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

"یکم رمضان المبارک مطابق ۶ مارچ ۱۹۲۷ء کو روانہ ہوئے اور ۲۹ ذی الحجہ مطابق ۲ جون ۱۹۲۷ء کو گھر لوٹ آئے۔ چار ماہ میں اللہ تعالیٰ نے اتنی وسعت و برکت دی کہ عراق، شام، فلسطین اور حجاز، دور دراز ممالک کا سفر طے ہو گیا۔ بغداد شریف و ملحقاتِ شریفہ میں دو ہفتے، دمشق میں ایک ہفتہ، بیت المقدس میں ایک ہفتہ، مدینہ منورہ میں تین ہفتے، مکہ معظمہ میں دو ہفتے غرض۔۔۔ قدم قدم پر اور لمحہ لمحہ پر تائیدِ ایزدی اور لطائفِ غیبی کا جلوہ نظر آتا تھا جو چشمِ بصیرت کھولتا اور نورِ ایمان بڑھاتا تھا۔"

مدینہ میں معمولات اور حرم نبوی میں جاروب کشی

حرمِ نبویؐ میں ہر ایک کا اپنے اپنے اوقات میں اپنا اپنا معمول ہوتا ہے۔ برنی صاحب کا معمول یہ تھا:

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۶

شب کو ڈھائی کے قریب حرم شریف کے دروازے کھلتے ہیں حاضر رہتے، فرطِ شوق سے، بڑے ادب سے لمبے لمبے قدم آہستہ آہستہ رکھتے، گویا دبے پاؤں جاتے، روضۃ الجنۃ میں تلاوت کرتے، محراب النبیؐ میں نماز پڑھتے مواجہ شریف میں درود و سلام پیش کرتے، پھر وظیفہ پڑھتے، فجر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی تاروں کی چھاؤں میں جنت البقیع میں دوڑ جاتے، نورِ ظہور کے وقت وہاں بھی یک سوئی ہوتی، سب ہی مزارات پر بلا ناغہ حاضر ہوتے، فاتحہ پڑھتے اور حضرت سیدہ خاتون جنت کے مزار پر دیر تک حاضر رہتے، مگر دل نہ بھرتا تھا طلوعِ آفتاب کے بعد حجاج کی آمد ہوتی اس وقت فاتحہ سے فارغ ہو کر حرم شریف واپس پہنچتے [1]

یہاں خدام کے ساتھ جھاڑو بہارو کے کام میں شریک ہو جاتے، ریاض الجنۃ میں فرش جھاڑتے، جھاڑو دیتے، خدام میں نام شامل کراتے، غیر حاضری پر باز پرس ہوتی تھی، کام دل کھول کر کرتے اور لطف اٹھاتے [2] چنانچہ فرماتے ہیں:

"اس کام میں ایک آدھ گھنٹہ صرف ہوتا، صبح ۷-۸ بجے کے قریب فراغت ہوتی تو مکان پر آتا، ناشتہ کرکے سو جاتا۔ دوپہر کو اٹھتا۔" [3]

حرمِ نبویؐ میں عبادات کو ٹھہرنے کے لیے خصوصی اجازت درکار ہوتی، درخواست کی منظوری منتظمین کی صوابدید پر موقوف ہوتی تھی۔ برنی صاحب اور ان کے دوستوں نے بھی اجازت مانگی تو مل گئی۔ برنی صاحب اس کی داستان یوں بیان کرتے ہیں:

"۶-۷ ذیقعدہ ۱۳۴۵ھ یوم یکشنبہ و دوشنبہ کی درمیانی شب حرم شریف میں بسر ہوئی۔ اس شب کا کیا کہنا۔ زہے قسمت، زہے نصیب، عشاء کی نماز پڑھ کر

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۲۹ [3] ایضاً۔

ہم چاروں اغوات کے چبوترہ پر بیٹھ گئے، نمازی رخصت ہوئے پھر خدام رخصت ہوئے، شاید کوئی خادم اندر رہ گیا ہو مگر نظر نہیں آیا، حرم شریف کے دروازے بند ہوگئے، روشنی مدہم ہوگئی، غرض تخلیہ ہوا تو عجب شانِ جلالت کے آثار محسوس ہونے لگے، بے اختیار دل عظمت سے بیٹھا جاتا تھا، ہم چاروں اندر سے اٹھ کر باہر صحن میں آبیٹھے، نوافل، ذکر و فکر، صلوٰۃ و سلام میں ہر کوئی اپنے اپنے ذوق کے مطابق مشغول ہوگیا، شاید نیند آئے مگر کیا ممکن ہے کہ پلک جھپکے البتہ محویت ضرور تھی رات ڈھلی تو ۲ بجے کے قریب دلوں پر جمال چھا گیا، رؤف رحیم کا رنگ آگیا۔ صاف معلوم ہوا کہ اب حاضر ہونا چاہئے۔[1]

الحمد للہ اس سے بڑھ کر زندگی میں کون سا وقت آسکتا ہے۔ اٹھے اور لرزتے ہوئے بارگاہِ اقدس کی طرف چلے، کسی کے دل میں تخلیہ کی تمنا تھی، خدا کی قدرت تینوں رفیق نماز کے واسطے روضۃ الجنۃ میں ٹھہر گئے اور ایک دیوانہ اپنی دھن میں افتاں و خیزاں پہنچا اور مواجہ شریف میں آستانۂ معلی کی جالی مبارک پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ اللہ اکبر، وہ تنہائی، شب کی خموشی، پیشی میں صرف دو شمعیں روشن اور بارگاہِ اقدس کی حضوری ؎

یارب کجاست محرمِ رازے کہ یک زماں   دل شرح آں دہد کہ چہ دید و چہا شنید

اتنے چاروں رفیق جمع ہوگئے اپنا اپنا ربط اپنا اپنا حال ؎

ہم ہی ہم ہیں تری محفل کوئی اور نہیں

گھنٹے منٹوں کی طرح گزر گئے وہی تین بجے حرم شریف کے دروازے کھلے اور تخلیہ برخاست ہوا اپنے حق میں یہ شب لیلۃ القدر معلوم ہوتی تھی الحمد للہ حمداً کثیراً و صلی اللہ علی رسول اللہ و بارک و سلم۔[2]

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۸۰۔ [2] ایضاً ص ۱۸۱-۱۸۲۔

خصوصی صلوٰۃ و سلام کا القا: برنی صاحب فرماتے ہیں:

"مواجہ شریف میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دعائیں خدا جانے کتنی مانگیں اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں لیکن ایک دعا اول ہی مانگی کہ ایک ایسی درود ذہن میں آجائے جس میں حضورؐ کی وہ شان مذکور ہو جو اللہ تعالیٰ کے علم میں مسلم ہے، وہ درود ذہنی ہو، کسی سے اب تک منقول نہ ہو، وہی پڑھا کروں اور اس کو حضور کا فیض سمجھوں، اللہ تعالیٰ کی شان مجھ جیسے کم علم کے ذہن میں بلا تفکر ایک قرآنی درود شریف معاً اتر آئی اور ہمیشہ وہی ورد رہی وَاَمَّا بِنِعْمَۃِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ باتباع امر اس کو یہاں ظاہر کرتا ہوں، وہ یہ ہے:

اللّٰھم صل و سلم علی سیدنا محمد طٰہٰ و یٰسین ختم ختم، خاتم النبیین رحمۃ للعالمین بالمومنین روف رحیم و انک لعلیٰ خلق عظیم و علیٰ آلہ و صحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

اس ورد سے عجیب برکات محسوس ہوتے ہیں امید ہے اس سے مومنین کو فیض پہنچے گا اور خیر جاریہ کے ثواب میں اللہ تعالیٰ ہم کو بھی شریک رکھے گا۔"[1]

مدینہ سے روانگی: برنی صاحب کے دو ہفتہ یہاں بہت راحت سے گزرے لیکن جب رخصت کا خیال آنے لگا تو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے اس میں ہفتہ عشرہ اور گزر گیا۔ ۲۲ ذیقعدہ کو روانگی پختہ ہوئی اور احرام باندھ کر بارگاہ اقدس میں حاضر ہوئے تو کیفیت یکسر بدل گئی، رخصت کے وقت دل خوشی سے بھر گیا۔ معلم الوداع یا رسول اللہ پڑھواتے اور برنی صاحب فرماتے ہیں ہماری زبان سے

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۸۲-۱۸۳۔

الوداع یا رسول اللہ، نکلتا تھا۔[1]

جدائی کا احساس دل سے غائب تھا، مدینہ سے مکہ معظمہ کیا جا رہے ہیں، گویا محمد رسول اللہ کے وسیلہ سے لا الٰہ الا اللہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب تک یہ دعا تھی خدایا از تو می خواہم مصطفیٰ را۔ اب یہ ورد شروع ہوا۔ محمد از تو می خواہم خدا را۔

سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر[2]

اولاد برنی صاحب کی تین لڑکیاں تھیں ان میں سے (۱) رشیدہ کی شادی اپنے مرشد حضرت مولانا محمد حسین کے فرزند مسعود حسن سے اور (۲) فاطمہ کی مولانا عبدالقدیر صدیقی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ کے فرزند موسیٰ عبدالرحمٰن سے اور (۳) کنیز فاطمہ کی عبدالقدیر صدیقی کے چچا زاد بھائی نواب صدیق یار جنگ کے فرزند امجد اللہ صدیقی سے کی تھی۔ برنی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ تینوں صاحب اولاد ہیں، صاحب روزگار ہیں، اللہ تعالیٰ شاد و آباد رکھے۔"[3]

برنی صاحب کے والد ماجد برنی صاحب کے والد ماجد حافظ محمد ابراہیم تندرست اور صحت مند تھے، ورزش کرتے تھے، آخر عمر تک نشست و برخاست میں کوئی معذوری نہ تھی، ساٹھ سال کی عمر میں آنکھ میں پانی اتر آیا تھا، علی گڑھ میں آنکھ بنوائی، اچھی بنی لیکن پھر پانی اتر آیا۔ وفات سے دو سال پہلے دہلی میں آنکھ بنوائی بالکل اچھی بنی اپنی ضرورت کے سب کام کرتے تھے، دانت آخر عمر تک مضبوط تھے، صرف آگے کا ایک دانت گرا تھا۔ حافظ تھے بہت پرہیزگار، تہجد گزار، اذکار و اوراد کے پابند زندگی تھے۔

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۱۸۱-۱۸۲ [2] ایضاً ص ۱۹۲-۱۹۳ [3] برنی نامہ ص ۱۷۔

لڑکپن میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی (۱۲۳۵-۱۲۹۲) سے بیعت ہو گئے تھے، ڈھلتی رات اٹھنا اور نماز کے بعد صبح تک یاد اللہ میں مصروف رہنا معمول تھا عمر بھر میں انتقال سے پہلے رمضان کے دو روزے چھوٹے تھے۔ تاریخ اسلام، فقہ، تصوف، طب سے خاص دلچسپی تھی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سلیس اردو میں لکھی تھی۔ شاہ ولی اللہ کی ہوامع اور محمد حقی نازلی کی "خزینۃ الاسرار" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ سب مسودات کی صورت میں محفوظ تھا۔ فن بیطاری پر ایک رسالہ لکھا تھا، طبی مجربات بھی مرتب کئے تھے[1] حیدرآباد میں بحیثیت وکیل چالیس برس بسر کئے جو لوگ واقف حال تھے کہتے تھے کہ وکالت میں ولایت کر دکھائی تھی[2] ان کے مکتوبات شائع کئے جائیں تو بہت سے جوہر کھلیں۔

برنی صاحب کا بیان ہے انتقال سے تین سال قبل حسب معمول میں موسم سرما کی تعطیلات میں حاضر خدمت تھا۔ پوچھا تمہیں کوئی استخارہ بھی معلوم ہے میں نے عرض کیا حضرت کوئی استخارہ معلوم نہیں تعمیل ارشاد میں ایک استخارہ عرض کرتا ہوں، مختصر مقبول ہے، تیسرے دن حسب معمول فجر کی نماز کے بعد سلام عرض کرنے گیا تو دیکھا کہ لحاف اوڑھے لیٹے ہیں۔ قریب بیٹھا تو محسوس ہوا کہ رقت طاری ہے، حیرت ہوئی، خاموش بیٹھا رہا، حضرت کو افاقہ ہوا تو فرمایا کہ واقعی تمہارا استخارہ بہت مقبول ہے، میں ادب سے خاموش رہا، خود بولے میں لڑکپن میں حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کا مرید ہو گیا تھا، اس کے بعد بڑے بڑوں کی صحبت و شفقت رہی لیکن کسی سے بیعت کی نوبت نہیں آئی، اب آخر عمر میں یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ کم عمری

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۲۲-۲۳ [2] ایضاً ص ۲۵۔

کی بیعت مسلم رہی یا پھر تجدید کی ضرورت ہے، تہجد میں غنودگی ہوئی تو خواجہ باقی باللہ کو متوجہ پایا، انہوں نے فرمایا تمہاری قدیم بیعت مسلم و مقبول ہے اور کل پیران سلسلہ تم پر مہربان ہیں[1]

وصیت نامہ ۲۳ نومبر ۱۹۳۱ء میں خط بھیجا، ناسازی طبع سے آگاہ کیا اور لکھا تینوں بھائیوں میں سے جو بھی بآسانی آسکے ایک ماہ کے لئے آجائے تاکہ ضروری کام نمٹائے جائیں، عجلت کی ضرورت نہیں۔ برنی موسم سرما کی چھٹی میں آجائے تو اچھا ہے، ۱۴ دسمبر سے سرما کی چھٹی شروع ہوئی میں روانہ ہوا، جب میں بلند شہر پہنچا، اولاً تو طبیعت ٹھیک تھی، فرمایا تمہاری آمد کی خوشی میں سنبھل گئی، وصیت نامہ تیار تھا، ۱۷ دسمبر سہ پہر سے ملکیت و جائیداد کے کاغذات و حسابات دیکھنے اور سمجھنے شروع کر دیے اور اگلے دن کو صبح سے شام تک یہی کام کیا، تیسرے دن ۱۹ دسمبر دوپہر تک اس کام سے فارغ ہوا، عدالت کے کارندے منشی اوصاف علی صاحب اس کام میں شریک رہے منشی جی بولیں اگر کوئی پیچیدگی پیش آتی، حضرت اسے سلجھا دیتے تھے، اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ وصیت نامہ بعد نظر ثانی مکمل ہو گیا، اس میں سب وارثوں کے نام ملکیت و جائیداد کی تقسیم درج ہوئی اور خاندانی امور کے متعلق ضروری ہدایات بھی۔ اس وصیت نامہ کے بعد خاندان میں کوئی اختلاف نمودار نہ ہو سکا اور اتفاق رہا[2]

حج بدل کی وصیت و تاکید ۱۸ دسمبر کو جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ اطمینان سے بیٹھے تو والد صاحب نے خود ہی حرمین شریفین کا ذکر چھیڑا، مجھ سے حالات سننا شروع کئے، جب مدینہ کا ذکر چلا تو طبیعت مچل گئی۔ رقت شروع ہو گئی، گھر کی بہو بیٹیاں آ بیٹھیں

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۲۵-۲۶ [2] ایضاً ص ۱۷۔

دلوں کا جوش آنکھوں سے جاری ہو گیا، یقین ہو رہا تھا کہ غلام اپنے آقا کی توجہ سے سرفراز ہوئے ہیں ؎

اڑ اتنا تو ہو جذب دل ناشاد کبھی مجھ کو بھولے سے مدینے میں کریں یاد کبھی
ہجر کی میری زبانی سنیں روداد کبھی ہند میں کر نہ مری خاک نہ برباد کبھی

حضرت نے اسی حالت میں فرمایا کہ دلوں کے حال سے اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے، مجھے عمر بھر حج و زیارت کی تمنا رہی اور دو ایک مرتبہ تو تہیۂ سفر بھی ہو گیا، لیکن نہ معلوم کیا مصلحت الٰہی تھی کہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور دل کی دل ہی میں رہ گئی، تم حج سے آئے میری ہمت بڑھ گئی کہ تم کو ساتھ لے کر جاؤں گا، آرام رہے گا۔

لیکن جسم میں طاقت تھی تو نگاہ بے کار تھی اب نگاہ درست ہوئی تو طاقت نے جواب دے دیا، [illegible] میں وصیت کرتا ہوں کہ [illegible] خود ہی جا کر میرا حج بدل ادا کرنا اور مدینہ حاضر ہو کر صلوٰۃ و سلام عرض کرنا۔ حرم نبوی کے خدام اور مدینہ کے حاجت مند باشندگان کی خدمت میں ایک ہزار روپیہ پیش کرنا۔ اس کے لئے میں اپنے اندوختہ سے دو ہزار روپے کی وصیت کرتا ہوں [illegible] کی رات گزری تیسرے رمضان کو صبح کے وقت وفات پائی [illegible] نے اکیانوے سال اور گیارہ یوم کی عمر پائی تھی۔[1]

حج بدل کے لئے روانگی اور حضرت گیسودراز کے مزار پر حاضری تاریخ ۹ مارچ ۱۹۳۳ء یوم پنجشنبہ شام کو پانچ بجے حیدرآباد سے رات بارہ بجے گلبرگہ پہنچے اور حضرت خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز کے آستانہ معلی پر فاتحہ پڑھی پھر رخصت ہوئے۔

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۱۸۔

برنی صاحب فرماتے ہیں:

"اول تو حضرت ماشاء اللہ ساداتِ دکن ٹھہرے، دوسرے خدا کے فضل سے اپنا
چشتیہ سلسلہ راست حضرت ہی کا سلسلہ ہے، اس نسبت سے محمدی کہلاتے ہیں
یہاں ہمارے سوا راست محمدی سلسلہ کم نظر آتا ہے"[1]

بمبئی سے جہاز میں سوار ہوئے تو پلین نمبر پانچ میں جگہ ملی، ان کی برتھ کے مقابل برتھ پر ایک قدیم دوست کا بستر جما، بیس برس کے بعد بغیر توقع جو یکایک ملاقات ہوئی تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چند سیکنڈ پہچاننے میں لگے اس کے بعد جو گلے لگے تو کئی منٹ بغل گیر رہے ؎

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

ہم نے ایک ہی سال میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا، ایک ہی سال علیگڑھ کالج میں داخل ہوئے، دونوں ہونہار سمجھے جاتے تھے، قرن [illegible] ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ان کو بہلا پھسلا کر ریاضی و سائنس میں کھینچا، ہم فنون میں جمے رہے، انہوں نے بی ایس سی کیا، ہم نے اکنامکس میں ایم اے کیا، ایل ایل بی کی سند دونوں نے حاصل کی، ان کا وطن مظفر نگر، ہمارا بلند شہر، کالج میں یہ کچی بارک میں، ہم پکی بارک میں رہتے تھے، یہ نہانے کے مانیٹر اور ہم طعام کے مانیٹر تھے، سوٹ بوٹ سے دونوں الگ تھے۔ کالج کی رعایت سے یہ داڑھی کی تواضع کرتے تھے، ہم اس سے بھی بے فکر تھے، اب ان کی ایک مشت میں دو انگشت کی کسر ہے اور اپنی وہی خشخشی، اب یہ خاصے مولوی نظر آتے ہیں، بفضلہ عنقریب حاجی بھی ہو جائیں گے، یہ نماز کے شروع ہی سے پابند

۱؎ صراط الحمید ج ۲ ص ۱۴۱۔

تھے اب ماشاء اللہ ذکر اذکار میں اشتغال بھی مراقبے بھی ہیں اور کیوں نہ ہوں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید ہیں۔

ان شاء اللہ وہ دن دور نہیں جب کہ حضرت الحاج مولانا منفعت علی صاحب انگریزی تعلیم یافتہ جماعت میں بڑے بزرگ شمار ہوں گے۔ اپنا تو وہی حال ہے ؎

گزری جہاں کے باغ میں یکساں برنگ سرو
سوکھے کبھی خزاں میں نہ پھولے بہار میں

وہی طرز، وہی روش، وہی وضع قطع، ہم نے ایل ایل بی کرتے وقت سوچ لیا تھا کہ "داشتہ آید بکار"، البتہ منفعت علی نے اس سند سے خوب کام لیا، سہارنپور میں چوٹی کے وکیل ہیں، ہم تعلیم و تصنیف میں مصروف ہیں[1]

مقامات زیارت | برنی صاحب فرصت کے اوقات میں آثار قدیمہ کی زیارت کے لئے بھی جاتے تھے، جو سعودی حکومت نے اب ڈھادئے تھے۔ جیسے مولد النبیﷺ، مولد فاطمہؓ، مولد علیؓ۔ چنانچہ برنی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ تینوں مقام اب ویران چٹیل میدان پڑے ہیں، لوگ پتہ بتاتے ڈرتے ہیں کوئی نہ بتائے تو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہاں دنیا کی بہترین مرصع اور متبرک عمارت کھڑی تھیں، ظاہر و باطن کی نعمتوں سے مالا مال تھیں، ان کی زیارات سے آنکھوں میں نور، دل میں سرور آتا تھا، اب وہ سب خواب و خیال ہو گیا، البتہ جو حقیقی برکات ہیں وہ حق داروں کے واسطے دائم قائم ہیں"[2]

غسل کعبہ کا معطر زمزم کا گلاس | برنی صاحب معلم کے چھوٹے بھائی حسین صاحب کے ساتھ ۱۴ ذی الحجہ یوم پنجشنبہ صبح کے وقت شیبی صاحب سے ملاقات کی غرض سے نکلے،

۱؎ صراط الحمید ج ۲ ص ۵۹ ۲؎ ایضاً ص ۸۰

جاتے وقت حرم شریف سے گزرے تو حسین نے کہا آج بیت اللہ شریف کو غسل دیا گیا ہے۔ ان کا مکان اس کی خوشبو سے معطر تھا۔ جب برنی صاحب پہنچے تو شیبی جلالۃ الملک سے ملنے گئے تھے، ذرا سی دیر بیٹھے تو حسین نے شیبی کے صاحبزادے سے پانی مانگا اس نے ٹھنڈا زمزم پیش کیا، برنی صاحب فرماتے ہیں:

"مجھ سے دریافت کیا گیا میں کیوں انکار کرتا، لیکن زہے قسمت ہم کو بلا طلب اور بلا توقع غسل کا معطر زمزم ایک بڑا گلاس بھر کر ملا ہوا، عطیہ الٰہی تھا فوراً ادب سے پی لیا۔ خوشبو سے دماغ بس گیا، خوشی سے دل بھر گیا۔ سچ پوچھئے تو روح مست ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

حسین نے مبارک باد دی کہ ایسا تبرک بن مانگے قسمت والوں کو ملتا ہے، تیری نیک فالی ہے، شیبی صاحب کا تھوڑا انتظار کیا، اس کے بعد رخصت ہوئے اور جہاں کہیں جانا تھا گئے، سب نے سن کر مبارک باد دی اور بتایا کہ احرام میں معطر زمزم پی لیا تو دم واجب ہے، ہم نے عرض کیا ہمیں تو وہم و گمان بھی نہ تھا لیکن ؎

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے

دو دم بسر و چشم حاضر ہیں، سچ پوچھئے تو ایسا تبرک سو دم میں بھی سستا ہے۔[1]

بیت اللہ میں ایک گھنٹہ ۵ ذی الحجہ کو فجر کی نماز کے بعد ہر شخص کو بیت اللہ میں داخلہ کی عام اجازت دی جاتی تھی، اس میں برنی صاحب بھی اندر گئے تھے، اس میں بھیڑ بہت ہوتی تھی اس لئے زیادہ دلجمعی سے قیام اور دعا کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۸۵ و ۸۶

دوسرا شیبی صاحب کو نذرانہ پیش کرنے پر خصوصی اجازت سے داخلہ ملتا تھا۔ اس میں یکسوئی ہوتی تھی۔ برنی صاحب نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، ان کا بیان ہے:

"ہم نے بھی نذر پیش کی صرف چند حجاج کا داخلہ ہوا اور تقریباً ایک گھنٹہ اندر حاضری رہی، جو پڑھنا تھا پڑھا، جو کہنا تھا کہا، جو دیکھنا تھا دیکھا، اللہ اکبر! اس عالم شہادت میں اس سے بڑھ کر کیا رسائی ہوگی، بیت اللہ شریف کے اندر حاضر ہیں، عالم باطن خدا کرے روشن ہے کیا خوب ہو کہ ہم بیت اللہ میں داخل ہوں، اللہ تعالیٰ ہمارے دل میں داخل ہو، ہمارا دل پھر بیت اللہ بن جائے ظاہر کے بیت اللہ میں باطن کا بیت اللہ آجائے، ایک حرم میں دوسرا حرم سما جائے۔ کچھ عجب لطف ہو جائے ؎

اور درمن و من درو ے چوں بگلاب اندر

جن کے دل بیت اللہ تھے، ان ہی کے ہاتھوں نے اس بیت اللہ کی بنا ڈالی اور انہی کی دعاؤں سے یہ بیت اللہ آباد ہے، سبحان اللہ وبحمدہ۔"[1]

مکہ معظمہ کے دو تبرک برنی صاحب کو قدیم آثار اور مقدس مقامات کی تصویروں کی جستجو تھی، مختلف دکانوں میں دیکھا لیکن ذخیرہ مختصر تھا کوشش سے ایک غیر معروف قدیم ترکی کمپنی کے فوٹو گرافر کی دکان پر کافی تعداد میں ذخیرہ ملا، ان میں بعض نادر تصویریں مل گئیں، اس طرح بہت مسلسل اور مکمل البم مرتب ہوگیا۔ دوستوں کے واسطے متفرق فوٹو بچ رہے۔[2]

مکہ معظمہ کے تبرکات! دو تبرک اہم ہیں، ایک زمزم اور دوسرے غلاف کعبہ،

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۸۷ [2] ایضاً ص ۸۹۔

زمزم ہر وقت ملتا ہے، غلاف کعبہ عشرہ ذی الحجہ کو نیا غلاف چڑھتا اور پرانا اتر کر تبرک بن جاتا ہے، بکتا تھا، امسال یہ ارزاں تھا، پورا کلمہ شریف چار پانچ روپیہ میں ملتا تھا، ہم نے دس بارہ خریدے، ان میں ایک بہت عمدہ تھا، بالکل نیا معلوم ہوتا تھا، ایک دکان سے اکٹھے خریدے، رعایت بھی رہی ۔[1]

قصر شاہی میں دعوت | برنی صاحب آثار قدیمہ کی تصویروں کی جستجو میں ایک دکان میں تھے کہ دو سرکارے ان کے نام لفافہ لائے اور بولے کہ ہم آپ کو تلاش کر رہے ہیں، یہ دعوت نامہ لیجیے اور قصر شاہی میں آج شام تشریف لائیے، ڈاکٹر خواجہ معین الدین صاحب آپ کے انتظار میں ہیں، شرکت کا ارادہ نہ تھا، لیکن ڈاکٹر خواجہ کو انتظار تھا، ان کے پاس پہنچے تو کہا، دونوں ساتھ چلیں گے ان کے اصرار پر قصر شاہی پہنچے، اسلامی ملک کے معزز مہمان بیٹھے تھے۔ مجمع دیکھ کر جی خوش ہوا۔ جلالۃ الملک تشریف لائے۔ مغربیوں کا لباس بہت خوب تھا، بعض احرام میں تھے، قیمتی تولئے زیب تن کئے تھے، بس ہماری حالت قابل دید تھی، معمولی چادروں کا احرام اور وہ میلا سلا، بال پراگندہ گرد آلود، جیسے کوئی دیوانہ، حج کا رنگ خوب چڑھا ہوا، امیروں میں ایک فقیر بھی موجود تھا ۔[2]

جلالۃ الملک کے آنے پر قصیدہ خوانی ہوئی، توحید پر تقریریں سن کر تحریک ہوئی کہ ہم بھی تقریر کرتے لیکن عربی پر ایسی قدرت نہ تھی کہ آخر میں جلالۃ الملک نے کہا کہ اگر کوئی حاجی اپنی زبان میں تقریر کرنا چاہے تو اس کا عربی میں ترجمہ کیا جائے گا، میں کھڑا ہوا میں نے کہا توحید کا دہرانا چنداں کارگر نہیں، رسالت کے اعلان اور وضاحت کی ضرورت

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۰ [2] ایضاً ص ۹۱ ۔

ہے، اس کے بعد اس ایمانی توحید کا دہرانا ہے جو رسالت کے طفیل حاصل ہوتی ہے اور جو اسلام کے باہر میسر نہیں آسکتی وہی مطلوب ہے، رسالت میں ہر کوئی سنت پر زور دیتا ہے اور زور دینا بجا ہے، اس لئے کہ قرآن میں اتباع کی تاکید ہے، لیکن بہت سے اس راز سے بے خبر ہیں کہ محبت اور تعظیم اتباع کی جان ہیں انہی دونوں کے صحیح امتزاج سے حقیقی اتباع پیدا ہوتی ہے، محبت میں قوت ہے اور تعظیم میں اعتدال جس اتباع کی بنیاد محبت اور تعظیم پر نہ ہو وہ محض ایک رسمی تقلید ہے۔ اتباع نہیں ہے اور نہ اتباع کی خیر و برکت ہے، اتباع کے واسطے محبت و تعظیم کس درجہ لازم ہے، اہل علم اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں توحید کے پہلو بہ پہلو حضور رحمۃ للعالمین کی محبت و تعظیم کی جو تعلیم ہے وہ دنیا میں بے نظیر ہے کہ عبدیت میں انتہائی محبوبیت و رفعت موجود ہے ۔[1]

اس شاہی دعوت میں مغرب کے پیر طریقت سید عبدالحئی کتانی اور ملا شود بازار بھی شریک تھے، کتانی اپنے اثر و اقتدار میں حضرت شیخ سنوسی کے ہم پلہ جانے جاتے تھے ۔[2]

دوسرے دن ایک عرب نے موصوف کا تعارفی کارڈ دیا کہ حضرت کو ملاقات کا اشتیاق ہے، چنانچہ بعد مغرب حرم میں شیخ سے نیاز حاصل ہوا، گلے لگایا، بہت دعائیں دیں، اور گرد عربوں کا مجمع تھا، حضرت کے ساتھ ترجمان بھی تھا، میرے ساتھ عبدالرحمن تھے۔ فرمایا تمہاری تقریر موثر اور بہت مقبول تھی، اسلامی جذبات کے اظہار میں تم نے تمام اسلامی ممالک کی طرف سے وکالت و نیابت کی، یہ اللہ کا

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۵ [2] ایضاً ص ۹۸ ۔

بڑا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے، میں نے عرض کیا حضرت تقریر اردو میں تھی، اس کا عربی میں ترجمہ بھی نہیں ہوا، پھر عربوں پر اس کا اثر کس طرح ہوا۔ فرمایا ایمان و اخلاص میں بھی اثر ہے، تمہاری آواز لب و لہجہ سے حقانیت ٹپکتی تھی، دل لذت اندوز ہوئے تھا اور تم نے درمیان درمیان میں جو آیات پڑھیں، ان آیات نے عربوں پر مقصد خوب واضح کردیا، جلسہ حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مست ہوگیا، یہ بیان اختیاری نہیں، فضل الٰہی ہے[1]

برنی صاحب کا مسلک و مشرب برنی صاحب علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے، وہ باقاعدہ عالم نہ تھے، نہ دیوبندی علماء سے پڑھا تھا، نہ بریلوی علماء کے مدرسہ کے فاضل تھے، مگر انہ دین دار تھا، اس میں میلاد ہوتا تھا، جو اس زمانہ میں صوفیانہ مشرب بزرگوں میں رائج تھا۔ ان کی والدہ نذر و نیاز (بزرگوں کی روحوں کو ایصال ثواب کے لئے خیرات) بہت احتیاط و اہتمام سے کرتی تھیں[2]

برنی صاحب صوفی مشرب تھے اور صوفیہ سے ان کا تعلق ہر زمانہ میں برابر قائم رہا ہے اس لئے وہ برزنجی اور قصیدہ بردہ پڑھتے تھے۔ سیرت اور میلاد النبیؐ کے جلسوں میں جاتے، بہت عمدہ اور پُر درد تقریر کرتے تھے، اس میں دانشور، محققین، تعلیم یافتہ اور اہل علم بکثرت آتے تھے، نیز حیدرآباد کے فرمانروا عثمان علی خاں بھی شرکت کرتے تھے "قادیانی مذہب" اسی جلسہ کا منظر اور ثمرہ ہے۔

بایں ہمہ وہ ایک منصف مزاج شخص تھے، اس لئے علمائے دیوبند سے ان کو کد اور نفرت نہ تھی، بلکہ ان کی کتابیں پڑھتے، ان سے استفادہ کرتے اور ان کی خوبیوں کا

---

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۸-۹۹ [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۱۹۔

اعتراف کرتے، انہیں حضرت گنگوہیؒ کو "رحمۃ اللہ علیہ" لکھنے میں تکلف نہ ہوتا چنانچہ حج بدل کی بحث میں لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا عبدالرشید[1] (رشید احمد) گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس (حج بدل کے) مسئلہ کو اپنی تالیف "زبدۃ المناسک" میں بہت وضاحت اور تاکید سے بیان فرمایا ہے، یہ تالیف دیکھنے کو تو مختصر سی ہے لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ واقعی دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے، اس سے مولانا کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے"[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"زبدۃ المناسک دیکھنے میں گو ایک چھوٹی سی اردو کتاب ہے، حضرت مولانا حاجی رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تمام مسائل حج اس خوبی سے یکجا کردئے کہ دریا کوزہ میں بند نظر آتا ہے، غور کیجئے تو اجمال میں تفصیل موجود ہے۔

اس سے حضرت کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، ایک علمی کرامت نظر آتی ہے۔ حجاج کے لئے یہ کتاب بڑی نعمت ہے، مولوی یحییٰ صاحب تاجر کتب گنگوہ شریف سہارنپور نے اس کو شائع کیا ہے"[3]

وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کی کتاب قصیدہ بردہ کی شرح عطر الوردہ کا یوں ذکر کرتے ہیں:

"قصیدہ بردہ کی اردو میں کئی شرحیں موجود ہیں، ایک شرح عطر الوردہ کے نام سے، مطبع مجتبائی دہلی نے شائع کی ہے، خوب ہے"[4]

---

[1] مطبوعہ نسخہ میں عبدالرشید چھپا ہے، یہ موصوف کی لغزش قلم ہے [2] صراط الحمید ج ۲ ص ۹۸ [3] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۰۳ [4] ایضاً ص ۱۸۳۔

حضرت مولانا شفیع الدین مہاجر مکی جو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلیفہ و مجاز تھے اور حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ ان کے مرید و خلیفہ تھے، مناسک حج کے ماہر تھے، برنی صاحب نے مدینہ منورہ کی آمد و رفت کے متعلق احرام کے مسائل ان سے پوچھ کر زینت کتاب کئے تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا شفیع الدین نگینہ والے مدت دراز سے بحیثیت مہاجر مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، حضرت کے علم و فضل کا کیا کہنا سبحان اللہ! خاص کر مناسک حج پر ایسا عبور بہت نادر ہے، اسی لئے حضرت سند مانے جاتے ہیں، دوسرے حج میں تحقیق مناسک (میں) حضرت سے نیاز حاصل ہوا، اس ناچیز کے حال پر بہت عنایت و شفقت مبذول رہی، چنانچہ مدینہ منورہ کی آمد و رفت کے متعلق احرام کے مندرجہ بالا مسائل حضرت کا عطیہ ہیں جو بطور خیر جاریہ درج کئے گئے ہیں[1]"

برنی صاحب نے علمائے دیوبند کی تعلیمی خدمات کا اعتراف مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ علمائے دیوبند میں اشاعت تعلیم کا جو حوصلہ اور سلیقہ ہے، اس کی مثال ہندوستان کے دیگر علماء میں کم نظر آتی ہے، البتہ عقائد کی بحث جدا ہے یہ ایک قدیم بحث ہے نئی نہیں[2]"

برنی صاحب کو مولانا مناظر احسن گیلانی (المتوفی ۱۹۵۶ء) سے جاننے والا کون ہوگا، دونوں جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر تھے، دوست تھے، ایک پیر کے مرید و خلیفہ تھے، وہ برنی صاحب کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"پروفیسر الیاس برنی میرے ہم مشرب دوست ہیں[3]"　　　(باقی)

---

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۲۵۳ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۳۸ [3] مکاتیب مناظر احسن گیلانی، مرتبہ مفتی اللہ رحمانی، مونگیر دار الاشاعت رحمانی ۱۹۷۳ء، ج ۱ ص ۱۰۳۔

پروفیسر محمد الیاس برنی

از ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی*

(۳)

بعض فروگذاشتیں | برنی صاحب اپنے زمانے کے عظیم شخص تھے، لیکن عظیم اشخاص بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہوتے۔ یہ لازمہ بشریت ہے۔ برنی صاحب سے بھی بعض غلطیاں ہوئی ہیں مثلاً "تحفۂ محمدی" میں درود تاج باترجمہ شامل ہے۔ اس میں بعض الفاظ قابل اعتراض ہیں اور وہ صحیح احادیث سے ثابت نہیں ہیں اور یہ درود شریف کی معتبر کتابوں میں منقول نہیں ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ اپنا التقائی درود اس میں شامل کرتے تو بہتر ہوتا۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہنی چاہیے کہ اگر معمول بہا عبادات کے اجر و ثواب سے زیادہ کسی عمل کا اجر و ثواب بتایا جائے تو یہ بات اس کے جعلی اور بناوٹی ہونے کی نشانی ہے۔

نذر و نیاز کے مسئلے میں ان کی یہ رائے درست ہے" یوں تو ایصال ثواب کے لئے کوئی دن و تاریخ اور کوئی طور طریقہ معین نہیں" تاہم ہر کام کا ایک موقع اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو لازم نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ باقی نہیں رہتا۔

---

* مشرف تخصص علوم حدیث جامعۃ العلوم الاسلامیہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔

لیکن علاوہ سب کچھ کرتے تھے جو عام طور پر رائج ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"۱۲ محرم کو ہلیم (حلیم) پر سید الشہدا کی فاتحہ ہوئی غرض محرم شریف کی فاتحہ جو اپنا معمول ہے مدینہ منورہ میں بخیر و خوبی انجام پائی" [۱]

ان کی مجموعی حسنات کے مقابلہ میں یہ فروگذاشتیں ایسی ہیں جن کا وزن زیادہ نہیں۔

ملازمت سے سبک دوشی | برنی صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے دائرۃ المعارف کے ناظم بھی رہے اور آخر کے دو برسوں میں جامعہ عثمانیہ میں رجسٹرار ہوئے [۲] اور اکتوبر ۱۹۴۸ء میں جامعہ عثمانیہ سے سبک دوش ہوئے [۳] جس کے بعد ان کی زندگی کا تیسرا دور پورا ہوا۔ برنی صاحب کی زندگی کا زیادہ تر زمانہ حیدرآباد میں گزرا، وہیں کوٹھی بنوائی، حیدرآباد میں لڑکیوں کی شادیاں کیں، کتابیں لکھیں اور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۸ء تک تصنیف و تالیف کا کام انجام دیا۔

وفات | اگست ۱۹۵۷ء میں اپنی کوٹھی بیت السلام سیف آباد میں جو ایک خوشنما پہاڑی پر واقع ہے برنی نامہ لکھا، پھر دسمبر ۱۹۵۸ء کے آخر میں عزیزوں سے ملنے بلند شہر آئے۔ تقریباً ۸۹ سال کے تھے کہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۹ء کو حرکت قلب بند ہوئی اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ قاضی کے قبرستان میں جہاں ان کے باپ دادا دفن ہیں، وہیں ان کی قبر ہے۔

تدفین کے وقت جب سینہ پر کافور ملا گیا تو وہ سمٹ کر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی صورت اختیار کر گیا تھا جسے دیکھ کر ناظرین حیران و ششدر رہ گئے۔ یہ ان بزرگوں میں سے تھے جن پر یہ فقرہ صادق آتا ہے:

---

[۱] صراط الحمید ج ۲ ص ۱۵۰ و ۲۶-۲۷ [۲] برنی نامہ ص ۲۴ [۳] ایضاً۔

دنیا خورد و عقبیٰ برد — دنیا میں مزے اڑائے اور آخرت میں بھی کامیاب رہے

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ — یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے

یہ واقعہ مجھ سے ڈاکٹر فاروق مصطفےٰ صاحب نے بیان کیا کہ یہ میرے والد صاحب کا چشم دید واقعہ ہے۔

تلامذہ | برنی صاحب نے عمر بھر پڑھایا، ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن تعلقات کم ہی شاگردوں سے رہے، جو شاگرد ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہے یا جن کی تعلیم و تربیت کی سرپرستی و نگرانی ان کے سپرد رہی ان سے تعلقات قائم رہے۔ چنانچہ شہزادہ نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد کے دونوں شہزادے مکرم جاہ اور مفخم جاہ شاگرد رہے اور یہ ان کی تعلیم و تربیت میں شریک رہے وہ جب ولایت سے آتے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ملاقات کرتے تھے۔[۱]

تصنیف و تالیف اور ترجمے | برنی صاحب ایک اچھے مصنف و مترجم بھی تھے، کتابوں کا نام مختصر تعارف کے ساتھ آگے آئے گا۔ وہ تصنیف و ترجمے میں تین باتوں کی خاص طور پر پابندی کرتے تھے جس کی بنا پر ان کی کتابیں بہت مقبول ہوئیں۔

۱۔ سلاست زبان ۲۔ صفائی بیان ۳۔ دلچسپی مضامین[۲]

یہ چیزیں واقعی بڑی اہم ہیں لیکن ان کے لئے صحت و استناد کو نہیں قربان کیا جاسکتا۔

شعر و سخن شناسی | برنی صاحب کا ایک خاص وصف شعر فہمی اور سخن شناسی بھی ہے اردو شاعری کے انتخابات ان کی وسعت نظر اور سخن شناسی کا ثبوت ہیں۔ وہ خود بھی موزوں طبع تھے۔ اس کا اور منتخبات کا ذکر آگے تصانیف میں آئے گا۔

---

[۱] برنی نامہ ص ۲۵ [۲] علم المعیشت ص ۶۹۸۔

تصانیف و تراجم | ذیل میں برنی صاحب کی تصانیف اور ترجموں کے نام مع تعارف پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کی تصانیف کے ایک سلسلے کا نام سلسلہ دعوت صدق تھا۔

۱۔ اسرار حق : آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور ارشادات صوفیہ کا ایک جامع و مربوط انتخاب ہے جن کے مقابل یورپ کے جدید سائنس اور فلسفہ کی انتہائی تحقیقات کا لب لباب دیا گیا ہے۔ اس سے اسلام کی حقانیت خود بخود ظاہر و نمایاں ہوجاتی ہے، اس کا پہلا ایڈیشن محمد مقتدیٰ خاں شروانی نے مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء میں چار سو صفحات میں شائع کیا تھا۔

۲۔ تسہیل الترتیل : اس میں قرأت کی ضرورت و اہمیت، اس کے اصول و طریق، اس کے نکات و اشارات خاص ترتیب سے نہایت سہل اور عام فہم پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں، جن سے پڑھنے میں غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا، اصول قرأت سے واقف ہونے کے بعد تلاوت میں کچھ اور ہی لطف آتا ہے اور رامز حق کا راز کھلتا ہے۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۳۶۱ھ اور تیسرا ۱۳۶۲ھ میں شائع ہوا۔

۳۔ تحفۂ محمدی : یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے، ہر حصہ میں درود تاج با ترجمہ، ایک عربی سلام اور چالیس نعتیں شامل ہیں، گویا چار حصوں میں جملہ (۱۶۰) نعتیں درج ہیں، یہ نعتیں قدیم و جدید (۶۰) مشہور و مقبول شاعروں کے کلام سے انتخاب کی گئی ہیں۔ چوتھے حصے میں (۲۴) فارسی نعتیں بھی شامل ہیں۔ تاج کمپنی کراچی نے اس کو بذریعہ بلاک طبع کرکے دیدہ زیب شائع کیا ہے۔

۴۔ مشکوٰۃ الصلوات : صلوٰۃ وسلام، اسلامی معارف اور عربی ادب کا بہترین سرمایہ ہے گویا "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" کی الہامی تفسیر ہے۔ ان کے مطالعہ سے سطح اثر

صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت و محبت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کے ورد سے نسبت محمدی کا فیضان ہوتا ہے اور دین کی نعمتوں کا دروازہ کھلتا ہے، غالباً اب تک صلوٰۃ وسلام کا کوئی ایسا مختصر و جامع ذخیرہ شائع نہیں ہوا، اس کا تیسرا ایڈیشن تاج کمپنی لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا، جو اب نایاب ہے۔ مصنف کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے دو سو نسخے مدینہ منورہ میں اور تین سو مکہ معظمہ میں تقسیم کئے تھے۔[1]

۵۔ معروضہ : یہ برنی صاحب کا شعری مجموعہ ہے، وہ الہ آباد یونیورسٹی میں امتحان لینے جاتے تو میر اکبر حسین صاحب الہ آبادی سے ملاقات کے لئے بھی جاتے، اپنا یہ مجموعہ کلام ان ہی کے اصرار سے شائع کیا تھا جو ہاتھوں ہاتھ نکل گیا تھا[2] اس میں حمد، نعت، منقبت و معرفت کی نظمیں سو سے زیادہ شامل ہیں۔ تاج کمپنی کراچی نے اس کا نفیس ایڈیشن آرٹ پیپر پر بذریعہ بلاک دیدہ زیب طبع کر کے مجلد شائع کیا ہے، جو کافی مقبول ہوا ہے۔ پھر ۴۰ مزید نظمیں ضمیمہ اول کے طور پر شامل ہیں۔

۶۔ قادیانی مذہب : بار اول ۱۹۵۲ء۔ بار دوم شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن ۱۳۵۲ھ میں صفحات ۴۴۴ پر شائع کی گئی تھی۔ اس میں قادیانیوں کے عقائد و اعمال کی تفصیل خود قادیانی کتابوں سے پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب قادیانی تحریک کی قاموس مانی جاتی ہے۔ چنانچہ پانچواں ایڈیشن (حجم بارہ سو صفحات تقطیع کلاں) مدت سے نایاب ہے چھٹا ایڈیشن اضافہ مضامین کے ساتھ شائع ہوا۔ محمد اشرف نے لاہور سے شائع کیا تھا۔

۷۔ قادیانی قول و فعل : حصہ اول پہلا ایڈیشن نایاب ہے اور حصہ دوم ۱۹۵۸ء

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۳۲ ؛ و ص ۱۰۳ [2] برنی نامہ ص ۲۲۔

میں شائع کیا گیا تھا۔

۸۔ صراط الحمید : جلد اول، عراق، شام، فلسطین و حجاز کے مقدس مقامات کے گوناگوں چشم دید حالات، نہایت دلچسپ و مفید معلومات اور سیر و سفر کی اس میں تفصیلی داستان مذکور ہے، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کے مشاہدات، ایمانی احساسات بارگاہ اقدس کے انوار و برکات، فیوض و انعامات اور فریضہ حج کے احکام و مسائل طور و طریق اور ادعیہ و صلوٰت کا بیان ہے۔

اس سفر نامہ میں جا بجا قرآنی معارف، ایمانی نکات، وہبی واردات، روابط قلبی کے نازک اشارات وغیرہ جن سے ایمان تازہ ہوتا ہے، دل کو عقیدت و محبت کا مزہ ملتا ہے عبارت کی لطافت اور معاصرین کے متعلق نادر معلومات اس پر مستزاد ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ سفر نامہ برنی صاحب کی دلچسپ آپ بیتی ہے اس کا احساس خود ان کو بھی تھا چنانچہ ج ۱ ص ۳۰۳ میں رقم طراز ہیں :

" بلا کم و کاست آپ بیتی لکھ دی اور آپ بیتی نہ لکھتا تو پھر کیا لکھتا، لکھنا لا حاصل تھا کچھ بھی نہ لکھتا، یہ توقع نہیں اور ممکن بھی نہیں کہ سب ناظرین ہم خیال ہوں ہم مذاق ہوں، ہم مشرب ہوں، ہم عقیدہ ہوں، تھوڑا بہت فرق رہنا ضرور ہے تاہم خدا کے فضل سے امید ہے کہ اپنی سرگزشت افراط و تفریط سے محفوظ ہے، رہی کوئی لغزش تو میں سراپا تقصیر ہوں، معصوم نہیں ہوں، انابت و مغفرت ہی کا اپنا سہارا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ "

صراط الحمید کا پہلا ایڈیشن ۱۳۴۶ھ میں اور دوسرا ایڈیشن ۱۳۵۰ھ میں مطبع برقی اعظم جاہی حیدرآباد دکن سے شائع کیا گیا تھا۔

۹۔ صراط الحمید جلد دوم : برنی صاحب نے اس کا تعارف یوں کرایا ہے:

"۱۳۵۱ھ میں دوسری مرتبہ حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی، حرمین شریفین میں حاضری نصیب ہوئی تو دوسرا سفرنامہ تحریر میں آیا جو صراط الحمید جلد دوم میں شائع ہوا۔

یہ سفرنامہ پہلے سفرنامے سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، عنوانات جدا، بیانات جدا۔ اس میں مکہ معظمہ، مدینہ منورہ کے احوال بالخصوص اور حجاز کے معاملات بالعموم تفصیل سے درج ہیں، ضمناً بہت سے واقعات بیان میں آگئے ہیں جو کافی دلچسپ ہیں، ان میں بعض خاص طور سے اہم ہیں اور نادر ہیں، غرض کہ صراط الحمید جلد دوم کا بھی خاص رنگ ہے۔ جلد اول کے بعد جلد دوم پڑھنے سے لطف دوبالا ہوجاتا ہے، جلد دوم میں حرمین شریفین کے فوٹو بھی شامل ہیں۔"

برنی صاحب نے یہ سفرنامہ دوران سفر قلم بند کیا تھا، فرماتے ہیں:

"ایک ماہ اور چند یوم جو مدینہ منورہ میں حاضری رہی تو فرصت کے اوقات میں سفرنامہ لکھتا رہا اور بیشتر حصہ وہیں تحریر میں آیا، صرف آخری فصل جس میں واپسی کا ذکر ہے البتہ باقی رہ گئی تھی کہ وطن پہنچ کر لکھوں گا۔ توقع تھی کہ واپسی کے بعد ہی یہ سفرنامہ جلد شائع ہوجائے گا لیکن عجیب اتفاق کہ سات سال گزر گئے اور طباعت کی نوبت نہ آسکی، مسودہ یونہی پڑا رہا، بلکہ ایک مرتبہ تو شبہ ہوا کہ گم ہوگیا، بارے خدا تلاش کیا تو وقت پر مل گیا۔

وجہ تاخیر یہ کہ واپسی کے بعد ہی گوناگوں مصروفیتوں کا ہجوم ہوگیا، یہ کام، وہ کام، علمی بھی، انتظامی بھی، خانگی بھی، سرکاری بھی، پھر اسی زمانے میں قادیانیوں سے

معرکے ہوئے جن کی تفصیلات ہماری کتاب "قادیانی مذہب" اور "قادیانی قول و فعل" میں درج ہیں، اپنی تو اکثر یہی حالت رہی اور رہتی ہے، علمی منصوبوں میں کتنے کام ابھی شروع نہ ہوسکے، کتنے کام برسوں سے ادھورے پڑے ان میں جو بہت خاص ہیں ان کا اظہار و اعلان بھی قبل از وقت مناسب نہیں۔ تاہم جو کام تکمیل پاچکے خدا کا شکر ہے پچیس کتابیں جو شائع ہوچکی ہیں یہ اسی کا فضل ہے۔" (ج ۲۔ ص ۶ و ۷)

آگے لکھتے ہیں:

"صراط الحمید جلد اول میں دل کھل کھیلا، جب مچلا بول اٹھا ؎

کہہ گزرتا ہوں پتے کی بے خودی کے جوش میں   ہوش میں ہوتا نہیں ہوتا ہوں جب میں ہوش میں

پھر بھی ضبط کی تاکید رہی۔ احتیاط کا اہتمام رہا۔ جلد دوم میں بھی دل کو کہیں کہیں موقع ملا۔ تاہم دماغ کا دور دورہ رہا کہ توازن لازم ہے ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل   لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

مگر سچ پوچھئے تو دھن بڑی چیز ہے۔ زندگی کی جان ہے سب دھنوں میں وہی دھن ؎

محمد از تو می خواہم خدا را   خدا از تو خواہم مصطفےٰ را

وہی توحید توحید ہے جو رسالت کے وسیلے سے نصیب ہو، رسول اللہ کو مانے تو اللہ کو جانے۔ اللہ تو سبحان اللہ۔ رسول اللہ ﷺ کی بھی کیا انوکھی شان ہے، صلوا علیہ وسلموا تسلیما ؎

ما بلبلیم نالاں گلزار ما محمد   ما نرگسیم حیراں دیدار ما محمد

قمری بسرو نازد بلبل بگل خرید   ما عاشقیم بے دل دلدار ما محمد

از خویشتن ندانم جز ایں قدر کہ دانم
ما قطرہ ایم بحرِ نخار ما محمدؐ
(صلی اللہ علیہ وسلم)

یہ کتاب پہلی بار ۱۳۵۸ھ میں مطبع برقی اعظم جاہی حیدرآباد سے شائع کی گئی تھی۔

۱۰۔ برنی نامہ : صراط الحمید جلد اول میں چار درویش کی سرگزشت میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۰ء تک حیدرآباد میں ۲۳ سال میں جو حالات پیش آئے تھے ان کا بیان ہے اور برنی نامہ میں اس کے بعد سے ۱۹۵۷ء تک سترہ برس کے قابل ذکر حالات و معاملات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ برنی صاحب لکھتے ہیں :

"میری خوش نصیبی یہ کہ حیدرآباد پہنچا، یہاں کے بزرگوں کا کیا کہنا ماشاء اللہ حقائق و معارف کے چمن کھلے ہوئے ہیں البتہ ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است"[1]

برنی صاحب کے اس زمانہ میں جن دانشور، اہل علم و اہل قلم، صوفیہ اور عہدہ داروں سے تعلقات رہے انہیں نام بنام بتایا ہے[2] فرمانروائے دکن میر عثمان خاں سے موصوف کے دیرینہ مراسم تھے، کنگ کوٹھی میں آنا جانا ان کا معمول تھا[3] اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

"۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۷ء تک چالیس برس حیدرآباد میں گزارے، اس مدت میں تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا سلسلہ بھی جاری تھا، چنانچہ چھوٹی بڑی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں چالیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور کئی منصوبے تکمیل طلب باقی تھے"[4]

۱۱۔ علم المعیشت : اردو میں اکنامکس کے موضوع پر سب سے پہلی نہایت مستند و جامع کتاب ہے، مشکل سے مشکل معاشی اصول و مسائل کو دلچسپ اور سلیس پیرایہ میں

[1] صراط الحمید ج ۲ ص ۹ و ۱۰ [2] برنی نامہ ص ۵ [3] ایضاً ص ۲۲ [4] ایضاً ص ۲۶۔

بیان کیا ہے، اس کے مطالعہ سے نئے نئے مضامین بخوبی ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور طلبہ واستاد سب اس کو شوق سے پڑھتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

برنی صاحب نے کتاب علم المعیشت مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی فرمائش و ہمت افزائی پر لکھنی شروع کی تھی[1] یہ وہ زمانہ تھا جب کہ موصوف کی ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم جاری تھی[2] اور وہ علی گڑھ کالج میں بی اے کے طلبہ کو معاشیات بھی پڑھاتے تھے اور ان کا کاروان عمر ابھی پچیسویں منزل طے کر رہا تھا۔ یہ اردو میں سات سو صفحات سے زیادہ کی کتاب پہلی بار ۱۹۱۷ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کی تھی۔ برنی صاحب نے اس کی تمہید علی گڑھ کالج میں لکھی تھی۔

اس کتاب کے متعلق ایک بالغ نظر، ہوشمند و دانشور عالم مولانا عبیداللہ سندھی المتوفی ۱۹۴۴ء کی رائے یہ ہے :

"یورپ میں میری سیاحت کے لئے مولوی الیاس صاحب برنی کی "علم المعیشت" بھی ایک محسن کتاب ہے۔ اگر یہ کتاب مجھے نہ ملتی تو میں یورپی اقتصادی پروگرام کو سمجھنے کے قابل نہ ہوتا"[3]

یہ اس صاحب علم شخص کی رائے ہے جس نے اس فن کی تحصیل کسی کالج یا یونیورسٹی میں نہیں کی تھی۔ صرف اس کتاب کے مطالعہ سے ایسی بصیرت حاصل کی تھی کہ پورے یورپ کی علم المعیشت کو بخوبی سمجھ گئے تھے۔ موصوف نے اسے اپنی محسن کتابوں میں شمار کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبالؒ المتوفی ۱۹۳۸ء جو خود بھی معاشیات کے بڑے عالم اور دنیا کے نامور دانشوروں میں سے ہیں وہ اس کتاب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں :

[1] صراط الحمید ج ۱ ص ۳۴۹ [2] ایضاً [3] مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں، مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۵۔

"آپ کی کتاب "علم المعیشت" اردو زبان پر احسان عظیم ہے اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ اکنامکس پر اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمل"۔ ۱؎

کتاب کے خاتمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ سے کتنا عشق تھا اور ان کا ایمان کس قدر راسخ تھا تحریر فرماتے ہیں:۔

"علم المعیشت" کا بیان ختم ہوتا ہے اب صرف آخری نکتہ جتانا باقی ہے اگر کل پہلوؤں پر غور کرکے بنی نوع انسان اپنی زندگی کے واسطے بہترین معاشی اصول دریافت کرنا چاہے تو اس کی ہدایت کے واسطے اللہ جل شانہ نے دریائے حکمت کو کوزہ میں بند کردیا ہے، قرآن پاک میں معاشی زندگی کے متعلق بہت سی ہدایتیں موجود ہیں اور صدہا سال کا تجربہ بھی آج انہی ہدایات کا موید نظر آتا ہے۔ ہم صرف ایک آیت شریفہ پر اکتفا کرتے ہیں وھو ھذا۔

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ۔ (اعراف، ۷:۳۱)

اور کھاؤ اور پیو اور بے جا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بے جا خرچ کرنے والے۔

اس کتاب کے سرورق کی پیشانی پر یہ آیت شریفہ:

وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ ۱۲۴)

اور جس نے منہ پھیرا میری یاد سے تو اس کو ملنی ہے گذران تنگی کی۔

دوبارہ یہ کتاب باہتمام محمد مقتدیٰ شروانی مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء میں شائع کی گئی تھی۔ تیسرا ایڈیشن ۸۰۰ صفحات پر مشتمل انجمن ترقی

[illegible] ۱۲؎ یہ فہرست صراط الحمید جلد دوم کے آخر میں شائع کی گئی ہے۔

اردو دہلی سے نکلا ہے۔

۱۲۔ اصول معاشیات: یہ کتاب نصابی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی ہے اس لئے کسی قدر دقیق اور مشکل مباحث پر مشتمل ہے، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے شائع کی تھی۔ صفحات ۶۰۰ ہیں، خوشنما جلد اور تقطیع کلاں ہے۔

۱۳۔ معیشت الہند: ہندوستان کے گوناگوں معاشی حالات جن کا جاننا ملک کی اصلاح و ترقی کے لئے ازحد ضروری ہے، کافی تحقیق اور تنقید کے بعد بہت سلیس اور دلچسپ طرز پر علمی پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی جامع و مستند کتاب دارالترجمہ جامعہ حیدرآباد سے شائع کی گئی تھی۔ ۸۵۰ صفحات، تقطیع کلاں اور جلد خوش نما ہے۔ ۱۳۴۴ھ میں دوسری بار شائع کی گئی تھی۔

۱۴۔ مقدمۃ المعاشیات: یہ مورلینڈ کی انگریزی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اکنامکس" کا سلیس و بامحاورہ اردو ترجمہ ہے جس میں معاشیات کے ابتدائی اصول و مسائل بیان کئے گئے ہیں، تقطیع کلاں، ۳۰۰ صفحات ہیں، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے شائع کی تھی۔

برنی صاحب کا ایک سلسلہ تصانیف منتخبات نظم اردو پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں غزلیات کا وافر ذخیرہ ہونے کی بنا پر عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ساری کائنات محض حسن و عشق اور گل و بلبل کی داستان ہے، مگر تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ اردو میں ہر رنگ کی بہتر سے بہتر نظمیں موجود ہیں لیکن وہ نظروں سے اوجھل تھیں۔ برنی صاحب کے اس انتخاب سے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ اردو کا دامن اس سلسلہ میں کتنا وسیع ہے۔

یہ معارف ملت' جذبات فطرت اور مناظر قدرت کے نام سے قدیم وجدید اردو شعراء کی نظموں کا ایک مفید اور جامع انتخاب ہے جو بارہ حصوں پر مشتمل ہے' اس میں اردو کے تقریباً دو سو قدیم وجدید نامور شعراء کا بہترین کلام عجیب وغریب ترتیب کے ساتھ آگیا ہے۔ بڑے بڑے ادیب اور نقاد سخن نے اس کی داد دی ہے اور یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا اس سے واقعتاً لائق مرتب کی اردو ادب پر وسیع نظر اور سخن فہمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۹ء سے بتدریج شائع ہوتا رہا اور ۱۹۲۴ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔

۱۵ تا ۱۸: اس کا پہلا سیٹ معارف ملت چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

۱۹ تا ۲۲: دوسرا سیٹ جذبات فطرت کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کی جلد اول اردو شاعری کے قافلہ سالار میر تقی میر و رفیع سودا کے کلام کا انتخاب ہے۔

جلد دوم۔ مرزا غالب' ذوق' ظفر' حسرت موہانی کے کلام کا انتخاب ہے۔

جلد سوم۔ تقریباً بیس قدیم و مستند اور باکمال شعراء کے کلام کا انتخاب ہے۔

جلد چہارم۔ تقریباً ساٹھ جدید مشہور و مقبول شعراء کے کلام کا دلکش انتخاب ہے۔

۲۳ تا ۲۶: تیسرا سیٹ۔ مناظر قدرت: جلد اول متعلق اوقات، صبح و شام' دن رات' دھوپ' چاندنی' موسم گرما، سرما، برسات اور بہار کے دلکش مناظر نظموں میں اس خوبی سے عکس فگن ہیں' ان کو دیکھ کر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے۔ یہ جلد قدرت کی دل ذیبیوں کا بہترین مرقع ہے۔

جلد دوم (کائنات اور اس کی اشیا)، اس میں آسمان، زمین، پہاڑ، جنگل' میدان' دریا، کھیت' باغات' شہر اور عمارات وغیرہ کی شعراء نے ایسی تصویر کھینچی ہے کہ نظمیں پڑھتے وقت گویا ہم آنکھوں سے ان کی سیر کر رہے ہیں۔

جلد سوم (نباتات وحیوانات) میں نباتات وحیوانات یعنی پھول پھل' کیڑے' پتنگے' تتلیاں' پرند وچرند وغیرہ کے متعلق نظمیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے شاعروں نے اشیائے قدرت کا کس حد تک مطالعہ کیا ہے اور مشاہدات میں کہاں تک جان ڈالی ہے۔

جلد چہارم (عمرانیات)، اس میں ہندوستان کے تمدن' رسم و رواج، عید تہوار' شادی، میلے، ٹھیلے، کھیل تماشے' بزم و رزم کے حالات دل کو بے چین کر دیتے ہیں' شعر وسخن کا یہ عجیب دل کش انتخاب ہے۔ ان تینوں سیٹ کی پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اشاعت ہوئی۔ تیسری بار محمد مقتدی خاں شیروانی کے زیر اہتمام ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ سے شائع کئے گئے تھے۔

عطیہ قادریہ: یہ تحفہ ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ میں یازدہم شریف میں بلا قیمت تقسیم ہوا۔

برنی کی تصانیف وتراجم کی تعداد

الیاس برنی صاحب نے اپنی تصانیف وتراجم کی تعداد "۴۰" بیان کی ہے اور مولانا منت اللہ صاحب نے برنی صاحب کی تصانیف کی تعداد "۴۹" بتائی ہے[1]

برنی صاحب کی حیات میں ان کی کتابوں کے ناشر، ادارے، مکتبے اور مطابع مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد حیدرآباد دکن۔

۲۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ' حیدرآباد۔

۳۔ مکتبہ ابراہیمیہ (عابد شاپ) "

[1] مکاتیب گیلانی ج ۱ ص ۱۰۳

۴۔ اختر دکن پریس، افضل گنج، حیدرآباد

۵۔ محمد الیاس۔ جام باغ ترپ بازار " (حیدرآباد میں قیام کے ابتدائی زمانے میں، پھر بیت السلام ویسف آباد۔ "

۶۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔ مینجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ۔

۷۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ دہلی۔

۸۔ تاج کمپنی لاہور۔ کراچی۔

۹۔ محمد اشرف لاہور۔

برنی صاحب کی فارمیسی اکسیر انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد، جہاں برنی صاحب کے مجربات تیار ہوتے تھے۔

۱۔ اکسیر کبیر: معدہ کی شکایات میں مفید ہے۔

۲۔ اکسیر آئل: جسم کے درد، ورم، نزلہ، زکام، انفلوئنزا میں مفید ہے۔

۳۔ اکسیر مرہم: جلدی امراض کے لئے مفید ہے۔

۴۔ اکسیر دندان: خوشبودار ٹوتھ پیسٹ، دانتوں کی شکایات میں مفید ہے۔

مزید برآں بعض موذی امراض جو بالعموم لاعلاج مانے جاتے ہیں۔ بالخصوص جذام کینسر ایسے امراض کا بھی علاج بطور خاص کیا جاتا تھا۔

یہ فارمیسی اکسیر انسٹی ٹیوٹ موصوف نے ۱۹۵۸ء میں یا اس سے کچھ عرصہ پہلے قائم کیا تھا۔

فرزند کامل پوری | معتمد حضرت بنوری

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کو ہندوستان میں ڈابھیل اور ''مجلس علمی'' کی وجہ سے کافی شہرت حاصل تھی، پاکستان کی آزادی سے قبل جب میں دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا تو حضرت بنوریؒ وہاں تشریف لائے، اور یہ فجر کی جماعت ہوجانے کے بعد کا وقت تھا، حضرت بنوریؒ نے شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے کمرے کے سامنے والی جگہ جو نماز کے لیے خاص تھی وہاں نماز ادا کی، اور وہیں ان کی زیارت ہمیں نصیب ہوئی، دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اکابرین کی زیارت سے مشرف فرماتے تھے، اور یہ بڑی جامعات میں پڑھنے کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔

دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار مولانا احتشام الحق تھانوی کا قائم کردہ مدرسہ ہے جیسا کہ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ''نقوش رفتگاں'' میں لکھا ہے، موصوف کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ نے جب ٹنڈوالہ یار میں دارالعلوم قائم کیا تو ہندوستان سے آئے ہوئے نامور علمائے کرام ان کی دعوت پر ان کے مدرسہ میں تشریف لائے اور شعبہ تدریس کے ساتھ منسلک ہوگئے، انہی علماء میں حضرت بنوریؒ بھی شامل تھے۔

مولانا احتشام الحق تھانویؒ اس زمانہ میں ریڈیو پر قرآن کریم کی تفسیر بیان کیا کرتے تھے اور میں ریڈیو پاکستان کی جانب سے ان کا اسسٹنٹ تھا، حضرت بنوریؒ جب ٹنڈوالہ یار تشریف لائے تو میرے بھی ان کے ساتھ تعلقات بن گئے اور پھر تقریباً دوسال کے بعد کراچی میں مدرسہ عربیہ اسلامیہ (حالیہ بنوری ٹاؤن) کی بنیاد رکھی تو میرے تعلقات ان کے ساتھ اور بھی زیادہ بڑھ

گئے، ساتھ ساتھ مجلس علمی میں بھی آنا جانا رہتا تھا اور وہیں حضرت بنوری نے مجھے "نفحة العنبر فی حیات الشیخ انور" ہدیتاً دیا تھا، اسی طرح ایک دفعہ حضرت بنوریؒ نے معارف السنن ہدیتاً پیش کی تھی، اور اس کی تیسری جلد پر مندرجہ ذیل الفاظ رقم فرمائے تھے:

"اقدمه الی صدیقنا النبیل الشیخ العالم الجلیل الباحث النشیط فی التالیف والمسائل العلمیة الاستاذ عبد الحلیم الجشتی وفقه الله لکل خیر"

حضرت بنوریؒ نہایت متواضع انسان تھے، مہمانوں کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پیش کرتے تھے، میں جب بھی حاضر ہوتا تو کنڈی بجاتا، حضرت بنوریؒ فرمایا کرتے تھے "جب بھی تم آتے ہو اور کنڈی بجاتے ہو تو میں سمجھ جاتا ہوں، اس لیے کہ آپ کے سوا جو بھی آتا ہے وہ گویا دروازہ پر ہتھوڑا مارتا رہتا ہے"۔

ایک دفعہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہ اللہ جامعہ بنوری ٹاؤن تشریف لائے تو حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی حضرت بنوریؒ سے مسجد کی مغربی جانب جنازہ گاہ کے قریبی کمرہ میں مجلس ہوئی، میں بھی اس مجلس میں شریک تھا، ہم تین کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، حضرت بنوری رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ میں نے مفتی احمد الرحمن کو مدرسہ کا مہتمم بنادیا ہے۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ انتہائی محتاط اور خدا ترس انسان تھے، حضرت بنوریؒ نے ان کو مدرسہ کی ذمہ داری بھی سونپی اور اپنی صاحبزادی سے ان کا نکاح بھی کیا، اہتمام ایک ایسا منصب ہے جس میں ہر شخص کو خوش نہیں رکھا جاسکتا، حضرت بنوریؒ کا یہ انتخاب ایسا رہا کہ مفتی احمد الرحمن صاحب نے اس خدمت کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ حضرت بنوریؒ نے حکومت پر تنقید کی تو حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ (متوفی: ۱۴۰۶ء) نے حضرت بنوریؒ کو خط لکھا جس میں یہ مضمون تھا "آپ مہربانی فرما کر حکومت پر تنقید نہ کریں، اس لیے کہ اس کی وجہ سے آپ کو جیل جانا پڑے گا اور مدرسہ برباد ہوجائے گا، اس لیے مدرسہ کو سیاست سے دور رکھئے" حضرت بنوریؒ نے اس خط کو اپنے سر پر رکھا (مجھے یہ واقعہ حامل رقعہ ہذا نے خود بتلایا تھا)، لیکن بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے مدرسہ سنبھالنے

کے ساتھ ساتھ سیاست کے میدان میں بھی شرکت کی صلاحیت رکھی ہوتی ہے تو وہ دونوں میدانوں میں خوب خدمات ادا کرتے ہیں، جیسا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کہ وہ دونوں صفتوں سے آراستہ تھے، مفتی احمد الرحمن رحمہ اللہ میں بھی ان کی جھلک تھی۔

وفات وتدفین

۱۹۹۱ء میں حضرت مولانا مفتی احمد الرحمنؒ کو ایک مدرسہ کی جانب سے مشکوٰۃ شریف کے ختم اور دورۂ حدیث شریف کے افتتاح کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا، چنانچہ مفتی صاحبؒ زندگی کی اس آخری شب اس مدرسہ میں تشریف لے گئے اور مشکوٰۃ کا ختم اور دورۂ حدیث شریف کا افتتاح کروایا، وہاں سے واپسی کے بعد دل کی تکلیف لاحق ہوئی اور یہ رات ۲ بجے کا وقت تھا، فوراً ہسپتال لے جایا گیا تقریباً چار بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

نماز جنازہ عصر کی نماز کے بعد آپ کے بڑے بھائی مولانا قاری سعید الرحمن صاحبؒ نے پڑھائی اور بوقت عشاء حضرت بنوریؒ کے بائیں پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔

موصوف نے اپنے سوگواران میں ہزاروں روحانی فرزند اور چار نسبتی بیٹے، پانچ بیٹیاں اور ایک اہلیہ جو کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی صاحبزادی ہیں، چھوڑے۔ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے، آمین

حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوری رحمہ اللہ

حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن رحمہ اللہ کے والد ماجد حضرت مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ کا تعلق مشہور افغانی قبیلہ یوسف زئی سے تھا، آپ کے آباء واجداد شرافت ودیانت، تقویٰ وطہارت میں امتیازی حیثیت کے حامل تھے۔

موصوف کی ولادت ۲۷/ اگست ۱۸۸۲ء کو ضلع کیمبل پور میں ہوئی، بچپن ہی سے نہایت سنجیدہ اور ذہین تھے، ابتدائی تعلیم شمس آباد میں حاصل کی اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں مولانا فضل حق صاحبؒ سے پڑھیں جو کہ حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے شاگرد تھے، اس کے بعد مکھڈ میں شرح جامی اور ملا حسن تک کی کتابیں مولانا قاضی عبدالرحمن صاحبؒ سے پڑھیں، پھر علمی پیاس بجھانے کے لیے ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، وہاں

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ اور دیگر اکابر کے ہاں حدیث کی کتابیں پڑھیں، اور دورۂ حدیث سے ۱۳۲۱ھ میں فراغت حاصل کی، پھر دوبارہ مکرر دورۂ حدیث کے لیے آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، وہاں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، علامہ انور شاہ کشمیری رحمہما اللہ اور دیگر اکابرین سے فیض یاب ہوئے۔

(کاروان تھانوی، تذکرہ مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوری، از حافظ محمد اکبر شاہ بخاری)

تدریسی خدمات اور صدر المدرسین کا عہدہ

دارالعلوم دیوبند سے مکررہ دورۂ حدیث کرنے کے بعد موصوف دوبارہ مظاہر العلوم تشریف لائے اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ کے زیر سایہ تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۳۴۴ھ میں جب مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمہ اللہ مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے تو حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کامل پوریؒ کو مظاہر العلوم کا صدر المدرسین بنایا گیا اور تا قیام پاکستان (۱۳۶۹ء) صدر المدرسین کے فرائض انجام دیتے رہے۔

(کاروان تھانوی، تذکرہ مولانا عبدالرحمن کامل پوری، از حافظ محمد اکبر شاہ بخاری)

آپؒ نے طالب علمی کے آخری دور میں حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے بیعت وارشاد کا تعلق قائم کیا تھا، پھر جب حضرت سہارنپوریؒ مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے اصلاحی تعلق کا ارادہ فرمایا، چنانچہ جب اس سلسلہ میں پہلا خط حضرت تھانویؒ کو لکھا تو مولانا تھانویؒ نے بیعت کرنے سے قبل ہی خلافت کی خلعت سے سرفراز فرمایا اور پھر بیعت وتربیت فرمائی، حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں آپ مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ کو بیعت سے قبل ہی خلافت عطا فرمائی۔

(بزم اشرف کے چراغ، تذکرہ مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ، پروفیسر احمد سعید)

لطیفہ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نہایت نکتہ سنج انسان تھے، ان کی نکتہ سنجی اس واقعہ سے چھلکتی ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے "مولانا کامل پوری نہیں، کامل پورے ہیں"۔

(بزم اشرف کے چراغ، تذکرہ مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ، پروفیسر احمد سعید)

علوم وفنون میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا مرتبہ ومقام

اسی طرح حضرت تھانویؒ کا ایک اور واقعہ بھی مشہور ہے، جب حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے ابن حزمؒ (ظاہری) کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا ''ابن حزم میں حزم نہیں'' (یہ واقعہ میں نے حضرت کی کسی کتاب میں پڑھا تھا حوالہ یاد نہیں) اس واقعہ سے جہاں حضرت تھانویؒ کی نکتہ سنجی ظاہر ہوتی ہے وہیں جرح وتعدیل کے باب میں اہل علم کا ادب اور ان کی رعایت کرنا بھی معلوم ہورہا ہے، یہ واقعہ جرح وتعدیل کے باب میں اپنی مثال آپ ہے، جس سے ہر فن میں ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد

قیام پاکستان کے بعد مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ پاکستان تشریف لائے، پاکستان تشریف آوری کے بعد اولاً آپ تین سال تک مدرسہ خیر المدارس ملتان میں مدرس رہے، پھر ۱۳۷۲ء میں مولانا موصوف حضرت مولانا احتشام الحق تھانویؒ کی قائم کردہ معروف دینی درسگاہ دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار میں تشریف لائے اور تین سال تک یہاں بھی تدریس فرمائی، اس کے بعد واپس اپنے وطن لوٹے اور ۱۳ دسمبر ۱۹۶۵ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

(بزم اشرف کے چراغ، تذکرہ مولانا عبدالرحمن کامل پوری، از پروفیسر احمد سعید)

ان کے خانہ علم سے ہزاروں طالب علموں اور مریدوں نے فیض پایا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے، آمین۔

مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ

مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ

مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی

(مشرف تخصص فی الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن)

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن چھوٹی سی جگہ میں ہے، لیکن خدمات وقربانیوں کی وجہ سے پاکستان میں اپنی مثال آپ ہے۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر بھی اللہ تعالیٰ نے اسے قبولِ عام سے نوازا ہے، یہ اس کے بانی حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۷۹ھ) کے اخلاص، حسنِ نیت اور بزرگوں کی دعاؤں کا ثمرہ و نتیجہ ہے۔

یہاں کے استاذ، خادم وکارکن جہاں بھی ہوتے اور زندگی گزارتے ہیں، خدمت خلق سے پہلوتہی اور جان کی بازی سے دریغ نہیں کرتے۔

چنانچہ قربانی کا یہ سلسلہ آج سے چودہ سال پہلے ۱۴۱۸ھ۔۱۹۹۷ء کو شروع ہوا اور آج تک جاری ہے، سب سے پہلے مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار صاحب رحمہ اللہ مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ وخلیفہ حضرت مولانا عبد العزیز رائے پوریؒ (۱۴۰۵ھ) شہید ہوئے۔

خدمات: مفتی احمد الرحمٰن صاحب رحمہ اللہ (۱۴۱۱ھ) کی وفات کے بعد سات برس تک مہتمم کی حیثیت سے عظیم خدمات انجام دیتے رہے۔ انتظامی امور کے ساتھ ساتھ درس و تدریس اور تصنیف کا سلسلہ جاری رکھا، ۱۳۹۰ھ میں ''کشف النقاب عما یقولہ الترمذی وفی الباب'' پر کام شروع کیا، جو ''کتاب الطہارۃ سے باب ماجاء فی کثرۃ الرکوع والسجود'' تک ۵ رجلدوں میں چھپ چکی ہے۔ موصوف کی اردو، عربی تصانیف و ترجمہ کی بڑی تعداد ہے۔

شہادت وتدفین: موصوف نے یکم رجب ۱۴۱۸ھ مطابق ۲ رنومبر ۱۹۹۷ء کو اپنے دو ساتھیوں سمیت جامِ شہادت نوش فرمایا۔ نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ (۱۳۹۷ھ) اور مفتی احمد الرحمٰنؒ (۱۴۱۱ھ) کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی
نگران: تخصص فی علوم الحدیث، جامعہ بنوری ٹاؤن

علومِ بنوری کے امین

مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ مولانا بنوریؒ کے منظورِ نظر اور ان کے علوم کے جانشین تھے، انہیں حضرت بنوریؒ سے بڑی محبت تھی، اسی محبت اور علمی صلاحیت کی وجہ سے انہیں بیرونِ ملک تعلیم مزید آگے بڑھانے کے بجائے اپنے مدرسہ میں بلوالیا اور انہیں علمی مشغولیت کے ساتھ ملک کے اندر ہی پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا، بلکہ جامعہ کراچی کی طرف سے اس کے نگران بھی بنائے گئے، انتقال کے بعد ڈاکٹر امتیاز صاحب صدر شعبہ علوم اسلامیہ جامعہ کراچی کو ان کے مقالے کا نگران مقرر کیا گیا۔ (شخصیات وتاثرات، مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ، ج:۲، ص:۲۷۲-۲۷۳)

وہ حضرت کے خاص تلامذہ اور منتسبین میں سے تھے، ان کی محبت وخلوص کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں علمی نسبت کے ساتھ قرابت داری کی نسبت بھی عطا فرمادی تھی، محدث العصر حضرت بنوریؒ کے علوم کے امین تھے، اسی لیے حضرت نے انہیں ایسے موضوعات دیئے تھے جو دائرہ معارف کی حیثیت رکھتے تھے۔ درس وتدریس اور انتظامی اُمور کی انجام دہی کے بعد ہمہ وقت انہی کاموں میں مشغول رہتے جو مولانا بنوریؒ نے انہیں سپرد کیے تھے، گویا اپنے استاذ ومحبوب کے کاموں کو حرزِ جان بنا رکھا تھا، ہر وقت یہی خیال کہ اسے پورا کرنا ہے، ہر وقت یہی فکر کہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے، محنت کا یہ عالم تھا کہ حضرت مولانا اور ان کے دیرینہ رفیق مولانا امین اورکزئی فجر کے بعد بیٹھتے تو رات بارہ بجے اُٹھا کرتے، ''کشف النقاب'' اسی محنت کا نتیجہ ہے، جس کی نظیر علمی وتحقیقی دنیا میں موجود نہیں ہے، اس ترویج علوم کے دور میں جب کہ جدید ٹیکنالوجی نے حدیث سے متعلق بہت ساری سہولیات فراہم کردی ہیں، لیکن اب تک ان کی کتاب سے مفر نہیں اور اس کے فائدے کا انکار نہیں کیا جاسکتا:

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا حبیب اللہ صاحب کی عربی پختہ تھی، فرفر عربی بولتے تھے، عربی میں خوب کمال حاصل تھا، اپنے

استاذ و شیخ کے عربی ادب و ذوق سے بھی خوب واقف تھے، اس لیے ان کی کتابوں کی نشر و اشاعت کا خصوصی اہتمام کیا، مولانا کی ''القصائد البنوریة'' اور دیگر ادبی و علمی کام منظرِ عام پر لانے میں مولانا حبیب اللہ صاحب کا بڑا عمل دخل تھا، اپنے معمولات میں پختہ تھے، غیر معمولی صلاحیت کے حامل تھے، بہت سمجھدار انسان تھے۔

ابن الجوزیؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے اوقات کو اپنے کاموں کے لیے خاص کر رکھا تھا، کسی لمحہ کو ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے، اسی لیے انہوں نے ہر وقت کے لیے کوئی نہ کوئی کام متعین کر رکھا تھا، یہاں تک کہ مہمانوں سے میل جول کے دوران بھی کام متعین تھا، جس میں مہمانوں کی مہمان نوازی بھی ہوتی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی ہوتا، مولانا حبیب اللہ صاحبؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی عطا فرمائی تھی کہ ان کے پاس احباب و متعلقین کا تانتا بندھا رہتا، ان کی تواضع اور گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کا قلم برق رفتاری سے اپنے منازل طے کرتا رہتا، گویا ایک ہی وقت میں کئی امور کی انجام دہی ہوتی رہتی تھی، مہمانوں کی مہمان نوازی بھی اور اپنا علمی کام بھی، ان کے دیرینہ رفیق مولانا امین اورکزئی صاحب تو چپ چاپ اپنا لکھتے رہتے تھے، لیکن مولانا بہ یک وقت کئی کام کرتے، باتیں اور مہمان نوازی بھی، ساتھ ساتھ علمی کام بھی۔

انتظامی امور ایسے ہوتے ہیں کہ اس میں ہر ایک کو خوش رکھنا بہت مشکل کام ہے، لیکن حضرت مولانا کو اللہ رب العزت نے سلیقہ اور حکمت بطور ودیعت عطا فرمائی تھی، جس کے باعث وہ سارے معاملات بحسن وخوبی کر گزرتے تھے، لیکن اپنے اصول اور جامعہ کے فائدے کے معاملے میں اس قدر مضبوط و متصلب تھے کہ اگر کوئی استاذ جامعہ کے مفاد کے خلاف کوئی کام کرتا تو یہ تک کہہ جاتے کہ: ''اگر جانے کا ارادہ ہو تو بتلا دیجئے گا، اسی وقت گاڑی بھیج کر سامان بھجوا دوں گا'' مولانا بنوریؒ کے مدرسہ کے معاملے میں کسی قسم کی تسامح کے قائل نہ تھے۔

حضرت مولانا کے اوقات میں اللہ نے ایسی برکت عطا فرمائی تھی کہ ''کشف النقاب'' انتظامی امور، وہ بھی صرف ایک جامعہ یا اس کے شاخوں کے نہیں بلکہ وفاق کی مصروفیات، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ بہت سی کتابوں کی تالیف اور ترجمہ کا سہرا بھی آپ کے سر ہے۔ آپ کی تالیفات اور مترجم کتب کے نام کافی ہیں، جس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اہل اللہ کے اوقات میں کیسی برکت ہوتی ہے۔

حضرت مولانا کی ذات میں اللہ نے انتظامی امور کا ملکہ ودیعت کر رکھا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ آپ بڑے مردم شناس انسان تھے، ادارہ کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کرتے تھے جو غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہوں اور ادارہ کو ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو سکے، مفتی عبدالرؤف غزنوی صاحب، مفتی عبدالرؤف ہالیجوی صاحب اور دیگر بعض اساتذہ جامعہ کا انتخاب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ وہ کس قدر اہتمام سے اساتذہ کا انتخاب کیا کرتے تھے، مدرسہ کے لیے استاذ مقرر کرنے سے پہلے ہی ان کے بارے میں خوب معلومات حاصل کرلیا کرتے تھے۔ ہر مدرس

کے بارے میں خبر گیری رکھتے تھے، اور اچھی طرح تحقیق کر لینے کے بعد پھر کسی کی بات سے متاثر نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے بارے میں کسی نے کہا کہ: ''یہ مودودی ہے۔'' مولانا نے فرمایا: ''ان باتوں کو چھوڑ دیں، مجھے اچھی طرح پتہ ہے کون مودودی ہے، کون نہیں۔''

جس تن دہی اور اخلاص سے انہوں نے ادارہ کی خدمت کی آج تک ادارہ ان کی محبت اور اخلاص کے ثمرات سے فائدہ اُٹھا رہا ہے، اسی محنت اور اخلاص کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا کے دورِ اہتمام میں جامعہ نے خاطر خواہ ترقی کی، مردانِ راہ وفا کی ہمیشہ سے یہ پہچان رہی ہے کہ وہ ساری مصروفیات کے باوجود اللہ کی یاد سے غافل نہیں رہتے، حضرت مولانا بھی اسی کاروانِ راہ وفا کے ایک فرد تھے اور اپنے معمولات کے بہت پابند تھے، ان کا کوئی بھی وقت اللہ کی یاد، مدرسے کے کام اور مفاد سے فارغ نہ ہوتا تھا۔

احتیاط اور تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نوٹوں سے بھرا تھیلا مدرسہ کے فنڈ کے لیے لے کر حاضر ہوئے اور بغیر رسید لیے واپس جانے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ: اپنی رقم کی رسید لیتے جائیں، انہوں نے عرض کیا کہ اس سے پہلے تو ہم نے کبھی رسید نہیں لی اور ہمیں آپ پر پورا اعتماد ہے، مولانا نے تڑپ کر فرمایا: '' یا تو آپ اپنی رقم کی رسید لیتے جائیں یا پھر ہم مدرسہ کے لیے اس رقم کو قبول نہیں کریں گے۔''

مدرسہ کے لیے وصول کردہ رقم کے استعمال کرنے میں بھی بہت احتیاط برتتے تھے، جس کی بنا پر بسا اوقات ایسی جگہ پر پیسہ خرچ کرنے سے بھی رک جاتے تھے جہاں رقم خرچ کرنی چاہیے، خصوصاً جب بڑا ادارہ ہو تو اس کی علمی ضروریات بھی کافی بڑھ جاتی ہیں، مثلاً کتابوں کی خریداری ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہر وہ مدرسہ جس میں کتابوں کی کثرت ہو اور طلباء میں مطالعہ کے ذوق کی آبیاری کی جائے تو ان کی استعداد میں خاصی ترقی ہوگی، یہی وجہ ہے کہ مولانا احمد رضا بجنوری صاحبؒ نے جب حضرت بنوریؒ پر بہت اصرار کیا کہ وہ ''معارف السنن'' کو جلدی مکمل کریں، اور اسی دوران وہ جامعہ میں تشریف لائے اور طلبہ کے زیر مطالعہ کتابیں دیکھیں تو حضرت بنوریؒ سے تکمیل کتاب پر اصرار ترک کر دیا، وجہ یہ لکھی: ''تخصص کے طلبہ کے کمروں کو دیکھا کہ ان میں مطالعہ کے لیے کتابوں کی اتنی وافر تعداد ہے جو بعض بڑے مدارس کے اساتذہ کے یہاں بھی نہیں دیکھی، ان باتوں کو دیکھ کر میں اتنا متاثر ہوا کہ معارف السنن کے کام کے سلسلہ میں مولانا پر کچھ بھی زور نہ دے سکا۔'' (خدام الدین، حضرت بنوری نمبر، ص: ۱۱۲) لیکن مولانا حبیب اللہ صاحب طلبہ کی رقم کو خرچ کرنے میں احتیاط کی وجہ سے مدرسہ کے لیے کتاب خریدنے میں بھی کافی تامل کرتے اور پوچھ تاچھ کے بعد کوئی کتاب مدرسہ کے لیے خریدتے تھے۔

توکل کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی مدرسہ میں سیکورٹی گارڈ رکھے گئے، بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ جامعہ میں بھی گارڈ رکھ لیے جائیں، حالات صحیح نہیں ہیں، شدت سے انکار کیا اور فرمایا: ''زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا

آ کر ماردیں گے، ماردیں وقت پر ہی موت آئے گی، اس سے پہلے نہیں۔'' اور گارڈ نہیں رکھے۔

سیاست کے معاملے میں حضرت بنوریؒ کا حال یہ تھا کہ مدرسہ میں سیاست کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، البتہ ایک مرتبہ حضرت بنوریؒ نے حکومت کے خلاف کوئی بات کی، تو ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ نے ایک شخص کو خط دے کر حضرت بنوریؒ کے پاس بھیجا، وہ شخص جب حضرت بنوریؒ کے پاس آیا اور حضرت ڈاکٹر صاحب کا خط دیا تو حضرت نے وہ خط اپنے سر پر رکھا اور اسے چوم کر پڑھا، حضرت ڈاکٹر صاحب نے چونکہ خط کی بات اس شخص کو بھی بتائی تھی کہ اس میں کیا لکھا ہے، اسی لیے اسے معلوم تھا کہ اس میں لکھا تھا کہ: ''خدارا! آپ حکومت کے خلاف بیان نہ دیں، ورنہ آپ جیل میں ہوں گے اور مدرسہ تباہ ہوجائے گا۔'' یہ واقعہ مجھے خود اس شخص نے سنایا جو حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب کا خط لے کر آیا تھا، اسی مزاج پر مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ بھی تھے کہ وہ سیاست سے خود بھی دور رہتے تھے اور مدرسہ کو بھی دور رکھا تھا۔

حضرت مولانا نے اپنی حیات مستعار کو ہمیشہ اللہ کی رضا میں استعمال کیا تو اللہ رب العزت نے اپنی ملاقات کے وقت انہیں رتبہ شہادت سے سرفراز کیا اور تا ابد انہیں اپنے شیخ و مربی حضرت بنوریؒ کے پہلو میں آرام کرنے کی سعادت نصیب فرمائی:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مولانا مفتی عبدالسمیع شہیدؒ

مولانا مفتی عبدالسمیع شہید رحمہ اللہ

آبائی گاؤں پنو عاقل میں پیدا ہوئے، ان کے والد صاحب عالم باعمل تھے، ابتدائی تعلیم انہی سے حاصل کی، اس کے بعد سندھ کے مشہور مدارس دارالفیوض کندھ کوٹ، مدرسہ قاسم العلوم گھوٹکی کے استادوں سے ابتدائی درجات پڑھے، اس کے بعد جامعہ اشرفیہ میں مولانا موسیٰ خان روحانی بازیؒ (۱۹۹۸ء۔۱۴۱۹ھ) سے استفادہ کیا، وہاں سے کراچی آگئے اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں دورۂ حدیث حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ (۱۳۹۷ھ) سے پڑھا۔ دورہ سے فارغ ہوکر یہیں افتاء کیا، مفتی احمد الرحمٰنؒ (۱۴۱۱ھ) کو آپ کی استعداد کا اندازہ طالب علمی کے زمانے سے تھا، اس لیے ان کو جامعہ میں مدرس مقرر کردیا، موصوف جلد ہی ترقی کر کے حدیث شریف کی کتابیں پڑھانے لگے۔ مفتی احمد الرحمٰنؒ (۱۴۱۱ھ) نے جب سوادِ اعظم اہل سنت پاکستان قائم کی تو موصوف ان کے ہم راہ کام کرتے رہے۔ یہ جامعہ کے مقبول ترین اساتذہ میں سے تھے، جامعہ کے لیے ان کی عظیم خدمات ہیں۔

شہادت و تدفین: یکم رجب ۱۴۱۸ھ کو مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا، پنو عاقل میں اپنے والد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

ڈرائیور محمد طاہرؒ

ڈرائیور محمد طاہرؒ

محمد طاہرؒ عباس پور کے رہائشی تھے، نیک و صالح نوجوان تھے۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے اساتذہ کے ڈرائیور رہتے۔ مولانا ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار شہیدؒ اور مفتی عبد السمیع شہیدؒ کے ساتھ یکم رجب ۱۴۱۸ھ کو جامِ شہادت نوش کیا۔ نماز جنازہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں ادا کی گئی، نماز جنازہ کی ادائیگی کے بعد آبائی گاؤں عباس پور آزاد کشمیر میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد طاسینؒ کی خدمات

مولانا محمد طاسینؒ کی خدمات

مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی ☆

مولانا محمد طاسینؒ ہری پور ہزارہ کے پٹھان تھے۔ ابتدائی تعلیم ہزارہ و پنجاب میں پائی۔ پھر (۱۹۳۹۔۱۹۴۰) میں حسن پور ضلع مراد آباد میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰۔۱۳۶۲ھ/ ۱۸۶۳۔۱۹۴۳ء) کے خلیفہ مولانا ولی محمد کیمل پوری سے پڑھا، پھر جامعہ اسلامیہ عربیہ میں داخلہ لیا اور حضرت نانوتوی کے آخری شاگرد حافظ عبدالرحمٰن امروہی (۱) سے ۱۹۴۲ء میں دورہ کیا۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے کم وبیش ۱۷ سال میں علوم عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل ایسے ارباب کمال اور چوٹی کے استادوں سے کی جن میں سے بعض اپنی نظیر آپ تھے۔ مولانا محمد طاسینؒ مجھ سے کہتے تھے کہ ''میں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ (۱۲۹۶۔۱۳۷۷ھ/ ۱۸۷۹۔۱۹۵۷ء) کو حافظ عبدالرحمٰن امروہیؒ کے سامنے دو زانو بیٹھے خوب دیکھا ہے''۔

حضرت مدنیؒ اپنے بزرگوں ہی کا ادب نہیں بلکہ اپنے چھوٹوں کا بھی بہت پاس ولحاظ کرتے تھے۔ چنانچہ وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (۱۳۱۵،۱۴۰۳ھ/ ۱۸۹۷،۱۹۸۳ء) جو اُن کے استادزادے تھے اور عمر میں ان سے بہت چھوٹے تھے، کے پاس جاتے اور دوزانو بیٹھا کرتے تھے۔

مولانا طاسینؒ نے ہوش کا زمانہ یوپی میں گزارا تھا۔ انہوں نے وہاں عقلی و نقلی علوم پڑھے تھے، یوپی آداب معاشرت کو دیکھا اور اُسے اپنایا تھا، وہاں رہ کر انہیں زبان دانی آئی، وہ یوپی کے شرفا کی تہذیب کا نمونہ بن گئے۔ میں نے انہیں باہر ہمیشہ شیروانی پہنتے دیکھا۔ بہت حوصلہ مند، ہوش مند، نہایت ذہین، بااخلاق وشائستہ عالم (۲)، متواضع اور بے باک وحق گو تھے۔ حق گوئی کی وجہ سے وہ جو بات حق سمجھتے تھے اس کا برملا اظہار کرتے تھے اس لئے بعض آرا میں تفرد پایا جاتا ہے۔ استاد نے جب شاگردوں کے امتحان کے پرچے دیکھے تو ان کی صلاحیت کو بھانپ لیا۔ مجھ سے کہتے تھے کہ جب میں جامعہ اسلامیہ کو خیرباد کہنے لگا اور آخری سلام اور دید کے لئے حافظ عبدالرحمٰنؒ کی خدمت میں حاضر ہوا، جانے کے لئے اجازت چاہی تو مجھ

☆ نگران شعبہ تخصص فی الحدیث۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

سے فرمایا: ''کہیں جانے کی ضرورت نہیں، یہیں آنا اور پڑھنا ہے''۔

خوش قسمتی دیکھئے کہ ابھی فارغ ہوئے ہی تھے کہ جہاں پڑھا تھا وہاں پڑھانے کی سعادت کا پروانہ مل گیا۔ موصوف یہاں بڑی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔

مولانا طاسینؒ ہی کی حکیم سید ابوالنظر رضوی امروہیؒ سے بڑی گہری دوستی تھی، ان کا نام غالباً طفیل عبداللطیف تھا، خانوادۂ سادات امروہہ کے گوہر شب چراغ تھے۔ حسن مثنیٰ ندوی امروہی کے چھوٹے بھائی تھے، بہت سنجیدہ وشریف اور پکے لیگی تھے اور پاکستان کے بہی خواہ، اور اس کے محبوں سے محبت کرتے تھے۔ اس لئے اپنی جائیداد چھوڑ چھاڑ کر یہاں آگئے تھے۔ غالباً تین چار برس کے بعد یہیں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، ذہین و دانشور تھے، نت نئے موضوعات جیسے موسیقی اور روحانیت وغیرہ پر لکھتے تھے۔ ابوالنظر علم دوست، اہل علم کے قدردان ومہمان نواز وحسن سلوک وشرافت میں سلف کی یادگار تھے۔ اُن کے یہاں اہل علم کے ناشتے کا خرچ پانچ سو روپیہ ماہوار تھا۔ ''ماہنامہ برہان ندوۃ المصنفین'' دہلی میں اُن کا کلام و مقالے ۱۹۳۸ء سے چھپتے رہتے تھے، پاکستان آئے تھے، لیکن انقلاب نے سب ٹھاٹ ختم کر دیا تھا۔

مولانا طاسین نے ۱۹۴۶ تک جامعہ اسلامیہ امروہہ میں پڑھایا اور برابر ترقی کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بن گیا، وہ کراچی آگئے، برنس روڈ پر دہلی کے ایک معروف تاجر محمد اسماعیل جو بہت علم دوست تھے، اُن کا پختہ ارادہ تھا کہ یہاں پٹنہ کی طرح ایک کتب خانہ قائم کیا جائے اور اس میں اہل علم کے لیے قیام وطعام کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں، اُن کی علم دوستی ومعارف پروری کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۷ء ہی میں ایک فلیٹ میں قیام پذیر تھے اُس کے بالائی حصے میں اُن کی فیملی رہتی تھی اور اُس کے زیریں حصے میں انہوں نے لائبریری قائم کر دی تھی۔ اس چھوٹی عوامی لائبریری کے مولانا طاسینؒ پہلے لائبریرین وناظم تھے۔ کراچی میں پاکستان بننے کے بعد پہلی عوامی، تاریخی، اسلامی، عربی لائبریری غالباً ۱۹۴۷ء میں قائم کی گئی۔ کراچی میں انہوں نے پہلا پنسلوں کا کارخانہ اور فیکٹری قائم کی تھی، جو اب تک برابر کام کر رہی ہے۔ عوامی اسلامی کتب خانے کے لئے رقم مخصوص کی اور ٹرسٹ بنایا گیا اور وہ تاج رباط العلوم الاسلامیہ کے نام سے بہادر آباد میں خدمات سرانجام دے رہا ہے، اس کے پاس زمین بھی ہے لیکن افسوس کہ اس نے ایسی ترقی نہیں کی کہ بائی کتب خانہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

فلیٹ کے زیریں حصے میں ہفتہ وار علمی مجلس بھی جمتی رہتی تھی۔ مولانا طاسین اور ابوالنظر امروہی کو پہلی بار اُسی مجلس میں دیکھا تھا۔ میرے بڑے بھائی مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ (۱۳۳۳-۱۴۲۰ھ/۱۹۱۵-۱۹۹۹ء) اور میں اس مجلس میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔

چند ہفتے ہی بیتے تھے کہ وہ علم دوست و معارف پرور جس نے ایک عوامی اسلامی کتب خانے کی بنیاد رکھی تھی، کی اچانک طبیعت بگڑی اور جلد وہ اللہ کو پیارے ہوگئے اور اس ہفتہ وار مجلس کا تسلسل ٹوٹ گیا، اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند کرے۔ مولانا محمد طاسینؒ نے انہی دنوں میں ڈاکٹر عبدالمعید (۳) سے کتب خانے کے نظم و ترتیب کے رہنما اُصول سیکھے، معلومات فراہم کیں اور اس فن میں ایسی آگاہی حاصل کی کہ انہیں زندگی بھر پھر کسی تربیت کی احتیاج پیش نہیں آئی اور جب ۱۹۵۲ء میں مجلس علمی ڈابھیل سورت ہندوستان سے یہاں منتقل ہوئی تو مولانا محمد طاسینؒ اُس کے لائبریرین و مہتمم کے فرائض انجام دیتے رہے اور اس سے ان کا رشتہ تادمِ واپسیں برابر قائم رہا۔

لائبریرین کا کام حسن ترتیب و تقسیم علوم ہی نہیں بلکہ Subjects Back ground موضوعات کتب میں مہارت و معلومات اہم چیز ہے تاکہ اہل علم کی تشنگی دور ہوتی رہے۔

مولانا محمد طاسینؒ اس خوبی سے اس خدمت کو سرانجام دیتے رہے کہ کراچی یونیورسٹی کے اسکالر اور محققین بھی اس کتب خانے سے برابر فائدہ اٹھاتے رہے، ڈاکٹر محمد مظہر بقاء (۱۳۴۰ـ۱۴۲۶ھ/ ۱۹۲۲ـ۲۰۰۵ء) راقم سطور، مفتی ولی حسن ٹونکیؒ ۱۳۴۲ـ۱۴۱۶ھ/۱۹۲۳ـ۱۹۹۰ء) وغیرہ اور بہت سے اہل علم یہاں آتے اور اُن سے کتابیں مستعار لے جاتے تھے، کسی محقق کو کسی خاص کتاب کی زیادہ ضرورت ہوتی اور اس کتب خانے کی کتاب کسی اور اہل علم کے پاس عاریۃً گئی ہوتی، تو اُسے خط لکھتے اور فرماتے کہ آپ پھر اسے دوبارہ منگالیں، چنانچہ ایک بار موصوف نے مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کو حسب ذیل خط لکھا:

۱۴ اگست ۶۶ء محترم جناب مفتی ولی حسن صاحب

السلام علیکم مزاج شریف!

کتاب قواعد الاحکام کی اشد ضرورت ہے اس وقت آپ عنایت فرمادیں، ہفتے عشرے کے بعد پھر ضرورت ہوگی تو دوبارہ آپ کی خدمت میں پیش کردی جائے گی۔ نیز کتاب الاموال فارغ ہو تو وہ بھی واپس فرمادیں، ممنون ہوں گا۔

المخلص

محمد طاسین

مذکورہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کا خط بھی پاکیزہ تھا۔ ان کی تحریر بھی مختصر و جامع تھی۔ نیز اس مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجلس علمی کے کتب خانے استفادہ کرنے والوں کی ضروریات کا کیسا خیال رکھتے تھے۔ اس مکتوب میں مکتوب الیہ کی رعایت اور ضرورت مند کی احتیاج، دونوں باتوں کا کس خوش اسلوبی سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ ان کی فہم سلیم کی روشن دلیل ہے نیز لائبریرین کی ذمہ داری

مستعار لینے والوں اور استفادہ کرنے والوں کی رعایت کا آئینہ دار مجلس علمی کے کتب خانہ کی سروس اور خدمت کا شاہد ہے۔

کراچی میں ان کی تدریسی خدمات سے مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (۱۳۱۴،۱۳۹۶ھ/۱۸۹۶،۱۹۷۶ء) کا دارالعلوم اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن بھی فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔موصوف دارالعلوم میں ادارۃ القرآن کے بانی و داماد مفتی بر اعظم پاکستان مولانا نور احمد کی وساطت سے پڑھانے لگے تھے۔آپ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں درجہ تکمیل میں مقدمہ ابن خلدون پڑھاتے تھے۔ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مہتمم جامعہ ہذا مدظلہ ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔

ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد جب کراچی میں تھا وہاں بھی مولانا محمد طاسینؒ ریڈر کے خدمات انجام دیتے رہے۔اس کے علاوہ ان کے تحقیقی مقالات بھی نت نئے موضوعات پر مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔آپ ایم فل اور پی ایچ،ڈی کے مقالات کے ممتحن بھی رہے۔اپنے علمی مقالات سے ملک وقوم کی خدمت آخر دم تک کرتے رہے۔

مولانا محمد طاسینؒ کی قیام گاہ بعض ارباب سیاست کی پناہ گاہ بھی تھی انہوں نے خود مجھے بتایا تھا کہ حزب اختلاف کے قائد اور سرحد کے وزیر اعلیٰ مفتی محمودؒ (۱۳۳۷۔۱۴۰۳ھ/۱۹۱۹۔۱۹۸۲ء) سے میرے تعلقات دورِ طالبعلمی سے جب وہ مرادآباد میں پڑھتے تھے،قائم تھے۔چنانچہ کراچی میں ان کی قیام گاہ تھی،یہیں وہ رات گزارتے تھے اور مفتی محمود کے جاں نثار اُن کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔

حواشی

(۱) مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہیؒ (۱۲۷۷۔۱۳۶۷/۱۸۶۰۔۱۹۴۸) بمبئی میں پیدا ہوئے مکہ میں قرآن حفظ کیا،حضرت نانوتویؒ (۱۲۴۸۔۱۲۹۷/۱۸۳۲۔۱۸۸۰) کے نامور شاگرد مولانا احمد حسن امروہیؒ (۱۲۶۷۔۱۳۳۰ھ/۱۸۵۰۔۱۹۱۲) سے علوم کی تحصیل کی آخر میں دیوبند جاکر تفسیر و حدیث کے کچھ اسباق حضرت نانوتوی سے پڑھے۔علم تفسیر و کلام میں دستگاہ کامل حاصل کی پھر مدرسہ شاہی مرادآباد، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، جامعہ اسلامیہ امروہہ میں شیخ الحدیث والتفسیر تھے۔تفسیر بیضاوی،مطول و مختصر المعانی پر حواشی بھی اُن سے یادگار ہیں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۲۳۳۔۱۳۱۷/۱۸۱۸۔۱۸۹۹) کے مجاز و خلیفہ تھے اور لوگوں کو بیعت بھی کرتے تھے۔امروہہ میں اپنے استاد احمد حسن امروہیؒ کے پہلو میں مدفون ہیں (تاریخ دیوبند ج ص ۵۰ ج ۲) حافظ عبدالرحمٰن امروہیؒ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کے مہتمم و ناظم تھے اور امروہہ کی جامع مسجد میں امامت کرتے، جمعہ اور تراویح پڑھاتے اس کے ایک حجرے میں تنہا رہتے، اُن کے بال بچے باہر ایک مکان میں رہتے تھے،جس کا کرایہ ماہوار دو روپے دیتے تھے۔آخر عمر میں تراویح پڑھاتے ہوئے بیضاوی کی عبارت

کا خیال آ گیا، پھر تراوتح پڑھانا چھوڑ دی۔

(۲) مولانا انظر شاہ نے ۱۹۵۹ء میں پاکستان کا سفر کیا۔ اس سفر کی روداد لکھی، کراچی میں مجلس علمی میں مولانا طاسینؒ سے ملے، مولانا طاسین اور مجلس علمی کے متعلق موصوف لکھتے ہیں ”پہلے روز مولانا طاسین نے مجلس علمی میں دعوت دی اور حسن ذوق کا کامیاب مظاہرہ کیا۔ طاسین میاں یوں تو جوان ہیں لیکن مطالعے کا ذوق وشوق پختہ کاروں کا سا ہے۔ مجلس علمی میں چار چاند لگا دیئے اور اس کو ایک کامیاب لائبریری بنانے کی فکر روز وشب ان پر مسلط ہے خدا تعالیٰ ان کی کوششیں بارآور فرمائے۔

(ماہنامہ نقش دیوبند جلد ۲ شمارہ نمبر ۷ جولائی ۱۹۶۰)

(۳) ڈاکٹر عبدالمعید (۱۹۲۰ء۔۱۹۸۴ء) کراچی یونیورسٹی لائبریری کے پہلے لائبریرین، علم کتب خانے میں پہلے ڈاکٹر، ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کے پہلے ڈاکٹر، اور پاکستان علم کتب خانے میں پہلے پروفیسر تھے۔ ہر دو علوم، علم کتب خانہ اور کتب خانے کے عملی تجربے میں یہاں وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے ممتاز اور فائق ہی نہ تھے بلکہ تدریسی شعبے میں استاد الکل فی الکل کا درجہ رکھتے تھے۔ پاکستان میں بیشتر علم کتب خانے کے دانشور و اہل قلم ڈاکٹر زیرا و راست اُن کے شاگرد ہیں۔ ان کی انہی گوناگوں خوبیوں اور شاندار مخلصانہ خدمات، رہنمائی اور ہمت افزائی، افراد سازی نے دو گونہ خدمات کے دائرے کو ایشیا تک محدود نہیں رکھا بلکہ افریقہ و امریکا کی یونیورسٹیاں ان کے دریائے علم و دیرینہ تجربات سے برابر فیض پاتی رہیں۔ ان کی انہی دل ربا صفات نے پاکستان میں لائبریرین کے وقار کو روشناس و بلند تر کرانے اور افراد تیار کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ انہی وجوہ کے پیش نظر ان کے شاگردوں نے ۱۹۸۱ء میں ان کی روشن اور دور رس خدمات کے اعتراف میں مقالات کا ایک مجموعہ پیش کیا تھا جسے ڈاکٹر عبدالمعید اور پاکستان لائبریرین شپ کے عنوان سے لائبریری پروموشن بیورو کراچی نے ۱۹۸۱ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر عبدالمعید کی انتظامی امور میں مہارت، لمبے علمی تجربے نے اُن کے زمانے میں کراچی یونیورسٹی لائبریری کو علمی دنیا کے کتب خانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہ دور کراچی یونیورسٹی لائبریری کا سنہری دور تھا۔ ڈاکٹر عبدالمعیدؒ کے نائجیریا میں زاریا یونیورسٹی کا دورہ اور ریبرو یونیورسٹی میں تقرر کے بعد کراچی یونیورسٹی لائبریری کو آج تک کوئی ایسا جامع صفات ”ڈاکٹر“ لائبریرین نصیب نہ ہو سکا۔ لائبریری سائنس میں ایم، اے لائبریرین کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں ایسا دور انحطاط بھی ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

کراچی یونیورسٹی لائبریری میں Active اور غیر Active کتابوں کی تقسیم نے اسلامی تاریخ اور علوم کے قیمتی ذخیرے کو جو جرمن اور فرنچ زبان موجود تھا، او رجو محنت سے جمع کیا گیا تھا ایسے بیش قیمت ذخیرے کو کتب خانے کے ذخیرے سے نکالا گیا۔ اس سے اس شعبے کو غیر معمولی نقصان پہنچا۔ ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں اب صدر شعبہ کے منصب پر آج بھی کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبدالمعیدؒ کے زمانے میں اس شعبے میں دو نامور ڈاکٹر موجود تھے ایک خود ڈاکٹر عبدالمعید اور دوسرے ان کے نامور شاگرد ڈاکٹر خورشید، جن سے اس شعبے کو زینت وشہرت حاصل تھی۔

حیات و کردار

شہیدِ اسلام مولانا محمد یوسف لدھیانوی ؒ

(ماہنامہ بینات- شہید ؒ نمبر)

حیات و کردار

مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاؤن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب وہ ماموں کانجن میں قیام پذیر تھے اور رسالہ بینات کی ادارت کے سلسلہ میں کراچی آتے رہتے تھے، پھر گاہ بگاہ علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ یہاں مدیر بینات کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تھے۔ وہ رواں اور شستہ اردو لکھتے تھے، متعدد عربی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ جب میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں شعبہ تخصص فی الفقہ اور پھر شعبہ تخصص فی علم الحدیث میں تخصص کے طلبہ کے اشراف و نگرانی سے وابستہ ہوا تو دعا سلام اور مصافحہ و معانقہ بھی ہونے لگا۔ مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ محنتی اور ذہین تھے، پڑھا بھی محنت سے تھا اور کام بھی لگن سے کرتے تھے، ہنس مکھ، ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی صحبت اور سرپرستی سے انہیں فائدہ پہنچا، اور انہوں نے بھی موصوف سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا بڑے بننے کا گر ہی یہ ہے کہ آدمی کسی بڑے کی سرپرستی میں رہے اور اس کی رہنمائی میں کام کرتا رہے۔ ایک دن وہ خود بھی بڑا بن کر ہی رہے گا۔ اور یہی کچھ مولانا کے ساتھ ہوا، انہیں جب یہاں کام کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو ان کی صلاحیت و استعداد کے جوہر کھلتے گئے۔ مولانا لدھیانویؒ کی سرشت میں فطرت سے دو باتیں ودیعت کی گئی تھیں، ان میں ایک طلب اور دوسری تڑپ تھی، وہ جو کام کرتے دل کی لگن

اور دین کی تڑپ اور اخلاص سے کرتے تھے، جس نے انہیں کندن بنادیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اعتدال و توازن کی نعمت سے سرفراز کیا تھا اور اس نے انہیں ہر طبقہ میں مقبول و محترم بنادیا تھا۔ موصوف نے تصوف کی وادی میں قدم رکھا تو ڈاکٹر عبدالحی عارفیؒ اور امام طریقیت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، دونوں سے خلافت ملی، اس سے ان کی زندگی میں تنوع آیا اور اب وہ ایک مرشد کی حیثیت سے مشہور و معروف اور مقبول و ہر دلعزیز ہوگئے۔ مولانا لدھیانویؒ نے جب سے اخبار جنگ میں "آپ کے مسائل اور ان کا حل" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تو انہیں مفتی کے لقب سے یاد کیا جانے لگا اور ان کی شہرت براعظم ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئی، اسی طرح انہیں پاکستان میں عوام و علماء کے طبقہ میں بھی خوب خوب شہرت ملی۔ مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ نماز بہت ہی اچھی اور عمدہ پڑھتے تھے، ان کی نماز کی کیفیت دیدنی ہوتی۔ وقت کا زیاں ان کے یہاں تھا ہی نہیں۔ وہ ہر وقت کام میں لگے رہتے تھے۔ لکھتے، پڑھتے، پڑھاتے یا مقالے اور کتابیں لکھتے رہے یا پھر ترجمہ کرتے، لوگوں کو ہدایت کرتے، ان کی رہنمائی اور اصلاح کرتے یا پھر یاد الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کا قلم دین کی سربلندی، خلق خدا کی اصلاح اور فتنوں، قادیانیت، شیعیت، اور بدعت وغیرہ کی بیخ کنی اور تردید میں تادم واپسیں سرگرم عمل رہا، ان کی تالیفات میں گوناگوں موضوعات کا تنوع اس امر کی نہایت روشن دلیل ہے، ان کی تالیفات میں "شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم" بہت عمدہ تصنیف اور قابل قدر کارنامہ ہے۔ موصوف نے جب مجھے یہ کتاب بھیجی اس پر مندرجہ ذیل دعائیہ کلمات تحریر فرمائے تھے:

"ہدیہ بخدمت عالی جناب ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، زیدت معالیھم۔

از مولف

محمد یوسف عفا اللہ عنہ

(۳، ۲، ۱۴۱۴ھ)

یہ اپنے موضوع پر ایسی شاہکار تصنیف ہے جس کا اسلامی اردو ادب میں جواب نہیں، اس کی عظمت کا اندازہ میرے بڑے بھائی اور وقت کے نامور محقق مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے سے کیا جاسکتا ہے، کہ یہ کتاب جب مجھے اور انہیں ملی اور مولانا نعمانیؒ نے

اسے پڑھا اور ان سے میری اس کتاب کے متعلق گفتگو ہوئی تو فرمایا:

"شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے بعد سے اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی"۔

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ ایسے خوش نصیب علماً وصوفیہ میں سے ہیں کہ:

۱:..... جن سے جید علماً نے کسب فیض کیا۔

۲:..... عوام نے بھی فائدہ اٹھایا،

۳:..... منتہی طلبہ نے بھی پڑھا۔

۴:..... بہت سی کتابیں یادگار چھوڑیں۔

۵:..... نیک اولاد چھوڑی۔

۶:..... بہت بڑی تعداد میں مرید چھوڑے۔

۷:..... سلسلہ طریقیت میں خلفاً کی کثیر تعداد موجود ہے۔ جن سے عوام وخواص کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رہے گی۔

۸:..... مجلس ختم نبوت کی آبیاری کی، یہ سب ان کے عظیم کارنامے ہیں۔

۹:..... یہی نہیں وہ اپنا نام شہیدوں کی فہرست میں رقم کراگئے۔

۱۰:..... خلق خدا میں ان کے مقبول اور خدا رسیدہ بزرگ ہونے کی شہادت ان کی نماز جنازہ میں عوام وخواص کا وہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا جو شاذ ونادر ہی کہیں نظر آتا ہے، مولانا کی شہادت پر رہ رہ کر ذہن میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں کا وہ شعر، جو حضرت مرزا صاحبؒ کی لوح مزار پر کندہ ہے، ابھرتا ہے اور مولانا لدھیانویؒ کے مزار پر صادق آتا ہے، اور وہ خوب ہے:

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ این مقتول راجز بے گناہی نیست تقصیرے

جامعۃ العلوم الاسلامیہ

اور

مفتی شامزئیؒ

جامعۃ العلوم الاسلامیہ اور مفتی شامزیؒ

مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی صاحب نگران شعبہ تخصص فی الحدیث بنوری ٹاؤن

ولادت ۱۹۵۲ء .... وفات ۲۰۰۴ء

حضرت مولانا مفتی نظام الدین شامزیؒ میرے ہم سبق مولانا فیض علی شاہؒ المتوفی ۱۴۲۳ھ کے شاگرد تھے، میں ۱۴۰۸ھ میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں تخصص فقہ اسلامی کے طلبہ کے تحقیقی مقالات کی نگرانی پر مامور تھا، مولانا سلیم اللہ خان مدیر جامعہ فاروقیہ نے مجھے جامعہ فاروقیہ کا کتب خانہ دکھانے اور اس کے متعلق مشورہ کے لئے بلایا اس موقعہ پر مدیر جامعہ فاروقیہ نے مولانا شامزیؒ کا تعارف کرایا تھا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی، اس وقت شامزیؒ نے مجاہدوں کی طرح سیاہ پگڑی باندھی ہوئی تھی، جسم چھریرا تھا، میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں سال بھر رہا۔ یہ ایسا زمانہ تھا جس میں الائنس موٹرز کا بھٹا بیٹھا، رقم اس میں پھنس گئی تھی اور میرا کنبہ 14 افراد پر مشتمل تھا، گھر کا خرچ اندوختہ پر چل رہا تھا میں (Home deportmint) یہاں زیادہ عرصہ تک ٹک نہ سکا اور مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ نے میری جگہ مولانا شامزیؒ کا تقرر کیا پھر جب کبھی بڑے بھائی مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ کی خدمت میں حاضر ہوتا مفتی صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، یہ جگہ انہیں خوب راس آئی، یہاں آزادی کی فضا میں رہنا سہنا نصیب ہوا، یہاں کی بساط علم سمٹنے لگی، پہلے مولانا مفتی احمد الرحمٰنؒ سدھارے، پھر مولانا مفتی ولی حسن خان ٹونکیؒ فالج میں معذور ہو کر رہ گئے اور زندگی کے رہے سہے دن کاٹے اور وفات پا گئے، آخر میں مولانا حبیب اللہ مختار کی شہادت ہوئی۔ [1] مولانا حبیب اللہ مختار کی شہادت کے بعد اب کوئی ایسی صفات سے بھی آراستہ نہ تھا جن کے مفتی صاحب جامع تھے، اللہ نے انہیں کام کا موقع دیا۔

(۱) مولانا حبیب اللہ کی شہادت کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی قائدانہ حیثیت ختم ہوگئی، نظام تعلیم بڑی طرح متاثر ہوا، تصانیف کا سلسلہ یکسر منقطع ہو گیا، مولانا حبیب اللہ مختارؒ بہت کامیاب منتظم، نہایت مردم شناس اور سیاسی ہنگامہ آرائی سے دور اور جامعہ کو بھی اس سے دور رکھنا چاہتے تھے، طلباء کو زیادہ چھٹیاں دینے کے بھی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا نعمانی نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں ستائیس برس پڑھانے کے بعد ۱۴۱۱ھ میں تخصص علوم حدیث کے شعبہ سے سبکدوشی اختیار کی تو مجھے ۱۴۱۲ میں اس شعبہ کی نگرانی کے لئے طلب کیا گیا پھر مفتی صاحب سے روز ہی علیک سلیک ہوتی رہتی تھی۔ مجلس تعلیمی اور مجلس شوریٰ میں اٹھنا بیٹھنا ہوا اور مفتی صاحب کی خوبیوں کا اندازہ ہوا، وہ معاملہ فہم اور ذہین آدمی تھے اور انتظامی مسائل کو سلجھانے کا سلیقہ تھا۔

مولانا شامزیؒ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا ایک مدرس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جو بات کہنا چاہتا ہے اس کا اسلوب بیان ایسا ہو کہ طلبہ کے دل میں اتر جائے ، یہ بات انہیں حاصل تھی اس لئے اس میں کامیاب رہے، شعروسخن کا بھی ذوق اچھا تھا، اردو کے شعرانہیں بہت یاد تھے۔ ہمارے یہاں جامعات میں اردو لکھنے کا رواج نہیں اس لئے طلبہ کو اردو لکھنا نہیں آتی......علماء، طلباء کیلئے درسی کتابوں کی شرح اور خلاصہ لکھتے رہتے ہیں جن میں کوئی علمی وتحقیقی بات نہیں ہوتی۔ اس لیے اس طبقہ میں ارباب قلم کم ہی نکلتے ہیں۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے شیوخ امام بخاری پر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لی، مقالہ اردو میں زیور طبع سے آراستہ ہے، ہر شخص پڑھ کر فائدہ اٹھا سکتا ہے اوران کے فضل وکمال کا اندازہ کرسکتا ہے، انہوں نے تصوف میں قدم رکھا تو مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے اجلّہ خلفاء میں مقام پایا، مفتی صاحب نے کڑے دن بھی گزارے، اور ٹھاٹھ بھی خوب کئے، سفر بھی بہت کئے، ان کے تعلقات کسی ایک دائرہ میں محدود نہ تھے، جہاد افغانستان میں انہوں نے جان کھپائی لیکن وہاں شہادت مقدر نہ تھی، شاہراہ قراقرم کو پتھر کی سلوں سے بند کر دیا گیا، اسے کھلوایا اور حکومت کی مدد کی، تصادم سے بچایا، میرا ماتھا اسی [illegible] کہ اب حکومت کو ان کی بصیرت وقوم میں ان کی عزت ورسائی کا اندازہ ہو گیا

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ) قائل نہیں تھے عربی اردو دونوں زبانوں پر انہیں یکساں عبور حاصل تھا ہر چیز پر ان کی نظر رہتی تھی، وہ دفتری کام بھی کرتے اور گفتگو بھی کرتے رہتے تھے، میں نے ایسا دفتر کی نشست میں پابند کسی کو نہیں دیکھا، ہر چھوٹے بڑے کے مرتبہ ومقام کا لحاظ رکھتے تھے، ریاضت ومجاہدہ بھی خوب کیا تھا، تصوف میں انہیں اونچا مقام حاصل تھا، کتابوں کے ترجمے بھی بہت کئے، تحقیقی کام بھی کیا کشف النقاب جیسی تحقیقی کتاب تدریس ہی کے زمانے میں لکھی گئی ہے، طلبہ کی تربیت کا بھی اچھا ڈھنگ آتا تھا انہوں نے جن لوگوں کا انتخاب کیا، جامعہ کو انہی نے سنبھالا ہوا ہے)

اللہ ہی خیر کرے، صحافی برادری ہو یا حکومت کے نمائندے سب سے ان کی یاد اللہ اچھی تھی، سب قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور عزت کرتے تھے۔

لطف یہ ہے کہ مفتی صاحب اختلافی مسئلہ میں دونوں فریق پر تقریظ لکھ جاتے تھے۔ ان کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ہر کتاب پر تقریظ لکھتے اور کسی کا دل میلا نہ کرتے چاہے تقریظ میں کوئی نئی بات نہ ہو، یہاں تک ہوا کہ مفاد پرست تاجروں نے ہر کتاب پر یہ لکھنا شروع کر دیا تھا "پسند فرمودۂ مفتی شامزی"۔ مفتی صاحب طلبہ پر اتنے مہربان تھے کہ کبھی کبھی بغیر پڑھے دستخط کر گزرتے تھے اس لئے ایک مرتبہ مماتی فرقہ کی حمایت میں بدنام ہو گئے تھے اور برأت کرنی پڑ گئی تھی، مفتی صاحب اپنے شاگردوں پر بہت مہربان تھے ایک فرشتہ خصلت انسان تھے۔ مفتی صاحب کے گوناگوں کام تھے، انکی ذمہ داریاں گوناگوں تھیں۔ ۱۔اداروں کی سرپرستی۔ ۲۔ دوستوں کی دلداری۔ ۳۔کمیٹیوں میں شرکت۔ ۴۔تاجروں سے دوستی۔ ۵۔فتوے پوچھنے والوں کی رہنمائی۔ ۶۔اپنے اور غیروں کے نجی امور میں صلاح ومشورے۔ ۷۔موبائلوں کی گھنٹی۔ ۸۔مریدوں کی اصلاح وتربیت۔ ۹۔سیاسی امور میں شرکت وانہماک۔ ۱۰۔مدرسوں اور مسجدوں کا افتتاح ۔ ۱۱۔اخباری نمائندوں کو انٹرویو۔ ۱۲۔عصر کے بعد بھی طلبہ کو کتابیں پڑھانا۔ ۱۳۔جامعہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا۔ ۱۴۔شب بیداری۔ ۱۵۔معمولات کی پابندی۔

یک انار وصد بیمار

ہر ایک کی سنتے کسی کا دل نہیں توڑتے تھے۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی قبولیت وشہرت نے انہیں قابل رشک شخصیت بنا دیا تھا، چنانچہ بڑے بڑوں کو انہیں اپنے یہاں بلانے کی طرف مائل کر رکھا تھا، مروت ایسی غالب تھی کہ طبیعت انکار پر آمادہ نہیں ہوتی جہاں سے آئے تھے، وہاں جانے کا وعدہ کر بیٹھے، مخلصوں کو بعد میں بتایا، انہوں نے کہا یہ غلطی نہ کریں، نہ یہاں کے رہیں گے نہ وہاں کے، بولے میں وعدہ کر چکا ہوں، انہوں نے ایسا راستہ نکالا کہ مفتی صاحب کو مفت میں چھٹکارا مل گیا۔ دل میں اللہ نے وسعت رکھی تھی کہ اس میں دوست دشمن سب سما جاتے تھے، مجھے

معلوم تھا کہ جو لوگ آج ان کی چھتری کے نیچے جمع ہیں کل انہی کی زبانیں کھلیں گی، یہی ہوا ان کی شہادت کے بعد کانوں نے جو سنا وہ لب پہ آ سکتا نہیں، وہ جب کبھی تخصص کے طلبہ کا زبانی امتحان لینے اور ساتھ بیٹھنے کا اتفاق ہوتا میرا ایسا احترام کرتے جیسا اپنے استادوں کا کرتے تھے۔ زندگی ان کی بہت سادہ تھی اللہ تعالیٰ نے انہیں دینی اور دنیوی ایسی ترقی عطا فرمائی تھی کہ ان کے ہمعصر بڑے بڑے اساتذہ کو بھی نصیب نہیں، ناموری وشہرت، ہر دلعزیزی ان کے قدم چومتی تھی، جامعہ سے جب نکلتے طلبہ ان کے جلو میں چلتے تھے، قدرت نے قد وقامت، ظاہری حسن و جمال، معنوی فضل وکمال اور کشش وگرویدگی کی صفات سے آراستہ کیا تھا لیکن مجھ سے کہتے تھے گھنٹے جواب دے رہے ہیں، پھر بھی بیٹھ کے پڑھاتے تھے۔ مفتی صاحب دنیا خورد عقبیٰ بُرد میں تھے۔ انسان کی کامیابی کا راز اس وقت کھلتا ہے جب دنیا سے ایمان سلامتی کے ساتھ لیجاتا ہے، حدیث میں آتا ہے خاتمہ کا اعتبار ہے، ان کا خاتمہ شہادت کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے، جو بھی ترقی کے مراتب ومنازل باقی تھے، مفتی صاحبؒ نے سیکنڈوں میں طے کر لیے، گھر سے غسل کر کے حدیث پڑھانے نکلے تھے صحیح بخاری کی حدیث "انما الا عمال بخواتیمھا" کی سند کے ساتھ جام شہادت نوش کیا، مفتی صاحب کا جرم شہادت حق گوئی وبیباکی تھا۔ اقبال نے سچ کہا ہے۔

آئین جواں مرداں حق گوئی وبیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

لطف یہ ہے کہ جنہوں نے انہیں اس مقام تک پہنچایا اب وہی اس جگہ کو گنج شہیداں کہتے ہیں۔
گنج شہیداں میں "مرشد ومرید" کے لوح مزار پر مرزا مظہر جان جاناں کا حسب ذیل شعر کندہ کرانا چاہیے۔

بلوح تربت ما یافتند از غیب تحریرے کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے۔

ہم تو اب یہ کہتے ہیں

رفتید ولے نہ از دل ما

مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ

(ماہنامہ بینات۔شہید ختم نبوت نمبر)

خیر کا سرچشمہ

ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی مدظلہ
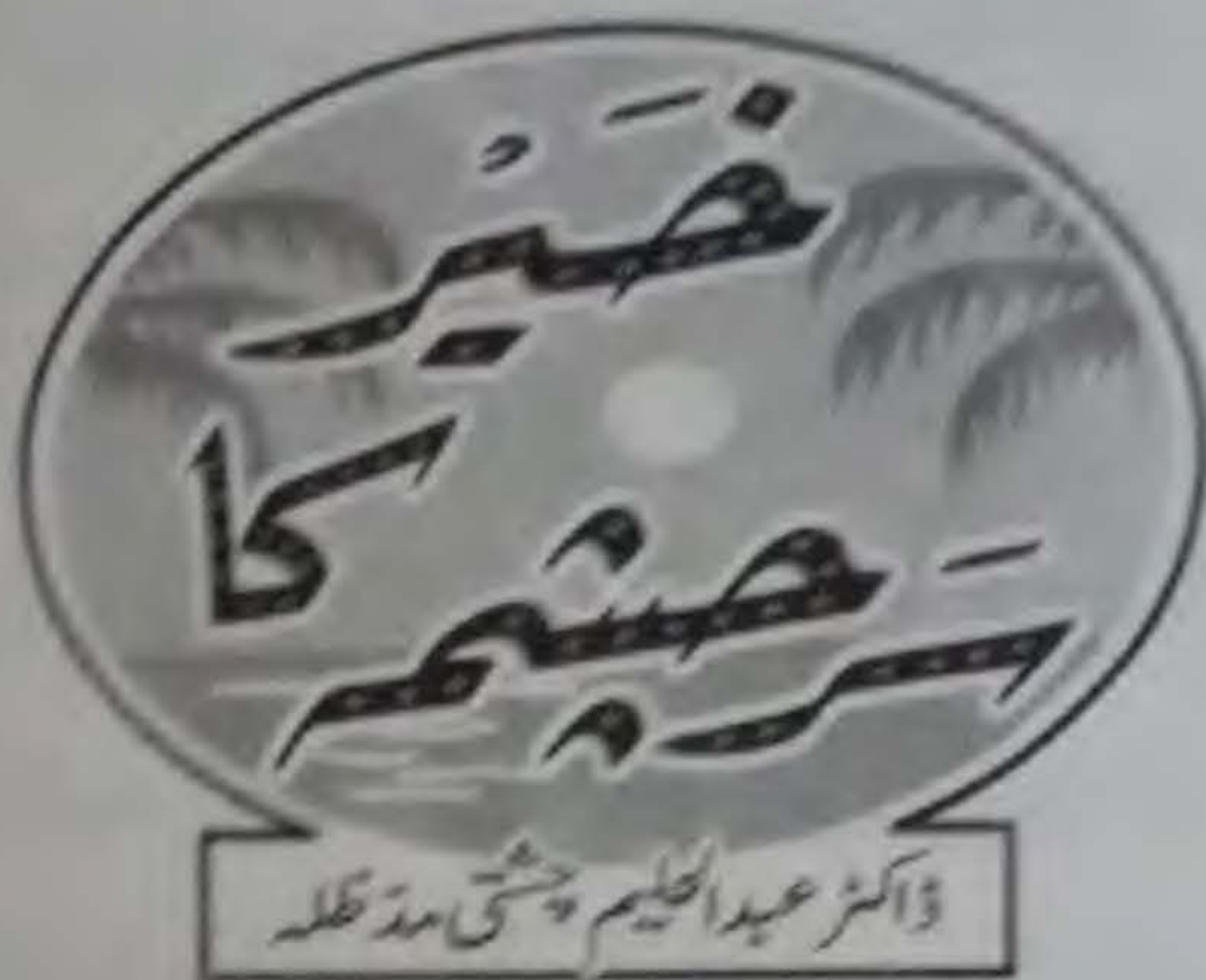
"جامعۃ العلوم الاسلامیہ" علامہ بنوری ٹاؤن، ایک نہایت محدود ایریا میں واقع ہے، لیکن اس کا نام اور گوناگوں مذہبی، ملی، تحقیقی، علمی اور ثقافتی خدمات وسرگرمیوں کا دائرہ کسی دینی ادارے اور یونیورسٹی سے کم نہیں۔ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ کا انفرادی کام، ہر مذکورہ بالا شعبہ ہائے زندگی میں پاکستان اور بیرون پاکستان کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بعض کام پاکستان میں ایسے انجام دیئے گئے ہیں جس کی نظیر مشکل ہی سے ہی کہیں ملے گی۔

یہ بات میں نے ایسے ہی نہیں لکھی، اس جامعہ کی ماضی کی داستان کا ذکر ہی کیا ہے۔ حال ہی کا تازہ واقعہ اس امر کی نہایت روشن دلیل ہے کہ تلمیذ وخادم خاص شیخ الہند مولانا عزیز گل کاکاخیل کے بھائی مولانا نافع گل "دارالعلوم دیوبند" میں مسامرۂ ابن ہمام، تقریر دلپذیر حضرت نانوتوی اور حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ جیسی اہم علمی کتابیں پڑھانے والے بزرگ تھے، ان کے فرزند عبداللہ جو جامعہ ہذا و جامعہ مدینہ منورہ کے فاضل تھے، جنہوں نے قرآن یاد کرنے کے بعد کبھی دیکھ کر تلاوت نہیں کی تھی، ان کے بیٹے "عدنان" نے جو اس سال جامعہ میں دورہ کررہے ہیں، انہوں نے سیمینار منعقدہ اسلام آباد ۸، ۹، ۱۰ ؍ اپریل ۲۰۰۵ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی نمائندگی کی، کنونشن سنٹر میں منعقدہ اس سیمینار میں جہاں پاکستان کے دانشوروں کا کریم طبقہ موجود تھا اور جناب صدر پاکستان جلوہ افروز تھے، طالب علم موصوف کو "ملکی سالمیت اور...... مواقع اور چیلنجز" کے عنوان پر بولنے کے لیے چھ منٹ دیئے گئے، اس نے فی الفور جیسی مدلل ومسکت اور شگفتہ تقریر کی اور اسے ملک کے دانشوروں میں جیسی پذیرائی ملی اور داد وتحسین حاضرین جلسہ نے پیش کی وہ ٹیلی ویژن پر پاکستان میں ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر میں ہر جگہ دیکھی اور سنی گئی۔ اس کے جواب میں جناب صدر کو پچاس منٹ

بولنا پڑا۔ وہ میرے مذکورہ بالا دعوے کی نہایت روشن دلیل ہے۔ اس موقع پر طالب علم عدنان کو بزبان حال مخفی کا یہ شعر پڑھتے ہوئے اُٹھنا پڑا:

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

اس پر تبصرہ پاکستان کے روزناموں میں خوب کیا گیا، ناظرین کو بھی ان کے پڑھنے سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس محدود ایریا میں آباد ''جامعہ'' سے کیسے کیسے ہونہار نکلتے رہے ہیں، جن کی خدمات اور خونچکاں داستان پڑھنے کے لائق ہے۔ ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' ایک ایسا جامعہ اور تعلیمی ادارہ ہے جس کے اساتذہ کی فہرست میں نامور اساتذہ اور علماء تدریسی و تصنیفی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں کے بعض اساتذہ نے انفرادی حیثیت میں اتنا علمی کام کیا ہے جو ایک ادارہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ اور مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ کی تصنیفات کی عالم میں دھوم ہے، مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کی تصانیف کا دائرہ بہت وسیع ہے، ڈاکٹر حبیب اللہ مختار رحمہ اللہ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد بھی خاصی ہے، ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب کے عربی تراجم کا سلسلہ جاری ہے اور مولانا محمد انور بدخشانی کی نصابی کتابوں کی عربی تسہیل کا جو ترقی پذیر سلسلہ ہے، وہ برابر جاری ہے۔

اس جامعہ کے علماء کی قربانیاں بھی بہت زبردست ہیں، اس لیے شہادت بھی ان کا مقدر بنی۔ چنانچہ ڈاکٹر حبیب اللہ مختار، مفتی عبدالسمیع، مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مفتی نظام الدین شامزئی اور مولانا مفتی محمد جمیل خان رحمہم اللہ...... اتنے بڑے بڑے اہل علم کو شہادت نصیب ہوئی۔

مفتی محمد جمیل خان میرے سامنے طالب علم رہے ہیں، مفتی ولی حسن خان ٹونکی رحمہ اللہ، جو ان کے اُستاد تھے، ان سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ میرا ان سے ربط وضبط زیادہ نہیں تھا، بس سلام دعا کی حد تک تعلق تھا۔ انہوں نے کبھی کوئی کتاب مانگی، میرے ذاتی کتب خانے میں ہوئی تو پیش کر دی، انہوں نے اس کا فوٹو کروا کر جلد بندھوا کر واپس کی، یہ ان کی طبعی شرافت اور علم دوستی کی دلیل تھی۔ حضرت نفیس شاہ صاحب کو جب کبھی کھانے پر مدعو کیا، میں ان کی خدمت میں حاضر رہا تو وہ مجھے اپنے ساتھ ان کے یہاں لے گئے، وہاں ان کا برتاؤ دیکھنے میں آیا اور ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ یا کبھی اقرأ روضۃ الاطفال کے طلباء کے ختم قرآن کی تقریب میں حضرت نفیس شاہ صاحب دامت برکاتہم کے ہمراہ جانا ہوا تو اقرأ روضۃ الاطفال کی ترقی کا اندازہ ہوا اور اس کی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا اور طلباء کی علمی ترقی سے جی خوش ہوا۔

مفتی محمد جمیل خان کے نام اور کام نے ان کی زندگی اور موت سب کو قابل رشک بنایا ہے، ذرا نظر کو بلند کیجیے، انہوں نے قرآن اور تعلیمات قرآن کو عام کرنے کے لیے ''اقرأ روضۃ الاطفال'' کے نام سے

کراچی میں مدارس کا آغاز ۱۹۸۴ء میں کیا اور یہ سلسلہ اتنی سرعت کے ساتھ پھیلا اور اللہ نے اس میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ پاکستان کے ہر بڑے شہر میں جگہ جگہ ''اقرأ روضۃ الاطفال'' کے بورڈ نظر آتے ہیں اور ہزاروں، لاکھوں بچے بچیاں قرآن پڑھتے اور حافظ بنتے ہیں، پھر شعبہ حفظ کے بعد سیکنڈری تک سلسلۂ تعلیم کو پھیلا دیا اور وہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ گلگت تک ''اقرأ روضۃ الاطفال'' کی بنیاد رکھی، تا آنکہ انہیں شہادت نصیب ہوئی۔ حدیث میں آتا ہے:

''خیرکم من تعلم القرآن و علمه''

ترجمہ: ''تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور سکھایا''۔

مفتی محمد جمیل خان کو اللہ نے اس خیر کا سرچشمہ بنایا اور انہیں اس خدمت اور کام کا ایسا سلیقہ عطا فرمایا کہ ہر محلّہ اور بستی اس سرچشمے سے سیراب ہو رہی ہے۔ مفتی محمد جمیل خان اپنے اساتذہ اور اکابرین کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ دامے، درمے، سخنے ہر طرح ہمہ وقت اس کے لیے حاضر رہتے تھے، اس خدمت میں بھی وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ رمضان المبارک حرمین شریفین میں گزارتے خدمت اور عبادت دونوں کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے اور بزرگوں کی دعائیں لیتے، وہ جو کام بھی کرتے، بڑی لگن اور دل سوزی سے کرتے تھے، وہ نہایت حاضر جواب تھے، باتوں باتوں میں دل موہ لیتے تھے۔

مفتی محمد جمیل خان، مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ان کے مرشد مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ انہی کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ جب کبھی نماز کا وقت ہو جاتا تو انہی کو امام بناتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی بعض دینی خدمات یہ ہیں:

- ☆ ختم نبوت میں بھی مفتی محمد جمیل خان شہید رحمہ اللہ کی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔
- ☆ انہوں نے ''اقرأ ڈائجسٹ'' کی بنیاد رکھی۔
- ☆ روزنامہ ''جنگ'' میں ''اقرأ'' کے صفحے کی بنیاد بھی انہوں نے رکھی اور شہادت تک وہی اس کے سرپرست تھے۔
- ☆ جہادِ افغانستان میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔
- ☆ وہ کتابیں خرید کر مدارس میں اور اکابر کے یہاں پہنچاتے۔

اپنے اکابر اساتذہ کی خدمت اور دینی کاموں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے ان کی قدر و منزلت دل و دماغ میں سمائی ہوئی ہے۔ ان کی دماغی نشو و نما میں چونکہ ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' کی تعلیم و تربیت کی گہری چھاپ تھی، اس لیے جامعہ کا ذکر پہلے آیا ہے، پھر ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا سعید احمد مردانوی شہیدؒ

(ماہنامہ بینات کراچی-شہید ناموسِ رسالت نمبر)

مولانا سعید احمد صاحب شہید رحمہ اللہ

مولانا سعید احمد صاحب ۱۹۶۶ء-۱۳۸۶ھ کو اپنے آبائی گاؤں خورہ بانڈہ مردان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور حفظِ قرآن مردان میں مکمل کرنے کے بعد ۱۴۰۲ھ کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا، اور ۱۴۱۱ھ کو سندِ فراغت حاصل کی۔

تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد ایک سال تدریس کی، پھر تخصص فی الفقہ کیا، مدرسہ امینہ للبنات میں تین سال ناظمِ تعلیمات رہے، اس کے بعد اپنے گاؤں میں مدرسہ مظاہر العلوم چلے گئے، لیکن شامزی صاحبؒ (۱۴۲۵ھ) کی خواہش پر دوبارہ کراچی آ گئے، اور جامعہ کی شاخ مدرسہ عربیہ اسلامیہ ملیر میں مدرّس مقرّر ہوئے، اور دس سال تک پڑھایا۔

شہادت:... ۷ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ کو جامِ شہادت نوش فرمایا، نمازِ جنازہ ملیر شاخ میں ادا کی گئی اور تدفین آبائی گاؤں خورہ بانڈہ، مردان میں ہوئی۔

مولانا انعام اللہ شہیدؒ

(ماہنامہ بینات کراچی - شہید ناموسِ رسالت نمبر)

مولانا اِنعام اللہ صاحب شہید رحمہ اللہ

مولانا اِنعام اللہ ۱۹۷۷ء مطابق ۱۳۹۷ھ کو پیدا ہوئے، موصوف قاری مفتاح اللہ صاحب مدظلہ کے بھانجے تھے۔

موصوف نے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز جامعۃ العلوم الاسلامیہ کی شاخ ''تعلیم الاسلام گلشن عمر'' سے کیا اور خامسہ تک کے درجات مکمل کئے۔

اس کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن منتقل ہوگئے اور ۱۹۹۸ء مطابق ۱۴۱۹ھ کو سند فراغت حاصل کی۔

تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد تعلیم الاسلام گلشن عمر میں تدریس کا آغاز کیا اور خامسہ تک کتابیں پڑھاتے رہے، انتہائی محنتی اُستاذ تھے۔

شہادت:... ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء کو جام شہادت نوش کیا۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی مدظلہم

رئیس قسم التخصص فی الحدیث، جامعہ بنوری ٹاؤن، کراچی

میں نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ میں دو ہی استاذ ایسے دیکھے جو فجر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ کر رات کے بارہ بجے تک برابر اپنے کام میں مصروف رہتے تھے، ان میں ایک مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہیدؒ اور دوسرے مولانا محمد امین اورکزئی صاحب شہیدؒ تھے۔ یہی دو لوگ برابر سرگرم عمل رہتے تھے۔ مولانا حبیب اللہ صاحب کے پاس تو لوگ آتے رہتے تھے، وہ باتیں بھی کرتے رہتے اور اپنا کام بھی کرتے رہتے تھے۔ مولانا امین صاحبؒ کا حلقہ بہت محدود تھا، ان کے پاس شاذ و نادر ہی کوئی آتا تھا، وہ اپنا کام تندہی سے برابر کرتے رہتے تھے، جو اوقات گھنٹے پڑھانے کے ہوتے تھے ان میں چلے جاتے تھے، پڑھا کے اپنی جگہ آتے اور اپنا کام مسلسل کرتے رہتے تھے، ان کے کام بڑے لمبے ہوتے تھے، اس لئے ان کا سلسلہ برابر قائم رہا، چنانچہ وہ اپنا کام زندگی بھر کرتے رہے، کام پورا نہیں ہوا زندگی پوری ہوگئی، اس لئے ان کی زندگی ہمہ وقت علم کی خدمت میں لگی رہی، ایسی محنت کرنے والے کم ہی زندگی میں اپنا کام پورا کر سکتے ہیں، یوں ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد اور علمی کام میں بسر ہوتی گئی، کام پھر بھی پورا نہیں ہوا۔

پہلی کتاب ”مسانید ابی حنیفہ ومرویاتہ من المرفوعات والآثار“ ان کے فضل و کمال کی شہادت اور ان کی یادگار ہے۔ یہ مولانا کے تخصص فی الحدیث کا مقالہ تھا جو عربی زبان میں حضرت مولانا ادریس میرٹھیؒ کی نگرانی میں لکھا۔

مولانا نے ”نثر الازہار“ کے نام سے طحاوی کی مبسوط شرح لکھنی شروع کی مگر اختتام کو نہیں پہنچی، یہ شرح مولانا محمد امینؒ کے کام اور اعلیٰ پایے کی عمدہ تحقیق کا مظہر ہے۔ ہمارے مشائخ خصوصاً حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہ ایک عرصہ سے طحاوی پر ایک خاص طرز سے کام کے خواہش مند تھے۔ خود تو انتہائی مصروف زندگی تھی، انہیں کسی گوہر نایاب کی تلاش تھی جو ان کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکے، اس کے لئے ان کی جوہر شناس نگاہ نے مولانا محمد امین

صاحب کا انتخاب کیا۔

امام طحاوی صحاح ستہ کے مصنفین میں سے نسائی کے ہم عصر ہیں، لیکن حدیث میں ان کی دواہم خصوصیات ہیں:

[۱] ان کے پاس ایسی احادیث کے متون اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہیں جن سے مجتہدین استدلال کرتے ہیں۔

[۲] اسانید بھی ان کے پاس سب سے زیادہ ہیں، یہ خصوصیت صحاح ستہ میں کسی کو حاصل نہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ حنفیہ کے ہاں ہی اس سے اعتناء کم ہے اور اس کا رواج اور قدر کم ہے اور جو روایت بالمعنی کرتے ہیں اس کی کتاب سے اعتناء سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، مولاناؒ کا یہی کارنامہ ہے کہ اس کتاب کی شرح لکھتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا، کاش وہ خود اس کی شرح پوری کر جاتے تو یہ ایسا عظیم کارنامہ تھا جس سے علمی دنیا عرصے تک فائدہ اٹھاتی رہتی، اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ان کو آخرت میں بلند ترین مقام نصیب فرمائے۔

مولانا کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ مولانا بنوری کی وفات کے بعد اپنے علاقہ ضلع ہنگو میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا، میں بھی ان سے ملنے گیا تھا، مدرسہ بھی اچھا بنایا ہے، خوشگوار مقام پر ہے، وہیں ان کا کتب خانہ بھی ہے لیکن افسوس کہ بمباری نے انہیں بھی نقصان پہنچایا اور وہیں جام شہادت نوش کر گئے۔

مولانا نہایت خوش اخلاق، باوقار اور بہت ملنسار تھے۔ علم کے قدردان اور علم دوست تھے۔ ان کی خصوصیات کے حامل پاکستان میں ان کے معاصرین میں بہت کم لوگ ہیں۔ جگر نے سچ کہا ہے:

جان کر من جملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

میں ان کی قدر تو نہیں کر سکا لیکن اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے مدرسے کو آباد رکھے۔

عبدالحلیم چشتی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ

(ماہنامہ بینات کراچی۔ شہید ناموسِ رسالت نمبر)

عاشَ سعیداً وماتَ سعیداً

ڈاکٹر مولانا عبدالحلیم چشتی
(جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن)

مولانا سعید احمد بن جام شوق محمد جلال پوری رحمہ اللہ ۱۹۵۶ء-۱۳۷۶ھ کو اپنے آبائی گاؤں نوراجا بھٹہ تحصیل جلال پور ضلع ملتان میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم پنجاب کے مختلف مدارس میں حاصل کی، پھر کراچی آگئے، اور یہاں جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں محدثِ عصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ (۱۳۹۷ھ) اور مفتی ولی حسن ٹونکیؒ (۱۴۱۵ھ) جیسے نامور اساتذہ سے حدیث پڑھی۔

اس کے بعد کراچی کی جامع مسجد شریفی جوڑیا بازار اور پھر جامع مسجد راہ گزر شاہ فیصل کالونی میں امام وخطیب رہے۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ اور مدرسہ امینیہ کراچی میں درسی کتابیں پڑھائیں۔

صحافتی خدمات:... موصوف کم وبیش دس برس ماہنامہ ''بینات'' کے ایڈیٹر اور کتابوں پر تبصرہ نگار رہے۔

ختمِ نبوت کے لئے خدمات:... موصوف عالمی مجلس تحفظ ختمِ نبوت کراچی کے امیر، اور دارالافتاء ختمِ نبوت کراچی کے نگرانِ اعلیٰ رہے، اور ہفت روزہ ''ختمِ نبوت'' کراچی میں اداریہ بھی انہی کا آتا رہا۔

بیعت وخلافت:... علوم سے فراغت کے بعد ارشاد وسلوک کی منازل طے کرتے اور کراتے رہے۔

تصانیف:... حسبِ ذیل پانچ کتابیں موصوف سے یادگار ہیں:

۱-معارفِ بہلوی (۴ جلد مطبوع)۔

۲-بزمِ حسین (۲ جلد مطبوع)۔

۳-حدیثِ دل (۳ جلد مطبوع)۔

۴-گوہر شاہی۔

۵-تخریج ونظرِ ثانی ''آپ کے مسائل اور اُن کا حل'' (۸ جلد مطبوع)۔

موصوف خیر کے کاموں میں ذرا پس وپیش نہیں کرتے تھے، اس بات کا اندازہ موصوف کے حسبِ ذیل خط سے کیا جاسکتا ہے:

''مخدوم ومکرم حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عرض آنکہ حاملِ ھٰذا مولانا صفی اللہ صاحب ہمارے حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب زیدمجدہم، مدیر جامعہ قادریہ بکھر کے صاحبزادہ ہیں، ان کی خواہش وچاہت ہے کہ آنجناب ان کو سندِ حدیث واجازتِ حدیث عنایت فرماویں، میں اسی غرض سے سفارش عرض کرکے شریکِ ثواب ہونا چاہتا ہوں۔ دعواتِ صالحہ کا خواستگار ہوں۔

والسلام

سعید احمد

۲/۹/۱۴۳۰ھ۔''

موصوف کو جب کوئی بات کھٹکتی تو اہلِ علم سے پوچھتے، چنانچہ ڈاکٹر عرفان عابد اعوان کے سوال:

''اِمام غزالیؒ اپنی کتاب ''سر العالمین'' کے صفحہ:۹ پر لکھتے ہیں کہ: ''غدیرخم میں حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''من کنت مولاہ'' فرمانے کے بعد اور اس موقع پر مبارک باد دینے کے بعد جب لوگوں پر خلافت کی ہوا وہوس غالب آگئی تو انہوں نے غدیرِخم کی تمام باتیں بھلادیں۔''

ڈاکٹر عرفان اعوان کے اس سوال کے جواب میں موصوف میرے پاس تشریف لائے کہ یہ کتاب اِمام غزالیؒ کی ہے یا نہیں؟ میں نے کتاب ''اتحاف السادۃ المتقین'' کی طرف راہنمائی کی، جس سے ان کی مراد برآئی۔

موصوف رقم طراز ہیں:

''ج:...ڈاکٹر صاحب! (عرفان عابد) بلاتکلف عرض کرتا ہوں کہ جب آپ کا مکتوب ملا اور میں نے امام غزالی کی کتاب ''سر العالمین'' کے حوالے سے آپ کی تحریر پڑھی تو اول وہلہ میں، میں نے یہی سمجھا کہ یقیناً کہیں نقل میں سہو ہوا ہے، یا پھر جان بوجھ کر خیانت سے کام لیا گیا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے امام غزالیؒ کے رسائل تلاش کئے، تو مجھے اپنے کتب خانے میں ''مجموعہ رسائل امام غزالیؒ'' کی وہ جلد مل گئی جو ایک سے سات تک ہے، اور اس میں امام غزالیؒ کے ۲۶ رسائل شائع کئے گئے ہیں، چنانچہ اس جلد کی ورق گردانی سے جب اس کے ۲۲ ویں نمبر پر رسالہ ''سر العالمین وکشف مافی الدارین'' دیکھا تو آپ کی طرح مجھے بھی جھٹکا لگا، پھر جب اس کے متعلقہ صفحے کا مطالعہ کیا تو بلامبالغہ آپ کے والد صاحب نے جو کچھ کہا اور آپ نے جو لکھا، بعینہٖ وہ سب کچھ بھی اس میں موجود تھا۔

چونکہ یہ رسائل محمد علی بیضوی کی جانب سے اور ''دار الکتب العلمیہ بیروت، لبنان'' کی طرف سے شائع ہوئے تھے، اور لبنان میں اہلِ تشیع کا غلبہ اور کثرت ہے، اس لئے اس طرف خیال گیا کہ یقیناً اس کتاب کی امام غزالیؒ کی طرف غلط نسبت کی گئی ہے، مگر اس کی تردید کے لئے مضبوط دلائل وشواہد اور قطعی ثبوت کی ضرورت تھی، اس لئے میں نے متعدد اہلِ علم سے اس کے بارے میں پوچھا تو اکثر حضرات نے اس سے لاعلمی اور حیرت وتعجب کا اظہار کیا، تا آنکہ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے درجہ تخصص فی الحدیث کے نگران حضرت مولانا عبدالحلیم چشتی دامت برکاتہم سے رابطہ کیا، انہوں نے بھی اس سے لاعلمی کا اظہار کیا، البتہ انہوں نے اس طرف متوجہ کیا کہ حضرت امام غزالیؒ (۵۰۵ھ) کی کتاب ''احیاء العلوم'' کے نامور شارح علامہ محمد الحسینی زبیدیؒ (۱۲۰۵ھ) کی ''اتحاف السادۃ المتقین'' کا مطالعہ کیا جائے، اس میں یقیناً امام غزالی کی تصنیفات کا تذکرہ ہوگا۔

وہاں دیکھا جائے کہ انہوں نے ''سر العالمین'' کو امام غزالیؒ کی تصنیفات میں شمار کیا ہے یا نہیں؟ چنانچہ ان کی راہنمائی اور توجہ دلانے پر ''اتحاف السادۃ المتقین'' مطبوعہ دار الفکر بیروت کی طرف رُجوع کیا گیا، تو بحمداللہ! اس کے صفحہ: ۴۱ پر امام غزالیؒ کی دُوسری تصنیفات کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا: ''اعود وانعطف إلی ذکر بقیۃ مصنّفاتہ'' یعنی اب میں ان کی دُوسری تصنیفات کے تذکرے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد علامہ زبیدیؒ نے حروفِ تہجی کے اعتبار سے امام غزالی کی تمام تصنیفات کی فہرست لکھی ہے، اس فہرست کو دیکھنا شروع کیا تو حرف ''سین'' کے تحت

"سر العالمین" نام کی کوئی کتاب نہ تھی، اس لئے کہ انہوں نے حرف "سین" کے ذیل میں صرف ایک کتاب "السر المصرف" کو درج کرتے ہوئے اس کا تعارف کرانے کے بعد حرف "الشین" شروع کردیا ہے، بس سے یقین ہوگیا کہ "سر العالمین" نام کی امام غزالی کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔...الخ۔"

شہادت:... موصوف نے بروز جمعرات بعد نماز عشاء ۱۱ر مارچ ۲۰۱۰ء مطابق ۲۵ر ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ کو اپنے بیٹے اور دو ساتھیوں سمیت جام شہادت نوش فرمایا۔

ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم نے بعد از نماز جمعہ، نماز جنازہ پڑھائی۔

تدفین:... جامع مسجد خاتم النبیین پوسٹ آفس سوسائٹی گلشن اقبال میں آرام فرما ہیں۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہید ناز کی تربت کہاں ہے

مولانا خواجہ خان محمدؒ

(ماہنامہ لولاک ملتان۔خواجۂ خواجگان نمبر)

سرتاجِ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی، کراچی

اس دور میں پاکستان میں نقشبندیہ مجددیہ سلسلے کی یہ تین خانقاہیں زیادہ سرگرمِ عمل رہی ہیں:

۱:...خانقاہِ سراجیہ کندیاں شریف۔

۲:...خانقاہ زوّاریہ (حضرت مولانا سیّد زوّار حسین صاحب رحمہ اللہ ۱۳۲۹ھ-۱۹۱۱ء، متوفی ۱۴۰۰ھ-۱۹۸۰ء)۔ مولانا زوّار حسین شاہ صاحب رحمہ اللہ کے تفصیلی حالات کے لئے دیکھئے ماہنامہ ''تعمیر افکار'' زوّار حسین نمبر۔

۳:... خانقاہ ٹنڈوسائیں داد (حضرت مولانا حکیم پیر ہاشم جان رحمہ اللہ ۱۳۲۲ھ-۱۳۹۵ھ)۔ ان میں تصنیفی واِشاعتی کام سلسلۂ زوّاریہ کا طرۂ اِمتیاز ہے، اور یہ سلسلہ روز بروز ترقی پذیر ہے، لیکن ٹنڈوسائیں داد میں سلسلۂ مجددیہ کی سرگرمیاں پیر ہاشم جانؒ کے اِنتقال کے بعد بظاہر زیادہ نمایاں نہ رہ سکیں، ان کے ہاں بھی قلمی کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا، یہ ذخیرہ عام استفادے کے لئے نہیں تھا، بلکہ اندرونِ خانہ محفوظ تھا، مجھے اس کی زیارت کا شرف حاصل ہے، اس میں مُلّا علی قاریؒ (متوفی ۱۰۱۴ھ) کا حمائل موجود تھا، جو پیر ہاشم جان صاحبؒ کو ان کے والد نے قرآن حفظ کرنے پر دیا تھا۔ حضرت مولانا پیر ہاشم جانؒ نے اجمیر شریف میں حضرت مولانا معین الدین اجمیریؒ (۱۸۸۱ء-۱۹۴۰ء) سے معقولات ومنقولات کی اور ان کے بھائی حکیم نظام الدین (مولود ۱۸۸۳ء) سے طب کی تکمیل کی، موصوف کو سب سے بڑا اشرف حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد ہونے کا حاصل ہے، اپنے والد ماجدؒ سے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں خلافت واجازت حاصل ہوئی، ۲۲ر رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ کو، کوئٹہ میں حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے ان کا اِنتقال ہوا، اور اپنے آبائی قبرستان گنجہ شریف ٹنڈوسائیں داد میں دفن کئے گئے، اللہ تعالیٰ آپ کی قبر کو نور سے بھردے، آمین!

نقشبندی سلسلے میں جہاں عملی بیعت واِرشاد کا سلسلہ سب سے زیادہ وسعت پذیر اور خاص

وعام میں مقبول رہا ہے، وہ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف ہے، اس خانقاہ کی حسبِ ذیل خصوصیات ہیں:

۱:... یہاں بیعت وارشاد کا سلسلہ بہت زیادہ وسیع رہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے انہیں عمرِ دراز عطا فرمائی اور یہ حضرت خواجہ صاحبؒ کے زمانے میں مرجعِ خلائق رہی ہے۔

۲:... یہاں قدیمی دِینی کتابوں کا کتب خانہ ہمیشہ اہلِ علم کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

۳:... اس کے سجادہ نشین خواجہ خواجگان حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحبؒ ہندوستان کی مقبول ترین جامعہ دارالعلوم دیوبند کے مستند عالم تھے۔

۴:... سیاسی قیادت کے لئے تمام دِینی جماعتوں کی نظریں خانقاہ سراجیہ کے سجادہ نشین حضرت خواجہ صاحبؒ ہی پر جمی رہتی تھیں، چنانچہ جمعیت علمائے اسلام کے قائدین آپ ہی کے زیرِ قیادت وزارت کے منصب کو پہنچے اور ایوانوں اور اسمبلیوں میں حق کی صدا بلند کرتے رہے، بلکہ حضرت کے بعض تربیت یافتگان کو اسلامی نظریاتی کونسل میں بھی خدمت کا فخر حاصل ہے، اور حضرت خواجہ صاحبؒ ہر موڑ پر اُن کے شانہ بشانہ رہے، اور سنتِ یوسفی پر عمل کرتے رہے، یہ سنت ایسی ہے جس پر یہ شعر صادق آتا ہے:

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوس نا کے نداند جام سندان باختن

یہ اس خانقاہ کا ایسا طرۂ اِمتیاز ہے جو اس دور میں کسی اور خانقاہ کو حاصل نہیں۔

۵:... سادگی اور بے نیازی، تو اسی خانقاہ کا شعار ہے، مجھے اس خانقاہ سے براہِ راست استفادے کا تو موقع نہیں ملا، لیکن مجھے اس سے دوگونہ نسبتیں حاصل ہیں، پہلی نسبت شاگردی کی ہے، یہ حضرت مولانا عبدالخالق ملتانیؒ (۱۳۱۳ھ-۱۳۸۶ھ) (بانی دارالعلوم کبیروالا) سے دارالعلوم دیوبند میں توضیح تلویح پڑھنے سے حاصل ہے۔ موصوف حضرت مولانا عبداللہ لدھیانویؒ (۱۹۰۴ء-۱۹۵۶ء) کے خلیفہ اور حضرت خواجہ صاحبؒ کے خواجہ تاش (پیر بھائی) تھے، ان کی دو باتیں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

۱:- ان کے طریقۂ تدریس کا نقشہ دِل پر نقش ہے، ان کا یہ معمول تھا کہ گھنٹہ بجنے سے پہلے ہی درسگاہ کے باہر ٹہلتے رہتے تھے، ادھر گھنٹہ بجتا اور ادھر ان کا قدم درسگاہ میں ہوتا۔ توضیح تلویح سال بھر ڈیسک پر رکھی رہی، مولانا متن اور شرح دونوں زبانی پڑھتے، تقریر کا آغاز اس جملے سے فرماتے: ''وہ نہیں کہتا مگر یہ'' اور گھنٹہ ختم ہونے کے ساتھ ہی ان کی تقریر پوری ہوجاتی، اس سے ان کی پابندیٔ وقت اور حسنِ معاملگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، لیکن بات کتاب کے حل تک ہی محدود ہوتی، خارجی معلومات اور دیگر کتب کی طرف رہنمائی نہ ہونا آج بھی درسِ نظامی کا اِمتیاز ہے، **فاعتبروا یٰاُولی الأبصار!**

۲:- دُوسرا اِمتیاز، ان کا یہ تھا کہ ان کی نمازیں اور مراقبے دونوں لمبے ہوتے تھے، جمعہ کا دن ان کا عید کا دِن ہوتا، چنانچہ جمعہ کے دن مولانا نمازِ جمعہ کے لئے ملتانی تہذیب میں جلوہ گر ہوکر مدرسے کے گیٹ سے اس وقت قدم باہر رکھتے جب مسجد سے اَذان کی صدا بلند ہوتی، اور پھر مسجد سے واپسی تین بجے ہوتی، ایک نماز سے فارغ ہوکر دُوسری نماز کے لئے آپ کا دِل اٹکا رہتا، آپ بہت خوش خوراک وخوش پوشاک اور نہایت لحیم شحیم تھے، اور مراقبے ہی میں اللہ کو پیارے ہوگئے، رحمہ اللہ۔

دُوسری نسبت خانقاہِ سراجیہ سے مجھے یہ حاصل ہے کہ میرے جو شاگرد خانقاہِ سراجیہ سے وابستہ رہے ہیں، میں نے ان میں دِین داری، تقویٰ وطہارت، اِخلاص وللّٰہیت اور معمولات کی پابندی خوب دیکھی ہے، اس ناچیز کو خانقاہِ سراجیہ سے یہی دو نسبتیں حاصل ہیں۔

حق گوئی وبے باکی

رَبِّ تعالیٰ نے اللہ والوں میں ایسی رُوحانی طاقت رکھی ہے جس کے آگے باطل کی ہر بڑی سے بڑی مادّی طاقت ہیچ ہے، اہل اللہ جب خلافِ حق دیکھتے ہیں تو برملا بلاخوف وخطر حق بات کہہ دیتے ہیں، حضرت خواجہ صاحبؒ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی جرأت وحق گوئی سے نوازا تھا، چنانچہ محترم محمد اشفاق اللہ واجد مجددی صاحب حضرت کے متعلق لکھتے ہیں: میاں نواز شریف ۱۹۹۳ء میں برسرِ اقتدار تھے، علمائے کرام کے بارے میں مسلم لیگی وزراء نے بڑی گندگی اُچھال رکھی تھی، خصوصاً علمائے دیوبند کے متعلق مسلم لیگی وزراء کی زبانیں بہت کھلی ہوئی تھیں، عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوّت نے آواری ہوٹل لاہور میں ایک پریس کانفرنس کا انتظام کیا تھا، پریس کانفرنس میں مولانا اللہ وسایا صاحب اور جمعیت علمائے اسلام کے قاری نذیر احمد بھی موجود تھے، خواجہ مخدومؒ کی طرف سے مولانا اللہ وسایا صاحب نے بیان پڑھا، بیان کے بعد صحافی حضرات نے سوالات شروع کئے، مولانا اللہ وسایا صاحب سے صحافی نے سوال کیا: آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ فوج میں بعض جنرل قادیانی ہیں یا مرزائیوں کے پشت پناہ ہیں، ان کے نام بتایئے؟ مولانا اللہ وسایا صاحب نے گھبرائے ہوئے چہرے سے حضرت خواجہؒ کی طرف دیکھا، آپؒ نے مسکراتے ہوئے کہا: میرے ایما پر بتاؤ، میں پورا ذمہ دار ہوں، تب مولانا نے کسی ناصر نامی جنرل کا نام لیا، جنگ اخبار کے صحافی نے حضرت خواجہؒ سے سوال کیا: آج کل مسلم لیگی وزراء جو علمائے کرام کے کردار کے متعلق بیان بازی کر رہے ہیں، حضرت خواجہ کے خیال میں کون کرواتا ہے؟ مرشدِ برحق حضرت خواجہؒ نے جواب دیا: میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وزیر اعظم نواز شریف ہی کے ایما پر مسلم لیگی وزراء بیانات دے رہے ہیں۔ صحافی نے پوچھا: حضورِ والا! ہم ایسے ہی اخبار کو خبر دے دیں؟ آپ نے فرمایا: آپ

بالکل ایسا ہی لکھ دیں، پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں، تمام صحافی حضرات یک زبان ہوکر بولے: حضرتِ والا نڈر آدمی ہیں۔'' (میرے خلیل ص:۴۰)

اقبال نے سچ کہا ہے کہ:

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رُوباہی

ادب واِحترام

علم ومعرفت میں ترقی کی منازل طے کرنے کے لئے ادب واِحترام ایک لازمی امر ہے، حضرت خواجہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے ادب واِحترام کا بھی اعلیٰ ذوق عطا فرمایا تھا، آپ مجسمۂ ادب تھے، چنانچہ نذیر رانجھا صاحب لکھتے ہیں: ''۱۹۷۴ء کی ختمِ نبوّت کی تحریک کے دوران جامع مسجد کچہری بازار، فیصل آباد میں ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروانوں کا جلسہ تھا، حضرت بنوریؒ کراچی سے تشریف لائے، مفتی زین العابدین صاحبؒ کی رہائش گاہ پر قیام پذیر تھے۔ حضرت مخدوم زماں خواجہ خواجگان خان محمد مدظلہٗ اپنے اُستاذِ مکرم کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت بنوریؒ نے کھڑے ہوکر آپ کا اِستقبال کیا، آپ حضرت بنوریؒ کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھ گئے، اِمام الحدیث حضرت بنوریؒ نے آپ سے فرمایا: آپ ایسا نہ کریں، لیکن حضرت خواجہؒ دوزانو ہی بیٹھے رہے۔ گفتگو کے بعد مجلس برخاست ہوئی، حضرت علامہ سیّد بنوریؒ مجلس سے جانے کے لئے اُٹھے، آپ نے حضرت بنوریؒ کا جوتا اُٹھایا اور ان کے سامنے رکھا، دونوں حضرات ایک دُوسرے کو الوداع کہنے کے لئے باہر تشریف لائے، بوقتِ رُخصت حضرت بنوریؒ نے آپ سے دُعا کی درخواست کی۔'' (تاریخ وتذکرہ ص:۴۴۱)

اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ آپ نے جن اکابر کی صحبت پائی ہے وہ بھی تو پیکرِ عجز وادب تھے، چنانچہ مرشدِ کامل حضرت ابوالسعد احمد خانؒ (متوفی ۱۹۴۱ء) کتابوں کا حد درجہ ادب واحترام کرتے تھے، کتاب کی بے حرمتی طبیعت کو قطعاً گوارا نہ تھی، چنانچہ نذیر رانجھا صاحب لکھتے ہیں: ''ایک دفعہ ایک مولوی صاحب کتب خانے میں کوئی کتاب دیکھ رہے تھے، کتاب پر معمولی سا غبار محسوس ہوا تو غبار جھاڑنے کے لئے زور سے کتاب دھپ سے بند کی، حضرتِ اقدس برآمدے میں بیٹھے تھے، بیتاب ہوکر اُٹھے اور دوڑ کر اندر تشریف لے گئے، مولوی صاحب سے پوچھا کہ اتنے زور سے آپ نے کتاب بند کی تھی؟ ان مولوی صاحب نے محجوب ہوتے ہوئے کہا کہ: حضرت! کتاب پر گرد وغبار تھا، وہ جھاڑنے کے لئے میں نے زور سے کتاب بند کی۔ حضرت نے فرمایا: ''مولوی صاحب! مجھے بیوی یا بیٹی کی گالی سے اتنا صدمہ نہیں

ہوتا، جتنا اپنی کتاب کی بے حرمتی دیکھ کر ہوتا ہے، غبار ہی صاف کرنا تھا تو رُومال سے آہستہ سے صاف کرتے، پھر اپنے عربی رُومال سے آہستہ آہستہ کتاب کو صاف کر کے بتلایا کہ اس طرح نرمی سے صاف کر لیتے، آپ کی دھپ تو میرے دِل پر لگی۔'' (تاریخ وتذکرہ ص:۴۹۵)

خموش اے دِل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

حضرت خواجہ صاحبؒ کی وفات پُرحسرت پر ہر آنکھ اشک بار اور دِل حزین ہے، اللہ تعالیٰ موصوف کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق نصیب فرمائے، آمین!

جان کر من جملۂ خاصانِ مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

اور ہاں!

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل
شہیدِ ناز کی تربت کہاں ہے؟

❊

مولانا ارشاد اللہ عباسی شہیدؒ

(ماہنامہ بینات کراچی-شہید ناموسِ رسالت نمبر)

مولانا ارشاد اللہ عباسی شہید رحمہ اللہ

تاریخ پیدائش:... مولانا محمد ارشاد اللہ بن محمد عبداللہ بن مولانا محمد معصوم عباسی ۱۹۶۵ء-۱۳۸۵ھ کو جدبہ، کالاڈھاکہ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم:... ناظرہ قرآن اور کچھ ابتدائی کتابیں اپنے والد کی سرپرستی میں پڑھیں، اس کے بعد ۱۹۷۸ء-۱۳۹۸ھ میں کراچی آگئے اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے درجہ حفظ میں داخلہ لیا، اور ۱۹۸۰ء-۱۴۰۰ھ میں حفظِ قرآن مکمل کیا۔

پھر ۱۹۹۰ء-۱۴۱۰ھ میں درسِ نظامی کی تکمیل کی، اور یہیں سے تخصص فی الفقہ کیا۔

تدریس و اِمامت:... تحصیلِ علم سے فراغت کے بعد ۱۹۹۷ء-۱۴۱۷ھ کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں تدریس کا آغاز کیا، اور آخر دَم تک تقریباً ۱۳ برس پڑھایا۔

موصوف داعی مسجد کراچی کے امام وخطیب تھے۔

شہادت وتدفین:... بروز جمعہ ۲۹ر اپریل ۲۰۱۱ء مطابق ۱۴۳۲ھ کو جامِ شہادت نوش کیا۔

جمعہ کی نماز کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ میں ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر دامت برکاتہم نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

پاپوش نگر کراچی میں مدفون ہیں۔

❋

مولانا حکیم محمد اختر ؒ

(سہ ماہی فغانِ اختر کراچی۔ شیخ العرب والعجم نمبر)

حضرت حکیم اختر صاحبؒ کی دو خوش بختیاں

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم
شاگردو مرید شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ ومشرف تخصص فی الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی

آغازِ اسلام سے ہر صدی میں گوناگوں علوم کے جامع رہے ہیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ چودہویں صدی میں کراچی میں حضرت حکیم اختر صاحب تھے، جو حضرت پھول پوریؒ کے زیرِ سایہ پلے بڑھے ہیں۔ یہ اُن کی پہلی خوش بختی ہے۔ حضرت پھول پوریؒ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے نہایت باکمال اور بڑے درجے کے خلفاء میں سے تھے۔ جن کے پاس کبھی کبھی بڑے بھائی حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ کے ساتھ میرا بھی بارہا جانا ہوا، اُن کی تھوڑی دیر کی حاضری ہفتے تک کام کرتی رہتی تھی۔ ان (حضرت پھول پوریؒ) پر حضرت تھانویؒ کی نظرِ کرم برابر رہی۔[1]

اور حضرت حکیم اختر صاحبؒ کی دوسری خوش بختی یہ ہے کہ حضرت پھول پوریؒ کے بعد آپ کا تعلق حضرت تھانویؒ کے خلیفہ ابرار الحق حقی ہردوئیؒ[2] سے قائم ہوا۔ اور اُن سے خلافت بھی ملی۔ اور گوناگوں دِینی خدمات کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کی گوناگوں خدمات میں (۱) مطب۔ (۲) رشد وہدایت۔ (۳) تعلیم وتربیت۔ (۴) مدرسہ کا قیام۔ (۵) خانقاہ کا قیام۔ (۶) شعر وشاعری۔ (۷) مطبع مظہری۔ (۸) کتابوں کی اشاعت۔ (۹) ہر دینی کام میں معاونت۔ (۱۰) اسفار۔ (۱۱) بیماری میں بھی خلقِ خدا سے ربط وتعلق۔ یہ اُن کے نمایاں اوصاف ہیں اور یہ عنوانات ایسے ہیں کہ اُن میں سے ہر عنوان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ (۱۲) مصائب وآلام میں ثابت قدمی اور یاد اللہ سے وابستگی و استحضار پھر اس مرض میں وفات۔ ایسی صفات ہیں کہ عجب نہیں موصوف نے شہادت کا درجہ بھی پایا ہو۔ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں خواجہ عزیز الحسن علیگ سے اللہ نے دین کا جو کام شاعری کے ذریعے سے لیا اس دور میں اس سے ملتا جلتا کام حکیم اختر صاحبؒ کو توفیقِ الٰہی سے حاصل ہوا۔ پاکستان، بنگلہ دیش، ہندوستان، مشرقِ وسطیٰ اسلامی ممالک وغیرہ میں اُن کے خلفاء دین کی خدمت پر مامور ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کا فیض مرنے کے بعد بھی جاری وساری ہے یہ اُن کی خوش قسمتی اور قبولِ عام کی دلیل ہے۔ جگر نے خوب کہا ہے۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے　　مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

فارسی شاعر نے کہا ہے۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

محمد عبدالحلیم چشتی

التاریخ: ۲۱ ذی قعدہ ۱۴۳۴ھ ۲۷/۹/۲۰۱۳ء بروز جمعہ

---

[1] ملاحظہ ہو بزمِ اشرف کے چراغ ص: ۱۰۴، پروفیسر سعید احمد، مصباح اکیڈمی جامعہ اشرفیہ لاہور۔ [2] ایضاً ص: ۸۵۔

العلامة عبد العزیز المیمنی

آثارہ واعمالہ

(تعریب)

(المجمع العلمی الھندی۔ 1986ء)

العلامة عبد العزيز الميمنى
مآثره وأعماله

الأستاذ
عبد الحليم چشتى

الأستاذ الميمنى و الأستاذ عبدالله محمد السورتى من الأدباء الشهيرين فى الهند ، الذين عرفتهم فى صباى لقد سمعت مراراً من أخى الكبير العلامة المحدث محمد عبد الرشيد النعمانى و الأستاذ محمد عبد العليم الندوى مفاخر هولاء العلماء الأدبية و اللغوية، فقرأت فى كتاب « الكتب التى أحسنت على المقالة التى كتبها الأستاذ عبد العزيز الميمنى بشوق بالغ ، وكذلك رأيت ذكر الأستاذ الميمنى فى مقدمة علمية للشيخ مسعود عالم الندوى على « اللغات الجديدة » (الطبعة الثانية) للعلامة السيد سليمان الندوى ، كما رأيت فى مجلة « معارف » نقداً على كتاب « سمط اللآلى » للشيخ محمد السورتى ، ورد الأستاذ الميمنى عليه فى مجلة « برهان » و تمتعت بهذا المناقشة العلمية بينهم ثم طالعت قصيدته العربية الطويلة عند وفاة أستاذه بشيرالدين السهسوانى ، كما رأيت اسمه على بعض تراجمه الأردوية للكتب الدراسية ، فكان يترجم من اللغة العربية إلى اللغة الأردية ترجمة متقنة. بذاك كله رسخة عظمة و حبه فى قلبى ، ولكنى لم أتشرف بلقائه الا فى كراتشى حين وصل إليها من عليكره فى شهر مارس ١٩٥٥م ، فتكرر اللقاء وازدادت الصلة . ثم لما فوض إليه ، درجة الأستاذية فى القسم العربى بجامعة كراتشى ، وانتقل إلى منزله « ميمن منزل » فى

بهادرآباد، كراتشی تضاعفت اللقاآت وسنحت لی فرصة رؤيته من قريب .

كانت أوقات حياته منظمة، فكانت لكل شیء من الأكل والاستراحة و المطالعة و اللقاء و النزهة مواعيد محددة ، لم أره قط يضيع وقته . اجتهد فی تحصيل العلوم كثيراً ، قرأ كتب الأدب على الشيخ محمد طيب المكی الرامپوری صاحب « النفحة الأحمدية فی الصلات الفعلية » ، و على الشيخ نذيرأحمد الدهلوی ، و درس الحديث من الأستاذ بشير الدين السهسوانی ، واستجاز رواية الحديث من الشيخ حسين عرب ، و لذلك كان يكتب فی أول الأمر « الأثری » بعد اسمه كان ذكياً صاحب حافظة قوية . طالع مراراً الكتب المهمة للأدب و استوعبها هضماً ، و قرأ بدقة كتب التاريخ و السير ، و حفظ معظم أجزائها . وكان يعرف كيف يستعمل معارفه ، يتكلم لغة فصيحة و بلغة مرتجلاً ، يحفظ قصائد منتخبة والامثال . لم يكن ينتمی إلی أسرة ولكنه كسب هذه المهارة الفنية بمواهبه الفطرية و جهده فی تحصيلها ، علی الرغم من أن اللغة العربية لم تكن لغة رسمية للهند ولا رائجاً فيها، و لكنها بقيت ولاتزال حية فيها بسبب الدين الخالد ، لذلك ذاع صيته فی البلاد العربية أكثر من الهند . اطلاعه علی موضوعه كان واسعاً عميقاً ، درس فی الجامعات الشهيرة فی الهند، و ألقی محاضرات فی الأزهر الشريف. اخبرنی الأستاذ محمد ملو (أستاذ الأدب و اللغة فی الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة) بانه قرأ كتاب ابن رشيق منه فی الأزهر . وكان علی اتصال دائم بما ينجز من أعمال فی موضوعه فی الأوساط العلمية فی العالم العربی و غيره عن طريق الجرائد و المجلات العلمية و فهارس المخطوطات و المراسلات و اللقاءات التی كان تجری بينه و بين معاصريه ، و قد اطلع علی المخطوطات العربية فی سفره إلی مصر و القسطنطنية سنة ١٩٣٥م .

قلما تجتمع الصحة وقوة الحفظ وفراغ البال وتنظيم الأوقات وهواية الدراسة و الاجتهاد و طول العمر فى رجل كما اجتمعت فيه، فاستفاد منها استفادة تامة ، فلم يولد فى الهند رجل كامل فى فنه بعد الصغانى اللاهورى ، والسيد مرتضى البلكرامى ثم الزبيدى ، وهم الذين تميزوا بما تميز به الأستاذ الميمنى المفاخر العلمية و الأدبية .

الشيخ السيد طلحة كان عالماً كبيراً فى وقته من أسرة السيد أحمد الشهيد التى ينتسب إليها السيد عبدالحى الحسنى، وقد كانت أخته الشقيقة فى عقده، فكان الشيخ طلحة بهذه العلاقة عماً لأبى الحسن على الحسنى الندوى . إنه كان يقضى العطلة الصيفية فى لكناؤ عند الأستاذ السيد عبد الحى، الذى كان يرتب فى تلك الأيام المجلد الآخر « نزهة الخواطر » وقد طلب من السيد طلحة مراراً أن يبلغ الأستاذ عبد العزيز الميمنى منه بأن يكتب نبذة عن حياته و يرسلها إليه ليدخلها فى كتابه . و هذا يرجع فى الأغلب إلى سنة ١٩٢٥/٢٦م ، وقد ذكر السيد طلحة بأنه بلغ الرسالة إلى الأستاذ الميمنى مراراً و لكنه لم يلتفت إليها . فتركه وأمره. لذلك لم يحتو « نزهة الخواطر » ترجمته، و حين صدر منه الجزء الثامن، وهو فى ذكر معاصريه ، ذكرت له . فطلب بلهفة يشاهده . فأعطيته إياه ، وأنا أعلم أنه ليس فيه ذكره، فقرأ هذا الكتاب ، و رأى فيه ذكر معاصريه ، و طالع شعرهم ، و صحّح بعض الاشعار ، و لكنى لا أعلم ماذا كانت شاعره حين لم يجد فيه ترجمته، فقد كان يحب ذكره ، و يحتفظ بما يكتب عنه ، ويردده امام أصحابه و تلاميذه كما كان يذكر صلاته بمشاهير عصره .

درس الأستاذ الميمنى فى الكليات و الجامعات الشهيرة فى الهند والباكستان ، فقد درس فى عليكره منذ ١٩٢٦م إلى ١٩٥٥م ، و بعد

ذلك انتقل إلى باكستان فقدّره رجال باكستان حق قدره ، وعينوه أستاذاً ورئيساً للقسم العربی فی جامعة كراتشی ، ثم فی جامعة بنجاب . فطالت مدة خدمته للغة العربية وآدابها ، و لا أعلم أحداً من معاصريه بأنه حظی بمثل هذه الحظوة .

قدّم الأستاذ الميمنی بحوثه العلمية النادرة منذ أوائل حياة العلمية حتى لُقّب بـ «العلامة» ، وقد سبقت «مجلة المجمع العلمی» بدمشق فی العالم العلمی باعطائه هذا اللقب و لما توفی حكيم أجمل خان سنة ١٩٢٨م ، انتخب عضواً للمجمع العلمی بدمشق ، فبقی عضواً له إلى آخر حياته ، كما نشر فی مجلته بتحقيقاته النادرة إلى آخر أيامه . وقد انتخب أيضاً عضو المجمع اللغة العربية بمصر ، ولقد عرف أمره ، فعدّ من المحققين منذ سنة ١٩٢٨م فی العالم العربی ، و لما نشر الأستاذ محب الدين الخطيب « خزانة الأدب » للبغدادی بتحقيقه . أضاف إليه تصحيحات و استدركات من تحقيق الأستاذ أحمد تيمور باشا و الأستاذ الميمنی ، و ذكره تارةً بـ «العلامة الكبير الأستاذ» وتارةً أخرى «حضرة العالم الكبير» و حيناً « العلامة المحقق الأستاذ» و حيناً آخر « من مفاخر الهند فی سعة الاطلاع على آداب اللغة العربية » . وفی سنة ١٩٢٩م طبع على الصفحة الأولى للجزء الثانی من « خزانة الأدب » « وحليناها بتصحيحات العلامة الجليل صاحب السعادة الأستاذ أحمد تيمور باشا . و بتصحيحات و تعليقات المحقق الكبير عبد العزيز الراجكونی » و حين أعلن محب الدين نشر « لسان العرب » لابن منظور الافريقی اختار للجنة التحقيق أربعة من كبار رجال اللغة و الأدب ، و هم : العلامة أحمد تيمور باشا ، و الأستاذ العلامة المحقق عبد العزيز الميمنی ، والدكتور كرنكو ، والسيد أبو شنب ، فنشره بتصحيحاتهم واستدركاتهم و ملاحظاتهم .

فی ۱۹۲۸م نشر کتاب الأستاذ المیمنی « أبو العلاء و ما إلیه » فاعترفت بأنه امتثل فیه بالأسلوب الذی اختاره أبو العلاء المعری فتکلف فی السجع احیاناً کما یوجد عند أبی العلاء. و مع ذلک أسلوبه عربی خاص ، جامع بین القدیم و الجدید . ذکره الأستاذ محمود محمد شاکر « باستاذی عبد العزیز المیمنی » کما اشار إلی « سمط اللآلی » کتاب الوحشیات » فقال :

و لاسیما کتابه الذی لایدانیه کتاب فی التحقیق وهو سمط اللآلی ،
و لما نشرت سنة ۱۹۶۵م دار القومیة للطباعة و النشر بالقاهرة دیوان سحیم عبد بنی حسحاس . ودیوان حمید بن ثور الهلالی ، الفاضل للمبرد بتحقیق الاستاذ المیمنی ذکره موسی قندیل المدیر العام لدار النشر « بالاستاذ العلامة اللغوی الکبیر» و قال : ان تحقیقاته عالیة ، بحیث لایستطیع أن یستفید بها إلا أهل العلم ، لذلک لجانا إلی بعض التوضحات بین القوسین، لکی یستفید بها أیضاً من لیس له حظ کبیر من العلم ، کما قمنا بعمل الفهارس للمراجعة » .

لقد کتب الأستاذ المیمنی کثیراً ، و حقق و نشر ، ولو أنه لم یقم بغیر مأثرته التحقیقیة الخالدة « سمط اللآلی » لکان کافیاً لشهرته و بقاء اسمه . و بعد انقطاع صلته من الجامعات عیّنته حکومة الباکستان — بالمساعی المشکورة السید ممتاز حسن أمین الوزارة المالیة — مدیراً أولاً لمعهد البحوث الاسلامیة ، و بعثته إلی البلاد العربیة للحصول علی المصادر العربیة المتصلة بالموضوعات الاسلامیة بدون قید أو شرط ، فسافر الأستاذ المیمنی ، وجمع أهم المصادر العزیة المطبوعة و صوّر النوادر المخطوطة . فاضاف بذلک ثروة قیمة لهذه المکتبة الناشئة عما یعدّ مأثرة عظیمة له من مآثره العظیمة المتعددة .

لقد اجتهد کثیراً فی بحث شخصیات علمیة مناسبة لتولی مسؤلیة تنظیم مکتبة المعهد، ففحص بنظره الدقیق، وانتخب رجالاً ذوی مواهب، غیر ملتفت إلی الشهادات فقط، فانتخب الأستاذ عبد القدوس الهاشمی أمیناً للمکتبة، فأدی هذه الخدمة علی أحسن ما یرام، و هو من أهل العلم و المعرفة، حسن المجالسة و المحادثة، فکان منظر اجتماعه بالأستاذ المیمنی فی المکتبة مع زائر من زوار المعهد منظراً مشهوداً، لما تری من غزارة المعلومات و تبادلها بین الرجلین.

کان الأستاذ المیمنی یرید تعیینی کذلك لأمین المکتبة، فکتب إلی وزیر التعلم مستمیراً خدماتی من هیئة المخطوطات و المکتبات الحکومیة فی الباکستان علی مرتب مناسب. ولکن لم استطع قبول ذلك لأسباب ذاتیة، ولکنه مع ذلك أبقی علی حبه و ودّه لی، ففی سنة ١٩٧٦ حین إحتجت إلی خطاب توصلیة منه لوظیفة جدیدة فی کلیة بیرو (جامعة بیرو حالیاً)، کتب لی هذا الخطاب الذی ما زلت احتفظ به کذکری أخیرة له عندی [١].

کان الاستاذ المیمنی رجلاً عظیماً قام بأعمال عظیمة. لم یوفق لها کثیر من معاصریه و لم تکن اسرته کبیرة. فقد کانت له ثلاثة بنون، وبنت واحدة فقط [٢] ویشتغل إبنه الکبیر أستاذاً فی قسم الجغرافیا فی جامعة السند، وإبنه الأوسط یدیر دکاناً باسم «میمن اسطور» فی حیدرآباد السند،

---

١. هذا الخطاب منشور فی هذا العدد من المجلة فی قسم آثاره الکتابة / المجلة.

٢. کانت للاستاذ المیمنی ثلاث بنات: أکبرهن زبیدة خاتون التی تقیم فی(Pune) یونا بالهند مع زوجها، و الصغری صفیة محمود مع أهلها فی کراتشی بالباکستان، أما الوسطی سکینة بانو فقد توفیت فی الهند سنة ١٩٢٩ حینما کان الاستاذ مشتغلا فی جامعة علی کره / المجلة.

أما إبنه الأصغر الدكتور محمد عمر ميمن فقد حصل على الدكتوراه من امريكا. و تزوّج بامرأة يابانية أسلمت، و توطن هناك. و هذا مما جعل الأستاذ الميمنى يقلق عليه و قد توفيت قرينة الأستاذ الميمنى فى آخر عمره ۱ ، فبقى وحيداً . تعزيه فى وحدته ثروة غير قليلة ، و مكتبة قيمة نادرة ، و المنزل . أما المكتبة فان لم تكن كبيرة واسعة ، الا أنها كانت تحتوى على كتب نادرة ۲. توجد على كثير منها تصحيحات الأستاذ الميمنى و فوائده و ملاحظاته فكانت و لاشك متعته التى تمتع بها إلى أن خذلت قواه وانهاذ أمله فى ابنه الصغير — المثقف مثله بالثقافة العربية — بتوطنه فى امريكا ، فباعها لجامعة السندتم باع منزله ۳ ، و مكث مع البنته مع ما معه من ثروة أحبها طول عمره، و لازال يحبها ، فكانه كان يريد أن يأخذ ما معه إلى حيث هو ذاهب و قد فعل كما فعل العلامة نور الدين حمزه المعروف بارج باشا الحنفى المتوفى سنة ۹٤٥ ، فقد كتب المورخ نجم الدين الغزى المتوفى سنة ۱۰٦۱ھ عنه ۴ : « كان حريصاً على جمع المال يتقلل فى معاشه ، ويلبس الثياب الدنيئة، و لايركب دابته حتى جمع أموالاً عظيمة، و بنى فى آخر عمره مسجداً بالقسطنطينية، و بنى بها حجراً لطلبة العلم، و وقف عليها أوقافاً كثيرة قال له الوزير إبراهيم باشا يوماً : إنى سمعت بأنك تحب المال ، فكيف صرفته فى الأوقاف ،

---

۱. اسمها زينب بائى توفيت سنة ۱۹۷٦ / المجلة .

۲. يشتمل هذا العدد على مقال عن نوادر مكتبته . / المجلة

۳. على ما أذكر أن المنزل بيع بعد وفاة الاستاذ كما قالته لى صفية محمود فى كراتشى عام ۱۹۸۳م / المجلة .

۴. مجموع ماتبرع به الاستاذ الميمنى فى هذه الاعمال الخيرية يبلغ مقداره سبع مئة الفروبية كما أخبرنى به ابنه الاكبر الاخ الأستاذ محمد محمود الميمنى المقيم فى حيدرآباد بالسند حين زرته عام ۱۹۸٦م . / المجلة

قال : هو أيضاً من غاية محبتي في المال ، حيث لم أرض أن أخلفه في الدنيا ، فأريد أن يذهب معي إلى الآخرة ».[1] و على هذا وزّع الميمني أمواله في حياته الأخيرة بين معاهد قومية مختلفة في الهند و الباكستان و المجمع العلمي العربي بدمشق . كما وزّع نسخاً كثيرةً من «صحيح البخاري» على الطلبة . من ذكرياته الحسنة في السخاء والجود و الكرم «زاوية الميمني» في مكتبة ندوة العلماء بلكناؤ . بهذه الأعمال الخيرة التي لم يعلمها كثير من الناس وكان يتهلل بشره فرحاً مما كان دليلاً على أنه اطمأن بنقلها إلى حيث هو كان بنفسه قاصداً .

الأستاذ عبد العزيز الميمني من الشخصيات التي لا ينجبها الدهر الا بعد قرون ، و حقاً كانت وفاته مأساة قومية . لا يمكن تعويضها . رحمه الله رحمة واسعة وأسكنه فسيح جنانه مع الصديقين و الأخيار .

تعريب : السيد زين العابدين الاصلاحي

١. الكواكب السائرة بأعيان المئة العاشرة ١١٣٩ (بيروت ١٩٧٩) .

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

(تعمیرِ افکار بہ یاد ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ)

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کی ذاتی گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ پاکستان اور بیرون پاکستان یک ساں شہرت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہر موضوع پر گہری نگاہ رکھتے تھے، موصوف جس موضوع پر تقریر فرماتے وہ حاضرین کے لیے اطمینان بخش اور کافی وشافی ہوتی تھی، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی خاصیت یہ تھی کہ کلام اول تا آخر باہم مربوط، لہجہ نہایت شائستہ ہوتا تھا، جس موضوع پر تقریر کرتے گویا معلوم ہوتا کہ اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں، موضوع چاہے معیشت وتجارت کا ہو یا قرآن وحدیث کا، صیہونی سازشوں کا جائزہ ہو یا مغربی افکار کا، ہر موضوع پر ان کی تقاریر مبتدی ومنتہی کے لیے بے حد کارآمد ہوتی تھی، مسلسل کئی گھنٹے کی تقریر میں اول تا آخر یکسانیت برقرار رہتی، اور سامعین بھی آپ کے انداز گفت گو سے خوب متاثر ہوتے۔ نیز ان کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ انہوں نے زندگی میں پیش آمدہ نئے نئے موضوعات پر لب کشائی کی اور کسی ایک موضوع کے ساتھ اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا۔

غیروں کی مجلس میں اسلام اور مسلمانوں کی ترجمانی حضرت ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھے انداز سے کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان جگہوں تک اسلام اور مسلمانوں کی بات پہنچائی جہاں عام آواز کا پہنچنا مشکل تھا۔ ان کے کچھ ذاتی افکار بھی تھے جو ان سے مختلف محاضرات میں منقول ہوئے ہیں، لیکن ان تک ان کی رسائی کئی قسم کے لوگوں سے اختلاط کی بنیاد پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی مختلف ومتنوع موضوعات پر کی گئی تمام تقاریر سلسلہ محاضرات کے نام سے شائع ہو کر

مقبول خاص وعام ہیں، جن سے موصوف کی علمیت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اللہ رب العزت ان کی کاوشوں کو بار آور فرمائے ان کے محاضرات سے امت کو فائدہ پہنچائے اور ان کو اس کا بہترین بدلہ عطا فرما کر اپنے خاص فضل سے غریق رحمت فرمائے۔آمین

مولانا قاری شریف احمد صاحبؒ

(ندائے صفہ — قاری شریف احمد نمبر)

قرآن مجید اور دنیائے اسلام

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہم

باسمہٖ سبحانہٗ و تعالیٰ

قرآن آسمانی کتابوں میں ایسی کتاب ہے جسے تمام برِّ اعظموں شہروں، بستیوں میں ہر جگہ مسلمانوں میں ہر روز پانچ نمازوں میں اور مدرسوں میں پڑھا جاتا ہے۔

اسے لڑکے لڑکیاں، مرد عورتیں، لنگڑے لولے اندھے بآسانی زبانی یاد کرتے اور پڑھتے رہتے ہیں، بالغ عورتیں اور مرد پڑھتے اور اس کے حکموں پر ہر جگہ عمل کرتے رہتے ہیں، اور جب سے یہ اُترا ہے اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں جو چھوٹا بڑا اِس کو زبانی یاد کرتا ہے اُس کو حافظ، قاری، کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے دُنیا میں یہ ایسی واحد کتاب ہے جس کے پڑھنے پر اتنے ثواب واجر کا وعدہ کیا گیا ہے، اور جو اِس کے حکموں پر عمل کرتا ہے اسے بزرگ، متقی، پرہیزگار سمجھا جاتا ہے۔

آخرت میں قیامت کے دِن اس حافظ قرآن کو دس آدمیوں کی شفاعت کا حق حاصل ہوگا، اُس کے ماں باپ کو ''تاج'' پہنایا جائے گا اور دُنیا اِس اعزاز کو دیکھے گی۔

حضور اکرم ﷺ کا اِرشاد ہے خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (ترجمہ) ''تم میں بہترین اِنسان وہ ہے جو قرآن سیکھتا اور دُوسروں کو تعلیم دیتا ہے۔''

قاری شریف احمد صاحب دہلوی اور اُن کی علمی خدمات :

کراچی میں اس زمانہ میں ایسے خوش نصیبوں میں قاری شریف احمد صاحب دہلوی رحمہ اللہ کی شخصیت بہترین انسان کی تھی، کراچی شہر میں وہ فضلاء ''مدرسہ تعلیم الدین ڈابھیل'' میں سے تھے، اُنہوں نے بزرگوں کو دیکھا، اُن سے فیض حاصل کیا، اور ''جامعہ مدنیہ لاہور'' کے بانی اور ہمارے ہم سبق حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمہ اللہ بن

مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی رحمہ اللہ جو شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے، اُن کے مجاز تھے۔

قرآن کریم سے خصوصی تعلق :

کراچی سٹی ریلوے اسٹیشن کی جامع مسجد میں خطابت اور امامت کے فرائض منصبی ادا کرتے اور قرآن پڑھاتے تھے، میں نے مولانا احتشام الحق تھانوی رحمہ اللہ کے یہاں شبینہ میں قرآن سنتے سناتے دیکھا، اور سٹی اسٹیشن کی جامع مسجد میں ان کے پیچھے نماز پڑھی، وہ بہت نیک اور خدا رسیدہ بزرگ تھے عالم قاری تھے، کراچی میں بکثرت حفاظ وقراء اُن کے شاگرد ہیں، اُنہوں نے حفاظ بھی بہت بنائے ہیں۔

تصانیف وتالیفات :

عربی میں اپنے اساتذہ کی کتابیں شائع کیں، اُردو میں کتابیں اور رسالے لکھے جن کی تعداد پچاس کے قریب ہے اور اِس سے خلق خدا کو فائدہ پہنچا۔

بیعت واصلاح :

حضرت قاری صاحب نے سو سال عمر پائی، جس کی وجہ سے بہت زیادہ شب قدر اُنہیں نصیب ہوئیں وعظ و نصیحت، اصلاح وارشاد سے مریدین ومسترشدین کی تربیت کی، اُن کے واحد خلیفہ ''صفہ ٹرسٹ، لاہور'' کے بانی اُستاذ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور حضرت مولانا نعیم الدین صاحب ہیں۔

یادگار کارنامہ :

اُن کا عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے مشہور مصنف ومحقق ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری کا عظیم نادر کتب خانہ وقف کرایا ہے، جس سے کراچی کے دانشور بآسانی فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

اور لاہور میں صفہ ٹرسٹ بھی اُن کی سرپرستی میں برابر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا ہے اللہ تعالیٰ اُن کی علمی یادگاروں کا فیض رواں دواں رکھے، اور اُنہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

لیے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گل

شہید ناز کی تربت کہاں ہے

محمد عبدالحلیم چشتی

۱۴۳۳/۴/۴ھ/ ۲۰۱۲/۲/۲۷ء

ڈاکٹر مفتی عبد الواحدؒ

(ماہنامہ دارالتقویٰ لاہور—اشاعتِ خاص حضرت ڈاکٹر صاحب)

عجیب کامل انسان

حضرت ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم
مشرف شعبہ تخصص فی الحدیث، بنوری ٹاؤن، کراچی
واستاذ الحدیث جامعۃ الرشید، کراچی

''حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی صاحب دامت برکاتہم العالیہ تلمیذ رشید: شیخ العرب و العجم مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ و برادر خورد محقق العصر مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب رحمہ اللہ عصر حاضر کی جانی پہچانی محقق شخصیت ہیں، علم حدیث اور اسماء الرجال سے خصوصی دلچسپی ہے۔ علم اوڑھنا بچھونا ہے، کسی کے بارے میں رائے بہت صائب اور جچی تلی اور تبصرہ بہت برمحل ہوتا ہے۔ حضرت دامت برکاتہم سے ان کے تاثرات مختلف مجالس میں لیے گئے۔ اس لیے کسی قدر تکرار بھی ہوگیا ہے۔ قدرے توضیحی اضافوں کے ساتھ پیش خدمت ہیں۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے اندر کمالات منفرد ہیں اول تو وہ ڈاکٹر (ایم بی بی ایس) تھے ان کو خدا نے کیسی توفیق عطا فرمائی انہوں نے عربی بھی پڑھی، درس نظامی کی مکمل معقولات ومنقولات کی تعلیم حاصل کی۔ پھر حفظ قرآن بھی کیا، محراب بھی سنائی۔ کمال ہے! تجوید اور قرآت سبعہ بھی پڑھی۔ کیا کیا انہوں نے کیا، کمال کر گئے، ساتھ ڈیوٹی بھی دی۔ انہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد مولانا نعمانی سے یہاں لاہور کے قیام میں کچھ چیزیں پڑھی تھیں ''شرح نخبۃ الفکر'' اور ''مکانۃ الامام ابی حنیفۃ فی الحدیث''۔ میں اس وقت انہیں پڑھتا دیکھتا تھا، مفتی بھی بن گئے۔ پھر یہ سب کام کیے۔ یہ معمولی بات نہیں ہے، یہ سب چیزیں ان کے مقدرات میں تھیں انہوں نے ان کی تحصیل کے لیے جان دے دی، شہید علم ہو گئے۔ انہوں نے کمال پیدا کیا۔ اللہ کا ان پر کتنا بڑا فضل ہے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی گوناگوں صفات ہیں۔ اللہ نے ان کو بس عمر زیادہ لمبی نہیں دی۔ تھوڑی عمر میں اتنا کام کیا، انہوں نے محنت بہت زیادہ کی۔ ان کے ایک تلمیذ نے بتایا کہ وہ فرماتے تھے: **''مولانا! اللہ نے علم کے میدان میں جان توڑ محنت کروائی ہے۔''**

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے کتنی محنت کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ کچھ بننا ہو تو محنت بہت کرنی پڑے گی۔ حافظ نے کہا ہے:

الا یا ایھا الساقی ادر کاساً و ناولھا
کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلھا

علم کا حال بھی یہی ہے پہلے دلچسپ ہوتا ہے پھر خبر لیتا ہے۔

کہاں سے آئے اور کتنی منزلیں طے کرلیں انہوں نے۔

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ اپنی صفات میں منفرد تھے۔ پچاس کے قریب تالیفات چھوڑیں فتاویٰ بھی چھوڑے اور دو سو کے قریب ان کے تحقیقی مضامین چھپے۔ جب تک ہمت نے ساتھ دیا وہ لکھتے رہے۔ کیا یہ معمولی بات ہے! ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء۔

حضرت مولانا نعمانی صاحب رحمہ اللہ نے بھی حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کی کتاب کی تحسین کی تھی اور انعام سے نوازا تھا۔ یہ حضرت مولانا نعمانی کی بھی تشجیع اور حوصلہ افزائی کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ ٹو دی پوائنٹ بات کرتے تھے، لمبی چوڑی تقریر نہیں کرتے تھے، طالب علم کو بناتے تھے، کیسے لائق طالب علم چھوڑے۔

استاد لائق ہو تو طالب علم کو بنا دیتا ہے کچھ نہ کچھ۔ ان کے طلبہ کی ان سے گرویدگی ان کی شخصیت کا پتہ دیتی ہے۔ دیکھیے کس فیلڈ کا آدمی ہے! اور کس فیلڈ میں آیا ہے۔ اور کیسی بلا کی محنت کی ہے، اس فیلڈ میں بھی منتہی اور اس فیلڈ میں بھی منتہی۔ اس لیے کام کر گئے۔ جو چھوڑ گئے وہ ان کے خلا کو کون پُر کرے گا۔

ایک مضبوط جماعت چاہیے ان کے خلا کو پر کرنے کے لیے۔

بہت اچھا کیا، کام بھی کیا اور طلبہ بھی اچھے چھوڑے جو ان کو زندہ رکھیں گے۔

اپنی کتابوں کی رائلٹی بھی نہیں لیتے تھے۔ عجیب وضع کے آدمی تھے۔ ''حضرت ڈاکٹر صاحب سیمینار'' میں ان کے متعلق ان کے ایک شاگرد نے جو مضمون پڑھا تھا اس نے کیسا گہرا تجزیہ کیا ہے اپنے استاد کا۔

میاں! ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ تو فوت نہیں ہوئے جو کتابیں لکھ گئے ان کی صورت میں زندہ ہیں، کام اور تلامذہ چھوڑ گئے ان کو قیامت تک ثواب ملتا رہے گا۔ تحریر تو ایسی چیز ہے بھائی جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے ان کے تلامذہ بھی اب محنت کریں ان کی جگہ ان جیسا کام کریں۔ ماشاءاللہ بہت باصلاحیت تلامذہ ہیں ان کے، ان کی نیک نامی کا باعث ہوں گے۔ کیسے لوگ تھے یہ کام کر گئے آج دیکھیے زندہ ہیں۔ بہت بڑی بات ہے۔

میاں! ان کے بعد ان جیسا عالم تو کیا ان جیسا انسان بھی نہیں ملے گا۔

وہ اعلیٰ علیین کے آدمی تھے وہیں پہنچ گئے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

☆☆☆